UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222984
UNIVERSAL
LIBRARY

The Drinched Book

text fiy book

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ک ۹۱۵۴ س ب ن Accession No. ۱۴۱۳۵

Author ہندوستانی زبان

Title ہندوستانی زبان

This book should be returned on or before the date last marked below.

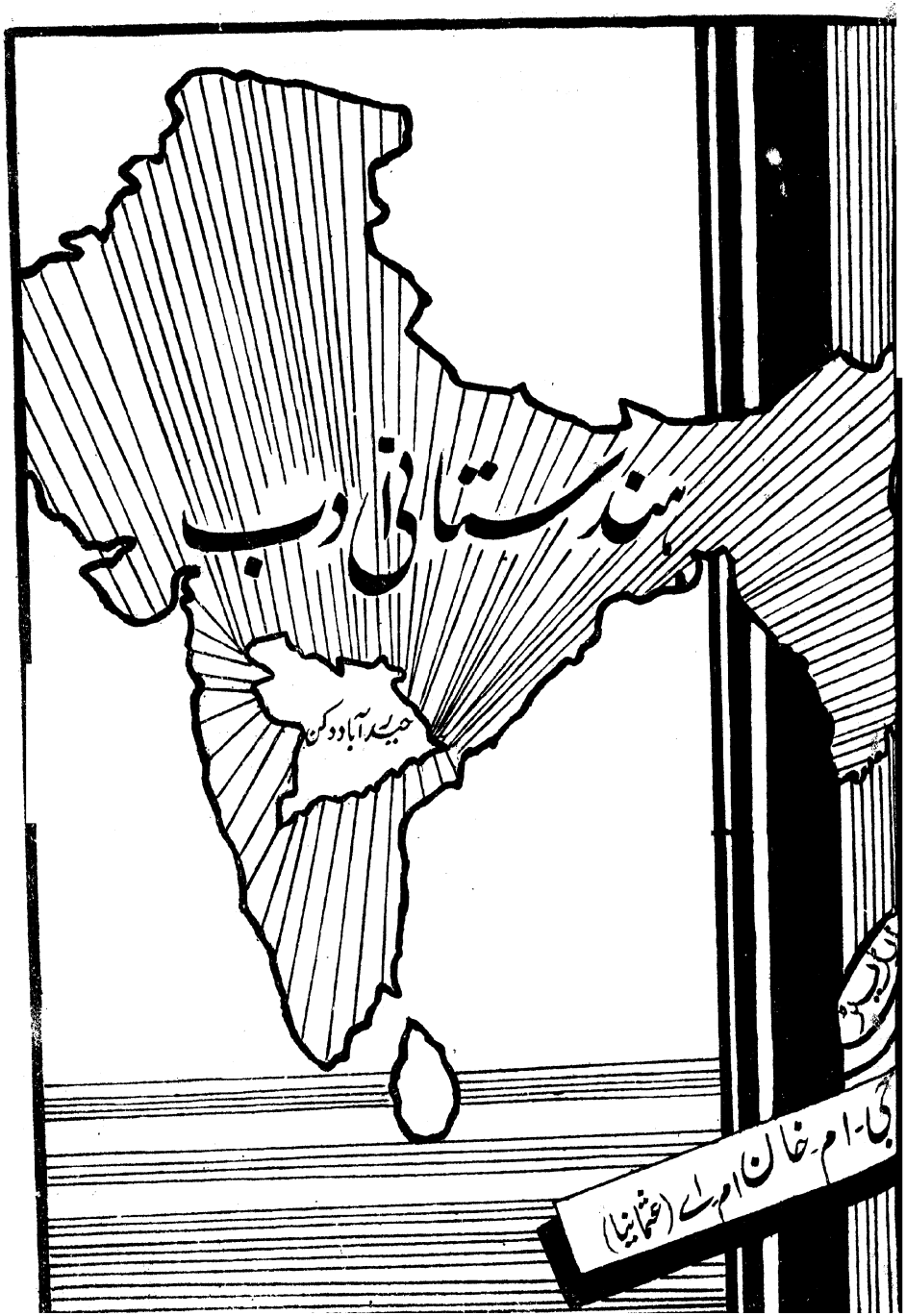
ہندستانی ادب
حیدرآباد دکن
جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔ اے اعظم پورہ۔ شرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

حکومت، پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

قیمت ایک پیچ آٹھ آنے

جلد ۱۴ نمبر ۱

آذر ۱۳۶۳ف

اکتوبر ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	افقر موہانی	۴	
صبح امید	صفی احمد (بہاری)	۵	
غریب الوطن کی فریاد	علی اختر	۶	
تشدد کا اسیر	سلام سندیلوی ام۔ اے ال ال بی	۸	
ہندستانی ادب اور ہندستانی زبان	مقتدا حسن رفیق شیدا ایٹھوی	۹	
بحث	ایاز عصمی	۱۱	
برطانوی یونیورسٹیاں اور حکومت			
ناشاد کانپوری			
نگم			
صحت کے پیسے وٹامن			
وجیے			
ابا جی ابن کو نان سے			
ماں کی بائیبل			
ایچ۔ سی۔ ڈینٹ			۱۴
افقر موہانی			۱۶
قمرالدین قمر			۱۹
ا۔ ا			۲۳
شاہد اختر			۲۵
م۔ ل			۲۸
ایوسیس			۳۱

ہمارے خیالات

ہندستانی ادب اور ۱۴ ویں سال میں

اس زمانے میں کسی ٹھیٹ علمی ادبی رسالے کا نمدار رہنا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ خریداروں کی کمی اور مالی پریشانیوں کے سبب پرانے پرانے علمی ادبی سیوک تک دم توڑ دے رہے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد ہی میں دو قدیم رسالے ختم ہو چکے۔ نئے رسالوں کا تو پوچھنا ہی کیا یعنی اگر کوئی رسالا اس مہینے جاری ہوا تو دو چار بار زیادہ سے زیادہ پانچ سات نمبر بعد اس کا ختم ہونا ایک ضروری سی بات ہے۔ کم از کم اسال کے اس لمبے چوڑے عرصے میں صرف حیدرآباد ہی میں پچاسوں ہی رسالے وجود میں آئے اور پت جھڑ کی طرح ختم ہو کر بھی رہے۔ اس کا دوش رسالے جاری کرنے والوں پر نہیں دیا جا سکتا بلکہ جنتا یا عوام اس کے ذمے دار ہیں اگر یہ لوگ ان نئے رسالوں کی طرف دھیان دیتے ان کے مستقل خریدار بن کر ان کی ہمت بڑاتے تو آپ یقین جانیے کہ ایک بھی رسالا ختم ہونے نہ پاتا بلکہ تمام رسالے جاری رہتے اور یہ سب مل کر علم و ادب اور بھاشا کی زیادہ سے زیادہ سیوا کرتے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس مصیبت کے شکار صرف حیدرآباد ہی کے رسالے نہیں بلکہ ہندستان کے ہر گوشے کونے سے جو بھی نیا رسالا جاری ہوا اس کو چند ہی مہینوں یا بعض نکلوں میں دو ایک سال کے اندر اندر ہی علم آلام کا رخ کرنا پڑا اور ہندستان کے بعض چوٹی کے پرانے رسالے جاری ہیں ان کا حال بھی تقریباً پتلا ہی ہے۔ اس لیے کہ کبھی کبھار ان کے اداریوں سے بھی سکوے اور شکایت کا رنگ جھلک ہی جاتا ہے انہیں میں سے ایک معاصر کے صبر کا پیمانہ اس طرح سے چھلک اٹھا تھا کہ اس نے واقعی سنجیدگی کو ہاتھ سے دے دیا "اور غیر علمی ادبی ان رسالوں کو جی کھول کر گالیاں سنا دیں جن کے آگے بے چارے علمی ادبی رسالوں کا چراغ جلتا نظر نہیں آتا۔ اس بارے میں ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اس کا تصفیا جنتا پر چھوڑے دیتے ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ صرف ہندستان ہی کے علمی ادبی رسالوں پر برے دن آئے ہیں۔ ہمسایا ملک پاکستان کے بھی علمی ادبی رسالے ایسی ہی مصیبتوں اور اسی قسم کی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ رسالوں کی بناء حالی کا لحاظ کرتے اور انہیں سہارا دلاسا دینے کی خاطر پاکستان میں ماہوار رسالوں کی ایک انجمن بنائی گئی ہے اس انجمن کا پہلا عام جلسہ ۱۱ اگست ۵۳ء کو لاہور میں ہوا۔ یہ جلسا اصل میں پہلی کانفرنس کی آواز تھا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے اکثر ماہوار رسالوں کے ایڈیٹر اور ممالک غیر شریک ہے سبھوں نے اپنی اپنی بپتا سنائی۔ اس کانفرنس کے صدر استقبالیا حامد علی خان تھے۔ انہوں نے اپنے خطبے میں بتایا کہ "ادبی رسایل اس وقت تک بے حسی، ناقدر شناسی اور کس مپرسی کا شکار رہے بے شمار اچھے ادبی رسایل بند ہو گئے اور جو زندہ ہیں وہ بھی سسک سسک کر جان دے رہے ہیں" آپ نے آگے چل کر کہا کہ "ادبی رسایل ہماری تاریخی، تمدنی، علمی اور ثقافتی میراث کے امین ہیں۔ یہ ملک و ملت کے خاموش خادم ہیں۔ ان سے بے نیازی خیتا کیے رہنا اور ان کی بے ریا خدمات کے دور رس نتایج کو خاطر میں نہ لانا قومی و ملکی نقصان ہے"۔

حامد علی خان کے بعد انجمن کے بانی راز الجیری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "..... ادب دم توڑ رہا ہے علمی ادبی اخلاقی اور فنی رسایل ... ایڈیٹر رگڑ رہے اور زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں" راز الجیری نے آگے چل کر بتایا کہ "..... بے شمار پرچے بند ہو گئے اور جو جاری ہیں وہ صبح شام کے مہمان ہیں... پاکستان کا پرانے سے پرانا اور کامیاب سے کامیاب ایک بھی ادبی

رسالا نہیں کہہ سکتا کہ وہ بغیر کسی نقصان کے زندا ہے۔۔۔۔ ہمارے ادبی رسالے عالم نزع میں ہیں۔ کیا انہیں یوں ہی کس مپرسی کی موت مرنے دیا جائے گا؟" پاکستان کے سرکاری آرگن یعنی حکومت کے پیسے سے نقصان میں چلنے والے رسالے "ماہ نو" کے بارے میں بھولے بھالے عوام کو یہ غلط فہمی ہے کہ اتنا اچھا اور دیدہ زیب رسالا اتنے سستے داموں دیا جاتا ہے تو پھر دوسرے معمولی قسم کے رسالے اپنی قیمت کیوں نہیں گھٹانے یا یہ کہ اسی قیمت پر "ماہ نو" جیسا رسالا کیوں نہیں دیتے؟ ایسے خام خیال افراد کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہم اسی کانفرنس کی ایک قرارداد کا خلاصا پیش کیے دیتے ہیں تیرویں قرارداد میں کانفرنس نے حکومت سے سختی کے ساتھ مطالبا ہے کہ "ماہ نو" جیسا اچھا اور قیمتی رسالا اتنے سستے داموں بیچکر دوسرے ادبی رسالوں کے حقوق پر ڈاکا نہ ڈالے۔ یا تو اس کے ظاہری معیار کو گھٹا دے یا یہ کہ اس کی قیمت میں کافی اضافا کر دے۔"

اس قرارداد سے صاف ظاہر ہے کہ سرکاری آرگن چونکہ حکومت کی آواز اور پروپگنڈے کا آلا ہوا کرتے ہیں اس لیے حکومتیں ایسے رسالوں کو سراسر نقصان میں چلایا کرتی ہیں چنانچہ ہمارے دیس ہندستان میں "آج کل" بھی حکومت کا آرگن ہے "ماہ نو" کی طرح یہ رسالا بھی پورے نقصان کے ساتھ چلایا جا رہا ہے اس گر کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جتنا کیا جائے کہ کوئی رسالا نقصان میں چل رہا ہے یا نفع کے ساتھ۔ وہ تو صرف ظاہرداری کو دیکھتی ہے یہ سچ ہے کہ عام ذہنیت اس قسم کے نفع نقصان کا اندازا نہیں کر سکتی۔ مگر ہمیں افسوس تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو تعلیم یافتا یا بعض صورتوں میں عالا تعلیم یافتا بھی کہتے ہیں، اور اس کے باوجود وہ رسالوں کے ظاہری گھٹیا قیمتا اور زیادا قیمتوں کا گلا گھونٹا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تو کم سے کم اس قسم کی بے معنی شکایتیں نہ کرنی چاہئیں۔

مختصر یہ کہ اوپر کی ان تمام مثالوں اور نظیروں کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد ان معترضین کے جوابات دینا ہے۔ "جو مشکل آج ادب کے بارے میں بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف ۳۲ صفحے کا دبلا تو اچھا نہیں۔ اسی لیے اس نیم جان کو ہم نے اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔"

پتلا اور چھوٹا رسالا کون خریدے جبکہ اسی قیمت میں ایک بھاری بھرکم اور شاندار رسالا مل سکتا ہو۔ یہ سچ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "ہندستانی ادب" یا اس کے دوسرے ساتھی رسالے کم حجم کے ساتھ زیادا قیمت وصول کرتے ہیں۔ مگر ان حضرات کو ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ زیادا قیمت پانے کے بعد بھی یہ رسالے بھاری نقصان کے ساتھ چلائے جا رہے ہیں۔

کیوں ۔۔۔ جواب ایک سے زیادا مرتبا دیا جا چکا ہے۔ جو بالکل ہی صاف ہے کہ ۔۔۔ محض علمی ادبی خدمت کی خاطر! جب رسالے چلانے والے ایثار سے کام لے سکتے ہیں تو کیا تعلیم یافتا حضرات اور صاحبان ذوق اپنے تھوڑے سے نقصان کو گوارا نہیں کر سکتے ۔۔۔ اگر ان میں کا ہر شخص اس بات پر آمادا ہو جائے تو خریداروں کی کثرت کے سبب رسالوں کی آمدنی میں کافی اضافا ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ رسالے بھی ظاہری خوبیوں اور بڑیا حجم کے ساتھ پیش ہوا کریں گے۔

بہرحال ہم نے بھی اپنی بپتا کا خلاصا بیان کر دیا ہے۔ ہمارا سب سے بھاری اور پہلا مقصد سیوا کرنا ہے۔ اسی لیے آج چودا سال سے برابر علم و ادب اور دیس بھاشا کی نمائش سیوا کیے چلے جا رہے ہیں۔ ایک عرصے سے نقصان جھیلتے چلے آ رہے ہیں، مگر یہ کب تک؟ اگر تعلیم یافتا طبقا اس طرف دھیان نہ دے تو "ہندستانی ادب" کا بھی لازمی طور پر وہی حشر ہوگا۔ جو اس کے بعض پرانے ساتھیوں کا ہوا۔

آخر میں ہم اس ادارے کی طرف سے ان تمام معاونین، مضمون نگار، افسانا نویس اور شاعر حضرات وغیرا کا شکریا ادا کرتے ہیں جن کے تعاون نے اس رسالے کو ایک اور سال کے لیے علمی ادبی سیوا کا موقع دیا ہے۔ ہمیں آشا ہے کہ اس جاری سال میں بھی ان تمام کرم فرماؤں کی عنایت پہلے کی طرح شامل حال رہے گی ہمت کر کے ہم نے اس سال بھی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ مگر کہہ نہیں سکتے کہ کیا ہوگا؟ حالات یقیناً نازک سے نازک تر ہو گئے ہیں ہو سکتا ہے کہ اچانک ہی دم توڑ دے مگر موت سے پہلے کسی چیز کا گلا گھونٹ دینا یہ بھی

حقایق و معارف

ہستی سے بے نیاز بنا کر چلے گئے — ہستی کا امتیاز مٹا کر چلے گئے
جلوے ترے نظر میں سما کر چلے گئے — دل کو مرے گھر اپنا بنا کر چلے گئے
کیا جانے کیا وہ دل کو سنا کر چلے گئے — تصویر انتظار بنا کر چلے گئے
مدہوش میکشوں کو بنا کر چلے گئے — افقر — گرتے ہوؤں کو اور گرا کر چلے گئے
کل کائنات دہر پہ چھا کر چلے گئے — ہستی میں یار کی جو سما کر چلے گئے

بیگانہ جس نے مجھکو مجھی سے بنا دیا — موہانی — ایسی بھی اک ادا وہ دکھا کر چلے گئے
ساحل پہ بھی تھے ایسے تھپیڑے ہواؤں کے — طوفان کی سمت مجھکو بہا کر چلے گئے
حکم اسیری ہم کو ملا گلستاں میں جب — وارثی — ہم خود ہی آشیاں کو مٹا کر چلے گئے
سجدوں پہ سجدے کرتے رہے ہم تمام عمر — کعبہ کسی کے در کو بنا کر چلے گئے
روز ازل سے وجد میں ہے روح اور وہ — اک نغمۂ لطیف سنا کر چلے گئے
قربان اس نوازش الفت کے جایئے — خاک لحد بھی میری مٹا کر چلے گئے
زاہد نہ پوچھ خلد بریں کا معاملا — رحمت کو راز دار بنا کر چلے گئے
دیکھا کچھ اس طرح نگہہ گرم گرم سے — دل سے جگر تک آگ لگا کر چلے گئے

ملے ہم نے کی ہے اس طرح افقر رہ وفا
ہر نقش پا پہ سر کو جھکا کر چلے گئے

صبح امید

صفی احمد (بہای)

مرکب شوق کو اے دوست نگ گام نہ کر
اپنی آزاد طبیعت کو یوں بدنام نہ کر
بندکش رسم کہن کی یہ شکایت کب تک
اپنے کمزور ارادوں کی حمایت کب تک

دل ہے آزاد تو پھر طوق و سلاسل کیا ہے
عزم راسخ کے لیے دوری منزل کیا ہے
اپنی بے باک امنگوں کا سہارا لے کر
دیکھ تو چھا کے ذرا عالم بوسیدا پر

عہد حاضر کی گذر جائے گی یہ تاریکی
صبح امید بصد شان نمایاں ہوگی
سعی پیہم تری وہ رنگ نیا لائے گی
آج کی بدلی ہوئی دنیا بدل جائے گی

ایسے ماحول سے اے دوست نہ ہو تو بد دل
مہر روشن سے چمکنے کو ہے پھر مستقبل
صبح کاذب کی سفیدی یہ رہے گی کب تک
ظلمت شب کی سیاہی نہ چھٹے گی کب تک

پردہ شب سے سحر ایسی نمودار ہوگی
جس کی پرتو سے زمیں اپنی ضیا بار ہوگی
ساز دل سے پھر اٹھیں گے وہ خوشی کے نغمے
جس سے ہو جائیں گے پر کیف یہ شیریں لمحے

ختم ہو جائے گا سرمایا پرستی کا نظام
مفلسو! خش ہو کہ آنے کو ہے وہ خش ہنگام

غریب الوطن کی فریاد

علی اختر

ہم یہ نظم "کاروان" کراچی سے شکریے کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ اس نظم کے لکھنے والے علی اختر حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر ہیں۔ جو کچھ عرصا پہلے ترک وطن کر کے کراچی میں بس گئے ہیں۔ "ہندستانی ادب" کے مستقل پڑھنے والوں کے لیے علی اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سالے میں ان کا کلام برابر چھپتا رہا ہے علی اختر کا شمار حیدرآباد کے ان چند گنے چند شاعروں میں ہے جن کے نام پر حیدرآباد بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اس نظم کو صرف شاعری کے خیالات کی ترجمان کہنا بڑی بھاری بھول ہو گی۔ یہ نظم اصل میں علی اختر حیدرآبادی کے حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہے اور سچ پوچھو تو یہ کسی ایک غریب الوطن کی فریاد نہیں، بلکہ اس نظم کے ہر ہر لفظ میں ان لاکھوں ہی غریب الوطنوں کی درد بھری فریادیں چھپی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے اپنے عزیز وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور غریب الوطن بن گئے ہیں۔

ہندستان سے گئے ہوئے لوگ ہوں یا پاکستان سے آئے ہوئے افراد دونوں نے اپنا اپنا وطن چھوڑا اور غریب الوطن کہلائے۔ چھ سال بعد بھی انہیں اپنے اپنے وطن کی یاد ستا رہی ہے۔ وہ اپنے وطن لوٹنے کے لیے بے چین اور بے قرار نظر آتے ہیں ان کے دلوں میں وطن کی محبت کا پاک جذبا ہر وقت ٹھاٹیں مارتا رہتا ہے۔ آدمی اپنے تمام دوسرے جذبوں پر غالب پا سکتا اور انہیں بھلا بھی سکتا ہے لیکن وطن کی محبت ایک ایسا پاک جذبا ہے جو مرے دم تک برابر قایم رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان بے چارے غریب الوطنوں کو بے طوق و سلاسل کے قیدیوں کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ـــــ ان لاکھوں ہی مجبور محض ہستیوں کو آزادی عطا کرنا ہندستان اور پاکستان کی حکومتوں کا سب سے پہلا فرض ہونا چاہیے۔

جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یہ تمام رکاوٹیں محض کشمیر کے جھگڑے کے باعث ہیں تو ہماری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی ہم یہ سمجھنے سے مجبور ہیں کہ آخر دوسرے مسایل کو کشمیر کے جھگڑے سے کیسے تعلق ہو سکتا ہے کشمیر کا جھگڑا تو ایک مستقل اور بلکل ہی الگ قضیا ہے۔ جو نہ معلوم کب فیصل ہو۔ باقی رہیں دوسری رکاوٹیں اور پابندیاں، یہ سراسر غیر ضروری اور ناواجبی ہیں ان کو اٹھا دینے سے بہت سی غلط فہمیوں کے پردے چاک ہو جائیں گے اور طرفین کے دلوں کا میل دور ہو جائے گا۔ دونوں ملکوں کے لوگوں کو جب آنے جانے اور رہنے بسنے کی پوری پوری آزادی دیدی جائے گی تو اس میل جول کا لازمی نتیجا خلوص اور محبت کی شکل میں نکلے گا جب جنتا ہی کے دل آئینے کی طرح پاک صاف ہو جائیں تو پھر حکومتیں آپس میں جھگڑا کس کے لیے مول لیں ـــ یہی وہ نازک نکتا ہے جس کو پورے پورے طور پر سمجھنے کی دونوں حکومتوں کے سنجیدا افراد کو غور کرنے کی ضرورت ہے اگر دونوں حکومتیں اس اہم اور ضروری مسلے کا حل تلاش کر لیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس کے کچھ ہی عرصا بعد کشمیر کے اٹل قضیے کا مذہ ہی کوئی حل نکل آئے گا۔

آخر میں ہم انسانیت اور وطن کی مقدس سرزمین کے پاک جذبے کے نام پر ہندستان اور پاکستان کے کرتا دھرتاؤں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ عقل کی عینک لگا کر "غریب الوطن کی فریاد" کو پڑھیں۔ اور اس کے ہر ہر شبد سے آہ و بکا اور چیخ پکار کی جو دلی ہلا دینے والی آوازیں آ رہی ہیں ان کو کان دھر کر سنیں۔ چونکہ یہ لاکھوں ہی دکھی غریب الوطنوں کے دلوں کی آواز ہے اور

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

ـــــ ممکن ہے یہ اثر کام کر جائے اور پتھر جیسے دلوں کو بھی موم کی طرح پگلا دے۔ اور آخر کار دونوں ملکوں کے درمیان

کوئی ایسا انسانیت نواز ہمیں ملتا ہے جو بے چارے اور مجبور محض غریب الوطنوں کی نجات کا باعث بنے۔ ایڈیٹر

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں کی خاک بھی ہے آنکھوں سے لگانے کے قابل
وہ دیس جہاں کا ہر ذرہ ہے ایک عبادت خانہ دل
وہ میرے خیالوں کی جنت، وہ میری امیدوں کا حاصل
وہ میری مرادوں کا مرکز وہ میرے ارادوں کی منزل

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں طفلی کی بہاریں وحشی و رقصاں گزری ہیں
وہ دیس جہاں غم کی گھڑیاں صد عیش بداماں گزری ہیں
وہ دیس جہاں میری راتیں سرشار و غزلخواں گزری ہیں
وہ دیس جہاں میری صبحیں مسرور و درخشاں گزری ہیں

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں ندی کے کنارے پہروں کھیلا کرتا تھا
کس شوق سے پانی کی لہروں کے رقص کو دیکھا کرتا تھا
جھنجھا سلا نے آتا تھا خورشید جگایا کرتا تھا
دنیا کے ستم سے ناواقف، جینے کی تمنا کرتا تھا

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس فضاؤں میں جس کی سرشار جوانی آئی تھی
وہ دیس جہاں جاگی تھیں امنگیں، شوق کی بدلی چھائی تھی
وہ دیس جہاں اک شوخ نظر پیغام مسرت لائی تھی
رگ رگ میں نہاں اک درد سا تھا اک چوٹ سی دل پر کھائی تھی

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں معلوم یہ تھیں ہستی کی ستم پرور گھاتیں
دل چسپ وہ باغوں کی سیریں، دل کش وہ سہانی برساتیں
گھنگھور گھٹاؤں کا اٹھنا، رنگین فضا سرخوش باتیں
اللہ کدھر نہاں ہیں وہ دن، اللہ کہاں ہیں وہ راتیں

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

ہاں کچھ تو سنا اے روحوں کو پیغام طرب دینے والی
ماتا کہ فضائے گیتی میں ہے کھیل دلوں کی پامالی
ماتا کہ زمانہ ہے یکسر انوار محبت سے خالی
ماتا کہ نہیں دنیا میں گراں بازوں پہ کسی کی بے حالی

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

للہ بتا کچھ بیکس کو یاران وطن کیا بھول گئے
پردیس کا عالم ہوتا ہے کس درجہ غم افزا بھول گئے
مدت سے ہے اک آوارہ وطن حرمان تمنا بھول گئے
آتا ہوں کسی کو یاد بھی میں یا سب مجھکو وہاں یا بھول گئے

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

کہنا کہ تمہارے ساتھی کو دنیا کے ستم نے لوٹ لیا
پردیس میں ہیہم ناکامی کے رنج و الم نے لوٹ لیا
ہستی کی متاع عشرت کو بے مہری غم نے لوٹ لیا

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

اٹھتی ہیں گھٹائیں گو اب بھی وہ مونہہ آنسوؤں سے دھوتا ہے
آتی ہیں بہاریں بھی وہ سر بجیباں ہوتا ہے
رہتا ہے وہی اک محو طوفاں جب چین سے عالم سوتا ہے
رونوں کو ہنساتا تھا جو کبھی دن رات پڑا اب روتا ہے

اے موج صبا! کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

ضروری نوٹ:۔ اس نظم کے آٹویں بند میں صرف چار مصرع نقل کی بھول کا نتیجہ نہیں بلکہ اصل ہی میں اسی طرح پر لکھا ہے۔

تشدد کا اسیر

سلام سندیلوی
ایم اے ال ال بی وشاردواس پرنسپل سنی ہائیر سکنڈری اسکول
(لکھنو)

بیکس و غمزدہ ریشم کا یہ بھا کیڑا
اپنے ہی چاروں طرف جال بنا کرتا ہے
اپنے ہی گرد امیروں کے تعیش کے لیے
اپنے ہی ہات سے دیوار چنا کرتا ہے

اس کی تخلیق ہوئی غم کدہ عالم میں
مسکراتے ہوئے ارباب دول کی خاطر
وقف یہ شمع رہی صرف شبستاں کیلیے
یہ لہو صرف ہوا رنگ محل کی خاطر

آنکھ کھلتے ہی بلا میں یہ گرفتار ہوا
چھن گئے اس کے مقدر سے خوشی کے لمحات
ظلم کے ہات میں تھرانے لگا جسم نزار
سسکیاں لینے لگی کھولتے پانی میں حیات

دل صد چاک سے جو زلف سنورتی ہی ہی
زندگی اس کی نگاہوں میں ہے کس درجہ حقیر
خون ارماں کی ہر اک تار سے بو آتی ہے
کوئی دیکھے تو ذرا اطلس و کمخواب و حریر

برگ شہتوت پہ بے چارا گزر کرتا ہے
ہے تو کیڑا ہی مگر نیش زنی سے معذور
کتنا معصوم مگر پھر بھی تشدد کا اسیر
کتنا خاموش مگر پھر بھی فغاں پر مجبور

لاکھ مدھم سہی نفی کی یہ چنگاری بھی
چند زردا روں کے رخسار کا غازا تو نہیں
گنج قاروں بھی نہیں سوز نفس کی قیمت
جوہر زیست زر و سیم کا سودا تو نہیں

ہندستانی ادب اور ہندستانی زبان

مقتدا فاروقی
سیدا ـــــ (ایٹاوی)

کسی زبان کی ترقی کا انحصار بہت کچھ اس زبان کے شعرا ادبا مشاعروں، ادبی اور علمی اداروں مطبوعات اور اخبارات ورسایل پر ہوتا چلا آیا ہے۔ بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں سرگرم عمل ہوتے رہیں لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہماری ملکی زبان (اردو ہو یا ہندستانی یہ دوسری بحث ہے) کی کماحقہ ترقی میں محض اس وجہ سے رکاوٹ ہے کہ اس کے ارتقائی ذرایع سے ٹھیک طرح پر کام نہیں لیا جارہا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں تو تفریحی اور ریڈیو کے اجرائی ٹھیکوں پر جہاں پر پڑھنے والے محض ترنم کے بل بوتے پر اپنے ٹھکے وصول کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں نہ کوئی مغز ہوتا ہے نہ یہ ٹھوس خدمت ادب بھی کہی جاسکتی ہے۔ رٹی رٹائی چند نمونوں کی غزلیں پڑھ دی جاتی ہیں۔ اداسی کی مداومت سے فیس وصول ہوتی رہتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اب سے کئی برس پیشتر ریڈیو کے اسٹیج پر پٹھیکیدار رکھے وہی آج بھی براجمان ہیں۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی نہ دوسرے ممتاز اور مشہور شعرا کو موقع دیا جاتا ہے کہ شاید وہ ان خدمتاروں سے بہتر ثابت ہوں۔ یہی حال دوسرے ملکی مشاعروں اور صحبتوں کا ہے۔ وہاں بھی اب فیس اور اجرت کا چلن ہوگیا ہے۔ اور اسی نقطہ نظر کے تحت شاعری بھی رہ گئی ہے دوسرے برائے نام ادبی اداروں میں بھی بجز نام ونمود اور غلط پروپگنڈے کے کوئی کارآمد بات نہیں پائی جاتی ہے۔

اب رہے اخبارات اور رسایل ان کا یہ حال ہے کہ غیر مہذب اور فحش اشتہارات سے اپنا پیٹ بھر لینا اور اخبارات کو جاری رکھنا ان کا انتہائی کمال ہے۔ نہ زبان کے متعلق علمی ادبی اور فنی مقالے ہوتے ہیں۔ نہ دوسرے موضوعات علمی پر بحث ومکالمانظر آتا ہے۔ جس سے زبان کو کچھ وسعت اور ترقی کا موقع مل سکے۔ محض بازاری اور مخرب اخلاق افسانوں یا رومانی اور شرمناک اغزلوں نظموں سے ادب اور زبان کبھی ترقی نہیں پاسکتے۔ آج کل کی مطبوعات کا بھی ایسا ہی شرمناک لٹریچر ہے جس سے اخلاق درست ہونے کے بجائے بگڑ جاتا ہے۔ چند ہمدردان ادب اور حامیان زبان کی چیخ وپکار صدا بصحرا سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ ہم نے مانا کہ بھارت ایسے برصغیر میں کچھ نفوس ضرور ایسے ہیں جنہیں زبان وادب اور ملکی لٹریچر کی ترقی کا دل سے خیال ہے مگر یہ کام محض ان سے انجام نہیں پاسکتا ہے تاوقتیکہ زیادہ سے زیادہ اہمنوائیاں نہ ہوں۔ شلاً کے ادبی ادارے مسدود ہورہے ہیں جو صحیح اصول پر کام کرنے والے تھے۔ مثلاً سیماب اسکول حضرت دل شاہجہاں پوری جناب نوح جناب آرزو مولانا صفی حسرت موہانی وغیرہ کے چمنستان ادب خزاں رسیدا ہوچکے یا ہورہے ہیں۔ ملک کا سب سے بڑا ٹھوس خدمت ادب انجام دینے والا علمی وادبی ۶۰ سالا ادارہ "جام جہاں نما" بھی حضرت مولانا ناظر موہانی وارثی کی آئے دن کی علالتوں سے مجہول ہورہا ہے جہاں ہر سال دس بیس شعرا ادبا اور اہل فن کامیاب صورت میں ہیئا نکلتے رہے اور جن کی خدمات زبان وادب سے نہ صرف ملک کے طول وعرض میں بلکہ غیر ممالک میں بھی اکثر وبیشتر تبلیغ واشاعت علم وفن کی ہوتی رہی۔ اور آج کے دن کوئی ایسا مقام ملک میں نہیں ہے جہاں مولانا موصوف کی فیض گستری سے زبان وادب کی صلاحیت کم وبیش نہ پائی جاتی ہو مگر آہ

ع "چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

اسی طرح اخبارات کو قطع نظر کرتے ہوئے ماہوار رسایل پر اگر نظر ڈالیے تو پچیس سال کے اندر کوئی

رسالا تمام ملک میں ایسا نظر نہ آئے گا جس نے "ہندستانی ادب" سے زیادہ زبان و ادب کی مستقل خدمات اور ضروریات انجام کو پہنچائی ہوں۔ کسی رسالے میں ایسے زیادہ سے زیادہ علمی ادبی مقالے تاریخی اور جغرافیائی حالات اخلاقی افسانے اور مذاقی و اصلاحی مضامین ہمیشہ شایع ہوتے رہے ہیں۔ یہ زبان اور ادب کی صحی اور مستقل ٹھوس خدمت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ "ہندستانی ادب" کا رکھ رکھاؤ اور شوخ رنگ برنگ سا نہیں معمولی کاغذ معمولی حجم جن میں دو تہائی رات کی حیا سوز و شرمناک تصاویر ہی ہوتی ہیں اور نہ جاذب نظر عریاں کارٹون ناظرین کے دلوں کو لبھاتے ہیں۔ اس لیے اس کا کام ٹھیٹ علمی ادبی خدمت انجام دینا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ علمبرداران زبان و ادب اور ملکی بھاشا کے حامیوں نے "ہندستانی ادب" کے ساتھ کیا تعاون عمل فرمایا۔ اور کس قدر اس کی مالی اور عملی طور پر ہمدردی فرمائی؟ اس کی پکار پر کس کس اہل ادب اور اہل زبان نے لبیک کہا اور آج اس کی انتہائی حالت زار پر کس نے ڈھاریں بندھائی؟ جس سے کچھ تو اس کی اشک شوئی ہو جاتی۔ جواب صاف نفی میں ملتا ہے ہمت اور ہمدردی کی بھی کوئی حد ہوا کرتی ہے۔ "ہندستانی ادب" نے اپنی حد سے بہت آگے کر دکھایا کیا ایسے سچے مخلص حقیقی خادم ادب اور بچہ یار رکھنے والے علمی ادبی رسالے کو بند ہو جانا چاہیے۔

یہ رسالا ایک عرصے سے سراسر نقصان میں چلایا جا رہا ہے اس بارے میں اس کے ایڈیٹر نے ایک سے زیادہ مرتبا لکھا ہے اس کے بعض اداریوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ رسالا کافی تعداد میں ہر مہینہ ایسے لوگوں کے نام بھیجا جا رہا ہے جو اس کے مستقل خریدار بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مگر شاید اب تک ان لوگوں میں احساس کی لہر نہیں دوڑی ہے۔ ایسے مقتدر لوگ چاہیں تو نہ صرف اس کے خریدار بن سکتے ہیں بلکے اپنے عطیوں سے اس کی ڈوبتی ناؤ کو بچا بھی سکتے ہیں۔ جو لوگ مدد امداد کر سکتے ہیں انہیں کو توجہ دلائی جاتی ہے اور انہیں افراد سے اپیل بھی کی جاتی ہے کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ دولت مند اور مالدار لوگ نام و نمود اور شہرت کی خاطر بعض وقت بے دریغ طریقے پر بھی دان کرنے نہیں چوکتے لیکن ایسی گمنام صورتوں میں مالی امداد کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہی لوگ پھوٹی کوڑی تک دینا گوارا نہیں کرتے۔ "ہندستانی ادب" نے آج تک کبھی بھی امداد کا سوال نہیں اٹھایا۔ اس کی اپیل تو محض خریداری کی حد تک رہی ہے اگر صاحب ثروت لوگ دل پر لیں تو سال بھر میں صرف چھ روپے دینا ان کے لیے کوئی بار نہیں۔

ایک ایسا رسالا چودہ[۱۴] سال سے برابر علمی ادبی اور زبان کی خدمت انجام دیتے آیا ہے اس کو جاری اور قایم رکھنا ہم سب پر فرض ہے۔ کوئی بھی رسالا مسلسل نقصان کے ساتھ ہرگز نہیں چلایا جا سکتا۔ ایسی ہی مالی مشکلات کا شکار ہو کر کئی ایک سالے دم توڑ چکے ہیں۔ اگر وہ سب سالے آج زندہ رہتے تو یقین علم و ادب اور زبان کی زیادہ خدمت ہو سکتی۔ مضی ما مضی مگر اب ہمیں چاہیے کہ جو رسالے اس وقت علمی ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں انہیں ختم نہ ہونے دیں۔ اس کی آسان صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہر فدائے ادب اپنی شخصی کوششوں سے اس رسالے کے لیے چند خریدار فراہم کر دے۔ خریداروں کی تعداد بڑھنے سے لازماً رسالے کا مالیا مستحکم ہو جائے گا۔ اس کے بعد یقین ہے کہ رسالے کی ظاہری خوبیوں میں تبدیلی ہو سکے گی۔

اس نوبت پر میں صرف اپنی ہی شخصی حیثیت میں نہیں بلکے لکھنؤ کے مشہور اور قدیم "ادارہ جام جہاں نما" کے نام پر ملک کے تمام اہل ذوق اور پرستاران علم و ادب سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نہ صرف خدی اس رسالے کے مستقل خریدار بن جائیں بلکے جہاں تک ہو سکے اوروں کو بھی خریدار بنانے کی کوشش کریں اور صاحبان ثروت سے بھی میری یہ پرزور اپیل ہے کہ وہ رسالے کے بدلے حالات کا لحاظ کرتے ممکن مالی امداد سے اس کی سرپرستی کریں تاکہ یہ قدیم علمی ادبی خدمت گذار اپنی دیرینا کوششوں کو جاری رکھ سکے۔

بجٹ

ایاز عصمی

(انجمن ترقی پسند مصنفین ڈھاکا کے اجلاس میں پیش کیا گیا)

چاند کی روشنی مدھم تھی اور ماحول پراسرار۔
میں رینگتے ہوئے اسٹیشن سے نکل کر گاؤں کی طرف جانیوالی کچی سڑک پر ہولیا۔ چاند کی بیمار پیلاسی روشنی میں کچی سڑک کے کنارے پنکھ پسارے ہوئے دیو کے مکھیت کسی خاموش ماتمی جلوس کی طرح نظر آرہے تھے ——
یہ سڑک جس کا سینہ دق کے مریض کے ٹھاٹ کی طرح کھڑے ہوئے چھوٹے سے اسٹیشن سے شروع ہوتا اور چھوٹے گاؤں کی اداسی اور گمبھیرتا میں مدغم ہوجاتا —— یہ سڑک جو کئی برسوں سے ایک حال میں شاکر تھی۔ جس پر میرا باپ چلتے چلتے بوڑھا ہوکر مرچکا تھا اس سڑک پر مجھے اپنے لڑکپن کے نقوش اب بھی ابھرے ابھرے سے نظر آرہے تھے۔ اور جوانی کے نقش پا بھی —— مگر یہ سڑک ابوالہول کے مجسمے کی طرح جیسی پہلے تھی من وعن آج بھی ویسی ہی تھی۔
یہ سڑک اس کے آس پاس سے چھوٹی ہوئی شریانوں جیسی پگڈنڈیاں، اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے مغموم کھیت کھیتوں کی منڈیروں پر اگے ہوئے خدروگورے گورے پودے سب کے سب میرے جانے پہچانے تھے۔ گرتین طویل سالوں کے بعد ان پر اجنبیت کی ایک باریک سی جھلی چڑھی ہوئی جان پڑتی تھی —— میں پورے تین سال کے بعد گاؤں لوٹا تھا ——
تین سال تک محکمہ مالیات کے بجٹ سکشن کی فضا میں اڑتے ہوئے ہندسے اس بری طرح میرا دامن پکڑے رہے کہ میں اپنے گاؤں کے کھیتوں کے پرعزم جھومتے جھامتے پودوں، گاؤں کے بڑے بوڑھوں اور اپنے بچپن کے ساتھیوں کو دیکھنے تک کو ترستا رہا۔ درخواست کے جواب میں آفس کا سپرنٹنڈنٹ ہونٹوں کو سکیڑ کر کہتا "کمال صاحب! جاسا ملک ابھی لوزائیدا ہے۔ بچا ہے ہم نے اسے حاصل تو کرلیا۔ مگر بغیر محنت اور جانفشانی کے ہم اسے زندا نہیں رکھ سکتے ——" اور "کیے جاؤ محنت مرے دوستو!" گنگناتے ہوئے وہ اپنی نئی محبوبا مس ہیلن کو ٹیلیفون کرنے لگتا ——
اور —— ہر سال بجٹ پیش کرتے وقت میرے دماغ پر اخراجات اور آمدنی کے ہندسوں کی ٹکراتی ہوتی ٹیلٹری —— پولیس —— جیل —— ریونیو —— ٹیکس —— آمدنی، اخراجات پڑتے پڑتے طبیعت اوب جاتی۔ ان ثقیل الفاظ اور بڑے بڑے ہندسوں میں زندگی کا دور دور تک پتا نہ چلتا۔ ان میں زندگی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ سامنے پھیلا ہوا بجٹ مجھے ایک خبر ریگستان نظر آتا جس میں میلوں، کوسوں، نخلستان کا سراغ نہ ملتا —— اور بار بار میرے جی میں آتا تھا کہ میز پر دھری ہوئی لال روشنائی کی دوات پوری کی پوری میز پر بکھرے کاغذات اور رجسٹروں کے اوراق پر انڈیل دوں —— اور تین سال کے بعد ایک ضروری خبر پہنچانے کے لیے مجھے گاؤں آنا پڑا تھا —— صرف دو دن کی چھٹی پر —— خبر پہنچانا تو جیسے میرا اور میرے گھر والوں کا مقدر بن گیا تھا۔ میرا باپ جوانی سے بڑھاپے تک ڈاک کا تھیلا لینے میں لٹکائے گھر گھر خط بانٹتا پھرتا تھا —— اس نے الغام اور پیٹ کاٹ کر جمع کیے ہوئے پیسوں سے مجھے پڑھایا لکھایا۔ وہ تدبیر کے ناخن سے میرے نصیب کے لکھے کو کھرچ دینا چاہتا تھا —— بوڑھا اس دن بہت ہی خوش ہوا تھا جس دن محکمۂ مالیات میں مجھے کلرکی ملی تھی۔ یہ خوشی دیکھنے کے کچھ ہی دنوں بعد بوڑھا مرگیا —— اور پھر میں ہیڈ کلرک ہوگیا۔ تقدیر کا پرانا چکر چل پڑا —— گوم گھام کر نصیبے کے کھرپے ہوئے الفاظ پھر ابھرے —— اسٹاف کی باتیں، درخواستیں، شکوا شکایتیں اور دفتر کے کاغذات افسر تک پہنچانا اور افسر کے حکم، احکام اور کاغذات اسٹاف تک —— اور یہ چکر اسی طرح چلنے لگا ——
لیکن ایک ضروری خبر جو صرف میرے گاؤں سے متعلق تھی جسے پہنچانے کے لیے مجھے دو دن کی چھٹی لینی پڑی تھی۔ مجھے ڈھکیلتی ہوئی گاؤں لے آئی تھی ——
چاند کی روتی بسورتی روشنی میں ببول اور ناریل کے درختوں کے سائے بڑے لمبے اور بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔ گاؤں

ابھی میل بھر دور تھا۔

گاؤں تاریک چھاؤں سے ڈھکا پڑا تھا۔ اونچے اونچے آم اور جامن کے درخت چاندکی روشنی کے درمیان اپنی پتیوں کی آڑ کیے ہوئے تھے۔

چچا موجو اپنے جھونپڑے کے برآمدے میں بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔

"سلام ــــ چاچا"

"ارے کمال ــــ! جیو جیو بیٹا۔ کب آئے، کیسے ہو تم تو ہم لوگوں کو بھول ہی گئے"۔ چچا نے ساری باتیں ایک سانس میں ہی کہہ ڈالیں۔

"بس ابھی ابھی چلا آرہا ہوں ــــ" اور اچانک میرے دماغ کی سطح پر وہ خیر اچھل آئی۔ جسے چچا نے کے لیے میں نے دو دن کی چھٹی لی تھی ــــ "لطیف"

ــــ پرسوں دس بجے دن کو اسٹاف لے جانے والی ٹرک اپنی گود میں متعدد زخمیانے ہوئے کلرکوں کو دلکاسے بھاگی جارہی تھی کہ رسل روڈ ریلوے کراسنگ پر لگی ہوئی بھیڑ بھاڑ اس کے آگے بڑھنے میں مانع ہوئی۔

"الو کے پٹھو، سالوں کو رستا چلنا جانے کب آئے گا"۔ ڈرائیور دلاور نے ساتھ ہی ایک موٹی سی گالی بھی لڑھکا دی۔

ایکسیڈنٹ ــــ ہسپتال ــــ مرگیا ــــ آہا ــــ چچ چچ ــــ کی جھنجھناہٹ فضا میں تیر رہی تھی ــــ

"شاید کوئی ٹرین سے کٹ گیا ہے" دلاور بولا "میں ایک منٹ میں آیا"۔

ٹرک سے اتر کر میں بھیڑ میں گھس پڑا ــــ ایک لاش جس کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ گھیرے کے بیچ میں پڑی تھی۔ ریلوے لائن پر کئی گز تک خون چھڑا ہوا تھا۔ یہ شکل میری پہچانی سچانی ہوئی معلوم پڑتی تھی۔ چہرے پر الجھی ہوئی نقشتشی داڑھی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں جیسے انہیں گدی کے پاس سے کسی نے اندر کی طرف کھینچ لیا ہو۔ پیلے پیلے بڑے بڑے کھرپوں جیسے دانت۔

انجن کے بھاری پہیوں پر چڑھ کر آئی ہوئی موت نے اس کے سیاہ چہرے پر زردی پوت دی تھی۔ مگر میں نے اسے پہچان لیا۔

"لطیف ــــ" میرے حلق سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میری نگاہوں میں نور بھابی اور لطیف کے بچوں کی تصویریں اور منتظر نگاہیں گھوم گئیں۔ بڑی پھرتی کے ساتھ ایک خیال نے میرے دماغ کی سطح پر سر ابھارا "کیا لطیف نے معیشتوں سے گھبرا کر خودکشی کر لی تھی"۔ "ریلوے کراسنگ کے پڑوس کا پان والا پولیس کو بیان دے رہا تھا" کچھ دیر پہلے یہ یہیں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا ــــ پھر اسٹیشن کی طرف چلا گیا ــــ اور گاڑی یہاں سے گذر رہی تھی کہ یہ لڑکھڑا کر نیچے گرا ــــ اور ــــ"

"پوں ــــ پوں ــــ پوں" ڈرائیور دلاور موٹر کا ہارن بجا بجا کر "ڈیوٹی فرسٹ" کی یاد دلا رہا تھا ــــ اور میں بھاگم بھاگ رینگتی ہوئی ٹرک پر سوار ہوگیا ــــ"

"کیسے رہے بیٹے کمال!" چچا موجو نے میرے خیال کا دھاگا توڑ دیا۔

"اچھا ہی رہا ــــ میں نے ڈرے ڈرے انداز میں گاؤں کی سہمی سہمی خاموش فضا کو گھورا ــــ" چچا لطیف کے گھر سب خیریت ہے نا"۔

"ہاں ــــ پچھلے ہفتے اس کی بیٹی کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ اب تو ٹھیک ہے۔ کیوں کیا بات ہے۔ کیا لطیف تم سے شہر میں ملا تھا"۔

"نہیں ــــ ہاں، ہاں ملا تھا مگر ــــ" میری زبان لڑکھڑا گئی ــــ

"اچھا چاچا صبح ملوں گا" اپنے ادھورے جملے پر چچا موجو کو ہکا بکا چھوڑ کر میں تیزی سے اپنے آبائی مکان کی طرف ہولیا۔ جس میں کئی سالوں سے میرے دوست ضمیر کا خاندان رہتا تھا۔ ضمیر کالج کا طالب علم تھا اور شہر میں ہی کالج کے ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔ آج اتفاق سے وہ بھی گھر پر موجود تھا

دونوں بچپن کے ساتھی نہایت گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ضمیر نے بتایا کہ اس نے کالج سے نام کٹا لیا ہے۔

"کیوں ——؟" مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ پورے گاؤں میں ضمیر ہی تو ایک لڑکا تھا جو بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔

"بھئی ہم کاشتکاروں کی ترقی، تنزلی، موت، حیات ہر چیز کا انحصار پٹ سن کی قیمت پر ہے۔ فصل تو امسال بہتر اچھی ہوئی مگر قیمت —— چالیس اور پچاس روپے کی جگہ دو تین اور چار روپے فی من ہو گئی ہے۔ میری ہی کیا اس سال تو سارے کے سارے کاشتکاروں کی بدیا بیٹھ گئی ہے —— موجو چاچا نے کاشتکاری چھوڑ کر ڈاک بنگلے پر نوکری کر لی ہے —— میں نے کالج سے نام کٹا لیا۔ عبدل مانجھی بن گیا۔ کچھ لوگ نوکری کی تلاش میں شہر کی گلیوں کوچوں میں بھٹک رہے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے بیل، ہل اور گھر کا سامان بیچ رہے ہیں۔ چوریاں کر رہے ہیں —— لطیف شہر میں بھیک مانگنے لگا ہے ——"

"لطیف ....." میں پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مکان کے سامنے تالاب کی لہروں پر ماہتاب کی بکھیری ہوئی قاشوں کا ناچ پھیکا پھیکا سا رنگ اور اداس اداس نظر آ رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا ساری کائنات غم کے لبادے میں لپٹ گئی ہے۔ گاؤں والوں کا دکھڑا سن کر فضا نے بھی مارے رنج کے گردن نیہوڑا لی ہے —— اور صبح جب سورج طلوع ہو رہا تھا شہابی رنگ کی شعاعوں نے تالاب میں آگ گھول دی تھی۔ میں ضمیر کو سوتا چھوڑ کر نور بھابی کی طرف جا رہا تھا۔

کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ پر نور بھابی ایک بھونڈی سی ناک بہتی ہوئی میلی کچیلی لڑکی کو گود میں دبکائے باہر نکل آئی ——

"سلام بھابی"

نور بھابی تین سال کے بعد اچانک مجھے سامنے پا کر مسکرائی اور اس نے گھونگٹ کھینچ لی۔ وہ اپنا بایاں پاؤں چوکھٹ سے باہر نکالنے پاؤں کے انگوٹھے سے برآمدے کی گیلی مٹی کریدتی رہی تھی۔ کہرام مچا رہے تھے —— بچے اچھ، اچھ، اچھ، اچھ میرے پاس کی میز پر بیٹھا ہوا۔ ملکہ کوئی پھیل پڑا۔ "ساری کی کرا دیا" محنت برباد ہو گئی

تھی۔ گھونگٹ کے اندر سے اس کی اندھیری زندگی جھانک رہی تھی —— دروازے کی اوٹ سے کمرے میں چھایا ہوا اندھیرا مجھے گھور رہا تھا —— رات کا رچا ہوا مانگ کا سیندور میلی ساڑی پر سے ٹیلا لاٹیلا سا نظر آ رہا تھا ——

"بیٹھو بھیا —— بڑے دن کے بعد صورت دکھائی۔ شہر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی کیا؟"

کمرے سے جھانکتا ہوا اندھیرا مجھے اب بھی گھور رہا تھا۔ گود میں دبکی ہوئی بچی نے میری زبان پکڑ لی۔ مانگ کا ٹیلا لاسیندور مجسم التجا بن گیا ——

"ہاں ہوئی تو تھی ....."

مگر کیسے —— کس حال میں، یہ سب کچھ بتانے میں میری زبان نے میرا ساتھ نہ دیا۔

"کیسے ہیں وہ ——؟" بھابی نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے وہ اپنے سہاگ کی خیر و عافیت کے علاوہ اور کوئی بات سننا نہ چاہتی تھی

"بھابی اس نظام میں جینا مر جانے سے زیادہ اکھٹن ہے"

بھابی خاموش تھی۔ میں جانتا تھا وہ گنوار ان میری بات سمجھ نہ سکے گی۔ اور اس کی مانگ میں رچے ہوئے سیندور کی ٹیلی چمک نے مجھ سے جھوٹ بلوا دیا ——

"اچھے ہیں —— بلکل اچھے ہیں" کہتے ہوئے میں لپکا رہا تھا دو دن کے بعد میں دفتر واپس لوٹا ——

بجٹ کے مہد سے لٹری کا خرچ۔ لطیف کا کٹا ہوا دھڑ اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی موت کی زردی، پولیس کے اخراجات —— نور بھابی کے گھونگٹ سے جھانکتی ہوئی اندھیاری زندگی اس کا سڑا ہوا سہاگ اس کے کمرے سے گھورتا ہوا اندھیرا۔ ریونیو ٹیکس بھیک کا سا پیسہ گڑگڑاتے ہوئے لطیف کا بیوقوف انہ قتل سے بہت پیچھے بیٹھا ہوا ضمیر، جیل کا خرچ بھاری کتنی کا ڈانٹر جلاتا ہوا بوڑھا عبدل بھکی کمر لیے بیٹھا کھانستا ہوا موجو چاچا —— خرچ، آمدنی خرچ —— موت —— حیات —— موت —— یہ سب کے سب میرے دماغ میں بھوتوں کی طرح اچھل کود اور ناچ

ایچ۔ سی۔ ڈینیٹ

برطانوی یونیورسٹیاں اور حکومت

۱۹۵۲ء کے درسی سال میں برطانیا کی یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کالجوں کو حکومت کی جانب سے ۱۷۱۲۶۹۹۳ پونڈ کی گرانٹ دی گئی تھی۔ یہ رقم ان کی کل آمدنی کا دو تہائی یعنی ۶۴ فی صد حصہ ظاہر کرتی ہے۔

یونیورسٹیوں کو حکومت کی طرف سے جو امداد ملتی ہے اس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے ۱۹۳۹ء کے دوران ان کو حکومت کی جانب سے جو مالی امداد ملی تھی وہ ان کی کل آمدنی کے صرف ۳۵٫۸ فیصدی حصے کے برابر تھی۔ فروری ۱۹۵۲ء میں برطانیا کے وزیر مالیات نے اپنے ایک اعلان میں بتایا تھا کہ ۵۲ء سے ۵۷ء تک حکومت ۱۱۷۵۰۰۰۰ پونڈ کی گرانٹ یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کالجوں کو دے گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں ہر سال اوسطً ۲۳۵۰۰۰۰ پونڈ کی مالی امداد ملے گی۔ اگر برطانیا کے مالی حالات بہتر ہوتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں اس سے بھی زیادہ رقم امداد کے طور پر دی جاتی۔

حکومت کے خزانے سے یونیورسٹیوں کو جو رقم ملتی ہے اس سے یہ ظاہر نہیں کہ انہیں کسی اور پبلک فنڈ سے امداد نہیں ملتی ۵۲-۱۹۵۱ء میں انگلینڈ اور ویلز کے مقامی تعلیمی اداروں (لوکل ایجوکیشن اتھارٹیز) نے یونیورسٹیوں کو ۱۰۴۴۱۵ پونڈ یعنی ان کی کل آمدنی کا ۱ء۴ فی صدی حصا بطور گرانٹ دیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۱ء میں ۸۳٫۴۵۸ فل ٹائم طلبا میں سے ۶٫۵۴٫۵۲ طلبا کو (یعنی ۷ء۲۶ فی صدی) پبلک اور پرائیویٹ فنڈوں (زیادہ تر پبلک فنڈوں) میں سے وظائف دیے گئے۔ انگلینڈ اور ویلز میں وزارت تعلیم نے ۲۰۱۲ اور مقامی تعلیمی اداروں نے ۱۰۳۰۰ وظائف طلبا کو دیے۔

برطانوی یونیورسٹیاں ہمیشہ اس بات پر فخر کرتی رہی ہیں کہ وہ اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت کی امداد دیگر دوسرے پبلک فنڈوں میں سے دی گئی۔ مالی امداد کے بغیر ملک کی قومی زندگی میں کوئی خاص رول ادا نہیں کر سکتیں لیکن اس امداد سے ان کی خود مختاری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ آج بھی فخریا طور پر یہ کہہ سکتی ہیں کہ اندرونی معاملات میں ان کو پوری آزادی حاصل ہے۔

یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی نے اپنی ایک رپورٹ میں جو اس نے ۳۵ء تا ۳۶ء کے سالوں کے متعلق پیش کی تھی۔ یہ بتایا تھا کہ "نہ صرف یونیورسٹیاں بلکہ خود حکومت درسی خود مختاری کے بنیادی اصول سے پوری طرح واقف ہے۔ یونیورسٹیاں طلبا کو کیا تعلیم دیتی ہیں اور ریسرچ کا کیا کام کرتی ہیں ان باتوں کے متعلق فیصلا کرنا ان کا اپنا کام ہے۔ حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی کے اس بیان کو رائے عامہ کی پوری حمایت حاصل ہے۔

یونیورسٹیوں کی خود مختاری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے انہیں جو مالی امداد دی جاتی ہے وہ اس شرط پر نہیں دی جاتی ہے کہ حکومت کے افسران ان کے حسابات کی جانچ پڑتال کریں یونیورسٹیوں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق طلبا کا انتخاب کریں۔ اور پڑھائے جانے والے کورسوں کے متعلق خود فیصلا کریں۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکومت یونیورسٹی امور سے کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج پہلے کی بہ نسبت اس کی یونیورسٹی امور سے دلچسپی زیادہ ہے لیکن یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی کے الفاظ میں "حکومت اور یونیورسٹیوں کے تعلقات کی

نشو ونما ایک ایسے ڈھنگ سے ہو رہی ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان کی آپس میں شراکت قایم ہے۔ یونیورسٹیوں میں ایک ترقی پسندانہ اسپرٹ پائی جاتی ہے۔ اور وہ پرخلوص طریقے سے اپنی پالیسیوں کو عوام کے مفادات کے مطابق مرتب کرتی رہتی ہیں۔ دوسری طرف حکومت اس چیز کو محسوس کرتی ہے کہ یونیورسٹیوں کی سب سے بڑی ذمے داری یہ ہے کہ وہ سچائی کی کھوج کریں۔ اور سچائی معلوم کرنے کے بعد حکومت کی آسانیوں کا خیال رکھے بغیر اس کے متعلق اعلان کریں۔"

حکومت نے یونیورسٹیوں کو تقریباً نصف صدی پہلے مالی امداد دینا شروع کی تھی۔ اور یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی ۱۹۱۹ء میں معرض وجود میں آئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے حکومت یونیورسٹیوں کو جو گرانٹ دیتی تھی وہ کوئی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یونیورسٹیوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ حکومت کی امداد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اور اسی امداد کی بدولت وہ اپنا بلند معیار برقرار رکھ سکی ہیں۔

یونیورسٹیوں کو ان بدلے ہوئے حالات کا پورا احساس ہے جولائی ۱۹۴۶ء میں وائس چانسلروں اور پرنسپلوں کی کمیٹی نے ایک بیان میں یہ کہا تھا کہ "یونیورسٹیاں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ حکومت کا نہ صرف حق بلکہ فرض بھی ہے کہ وہ اس چیز کے متعلق اپنی تسلی کرے کہ یونیورسٹیوں کی تعلیم قومی مفادات کے مطابق ہے کہ نہیں۔ اور وہ انہیں جو مالی امداد دیتی ہے اس کا صحیح استعمال ہو رہا ہے کہ نہیں۔"

تعلیم کے میدان میں یونیورسٹیوں اور حکومت کی جو شراکت قایم کی جا رہی ہے اس میں مرکزی منصوبا بندی کے اصولوں اور یونیورسٹی خود مختاری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اب تک یہ کوشش کامیاب ہی ہے اور یہ کامیابی تمام متعلقین یعنی حکومت یونیورسٹیوں اور نجی اداروں کے خلوص کی بدولت ہوئی ہے اور آشا ہے کہ یہ کامیابی جاری رہے گی۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی نے اپنی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا ہے کہ ــــ حکومت کی امداد کے بغیر یونیورسٹیوں کو اپنا کام چلانے کے لیے کافی فنڈ نہیں مل سکتا۔ یونیورسٹیوں کے بغیر مردوں اور عورتوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اور انہیں اس قابل نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ حکومت صنعت اور دوسرے پیشوں میں ذمے داری کے کام سنبھالیں۔"

ہندستان کی عام اور ملی زبان "ہندستانی" میں آواز کی اصول پر
پہلی کتاب
دمنی
ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور
کی امر کہانی
ترجمہ
جی۔ ام خان ام۔ اے
(عثمانیا)
ایڈیٹر
"ہندستانی ادب"
چھپ کر تیار ہو گئی ہے
قیمت ایک روپیا آٹھ آنے ــــ ڈاک خرچ الگ
ملنے کا پتا
منیجر "ہندستانی ادب" ۹۹ اے
اعظم پورہ اشرقی
حیدرآباد دکن

ناشاد کانپوری

افقؔ مہانی

بابو سریدھر پرشاد گمؔ ایم اے ڈپٹی کلکٹر بارابنکی یعنی حضرت ناشاد کانپوری کے مجموعہ کلام "کیف سرمدی" پر ملک کے بعض بزرگان ادب نے جو سب کچھ لکھا ہے جس کی فی زمانہ ضرورت اور اہمیت ہے۔ چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی ضیاؔ احمد ضیاؔ۔ جگرؔ بریلوی۔ دیبی پرشاد تمکینؔ نے بہت خوب۔ اور برجاصل تبصرے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ ظاہر اس کی ضرورت نہ تھی کہ ایسے گوشہ نشین کو بار بار کی یاد دہانیوں سے خواہ مخواہ نقادان فن کی صف میں بھولاں لاکر کھڑا کیا جائے۔ مگر برا ہو میری شہرت کا اور محبت رسوا کا کہ ان حالوں بھی خاموش نہ بیٹھنے دیا گیا۔ ؎

"انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"

کے مسلمہ اصول پر بغیر کچھ لکھے بھی چارہ نہ تھا۔ الغرض کہنا ہی پڑا

چلے ہے خامہ بسم اللہ

ناشاد صاحب کا میں صورت آشنا بھی نہیں ہوں۔ ان کا مجموعہ کلام "کیف سرمدی" جو حال ہی میں طبع ہوکر شائع ہوا ہے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی پہنچی ہے جس میں سرؔ صدیقی اور ضیاؔ صاحب وغیرہ کے تبصرے پیش نظر ہیں۔ ان تبصروں میں جن الفاظ سے ناشاد صاحب کا تعارف کیا گیا ہے وہ محض رسمی اور اخلاقی ہیں۔ ان کی شاعری اور شاعرانہ اہمیت سے بہت کم بحث کی گئی ہے۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی اتنا کم گہرا اور غور طلب نہیں ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہوسکتی۔ لکھنے والے کسی خارجی شخصیت کے کیسے ہی ممتاز اور محترم کیوں نہ ہوں مگر ان کے واسطے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی شاعری میں بھی وہ اتنے ہی کامل اور پورے اتریں جس قدر وہ اپنی ذاتی شخصیت کے وہ اہل ہیں۔ سب سے پہلی بات قابل تحریر یہ ہے کہ وہ برادران وطن جنہوں نے اردو زبان کو عصبیت کی تیز چھری سے ذبح کرنا چاہا ہے۔ اور کسی قدر کامیاب اور گنجائش اپنے دلوں میں اردو زبان سے نہیں رکھتے ہیں۔ حضرت ناشاد اسی قوم کے ایک ہونہار اور لائق احترام فرد ہیں۔ میرے اس لکھنے سے صرف یہ مراد ہے کہ ان کی وسعت نظر اور عالی ظرفی کا اندازہ کیا جاسکے۔ جس سے اس کا بھی انکشاف ہوجائے گا کہ وہ دونوں ادب اور شعر وسخن کے شوق میں کس مرتبے پر ممتاز ہیں اور ان کا رجحان طبع کسی حال میں ایسی ننگ و تاریک کاوٹوں سے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ اگر اس اضافی موضوع پر مزید شرح وبسط سے بحث کی جائے لہٰذا اس کو قطع نظر کرتے ہوئے اب اصل موضوع پر ناظرین کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

ناشاد صاحب کا کلام کوئی کلام عجب نہیں ہے۔ سب کی طرح وہ بھی فکر فرماتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ان کے کلام میں جدت اور دلکشی نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے اور انداز بیان بہت کچھ دوسروں سے علیحدہ اور نادر ہے ایک شاعر میں یہی وہ صفات ہیں جو اسے مقبول اور عزیز بنا دیا کرتی ہیں۔ ہر شاعر کے کلام میں سوز و ساز وصل و ہجر، واردات اور رد و دعوم، زبان و محاورات سرور و کیف اور مناظر قدرت کے موضوعات پر طبع آزمائی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں کسقدر موثر اور جاذب نظر ہوتے ہیں یہ دیکھنے والی بات ہے۔ اکثر و بیشتر کو تو حافظا قبول ہی نہیں کرتا۔ اور فوری اگر قبول بھی کرلیا گیا تو دوسرے لمحے میں فراموش کردیا گیا۔ مگر ناشاد کے یہاں اس کے بالکل برعکس سامان دلکشی نظر آئے گا۔ ان کا انداز بیان اور طرز ادا ایک ایسی جاذبیت اپنے میں رکھتے ہیں جو دیکھنے والوں سے کبھی فراموش

نہیں ہو سکتی۔ یہی خصوصیت ان کے کلام کی تمام و کمال انفرادیت کہی جا سکتی ہے۔ کوئی موضوع ہو کوئی رخ ہو اور کوئی انداز ہو وہ ہر کہیں اپنی انفرادیت میں کامیاب ہی نظر آئیں گے۔

ان کا کلام موجودہ زمانے کی شاعری سے بڑی حد تک راستا ہے۔ مگر اس کے یہ کبھی معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ قدیم شاعری سے علیحدہ اور ناواقف ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے ان کے کلام میں ایک طرف اگر ہجر و وصل اور معشوق کی بے وفائی و تغافل کا ذکر ہے جس سے قدیم سوگواری کا خاکہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے تو دوسری طرف سرور و کیف اور نشاط روح کے مناظر بھی نظروں میں پھر جاتے ہیں۔ یہ ان کی قدرت کلام اور فکر سخن کی غیر معمولی ندرت و روانی کی بات ہے جو ہر کس کے بس کی نہیں۔ وہ جس موضوع اور جس رخ پر کسی شعر کی بنیاد قائم کرتے ہیں اس کی انتہا کو معلوم کر لیتے ہیں۔ اور آخری لفظ ہی پر مضمون کو ختم کرتے ہیں جس سے ان کا کوئی شعر محتاج تاویل نہیں رہتا اور دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں اس حد تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں تک شاعر نے پرواز کی ہے ایسی حالت میں کسی قسم کی الجھن اور ابہام شعر کے سمجھنے میں باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ بعض بعض اشعار تو ضرب الامثال کا حکم رکھتے ہیں۔ جو فوراً زبر ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں کے معمولی اشعار بھی دوسروں کے وہاں نمونے میں نظر نہ آئیں گے۔

مثالوں کا شیوا نہیں۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے ذیل کے نمونوں سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔

ناشاد صاحب نے شاعری کے تمام موضوعات پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور خوب خوب گل کھلائے ہیں۔ بعض کے بعض اشعار بطور نمونہ مشتے از خروارے کے مصداق ہدیہ ناظرین ہیں شاید میری طرح دوسروں پر بھی موثر ثابت ہوں۔

سوز و ساز

اس موضوع پر ناشاد صاحب نے کم ہی کہا ہے پھر بھی جو کچھ فکر ہوئی ہے وہ شکور اور لائق تحسین ہے۔

ملاحظہ ہو:-

دل کو غم سے حذر نہ ہو جائے زندگی دردسر نہ ہو جائے
غم محبت اثر نہ ہو جائے بے خبر۔ باخبر نہ ہو جائے
نا امیدی بھی ساتھ چھوڑ دے دل بھی مفلس کا گھر نہ ہو جائے
دل کے داغوں کو ناز ہے اس پر شب غم کی سحر نہ ہو جائے
حال ناشاد کیا کہے کوئی کہیں تم پر اثر نہ ہو جائے

کیف و سرور

اس موضوع پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے اور یہ حصہ ان کے تمام مجموعے کا شباب ہے۔ بعض اشعار درج کیے جاتے ہیں

فضائے ہر دو عالم جگمگائی یہ کس نے چھڑ لقا بے رخ اٹھائی
کھلے غنچے، ستارے مسکرائے جھلک کس نے لبِ پر ناز دکھائی
بڑھائی ان سے جب ہم نے محبت حیات چند روزہ مسکرائی
انہیں بھی اب حجاب آنے لگا ہے محبت رنگ لائی، رنگ لائی

تغزل شباب

وہ چاند سی صورت نامِ خدا وہ اٹھتی جوانی کیا کہیے
دل لے گئے باتوں باتوں میں یہ سحر بیانی کیا کہیے
کچھ ہنس کے کہی کچھ رو کے کہی کچھ ایسے کہی کچھ ویسے کہی
روداد محبت کیا کہیے روداد جوانی کیا کہیے

معاملہ بندی

بدگمانی کو بھی خدا سمجھے کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے
عشق کا حسن ظن، معاذ اللہ تم کو بھی ہم ستمگر سمجھے
پوچھتے کیا ہو مدعا اس کا جو تمہیں اپنا مدعا سمجھے
اس میں ناشاد کی خطا کیا ہے التجاؤں کو تم گلہ سمجھے

شراب و مستی

زہر ہستی پیا نہیں جاتا ابتو ساقی جیا نہیں جاتا
بادہ نوشی حرام ہے لیکن بے پیے بھی جیا نہیں جاتا

بادہ و لغزش سے توبہ شیخ را زحیات کیا جانے

شیخ کب تک شرع کی پابندیاں زندگی ہے بیعت پیر مغاں
بیخود و ہشیار جو چاہیں کریں چشم ساقی کے اشارات نہاں

دنیا پہ خاک ڈالیں، غم کا علاج کرلیں
موسم بہار پر ہے آؤ پیئیں پلائیں

تصوف و معرفت

خود تماشا ہے خود تماشائی حسن اپنا ہے آپ شیدائی
ہم کہاں، اور کہاں تری محفل ہے محبت کی کارفرمائی
عشق کی عظمتوں سے ناواقف کر رہے ہیں ابھی جبیں سائی

تمنا ہے حور و قصور و جناں کی بہت پست ہے حوصلہ آدمی کا
مزا آرہا ہے نئی زندگی کا کرشمہ ہے ادنیٰ سا یہ عاشقی کا

حسن، حسن صفات کیا جانے عاشقی کے نکات کیا جانے
ہو گیا جو کسی کا سودائی وہ حیات و ممات کیا جانے
دل کا ایمان اور ہی کچھ ہے عاشقی ذات پات کیا جانے
ترے در سے اٹھ تو جاؤں تو ہی منصفی سے کہہ دے
ہے مری جبیں کے قابل، کوئی اور آستانہ

متفرقات

کوئی کیوں بے وفا ہے کیا کہیے اپنی اپنی ادا ہے کیا کہیے
چاند تارے بھی اب تو سونے لگے اے غم ہجر! کتنی رات ہوئی
جس پہ لاکھوں مسرتیں صدقے ایک ایسی بھی غم کی رات ہوئی

ارباب وفا کو دیکھتے ہیں! دنیا کی ہوا کو دیکھتے ہیں
شاید کہ پیام کوئی لائے ہر موج صبا کو دیکھتے ہیں

قطعہ

بادۂ لالہ فام پیتا ہوں
لے کے ساقی کا نام پیتا ہوں
دیکھتا کیا ہے زاہد خود بیں
جو ہے تجھ پر حرام پیتا ہوں

ملایا میں تعلیمی ترقی

اس سال کی پہلی ششماہی میں ملائی فیڈریشن کے نئے دیہات میں شہریت کے موضوع پر ۵۰ کورسوں کا انتظام کیا گیا تھا ان کورسوں کے متعلق ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس قسم کا پہلا کورس مئی ۱۹۵۲ء میں میلاکا کے علاقے میں شروع کیا گیا تھا جو بہت کامیاب ہاتھا اس کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے برطانوی ہائی کمشنر برائے ملایا نے ہدایات جاری کیں کہ شہریت کے کورسوں کا ملک بھر میں انتظام کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کورسوں کا یہ سلسلہ بہت کامیاب رہا۔

ملایا کے ایجوکیشن ڈیولپمنٹ فنڈ بورڈ نے یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ ۴۵۰۰۰ ڈالر (ملائی) نئے اسکولوں کی تعمیر اور ان کے ضروری سامان پر صرف کیے جائیں۔

سنگم

قمرالدین قمر

(زیر تصنیف ناول کا ایک ورق)

وہ ایک طوائف تھی ——

گندگیوں، شہر بھر کی برائیوں اور دنیا بھر کے برے امراض سے رزق حاصل کرنے والی طوائف ——

ہوا کے ملایم جھونکے نے اس کی عنابی آنچل میں بڑی پیاری لہریں پیدا کیں۔ وہ آنچل کے پلو کو سمیٹ کر مسکرائی۔ جیسے فضا پر تاروں کا چھڑکاؤ سا ہوگیا۔ میں ان لہروں میں کھویا ہوا اس کی داستان بڑے غور سے سنتا رہا۔ لمحے بھر کے لیے وہ خاموش ہوگئی۔ پھر اداس لہجے میں بولی ——

"میں ایک طوائف تھی۔ دلی کی چاوڑی میں بیٹھنے والی —— لیکن مجھے یہ دنیا پسند نہ آئی۔ اور قحبا خانے کی آہنی سلاخوں کو توڑ کر باہر نکل آئی —— میں جانتی تھی طوائف کی کوئی ذات نہیں ہوتی وہ بنتی یا بنائی جاتی ہے۔ ان حالات اور ان تقاضوں کے تحت جن میں خدا نے مرضی اور پسند کو دخل نہیں ہوتا۔ طوائف بننے کی ذمے داری عورت پر نہیں۔ سماج پر اس کے افراد اور ان مردوں پر ہے جو عورت کو طوائف بناتے ہیں اور پھر اسے انسانی برادری سے خارج کر کے کہتے ہیں کہ طوائف ہے —— میں ایک کسبی تھی لیکن اب نہیں ہوں۔ میں اس قفس کی چار دیواری کو چاند چکی ہوں۔ اب میرے کھوکھلے جسم اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی حرارت اور جوت ختم ہو رہی ہے —— ان بدنصیب بہنوں کو جو آہنی زنجیروں میں جکڑی، گندگیوں میں کیڑوں کی طرح جیسی زندگی گذار رہی ہیں۔ سماج میں، تمہارا کوئی مقام نہیں۔ معاشرت میں کوئی جگہ نہیں —— ایسا نہیں —— اے حوا کی بیٹیو! ایسا نہیں۔ یہ تو محض ایک سوانگ ہے ایک رچا ہوا سوانگ اس روپہلے پردے کو چیر کر دیکھو تو سہی —— اپنے پیٹ کی خاطر اپنے جسم کو بیچتی ہو۔ ہزاروں موذی امراض کا شکار ہوتی ہو تم عورت ہو۔ تم تخلیق کی امین ہو، تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ ہر موقع اور ہر محاذ پر تم نے اپنے کارنامے دکھائے۔ کیا رضیا سلطانا تم جیسی عورت نہ تھی۔ جھانسی کی رانی تمہاری طرح حساس نہ تھی۔ وہ بہادر بھی تھی۔ اس نے آزادی کے لیے تلوار اٹھائی۔ اپنی زندگی کے مقصد کے لیے جدوجہد کرتی رہی اور تم سمجھتی ہو زندگی کا مقصد اور اس کا نصب العین محض گندگیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگنا سانس لینا اور گھٹ گھٹ کر مرجانا —— تم بڑی نادان ہو"

"بڑا تلخ تجربا ہے تمہارا"

اس پر وہ زہرخند کے ساتھ بولی "زندگی کے اصول اور جدوجہد میں ایسے کتنے ہی تلخ تجربوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ..... منزل کی جستجو میں کتنی ہی ناہموار شاہراہیں مل گئیں، مگر ....." کچھ توقف کے بعد کہنے لگی "زندگی کے دوڑ میں ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ بس یہی کامیابی کا راز ہے ——" میں نے اس کے فلسفے کو سراہتے ہوئے کہا۔

"ویری نائس" اور ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے ——

اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں چہرے پر جھریوں کی پتلی پتلی لکیریں نمایاں تھیں اور گورا گورا سڈول جسم جھنجھوڑے جانے پر لٹک آیا تھا۔ جس کی وجہ سے چلتے وقت جسم میں ایک خم پڑ جاتا کہ دور سے دیکھنے پر پوڑا پنے کا گمان ہوتا۔ مگر اس کا پگھلے ہوئے تانبے جیسا رنگ شام کی گلابی فضا میں بڑا ہی دلکش اور جاذب نظر معلوم ہوتا۔

وہ آنچل کو سر پر ڈالتی ہوئی بولی "شاعر تم کل وہیل کی

شاعری کرتے ہو۔ یا جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہو اسکی ترجمانی
میں اس کے سوال پر بھونچکا رہ گیا۔ ابھی کچھ کہنا چاہتا
تھا کہ وہ بولی "اگر ایسا ہے تو پھر تم اس سرزمین پر ایک اجنبی
کی حیثیت رکھتے ہو۔ اور تمہیں شکوک نگاہوں سے دیکھا جا رہا
ہوگا۔ کیوں؟"

میں نے سر ہلایا۔ اور سوچنے لگا یہ ایک طوائف ہو کر ایک
اچھی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ بڑی عجیب بات ہے؛ چند قدم
چلنے کے بعد وہ پھر بولی۔

"تمہارے ذاویہ فکر و نظر کے مطابق طرح طرح کی قیاس
آرائیاں کی جا رہی ہوں گی۔"

"ہونہہ۔۔۔۔" میں نے کہا "یکلخت کہا جا رہا ہے۔ ہمارے
اشعار و ادب پاروں سے گل و بلبل کی بجائے خون اور بارود کی
بو آ رہی ہے۔ ہم جوان لہو کو منجمد کرنے کی بجائے گرما رہے
ہیں۔ ہم آسمان کو چھوڑ کر زمین پر اتر آئے ہیں۔ جہاں دھان
کی لہلہاتی فصلوں کے ساتھ کسانوں کے دل دھڑکتے ہیں،
جہاں ملوں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے
نحیف اجسام اور ان سے لپٹی ہوئی گندگیاں کوڑ کے زخموں
کی طرح سر اٹھا تکتی ہیں۔ جہاں بھوکے ادھنگے انسانوں کی
خستہ حالی ہمارے ذہنوں کو متاثر کر رہی ہے اور ہم متاثر
ہو کر اپنے معاشرے سے نفرت و بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں،
جس نے انسانی برادری اخوت اور مساوات کی تمام قدروں
کو ٹھکرا کر زمین کی پیداوار اور سرمایہ پر صرف ایک طبقے کو مالکانہ
اختیار دے دیا ہے۔"

تب وہ مسکراتی ہوئی بولی "شاعر کیا ہم اس تفریق کو مٹا
نہیں سکتے۔ میں مدت سے یہی سوچا کرتی ہوں لیکن۔۔۔۔۔۔
اس کے ہونٹ وا ہو گئے۔ فضا میں ایک پھلجھڑی سی چھٹی اور پھر
جھر اس کی چنگاریاں دیر تک چھڑتی رہیں۔

اب ہم دونوں ایک تاریک گلی کو عبور کر رہے تھے اس کا
ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا وہ سنبھل سنبھل کر احتیاط سے قدم اٹھاتی
میرا سہارا لیے میرے پہلو بہ پہلو چلی آ رہی تھی۔ کہیں کہیں اونچے
نیچے ٹیلے سے اسے ٹھوکر لگ جاتی تو وہ ڈگمگا جاتی۔ اور میں
فوراً ہی اسے سہارا دیدیتا۔ گھمبیر تاریکی میں اس کی دھنسی ہوئی
خونبار آنکھیں جیسے کہہ رہی ہوں "شاعر اب میں بہت کچھ سمجھ گئی
ہوں میں نے سب کچھ کھو کر سیکھا ہے۔ تم جانتے ہو شاعر۔ عورت
کا انتقام کتنا زبردست ہوتا ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھو وہی
چمک ہے جو آج سے دس سال پہلے تھی۔ میں اس کی حفاظت کس
طرح کرتی آئی ہوں۔ شاید تم نہیں جان سکتے۔ یہ میری زندگی
کی کل کائنات ہے۔ مگر میرا جسم کیوں ملک کیا۔ گوشت میں جھریاں
کیوں پڑ گئیں۔ کیا میں بوڑھی ہو گئی ہوں ــــ نہیں مجھے زہریلے
سانپوں نے جو سیا ہے۔ اس کا زہر میرے انگ انگ میں پیوست
ہو چکا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ زہر کا کاٹ تریاق ہے ہم لوگ زندگی
کی الجھنوں میں غرق یہ نہیں سوچا کرتے ــــ مگر مسافر کی
صحی منزل کا نشاں ٹھوکر کھانے کے بعد ہی ملتا ہے۔"

ہم دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ طاق
پر موم بتی روشن تھی۔ جس کی پیلی پیلی روشنی اندھیرے کے نگر
پر پھیل چکی تھی۔ سامنے ایک چھوٹا سا میز رکھا ہوا تھا جس کے
ساتھ ہی دو بید کی کرسیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز پر
چند کتابیں، کاغذات اور گرد سے اٹی ہوئی پنسل پڑی تھی۔

"یہ میرا گھر ہے ایک شاعر کا چھوٹا سا گھر۔ کیا تمہیں پسند ہے"
میں نے اپنے گھر کا تعارف کرایا۔" اس سامنے والی کھڑکی
سے ٹھنڈی اور تازہ ہوا کبھی نہیں آئی۔ اس کے چھوٹے سے
ایک گندی نالی بہتی ہے۔ جس کی سرانڈ میرے بچے کو بری لگتی
ہے اور میری بیوی کو شکایت ہے کہ آج سات سال ہوئے اس
گھر میں آئے لیکن سورج کی کرنیں ادھر کبھی نہیں آئیں جس کی
وجہ سے سیلن اور پھپھوندی کی بو دماغ میں ہیجان بپا کر دیتی
ہے ــــ

"آؤ تمہیں اپنی بیوی اور بچے سے ملاؤں۔"
ہم کمرے سے رینگ کر آنگن میں پہنچے جہاں چرپائی پر

میرا بچا سو رہا تھا۔ لیکن میری ..... میں نے کئی آوازیں دیں لیکن جواب ندارد ——— وہ میرے قریب کھڑی سوئے ہوئے بچے کو پیار بھری نظر سے دیکھ رہی تھی ——

"نشا! او۔ نشے ....."! میں بچے پر جھک گیا۔

"بیٹے جاؤ! کیا تمہیں میرا بچا اچھا لگتا ہے۔ بڑا بھولا بچا ہے۔ سنکر۔ اللہ اسے چانتاروں کی حیات دے یہ میری کل کائنات ہے جیتی جاگتی شاعری۔ اے میری شاعری جاگ اٹھو" میں نے کو پیار کرنے لگا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور اٹھ کر مجھ سے چمٹ گیا۔ میں نے پوچھا "اچھے تو ہو میرے بچے" وہ بسور اٹھا "ہم کو بھوک لگی ہے"۔ لوتی! لوتی!! لوتی!!!

"اچھا اچھا اچھا!! ——" میں نے تسلی دی اور اسے ایک گلاس پانی کا دیکر بولا "اب تو اسے پی لو۔ میں بازار روٹی لینے جا رہا ہوں ——" پھر ہم دونوں آنگن سے کمرے میں چلے آئے ——

"کتنی معصوم شاعری ہے میری"

وہ مسکرائی ——

پھر اس نے پوچھا —— "تمہاری بیوی کہاں ہے"۔ اس کے یوں سوال کرنے پر میں یک لخت جھینپ سا گیا۔ پھر فوراً ہی اپنے پر قابو پاتے ہی بولا ——

"کہیں باہر گئی ہے دراصل بچے کی تکلیف اس سے دیکھی نہیں جاتی کیونکہ وہ ایک ماں ہے نا ..... اور تم تو جانتی ہو میں ایک ہندستانی شاعر ہوں۔ جہاں ادب آرٹ کی کوئی عزت نہیں وہاں شاعر و ادیب کو بھلا عزت کی نگاہ کا مستحق کیوں سمجھا جائے۔ جہاں کہ وہ فاقا کش مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں اس لیے کہ ہمدا فرنگ میں زبان و قلم خیالات اور جذبات کی آزادی کے لیے ہم جو جنگ کر رہے تھے وہ آزادی ملنے کے بعد بھی عنقا ہے ہم آزاد ہیں لیکن اپنی آزادی کا بھی مصرف نہیں کر سکتے —— ہمارے ہر قول و فعل پر سنگین پہرا بٹھا کر ہمیں شکوک نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے —— ہم ترقی پسند ہیں۔ ہم کمیونسٹ ہیں۔ ہم قوم اور ملک کے غدار ہیں۔ حکومت کے دفتری سانچوں میں ڈھلے ہوئے یہ الفاظ ہمارے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ آزادی جس کا ہم مدتوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ ماؤ جس کے حصول میں ہماری قربانیاں تاریخ کے صفحات پر سنہرے یادگار رنگ ثبت ہو گئی ہیں"۔

موم بتی کی لو ٹمٹما رہی تھی۔ کمرے میں ہلکے گہرے سائے رینگ رہے تھے —— "تم تھک گئی ہو۔ لیٹ جاؤ۔ میری بیوی تھوڑی دیر میں آتی ہی ہو گی۔ پھر ہم سب مل کر کھانا ہی کھائیں گے ——" وہ لیٹی نہیں بیٹھی رہی۔ میں کچھ سوچتا رہا۔ بتی جلتی رہی رات ڈھلتی رہی۔ تارے ٹمٹماتے رہے کہ تھوڑی دیر بعد خاموشی کے پردے کو قدموں کی چاپ کی مدھم مدھم آواز نے چھیڑ دیا ——

میں اٹھ گیا۔ میری بیوی سہمی سہمی ڈگمگاتی ہوئی اندر آئی۔ اس کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی چنگاری سلگ رہی تھی۔ ساڑی پر سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔ عنبریں زلف شانے پر جھول رہے تھے اس کے پلو میں لٹا ہوا ایک پلندا تھا جسے کھولتی ہوئی وہ جھجکی۔ اس کی نگاہیں تیکھی رگ شکور سے جا ملیں اور وہ پورے جسم سے لرز گئی۔ چہرے پر گھبراہٹوں کے ہالے تن گئے۔ وہ پیچھے مڑی اور لپکی کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں چند قطرے آنسو کے امڈ آئے۔

"رضا ——"

اس کے نازک ہاتھ پر دو بوند آنسوؤں کے ٹپک پڑے

"تم کہاں تھیں"!

وہ خاموش رہی۔

"میں پوچھتا ہوں تم اتنی رات گئے کہاں تھیں"! وہ خاموش ہچکیاں بھرتی رہی اور میں سوال کرتا رہا۔ جب وہ کچھ بولی نہیں تو میں نے اسے ایک جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کے ماتھے سے خون کی ہلکی سی لکیر کھنچ آئی۔ شکو لپک کر اس کے سرہانے جا بیٹھ گئی۔

"شاعر ــــ!"

میں باہر چلا آیا۔

کچھ تو قف کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ میرے شانے سے لگ کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا۔ شکو نے اسے تسلیاں دیں۔ پھر میں نے اس کا تعارف شکو سے کرایا۔

"یہ میری ساتھی ــ جو ایک طوائف تھی۔ لیکن اب ایک اچھی عورت ہے ــــ"

"اور یہ میری بیوی۔ جو مجھے بہت عزیز ہے مگر یہ اپنے بچے کی حالت سے مجبور ہو کر اس سے قبل بھی دو رات ــــ ..... ." میں خلا میں گھورنے لگا۔ رضیا نے دسترخوان پر روٹی سجھی دی۔ اور جب میں روٹی کا پہلا لقمہ منہ میں ڈال رہا تھا تو میرے کانوں میں بہت سی آوازیں یک وقت گونج اٹھیں ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا جیسے فلک سے تارے گنجے کی ناخنوں کی طرح جھڑ جھڑ کر گرنے لگے۔ دماغ میں پٹیاں سی بجنے لگیں ــــ

ــــ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے ہات سے روٹی کا لقمہ گر گیا ــــ

شکو میری اس حالت کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر میری بیوی سہمی سمٹی دبک گئی ــــ

پھر ایک لمحہ دوسرے لمحے سے ملا اور وقت کا تالابی طرح جھنجھنا اٹھا۔ فضاؤں میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی شور، واویلا اور چیخوں کا سیلاب اندھیرے کی پرسکون ندی میں چنگھاڑ اٹھا ــــ

"ہو ہو ہو ــــ"

پھر جب ایک وقفہ دوسرے وقفے سے ہم آہنگ ہوا تو افق سے اس پار سے روشنی کی ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی ــ دیکھتے دیکھتے روشنی پھیلتی گئی۔ پھیلتی رہی۔ وسیع۔ وسیع تر اور تار کے ساز سے ایک نغمہ چھوٹا۔ شیریں اور حوصلہ افزا۔ جس کی سریلی آوازوں نے رگوں میں ایک طرح کی سنسناہٹ دوڑا دی، تب دو عورت، کئی عورتیں۔ رضیا اور شکو ــــ کئی لاکھ رضیا۔ کئی لاکھ شکو۔ اس کے بازو سن گئے۔ ان کی بھیری ہوئی آنکھیں جاگ اٹھیں۔ ان کے کالے کالے بال ہوا کے دوش پر اڑنے لگے اور ساڑی کا آنچل پرچم کی طرح لہلہا اٹھا ــــ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میری شاعری جاگ اٹھی۔ میرا بچا میری انگلی پکڑے ساتھ چلنے لگا۔ اور شکو کی آنکھوں کی ابدی چمک سکارے مارنے لگی۔ جیسے شکو نے رضیا کی آنکھوں میں سمو دیا۔

پولیو کے علاج کیلیے نیا آہنی پھیپھڑا

برطانیا کی میڈیکل ریسرچ کونسل نے اپنی تازہ سالانا رپورٹ میں بتایا ہے کہ شدید قسم کے پولیو (فالج الاطفال) کے علاج کے لیے ایک نیا آہنی پھیپھڑا تیار کر لیا گیا ہے امید کی جا رہی ہے کہ نئے پھیپھڑے کی مدد سے مستقبل میں فالج الاطفال کے باعث اموات کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو جائے گی ۱۹۴۷ء کے بعد جب برطانیا میں وسیع پیمانے پر پولیو کی بیماری پھیلی تھی میڈیکل ریسرچ کونسل نے پولیو سے متعلق اپنی ریسرچ کا دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا اور نیا آہنی پھیپھڑا ان کوششوں کا نتیجا ہے۔

پانچ ہندستانیوں کو نفیلڈ فاؤنڈیشن کے وظائف

ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے سال کامن ویلتھ ممالک کے جن باشندوں کو نفیلڈ فاؤنڈیشن وظائف دیے گئے تھے ان میں پانچ ہندستانی باشندے بھی شامل تھے۔ ہر وظیفہ ایک سال کے لیے تھا۔

صحت کیلیے وٹامن

۱-۱

تندرست رہنے کے لیے انسان کو کس قسم کی خوراک استعمال کرنی چاہیے۔ اس موضوع پر بڑی ہی چھان بین کی گئی ہے۔ اور مختلف وٹامن کی اہمیت سے متعلق جدید علم کی روشنی میں ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ مختلف بیماریوں کی مدافعت میں وٹامن کیا پارٹ ادا کرتے ہیں اور خوراک میں مختلف وٹامن کی مناسب مقدار کی کمی کے باعث ہیں کون کون سے امراض لاحق ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ اس علم کی مدد سے ہم روز روز کی خوراک میں صحت کے نقطہ نظر سے موزوں کھانے پینے کی چیزیں شامل کر کے کئی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط تک غذائی چھان بین اس حد تک ہی رہی تھی کہ جسم انسانی کی نشو و نما میں خوراک کے تین اجزا پروٹین چکنائی اور کاربو ہائیڈریٹ کو کیا اہمیت حاصل ہے لیکن اس چھان بین میں کوئی ایسا خلا محسوس کیا جاتا رہا جسے مزید کئی سال کے تجربوں کے بعد پورا کیا گیا۔

۱۸۸۰ء میں جیمز لنڈ نامی ایک ڈاکٹر نے تجربوں سے یہ ثابت کیا کہ سکروی (خراب خون سے پیدا ہونے والا ایک مرض) جس سے جسم پر کالے داغ پڑ جاتے ہیں۔ مسوڑے سوج جاتے ہیں۔ اور ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگتا ہے کا علاج لیموں یا دوسرے ترش پھلوں کے رس سے کیا جا سکتا ہے ۱۸۸۳ء سے تھوڑے عرصے بعد جاپانی بحریہ کے ایک ڈاکٹر ایڈمرل ٹکاکی نے یہ ثابت کیا کہ مختلف پھلوں کے ثابت دانوں کا استعمال بیری بیری نام (استسقا کی قسم کی ایک بیماری) کے مرض کے روک تھام میں مفید ثابت ہوتا ہے ۱۸۹۷ء میں جاوا میں جیل خانے کے ایک ڈاکٹر ایجکمن نے یہ دریافت کیا کہ پسے ہوئے چاول کھانے والے پرندوں میں بھی بیری بیری کے مرض کی علامتیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک وٹامن سے متعلق علم کو تگ روپ دینے کا تعلق ہے اس کا سہرا سر فریڈرک گولینڈ ھاپکنز کے سر ہے۔ اب تک دریافت کیے ہوئے وٹامنوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ صرف ڈاکٹر ہی ان کے نام یاد رکھ سکتے ہیں۔ ان میں وٹامن اے۔ سی۔ ڈی اور بی گروپ کے وٹامن زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

خوراک میں وٹامن اے کی کمی کئی بیماریاں پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ یہ وٹامن ہمیں مکھن، گھی، دودھ دہی، انڈے کی زردی اور مچھلی وغیرہ کے استعمال سے میسر آ سکتا ہے۔ گھی کو کھلے برتن میں زیادہ دیر آنچ دینے سے وٹامن اے ضائع ہو جاتا ہے۔ بناسپتی اور نباتاتی تیلوں میں وٹامن اے موجود نہیں ہوتا۔ کاڈ، شارک اور بھارت میں پائی جانے والی بعض دوسری قسم کی مچھلیوں کا تیل وٹامن اے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن اس پر خرچ زیادہ آتا ہے اس لیے وٹامن اے کی مناسب مقدار حاصل کرنے کے لیے سستا اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ ایک بالغ کی روزمرہ کی خوراک میں تین اونس پتوں والی سبزیاں ملائی جائیں۔ آم، تمارٹر۔ گاجر، پپیتا اور ہرے اور پیلے رنگ کے دوسرے پھلوں میں "کیروٹین" خاصی مقدار میں موجود ہوتی ہے جو کھانے کے بعد وٹامن اے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بی گروپ میں کئی وٹامن شامل ہیں ان میں سے "تھائمین" نامی ایک وٹامن کی کمی سے بیری بیری کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مرض سے مختلف اعضائے جسمانی کام کاج سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا نتیجا اکثر حرکت قلب بند ہو جانے

کی صورت میں رونما ہوتا ہے یہ وٹامن حاصل کرنے کے لیے دالیں نہایت اناج، مونگ پھلی اور دوسرے گری دار میوے استعمال کرنے چاہئیں۔ پسا ہوا چاول کھانے والے اشخاص بھی روزمرہ کی خوراک میں دودھ دلیس شامل کر کے اس مرض کے خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بی گروپ کے دوسرے وٹامنوں کی کمی سے زبان پر چھالے پڑنے اور آنکھ کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دالوں اور گری دار میووں میں اس گروپ کے بہت سے وٹامن موجود ہوتے ہیں۔ خمیر اور دودھ سے تیار کی ہوئی چیزوں اور کلیجی اور انڈوں کے استعمال سے کافی مقدار میں وٹامن بی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دانتوں کی مضبوطی کے لیے وٹامن سی کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کی کمی کے باعث مسوڑوں سے خون آنے لگتا ہے اور جسم میں زیادہ عرصے تک اس وٹامن کی کمی کا نتیجہ مرض سکروی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ مسوڑوں کی سوزش جریان، خون اور مختلف اعضائے جسمانی کا درد اس مرض کی اہم علامتیں ہیں۔ یہ وٹامن عام طور پر تازہ پھلوں سبزیوں اور خاص کر سبز پتوں والی سبزیوں میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے یا سی سبزیوں میں وٹامن سی ضایع ہو جاتا ہے اور خشک اناج دالوں میں یہ موجود نہیں ہوتا۔ البتہ اناج کے دالوں کو پانی میں بھگو کر پھوٹتے ہوا جائے تو ان میں بھی وٹامن سی پیدا ہو جاتا ہے یہ عمل بالکل سادہ ہے۔ اناج کے دالوں کو پانی میں چوبیس گھنٹے بھگوئے رکھنے کے بعد گیلی زمین یا گیلے کمبل پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر انہیں ایک گیلے کپڑے سے ڈھک دیا جاتا ہے یہ دانے دو تین دنوں میں پھوٹ پڑیں گے اور انہیں کچا یا پکا کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پکانے کے عمل میں انہیں زیادہ دیر تک آنچ نہ دی جائے۔ اس طرح پھوٹے ہوئے مونگ یا چنوں کا استعمال وٹامن سی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

آملا ایک سستا پھل ہے جس میں وٹامن سی کی زیادہ مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ اس آملے میں وٹامن سی کی مقدار ایک یا دو سنگتروں کے برابر ہوتی ہے اس کے تازا رس میں سنگترے کے رس کے مقابلے میں وٹامن سی کی مقدار بیس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ عام طور پر تازا پھلوں اور سبزیوں کو خشک کرنے یا آنچ دینے سے ان میں وٹامن سی ضایع ہو جاتا ہے لیکن آملے کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اسے آنچ دینے سے بھی وٹامن سی ضایع نہیں ہوتا۔ اس لیے مربا اور اچار وغیرہ میں ڈال کر بھی آملے میں موجود وٹامن سی کی مقدار سے پورا فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے امرود اور آم میں بھی یہ وٹامن کثیر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔

ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے وٹامن ڈی کو خاص اہمیت حاصل ہے جسم میں اس وٹامن کی کمی سے ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔ ان کی قدرتی ساخت میں فرق آ جاتا ہے اور سوکھے کی بیماری ہو جاتی ہے یہ وٹامن زیادہ تر جانوروں کے جگر جگر کے تیلوں انڈے کی زردی دودھ اور ان مولیشیوں کے دودھ سے تیار کیے ہوئے گھی میں موجود ہوتا ہے جنہیں سبز چارا کھلایا جائے اور دھوپ میں رہنے کا موقع دیا جائے۔ تنگ اور تاریک گھروں میں رہنے والے بچوں اور پردا کرنے والی عورتوں کو سوکھے کی بیماری لاحق ہونے کا زیادہ ڈر لگا رہتا ہے۔ وٹامن ڈی حاصل کرنے کا سب سے سستا طریقہ دھوپ کھانا ہے۔ اس وٹامن کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جو دوائیاں تیار کی گئی ہیں وہ بڑی مہنگی ہیں لیکن دھوپ کھانے سے بلا قیمت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حاملہ عورتوں کو ایسی خوراک دی جانی چاہیے جس میں وٹامن ڈی وافر مقدار میں موجود ہو۔ اس سے جہاں ماں کی صحت اچھی رہے گی وہاں یہ وٹامن ہونے والے بچے کی تسلی بخش نشو و نما کا بھی ضامن ہوگا۔

ہندستانی ادب کے خریدار بن کر ہمیں علمی ادب کی ترویج میں مدد دیجیے

وجہ

شاہد اختر

(ایک کہانی)

مجھے اس سے اس وقت کی ملاقات تھی جب وہ اک ہونہار طالب علم تھا اور اسکول کے ذہین لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ میں اک ساتھ پڑھتے تھے اس کے والدین بہت غریب تھے۔ خانداری کافی بڑی تھی۔ پھر بھی بڑی کوششوں سے وہ میٹرکولیشن تک آیا۔

ہم لوگوں کے سالانا امتحان کا وقت قریب تھا۔ سب ہی لڑکے امتحان کی تیاریوں میں مشغول نظر آتے تھے۔ عین اسی موقع پر اس کی چھوٹی بہن بیمار پڑی۔ اور کچھ دنوں کی علالت کے بعد مر گئی۔

میٹرک کے بعد اسے تعلیمی سلسلہ ختم کر دینا پڑا۔ کچھ عرصا بعد پتاجی کی تبدیلی رانچی ہوگئی اور پٹنا سے رانچی چلا آیا۔ کچھ دنوں تک ہمارے مابین خط کتابت کا سلسلا جاری رہا۔ پھر میں بھی نئے ساتھیوں میں کھو کر اسے بھول بیٹھا اور اس نے بھی خط کا جواب پاکر لکھنا بند کر دیا

میں ۸۰-۱۹ کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اس کا ایک خط آیا لکھا تھا "مجھے اک فرم کی نوکری مل گئی ہے۔ ۵۰ روپے ماہوار پر صبح ۹ بجے سے لے کر رات کے ۹ بجے تک کام کرنا پڑتا ہے لہٰذا اب پھر ہمارے درمیان خط کتابت کا سلسلا جاری ہوگیا اور عرصے کی دبی ہوئی محبت یک بارگی تازا ہوگئی۔ اس کے خطوط برابر آتے رہے۔ میرے پاس ہونے کی خوشی میں تار بھی دیا اور مٹھائی کا تقاضا بھی کیا تھا میں نے اسے چند دنوں کے لیے بلایا تھا۔ لیکن پتاکی علالت کے سبب وہ نہ آسکا۔ اسی درمیان میں میرا بھی چلا گیا تھا۔ واپسی پر اس کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا "پیارے پرکاش خط نہ لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ تمہیں سن کر دکھ ہوگا کہ پتاجی ہیں بے بس مجبور چھوڑ کر چل بسے۔ زندگی بڑی کش مکش میں گذر رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ خودکشی کروں مگر بار بار ناکام ہو جاتا ہوں۔ شاید ابھی کچھ اور مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں خط اگر دیر سے آئے تو خفا مت ہونا۔ تمہارا وجے" کافی طویل عرصے کے بعد پھر ایک خط آیا۔ میں اس کی خوشیوں میں صنا فاہی صافا چاہتا تھا۔ خط بہت ہی نرالے انداز میں لکھا تھا۔

"اچھے پرکاش۔ سچ پوچھو تو ہم میں محبت، پیار، پریم سب کو ایک ڈھکوسلا ہی سمجھتا تھا۔ لیکن اب میں اسے بھگوان کی ایک مقدس امانت خیال کرتا ہوں۔ جسے بھگوان کبھی واپس نہیں لیتا پرکاش میں تو زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ مگر اب۔۔۔۔ اب یہ چاہتا ہوں کہ یہ جیون کبھی ختم ہونے والی کہانی بن جائے۔ پرکاش بھگوان نے آکاش کی سب سے سندر ناری کو میری زندگی کا جزو کل بنا دیا ہے وہ بہت معصوم و الھڑ لڑکی ہے کبھی کبھی عجیب باتیں کر بیٹھتی ہے۔ اسے ہندستانی رقص سے بے حد پریم ہے ابھی اسٹیج رنگ رہی ہے۔ اسے شفق کی لالی بہت بھاتی ہے اور دیر تک وہ اس کے متعلق عجیب و غریب قیاس آرائیاں کرتی رہتی ہیں ایک روز میں اسے روس، چین۔ دیش کی دیش پریمت جوان مالا لڑکیوں کی بہادری کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنا رہا تھا جب کہانی ختم ہوگئی تو اس نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے پوچھا "کیا ہمارے دیش کی لڑکیوں کو بھی دیش کے لیے لڑنے کی اجازت ملے گی میں ہنسنے لگا۔ میں نے تمہارے متعلق ساری باتیں اسے بتا دی ہیں وہ پوچھ رہی تھی کہ پرکاش با لو گیت بھی لکھتے ہیں۔ میں نے ہاں کہا تو وہ خوشی سے ناچنے لگی اور کہنے لگی ان سے کہو کہ گیت لکھیں تو میں ان گیتوں کے ساتھ ناچوں گی پرکاش اگر کبھی سوبھاگیہ ملا تو میں تمہیں اس سے ملاؤں گا۔ وہ بھی تم سے ملنے کی بڑی آرزو رکھتی ہے۔ اگلے خط میں نام پتا سب لکھوں گا۔ تمہارا وجے"

اس خط کے دو مہینے تک اس کا کچھ کوئی خط نہ آیا۔ میں نے سمجھا کہ بخت لیلیٰ مجنوں کے ڈھنگ کھیل رہا ہے کبھی ملاقات ہوئی

تو پوچھوں گا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکیے نے ایک لفافا میرے حوالے کیا۔ میں نے جلدی سے لفافا چاک کیا۔ میرا خیال صحی نکلا یہ وجے کا خط تھا۔

"کافی طویل مدت کے بعد لکھ رہا ہوں بات ہی کچھ ایسی تھی تم نے اپنی ہونے والی بھابی کے متعلق پوچھا تھا۔ وہ میری نہ ہو سکی۔ کیوں اور کا ہے میں نہیں جانتا۔ شاید میں ہی اس کے قابل نہ تھا ——"

"اسے ایک اچھے گھر کے دولتمند آدمی کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ اس میں اس کے والدین کا بھی دوش نہیں وہ غریب تھے۔ اس پر قرضہ اتار اس سے بہتر علاج شاید ان کے پاس کچھ نہ تھا کہ اپنی کو بیچ دیں۔ مجھے اس کا زیادہ غم ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ اگر دیش کی اکھڑ لڑکیاں پیاری پیاری میٹھی رسیلی باتیں سن سن کر چہرے بگڑتے رہے تو ایک زمانا ایسا بھی آئے گا کہ لوگ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو بیچنے میں پس و پیش نہ کریں گے۔ پر کاش شاید تمہیں تعجب ہو مگر مجھے جب بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کی جوانی ہی نہیں بلکہ زندگی کے سارے سپنے ساری آرزوئیں سارے ذہنی تخیلات اور مستقبل کی محبت بخش زندگی تو اچانک میری رگوں میں خون جوش مارنے لگتا ہے۔ مجھے سرمایہ داروں ہی سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے بھی جو ان کی آزادی کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں نفرت کا بے پناہ جذبا موجیں مارنے لگتا ہے۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ کیوں نہ ان لوگوں کی گردنیں اڑا دوں جنہیں انسانی وقار حریدنا آتا ہے مگر دوسرے ہی لمحے جیل کی چار دیواری ..... بوڑھے ماں باپ جوان بہن اور چھوٹے چھوٹے پیارے بھائی آنسو دیدا چار کھڑے نظر آتے ہیں۔ پر کاش بہنوں کی شادی اور بھائیوں کی پڑھائی یہ سوالیا نشان میرے ذہن میں چکر لگاتے ہیں اور میں فرم کے مالک کی ڈانٹ سن کر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ جہاں جہاں سے شادی کا پیام آتا ہے ..... ۵ ہزار سے کم کسی کی بات ہی نہیں ہوتی۔ خط طویل ہوتا جا رہا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں مجھے پاگل نہ سمجھنے لگو۔ میں بھی نہ جانے کن جذبات کے تحت یہ سب کچھ لکھ بیٹھا۔ خط برابر لکھا کرو۔ بڑی تشفی ہوتی ہے۔ ایسے پرانے اور پر خلوص ساتھی کیسے نصیب ہوتے ہیں۔ تمہارا وجے"

میں دیر تک خط کو الٹ پلٹ کر پڑھتا رہا۔ میں اس کی ساری تحریروں سے صرف یہ مطلب نکال سکا۔ وجے ایک کہانی ہے! آخر میں نے اسے جواب دیا۔

"پیارے وجے۔ تمہارا خط ملا۔ تم کافی گھاگ ہو گئے ہو مگر تم شاید یہ بھول گئے جب تک زندگی میں کوئی ہلچل طوفان نہ ہو وہ زندگی نہیں۔ صبر سے کام لو۔ مستقبل نے ماضی سے کب ہار مانی ہے یہ گرمی کی تعطیل میں ضرور آؤں گا۔ تمہارا پرکاش"

اسی درمیان تپاجی کی تبدیلی رانچی سے سونگیر ہو گئی اور میں چھوٹا ناگپور کی سنگلاخ سرزمین کو الوداع کہتا ہوا مونگیر پہنچ گیا۔ اب میرا بی اے کا آخری سال تھا۔ میں نے اپنی چند پلی کی خبر بھی کو دے رکھی تھی اسی دنوں اس کا خط آیا۔ اس کی بہن اور وجے کی شادی ہو رہی تھی مجھے بلایا تھا۔

دوسری صبح میں دار پور کی گلی میں رکشا پر چلا جا رہا تھا کہ رستے ہی میں وجے سے ملاقات ہو گئی اور ہم لوگ باتیں کرتے کرتے گھر پہنچ گئے۔

جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے اس کی شادی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور پھر چند دنوں بعد میں واپس چلا آیا۔ شادی کے تھوڑے عرصے تک اس کے خطوط آتے رہے پھر یک لخت بند کر دیا۔

اب ہمارے گھر کی بھی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی تپاجی پنشن پا رہے تھے اس لیے ۸-۱۰ کے بعد مجھے بھی پڑھائی ختم کر دینی پڑی ماتاجی کی وصیت کے مطابق میری شادی بھی کر دی گئی اور میں ازدواجی زندگی میں جکڑ گیا۔

کافی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے گورنمنٹ اسکول کی نوکری مل گئی اور میں بھاگلپور ضلع اسکول میں ماسٹر ہو گیا۔ اسکول کی زندگی اور دوسرے ازدواجی زندگی کی ساری باتیں وارث کو پریشان نہ رکھتی۔ اس لیے دھیرے دھیرے ماضی کے واقعات دھندلی

شکلوں میں تبدیل ہونے لگے۔

اسی عرصے میں مجھے راجگیر کسی کام پر لے جانا ہوا سوچا موقعے کی بھی کوئی خیریت معلوم نہیں ہے اک روز وہاں رہ کر دوسرے دن راجگیر چلا جاؤں گا۔ دوسرے صبح میں مراد پور کی گلی سے گذر رہا تھا کہ اچانک پر کاش، پر کاش کی آواز سنائی دی مڑ کر دیکھا تو اک نحیف و لاغر انسان کھڑا آواز دے رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے پہچانا یہ وجے تھا۔ ہم لوگ پنٹو ہوٹل میں گئے۔ میں نے بہت سی باتیں پوچھنے کے بعد شیلا کے متعلق بھی پوچھا تو کہنے لگا پچ دن ہوئے اس کا پتی مرگی کی بیماری میں مر گیا۔ اس کے بعد میں بچہ نہیں جانتا۔ وہ بچے لے کر اپنے گھر گیا۔ میں نے رات کا کھانا وہیں کھایا اور دوسری صبح آنے کا وعدا کر کے چلا گیا۔

دوسری صبح میں اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا رات سے کافی بخار ہے۔ میں ڈاکٹر کے یہاں گیا اور اسے لے آیا۔ ڈاکٹر نے T.B تجویز کی اور کسی پہاڑی مقام پر لے جانے کو کہا۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اسی روز میں راجگیر کی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ رستے بھر مجھے پہاڑی مقام، ۱۰ روپے اور شیلا یاد آ رہے تھے۔

ڈاک تار کی سوسائٹی سالگرہ پر خاص عنایت

چار آنے میں تار بھیجیے

پہلی نومبر ۱۹۵۳ء سے نئی دہلی میں محکمہ تار کی سوسائٹی نمائش شروع ہو رہی ہے۔ جس میں محکمہ ڈاک و تار "اپنا پیغام خود ارسال کیجیے" کے نام سے ایک نئی سروس شروع کر رہا ہے۔

نمائش دیکھنے والے اپنا پیغام خود ٹیلی پرنٹر پر ٹائپ کر سکیں گے یہ ٹائپ کیا ہوا کاغذ کی قطعے تار کے پیلی فارم پر چسپاں کر کے مکتوب الیہ کو ارسال کر دیے جائیں گے۔ تار میں تار اور رقم کے نام سمیت پانچ سے زیادہ ۱۴ شبد بھیجے جا سکیں گے اور اس کی فیس صرف چار آنے ہوگی۔

—

بین قومی سائنٹیفک فلم ایسوسی ایشن کا جلسا

ہندستانی ڈاکیومنٹری فلموں کی نمائش

لندن میں ۱۸ تا ۲۴ ستمبر بین قومی سائنٹیفک فلم ایسوسی ایشن کا ساتوان سالانا جلسا منعقد کیا جا رہا ہے اس موقع پر ہندستان کی سات تعلیمی فلمیں بھی دکھائی جائیں گی ہندستانی فلموں میں چند فلموں کے عنوان یہ ہیں۔ "فولاد کی کہانی"۔ "صنعت کو ریسرچ کی امداد" "نیشنل فزیکل لیبارٹری"، "نیشنل کیمیکل لیبارٹری"۔

یہ دوسری بار ہے کہ اس ایسوسی ایشن کا جلسا لندن بلایا جا رہا ہے۔ پہلا جلسا ۱۹۴۷ء میں بلایا گیا تھا۔ اوپر کے جلسے کے منتظم برطانیا کے سائنٹیفک فلم ایسوسی ایشن ہے جس کے سرپرست ڈیوک آف ایڈنبرا ہیں۔

کولمبو منصوبے کے تحت ایشیائی یونیورسٹیوں کی امداد

حکومت برطانیا کے کولمبو پلان کی فنی تعاون کی اسکیم کے تحت جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی یونیورسٹیوں کے لیے برطانوی یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے ماہرین تعلیم کی خدمات مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ یہ ماہرین ایشیائی یونیورسٹیوں کی تنظیم کے مسایل پر مشورا دیں گے اور اگر ضرورت پڑی تو لکچر و فیرا بھی دیں گے۔

—

ابائی ابن کونان بے

م۔ ل

قزاقستان کے شاعر اعظم نے قزاقستانی ادب اور قزاقستان کی ادبی زبان کے بانی اور وسط ایشیائی قوموں کی ادبی تاریخ کی نامور ہستی ابائی ابن کونان بے کا کام ہمیشہ قایم اور چمکتا رہیگا

ابائی (ابراہیم) ابن کونان بے کوہستان قیرگیز کے (جو اب علاقے سیمی پالاتنسک کا ضلع ابائی ہے) ایک خانابدوش قبیلے تو بیکتی میں ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوے تھے۔ ان کے والد کونان بے قبیلا تو بیکتی کے سردار اور علاقے کے جابر حکمرانوں میں سے تھے۔

مگر پرابتدائی تعلیم کے بعد ابائی کو ان کے والد نے سیمی پالاتنسک کے ایک مدرسے (مسلم مذہبی اسکول) میں بھیجدیا مذہبی اسکول کی تعلیم میں اس تخیل پرست اور متجسس نوجوان کا دل نہ لگا۔ اس نے خاصے طور پر مشرق کے ممتاز اور مشہور مصنفوں کی کتابوں کا مطالعا شروع کر دیا۔ ان کی تقلید کرتے ہوے ابائی نے بھی مختلف موضوعات پر کئی مضامین لکھوئے۔ چھوٹی نظمیں وغیرا لکھیں۔ شاعری سے لگاو انہیں اپنے گاوں ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ وہاں انہوں نے لوک گیت سنے تھے اور دیہاتی قصاگو انہیں پریوں کی کہانیاں قصے اور نظمیں سنایا کرتے تھے۔ مدرسے میں تعلیم کے دوران ہی میں ابائی کو دوسری تومیوں کی شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی عربی، فارسی کلاسکی ادب انہیں خاص طور پر پسند آیا۔ روسی زبان سیکھنے کا انہیں اس قدر شوق تھا کہ مسلم مذہبی اسکول میں تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایک روسی اسکول میں بھی داخلا لے لیا۔

لیکن ابائی کو مدرسے کی تعلیم مکمل کرنی نصیب ہوئی۔ ان کے والد کونان بے نے بیٹے کو مدرسے سے اٹھوا لیا تاکہ اسے قبیلے کا سردار بننے کی تربیت دے لیکن ابائی کو اپنا یہ مستقبل بے کیف معلوم ہوا۔ انہوں نے جن کویوں کے ساتھ وقت گذارنا اور زبان در زبان مدتوں سے چلے آنے والے لوک گیت سیکھنا زیادا پسند کیا۔ اپنی مرضی کے خلاف جب کبھی کبھی ابائی کو قبیلے کے اندرونی جھگڑوں سے سابقا پڑتا تو وہ اپنے والد کی نا انصافی اور بے رحمی کو برداشت نہ کر پاتے اور اکثر ان کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے کونان بے کے دل میں اپنے بیٹے سے نفرت پیدا ہوگئی۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہ عام لوگوں سے گھل مل کر رہتا۔ اور روسی کلچر سے دلچسپی رکھتا تھا۔ باپ بیٹے میں فیصلا کن قطع تعلق ۱۸۷۱ء میں ہوگیا۔

جب ابائی کے اپنے والد کے ساتھ تمام تعلقات ختم ہوگئے تو جن کوی اور قزاقستانی نوجوان ہی ان کے عزیز ترین دوست بنے۔ زارشاہی حکومت نے جمہوریت پسند روسی دانشوروں کے بہترین نمایندوں کو جلاوطن کر کے سیمی پالاتنسک بھیجدیا تھا۔ انہیں کی مدد سے ابائی نے روسی ادیبوں اور مفکروں کی تصنیفات کا مطالعا کیا۔ انہوں نے پشکن لرمونتوف نیکراسوف سالتی کوف شچدرین۔ لیو طالستائی ترگنیف بیلنسکی چیرنی شیوسکی دوبرولیوبوف اور پیساریف کی کتابیں پڑیں انہوں نے ابائی کے ترقی پسند نظریات کی تشکیل میں مدد دی۔

ابائی نے مشرق کے کلاسکی شاعروں کی نقل کرتے ہوے طالب علمی کے زمانے ہی میں نظمیں کہنی شروع کر دی تھیں لیکن یہ نظمیں اکثر حقیقی زندگی سے کوسوں دور ہوا کرتی تھیں۔ بعد کے زمانے میں قزاقستان کے عوام کی زندگی ان کی شاعری کا موضوع بن گئی۔ اپنی بہت سی تصنیفات میں جو شاعرانا جوش بیان اور سماجی اہمیت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں

ابائی نے انسان کی محنت، اخلاق اور سماجی نصب العین کے مسئلوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظمیں خون آشام قبائلی جھگڑوں اور جاگیردارانہ نظام کے بدولت جہالت اور تہذیبی پسماندگی کی مذمت کرتی ہیں۔ ابائی نے اپنی شاعری میں قزاقی قوم کی مظلومیت اور محکومیت پر دلی رنج و ملال کا اظہار کیا۔ لیکن جہاں بہت سے قزاقستانی شاعروں نے ابائی سے پہلے اپنی قوم کی مظلومیت کی تصویر پیش کرتے ہوئے بے بسی اور لاچاری کا اظہار کیا تھا۔ جہاں انہیں عوام کی مصیبتوں کے خاتمے کی کوئی راہ نظر آتی تھی۔ وہاں ابائی نے عوام کے تاریخی فرض کو پہچانا انہوں نے لکھا "عوام کے بغیر زندگی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بیابان صحرا میں کپڑے کا خیمہ پھیلا ہے اور رات میں گزیلے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ اپنی بہت سی تصنیفات میں ابائی نے عوام کو اپنے ہر مسرت مستقبل کے لیے جدوجہد کرنے کو للکارا۔ روسی مادی جمالیات سے متاثر ہو کر ابائی نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ شاعر کو عوام کے مفادات کے لیے لڑنا چاہیے۔ "میں محض تفریح کے لیے شاعری نہیں کرتا۔"

ابائی ایک عظیم جدت طراز فن کار اور حقیقی قومی شاعر تھے۔ انہوں نے قزاقستانی ادب کو ایک بلند سماجی معیار پر پہنچایا۔ اور فن کارانہ طرز بیان سے اس کو مالا مال کیا انہوں نے فن شعر کو ئی کی پرانی طرزوں کو ایک چابکدست فن کار کی طرح استعمال کیا۔ اور اپنی شاعری کے لیے نظریاتی مواد کے مطابق نئی طرزوں کی بنا ڈالی۔ ابائی کا فن طرز بیان کی مبالغہ آمیزی اور تصنع کی قید سے آزاد ہے۔

ابائی کی نظموں میں اس وقت خاص طور پر اور بھی جان پڑ گئی جبکہ وہ روسی قوم کے روحانی کلچر کی پوری اہمیت کو بھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ ابائی کو پوری طرح احساس ہو گیا کہ قزاقستانی قوم کے لیے اپنا صدہا برس کی پسماندگی اور جہالت سے نجات حاصل کرنے اور مستقل ترقی پانے روسی کلچر سے تعلق قائم کرنے میں چھپا ہوا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا "یاد رکھو کہ اہم ترین بات روسی علم سیکھنا ہے۔ . . . ابائی کا خاتمہ کرنے اور اچھائی کو لانے کے لیے روسی زبان اور روسی کلچر کا جاننا ضروری ہے۔ روسی دنیا کو دیکھتے ہیں اگر تم ان کی زبان سیکھ جاؤ گے تو تمہاری آنکھیں بھی دنیا دیکھنے لگیں گی۔"

روسی زبان پر ابائی نے اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ وہ نہ صرف خود ترقی پسند روسی ادب کے شہ پاروں سے واقف ہو سکے بلکہ اپنی مادری زبان میں چند کا ترجمہ بھی کیا۔ ابائی کے ترجموں ہی میں قزاقی قوم نے پشکن لرمنتوف اور کرسنوتوق کی آواز سب سے پہلی بار اپنی زبان میں سنی۔ یورپ کے کلاسکی ادیبوں کے لافانی شاہکاروں سے اپنی قوم کے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے ابائی نے گوئٹے اور بائرن کی نظمیں قزاقستانی زبان میں ترجمہ کیں۔

روسی کلاسکی ادب کی روایات کو اپناتے ہوئے ابائی نے قزاقستانی ادب میں تنقیدی حقیقت پسندی کی طرز سب سے پہلے رائج کی۔ انہوں نے بہت سے قومی اور حقیقت افروز کردار اور مناظر پیش کیے آزادی سے محبت اور قوموں کے باہمی میل ملاپ کا پرچار کیا۔ اس کی مثالیں "نومبر" "جاڑے ڈیوڑی" اور "گا کلیہ" میں ہیں۔

شاعر اور مترجم کے علاوہ ابائی لوگ گیتوں کے بڑے ماہر اور نغمہ ساز بھی تھے۔ انہوں اپنی بیس سے زیادہ نظموں کی دھنیں نکالیں۔ اور یہ گیت آج تک قزاقستان میں گائے جاتے ہیں۔ تاتیانا کا خط (جو پشکن کے "یوگینی اونیگن" میں سے لیا گیا ہے۔) جن کا ابائی نے ترجمہ کیا تھا۔ اور دھن نکالی تھی۔ پچھلے کوئی ساٹھ برس سے قزاقستان کے قومی گانوں کی مستقل فہرست میں شامل ہے۔ سوویت نغمہ سازوں نے ابائی کے ورثے موسیقی سے استفادہ کر کے نظموں کی سمفنی (۱۔ ابائی لوف اور ۱۔ بروسی لوہ سکی نے) اور غنائی ڈراما "ابائی" (۱۔ ابائی اوف اور ل۔ حمیدی) نیز دوسری چیزیں پیش کیں۔

۱۹۰۴ء میں ابائی کی وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنی شاعری

کا ایسا بیش بہا ورثا چھوڑا جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور جو انیسویں صدی کے آخری پچیس برسوں میں قزاق قوم کی زندگی کی سچی تاریخ ہے۔

۱۹۴۵ء میں آزاد سویت قزاقستان نے اپنے عظیم شاعر ابائی ابن کونان یے کی سو سالا سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی تھی۔ یہ سو سالا سال گرہ قزاقستانی قومی کلچر کا ایک یادگار دن بن گیا۔ سویت عہد حکومت میں قزاقستانی قومی کلچر پھول پھل رہا ہے۔ اور قزاق قوم کے شاعر اعظم کو بھی اسی زمانے میں حقیقی قومی شہرت اور عظمت ملی ہے۔

قزاقستان کے تمام جدید شاعر ابائی کو اپنا پہلا استاد مانتے ہیں۔ ابائی کی نظمیں وغیرہ اسکولوں کی تمام نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ ابائی کی زندگی اور کارناموں کے متعلق کئی فنی تخلیقات ہوئی ہیں۔ م عوئزوف کا ناول "ابائی" فلم "ابائی کے گیت" "جوگ۔ اوشال نے بنائی ہے لوک کہانیوں کی نکلیں اور گیت کاستے ئیف اور مائچے اور دوسرے فن کاروں کی بنائی ہوئی تصویریں قزاقستان کے ادیب اور عالم ابائی کے ورثا کا مطالعا کر رہے ہیں۔ جو سویت دور ہی میں جمع کیا گیا۔ اور قزاقستانی زبان میں سب کا سب شایع کیا گیا۔ قزاقستان کے عوام ابائی کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ان کے نام سے بہت سے اسکول، کالج، شہروں کی سڑکیں اور تھیٹر موسوم ہیں۔ ابائی کی شاعری ان کے وطن کے کونے کونے اور باہر بھی دور دور مشہور اور مقبول ہے۔

قزاقستان کے کلاسکی ادیب اور قزاق قوم کو علم و تہذیب کی روشنی سے مالا مال کرنے ابائی کا نام اور ان کی یاد قزاق قوم کے دل میں ہمیشا باقی رہے گی۔

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے تو کرپا کر کے چندا منی آرڈر کر دیجیے۔ وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا

دنیا میں بوائے اسکاوٹوں کی تعداد ۵۵ لاکھ

ہندستان میں چار لاکھ اسکاوٹ

بوائے اسکاوٹ تحریک جو ۵۵ء میں پی گولڈن جوبلی منا رہی ہے برابر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ بوائے اسکاوٹس انٹرنیشنل بیورو لندن کی تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا میں بوائے اسکاوٹوں کی تعداد ۵۵۶۱۹۹۳ ہے پچھلے روسال میں ۱۴۵۱۸۴۶ اسکاوٹوں کا اضافا ہوا ہے تعداد کے لحاظ سے امریکا پہلے نمبر اور برطانیا دوسرے نمبر پر ہے امریکا میں اسکاوٹوں کی تعداد ۳۱۸۳۲۶۶ اور برطانیا میں ۱۹۷۰۴۸۸ ہے۔ ہندستانی۔ پاکستانی اور سیلونی بوائے اسکاوٹوں کی تعداد ترتیب وار ۴۱۷۶۹۔۳۶۸۱۱۶۵۸ اور ۸۹۲۲ ہے۔

برطانیا سے غیر ملکی سیاحوں کی دلچسپی

اعداد و شمار مظہر ہیں کہ ۵۲ء کے دوران سمندر پار کے ۷۳۳۰۰۰ لوگ برطانیا آئے ۵۱ء میں ان کی تعداد ۷۱۲۰۰۰ تھی۔ ان اعداد و شمار کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ امریکی سیاحوں کی تعداد میں ۳۶۰۰۰ کا یا یوں کہہ لو ۲۰ فی صدی کا اضافا ہوا۔ جنگ کے بعد اتنا اضافا پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ دولت مشترکا سے آنے والوں کی تعداد بھی ۵۱ء کے مقابلے میں کچھ زیادا تھی لیکن برطانیا کے باقی حصوں سے ۵۱ء کے مقابلے میں کم لوگ برطانیا آئے سیاحوں کی آمد سے برطانیا کو ۱۰۰۰۰۰۰/ پونڈ اور ۵۲ء میں ۱۱۴۵۰۰۰۰۰ پونڈ کی آمدنی ہوئی۔

ماں کی بائبل

یو سیس

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بچوں کی پرورش دنیا کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ آج کے بچے ہی کل کی قوم ہیں۔ ان کی پرورش طبی سائینس اور دوسرے اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں امریکا کے ایک ادارے نے ایک کتاب شایع کی ہے جو پچھلے چالیس برس سے امریکا میں بائبل کے بعد دوسرے درجے پر ہے اور اسے ماں کی بائبل کہا جاتا ہے۔

امریکا میں بائبل کے بعد جس دوسری کتاب کی سب سے زیادہ اشاعت ہے وہ بچوں کی پرورش کے متعلق امریکی سرکار کی شایع کی ہوئی ایک کتاب ہے جس کا نام "انفنٹ کیئر" ہے یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں چھپی تھی۔ لیکن اس وقت سے اس پر آٹھ بار نظر ثانی ہو چکی ہے اور بچوں کی پرورش کے متعلق جدید ترین معلومات اس میں شامل کی گئی ہیں۔ اور تین کروڑ دس لاکھ سے زاید کاپیاں تقسیم ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کو اکثر "ماں کی بائبل" کہا جاتا ہے اور نئے نئے بچوں کی پرورش کے متعلق اس سے ماں باپ کی رہنمائی ہوتی ہے۔ بچوں کی پرورش کے متعلق یہ کتاب لاکھوں والدین خریدتے ہیں اور ڈاکٹر نرسیں، ہسپتال اور ہیلتھ آفیسر اسے تقسیم کرتے ہیں۔ تقریباً سات زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جا چکا ہے جنہیں دوسرے ملکوں کے ڈاکٹر نرسیں اور سوشل ورکر استعمال کرتے ہیں۔ برازیل کے ایک اخبار نے اس کی تقسیم اپنے ذمے لی ہے۔

یہ کتاب پہلے پہل مسز میکس ولسٹ نے چلڈرنز بیورو کے لیے لکھی تھی جو ایک بیوہ تھی۔ اور پانچ بچوں کی ماں تھی۔ اس نے اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں لائبریری آف کانگریس میں ریسرچ کی۔ میڈیکل اسکول میں بچوں کی پرورش کے متعلق تربیت حاصل کی اور مشہور ماہرین دایا گری سے مشورے لیے۔ اس کتاب کے جدید ترین ایڈیشن ڈاکٹروں، نرسوں ماہرین علم نفسیات، ماہرین ماہرین خوراک اور والدین کی تعلیم اور تربیت کے ماہروں کے مشورے اور ہدایات کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ گھروں میں اس کتاب کے عملی پہلو

کا جائزہ لینے کے لیے تجربے کار والدین سے اس پر بحث چیخی اور رائے زنی کرائی جاتی ہے۔

سائینس کی جدید معلومات کی روشنی میں چلڈرنز بیورو کی اس کتاب میں جو کچھ ہدایات درج تھیں ان میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ایک تبدیلی یہ ہے کہ بچے کو مقررہ وقت پر خوراک دینے کا پرانا طریقہ ترک کر دیا گیا ہے اب بچا جب بھوک پیاس کی وجہ سے رونے لگے تو اسے دودھ وغیرہ پلایا جانا چاہیے اور مقررہ وقت پر دودھ دینے کے لیے بچے کو رلانے کو اب غلط قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے بچے کے لیے مضر بتایا گیا ہے اور ایسا کرنا بچے پر سختی کرنا ہے۔

جدید نظریے کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ بچے کو اگر بھوک لگنے کے وقت ہی کچھ کھلایا جائے تو غدہ نخدی اس کو کھلانے پلانے کا وقت مقرر ہو جاتا ہے اور بچے کا ایک مقررہ پروگرام بن جاتا ہے۔ یہی بات بچوں کی نیند کے متعلق بھی درست ہے کیونکہ بچوں کو بھی اپنی اپنی خاص ضروریات اور سہولتوں کے برابر مختلف قسم کی بات پسند ہوتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے اسی سے ان میں ایک باقاعدگی ہوتی ہے۔

بچوں کی خوراک کے متعلق بھی خیالات میں بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں چھاتیوں کا دودھ ہر صورت میں پلانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے ایڈیشن میں بتایا گیا ہے کہ ماں کو چاہیے کہ بچے کو کافی مقدار میں خوراک دیے جانے کا دھیان رکھے

چاہے چھاتیوں کا دودھ پلائے یا بوتل کا دودھ ۔ اصلی اثر تو اس جذبے کا ہے جس کے تحت بچے کی پرورش کی جائے دودھ کی کسی خاص قسم کا اس سے کوئی تعلق نہیں ۔

پرانا خیال تو یہ تھا کہ بچے جب تک سات آٹھ مہینے کے نہ ہو جائیں انہیں دن میں ایک بار پھلوں کا رس دیا جا سکتا ہے اور یہ کہ پہلے برس میں تو کوئی ٹھوس غذا نہیں دی جانی چاہیے لیکن جدید تجربا یہ بتاتا ہے کہ بچہ جب تک دو مہینے کی عمر کو پہنچے اسے دن میں نکترّوں کا دو اونس رس دینا چاہیے اور تین یا پانچ مہینے کا ہونے تک انڈے کی زردی دینی شروع کرنی چاہیے ۔

بعض ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بچوں کو ٹھوس خوراک اس وقت دی جانی چاہیے جب وہ چند ہفتوں کا ہی ہوا اور بعض کہتے ہیں جب وہ تین سے چار مہینوں تک کا ہو ۔

بچوں کی پوشاک

اس پرانے خیال کی تردید کر دی گئی ہے کہ بچوں کو بہت سے کپڑے پہنائے جانے چاہئیں ۔ جدید خیال یہ ہے کہ اس سے بچے بہت بے آرام ہو جاتے ہیں اور انہیں موسم کے برابر کپڑے پہنائے جانے چاہئیں ۔ بچے کو اٹھانے بٹھانے وغیرہ سے متعلق بھی جو پرانا خیال تھا اس میں بھی تبدیلی آ گئی ہے ۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ بچہ رو رہا ہو تو اسے گود میں مت اٹھاؤ ۔ نیا خیال یہ ہے کہ بچے کو گود میں اٹھا کر چھاتی سے لگا لینا چاہیے ۔ اس سے اس کی تسلی ہوتی ہے انگوٹھا چوسنے سے بچے کو روکا جائے اس سے اسے بڑا طف حاصل ہوتا ہے اور آج کل کے ماہرین کہتے ہیں کہ بچے کو گود میں اٹھا کر پچکارنے پیار کرنے یا اس سے باتیں کرنے یا دودھ وغیرہ پلانے کے مقابلے میں اگر بچے محض انگوٹھا چوسنا ٹھیک متبادل نہیں تاہم ان چیزوں کی عدم موجودگی میں اچھا متبادل ہے

اس کتاب کے نئے ایڈیشنوں میں بچوں کی نفسیات کے متعلق نئی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بچے بڑے ہوشیار ہوتے ہیں اور ان پر بہت سی ایسی باتوں کا بھی اثر ہوتا ہے جن کے متعلق سوچا جاتا تھا کہ وہ ان سے آگاہ نہیں ہوتے تھے ۔ مثلاً گھر میں جھگڑوں کا بچے کے جذبات اور سکون پر بہت برا اثر پڑتا ہے ۔

چونکہ ان کے متعلق کہا جائے نئے نئے بچوں پر بھی اس کا ردعمل ہوتا ہے ان کی خامیوں اور کمزوریوں پر ان کی موجودگی میں کوئی بحث نہیں ہونی چاہیے ۔

بچوں کی بالیدگی

بچوں کی بالیدگی کے متعلق اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ہر بچہ اپنے اپنے ڈھب کے برابر بڑھتا جاتا ہے ۔ ماں باپ کسی بھی بچے کو تیزی سے فوراً ہی بڑا نہیں بنا سکتے اس کی پرورش قدرتی طریقے اور اصول کے تحت ہی ہو گی ۔ لیکن ماں باپ بچے کے لیے موزوں اور ماحول اور اس کی بالیدگی کے لیے کھلی آزادی دے سکتے ہیں تاکہ وہ اپنی قابلیت کے برابر پروان چڑھے ۔

اس نئے ایڈیشن کے مطابق والدین کو چاہیے کہ وہ بچے کی تبدریج پرورش پانے کا انتظار کریں ۔ اور کسی خاص عمر کو پہنچنے کے ساتھ ساتھ ان سے ہنسنے یا سر اٹھانے چلنے باتیں کرنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے ۔

اگرچہ سائنس کی نئی نئی معلومات کی وجہ سے اس کتاب میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں لیکن بچوں کی پرورش کے متعلق جو بنیادی فلسفہ ہے اس کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور یہ آج بھی ویسا ہی درست ہے جیسا چالیس برس پہلے تھا ۔ اور وہ یہ کہ سب بچوں کو ماں کی شفقت پیار اور پرورش کی ضرورت ہے ۔ جسمانی پرورش کی طرح اسے پیار کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے ۔

اگر آپ مصنف ہیں اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے ۔ اس لیے کہ یہی وہ بیباک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے

Osmania University Library,
HYDERABAD (DECCAN)
DEC

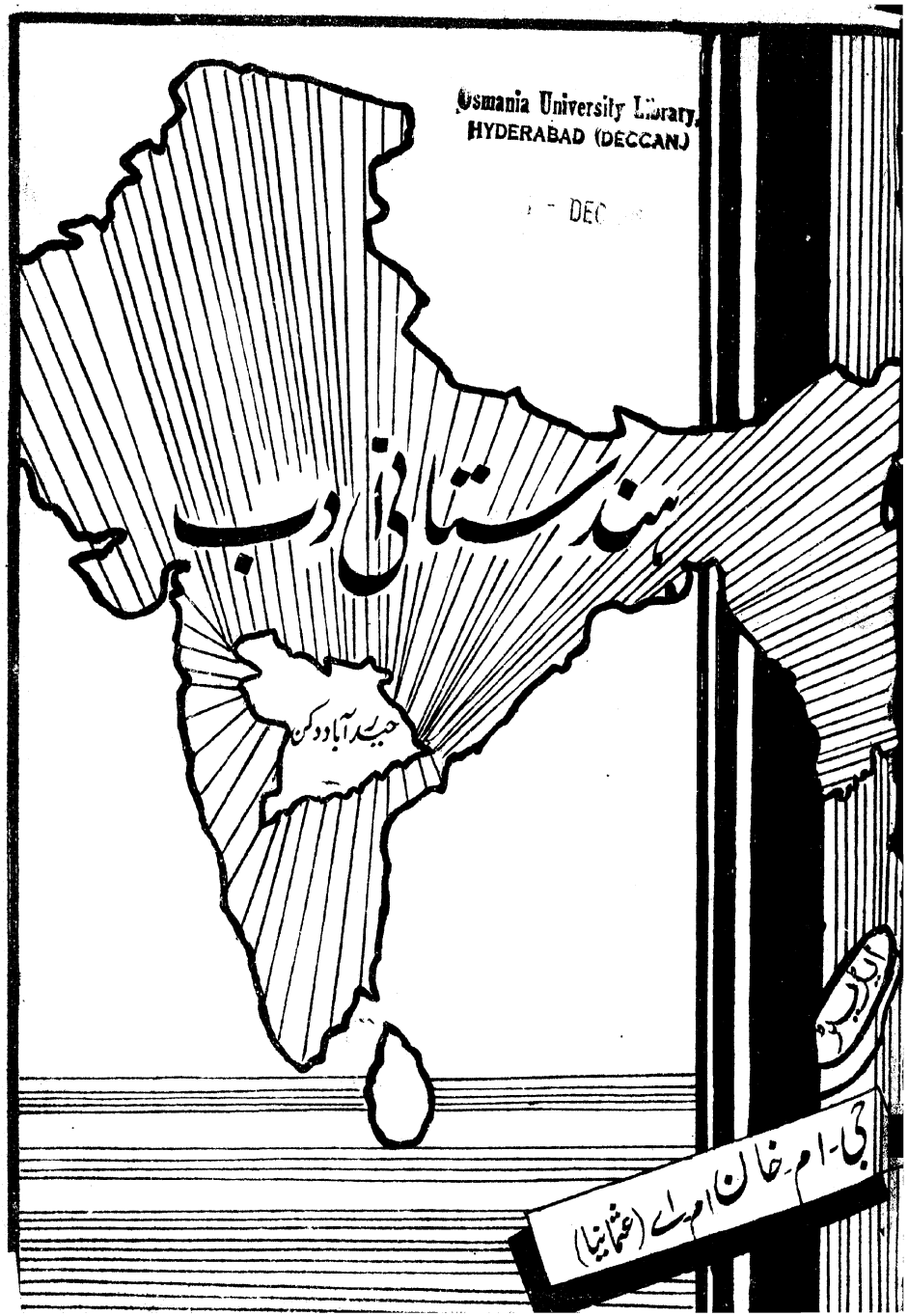

جی۔ ام۔ خان ام اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر (۱۸۴) اتیج

ہندستانی ادب

۹۹ اے۔ اعظم پورہ شرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

دے ۱۳۶۳ف

جلد (۱۴) نمبر (۲)

قیمت ایک چاآنے

نومبر ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	میں سلام کرتا ہوں
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳	روس میں تلسی اس کی رامائن سے دلچسپی
خاتون مشرق یا مغرب پرست شوہر سے	صفی احمد (بہاری)	۴	نہ ہوئی ہیں میاں
محسوسات ماہر	ماہر القادری	۵	خوراک کے بارے میں ہمارے توہمات اور غلط فہمیاں
غزل	حکیم حاجی الوارثی (جگدیشپوری)	۵	سر سہلاتے ہوئے پتو
غزل	مولوی حکیم وارثی (جگدیشپوری)	۵	آگ میں پھول
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند	۶	س کے نام
مسٹر لوبر	آیا زعصمی	۹	بچوں کے لیے فلمیں
پاگل	سنتوش نارائن ماتھر	۱۰	روٹری انٹرنیشنل
دلی سے کشمیر تک	اندرا کماری	۱۱	انجام
"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے"			ایڈیٹر

اجمل رشید (عادل آبادی)	۱۲	
گ۔ گوتوسکی	۱۸	
عصمت آرا عصمت	۲۰	
ا۔ا	۲۱	
محمودہ رضویہ نشتی فاضل	۲۲	
قمرالدین قمر	۲۳	
صبا نقوی	۲۶	
پروفیسر کینزک ہکسن	۲۷	
یوسیس	۲۹	
رفیع صدیقی	۳۰	
	۳۱	

ہمارے خیالات
"حقایق و معارف" کی روشنی میں

برابر کے صفحے پر مولانا فقر سوہانی کی غزل دی گئی ہے آج ہم اسی غزل کے بعض شبد یا الفاظ کی روشنی میں ان سفینہ نہیں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے جو ہمارے آوازی یا صوتی طرز تحریر کو ناپسند کرتے ہیں ——

ہم نے لکھائی کا یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت آواز ہی ایسی نکلتی ہے لکھنے ہندستانی ادب کے متعلق پڑنے والوں کو یاد ہوگا کہ آج سے کچھ عرصا پہلے اسی موضوع پر لکھتے ہوئے ہم نے یہ بات ظاہر کی تھی کہ صوتیاتی اصول یا تو مشک سٹم پر اگر الفاظ یا جملوں یا کسی تقریر کی ریکارڈنگ کی جائے تو اس کے سننے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جائے گی کہ بعض شبدوں کی آواز جس طرح پڑا دا ہوتی ہے انہیں اس ڈھنگ پر نہیں لکھا جاتا۔ اور یہ علم صوتیات یا فونیٹکس کے اصول کے تحت ایک بھاری غلطی ہے صوتیاتی اصول یا قاعدا تو یہ ہے کہ آواز جس طرح پڑا دا ہو اسی طرح پر لکھا بھی جائے مگر ہم دیکھتے ہیں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اس خامی یا خرابی کا اصل سبب یہ نہیں کہ لکھنے والے اس نقص سے ناواقف ہیں بلکہ وہ بہتر طریقے پر جانتے اور سمجھتے ہیں لیکن افسوس کہ بقول کسے "لکیر کے فقیر" بنے ہوئے بزرگوں کے بتائے ہوئے پرانے و غلط ڈگر پر چلنا پسند کرتے ہیں ——

ہم نے صوتی اصول پر لکھائی کا بیڑا محض زبان کی اصلاح اور اسکی آسان سے آسان تر بنانے کی خاطر اٹھایا ہے زبان اگر آسان ہوگی تو اس کو شخصی آسانی اور سہولت کے ساتھ اپنائے گا اس سے ہندستانی ترقی کرے گی اور پھلے پھولے گی مگر افسوس ہے کہ عام طور پر اس سفینہ مطلب خیال کی مذمت اور مخالفت ہی کی جاتی ہے ہم اس سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آج نہیں تو کل زمانا اس کی ضرورت کو محسوس کرے گا۔ اور ہمارا پیش کیا ایک کی کا بنیاد اور پورا ہو کر رہے گا

نوٹ یعنی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو ہمارے صوتی اصول کی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جاتی ہے اور دوسری طرف "ضرورتاً" فانیا کے تحت اسی زبین اصول کو بغیر جھجک اور بلا تامل اپنا لیا جاتا ہے ——

"حقایق و معارف" کے مطلع کے دوسرے مصرعے میں پہلے تو لفظ "سجدہ" کو اسی طریقے پر لکھا گیا ہے جیسا کہ اصول صوتیات کے خلاف عام طور پر غلط لکھا جاتا ہے اسی صحیح ہجی کا لفظ حیثیا فانیا قرار پا کر بکل اس کی ہیئت کذائی ہی بدل دی گئی اور محض قافیے کی خاطر اس کے الف کو بے تکان بدل دیا گیا —— حالانکہ شبد وہی "سجدہ" اور اس کے معنی اور مفہوم بھی وہی ہے —— یہ کوئی انصاف ہے یا ہٹ دھرمی یا بچوں کی سی ضد —— کہ جس بات پر ہٹ گئے تو بس اسی پر قایم رہیں گے کہ سمجھدار آدمیوں کا تو شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ کسی معقول تحریک یا بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔ اگر کوئی شخص ایک اچھا اور مفید خیال پیش کرے تو اس پر غور کریں۔ یہ تو کوئی تک نہیں کہ خدا نہ کرے اگر غلطی کریں تو وہ غلطی، غلطی نہیں اور اگر کوئی دوسرا ویسا ہی فعل کرے تو وہ نہ صرف غلطی بلکہ پاپ، مہا پاپ ہیمپٹی کا بدتمیزی، ہٹ دھرمی اور جہالت وغیرہ وغیرہ ——

شاعر نے صرف اسی ایک لفظ کو صوتی اصول پر لکھنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ "جلوہ" کو جلوا اور مقطعہ میں "سفینہ" کو سفینا لکھا ہے —— اگر کوئی سوال کرے کہ ایسا کیوں —— تو جواب ملے گا، چونکہ غزل کا قافیا سوا، دھو کا، شبد ا ایسا فرد ا وغیرہ قرار دیا گیا تھا۔ اسی لیے مجبوراً قافیا قرار دینے کی خاطر "سجدہ" کو سجدا، "جلوہ" کو جلوا اور سفینہ کو سفینا لکھا گیا ——

اگر "ضرورت قافیا" واقعی مجبوری کا دوسرا نام ہے تو پھر اس کا ووٹ کو ہٹانا چاہیا کہ ہمیشہ کے لیے دور کیوں نہیں کر دیا جاتا —— یعنی اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایسے تمام شبدوں کو "ہ" سے الف میں بدل دینا چاہیے جن کی آواز قطعی طور پر "ا" ہی کی نکلتی ہے، اور صوتی یا آوازی اصول کا حقیقی تقاضا بھی یہی ہے کہ شبدوں یا الفاظ کو اسی طریقے پر لکھا جائے جیسے موجہ سے ان کی آواز ادا ہوتی ہو

اس بات میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شبد لفظ کی اصل تو عربی ہے اور فلاں لفظ فارسی یا ترکی زبان کا ہے —— مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ غیرت تک —— علم لسانیات کے طالب علم بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ ابتداے آفرینش سے آج تک کوئی بھاشا کسی بھی بھاشا میں یا زبان نہیں ہے وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی ہیں۔ پڑوسی دیسوں میں میل جول اور تجارتی تعلقات کی بنا پر ایک دیس کی بھاشا کے شبد دوسرے دیس کی بھاشا میں ملے بغیر نہ رہے اسی طرح حاکم قوموں کی بھاشا کے شبد محکوم قوموں کی بھاشاؤں میں شامل ہوتے آئے ہیں بعض شبد تو اصلی روپ میں اور بعض شبد اور بہت سے تو طرز و ترکیب یا شکل و صورت بدلنے کے بعد شامل کر لیے جاتے ہیں۔ ایک زمانا گذرنے پر کثرت استعمال کے بعد یہ شبد یا لفظ اسی زبان کا جز قرار دے لیے جاتے ہیں ایسی صورت میں یہ اعتراض ہی بے جا، بلکہ ایک حد تک بے معنی سا معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شبد تو فلاں زبان کا ہے۔ ہم اس میں تبدیلی کیوں کر کر سکتے ہیں —— جب آپ قافیے کی خاطر کسی شبد کا روپ بدل سکتے ہیں تو ذرا بھی اصلاح

حقایق و معارف

افقؔ موہانی

ختم یوں جھگڑا جبین و آستاں کا ہوگیا
ذوق سجدہ رفتہ رفتہ خود ہی سجدا ہوگیا

اب تو یہ عالم مری رسوائیوں کا ہوگیا
نام بھی جس نے لیا میرا وہ رسوا ہوگیا

بیخودیٔ شوق میں وارفتہ ایسا ہوگیا
بارہا ہستی پر اپنی ان کا دھوکا ہوگیا

یہ نہیں معلوم منزل ہے کہاں جلوا کہاں
اک زمانہ ان کو بے دیکھے ہی شیدا ہوگیا

پائے ساقی پر گرے کچھ رند پہلے جھوم کر
آخری لغزش میں جو تھا سجدہ پیما ہوگیا

آسماں دیکھا تو پہروں آسماں دیکھا کیا
آپ کا دیوانہ اب دیوانہ ایسا ہوگیا

نشتر اک آشیاں تو نے کیا تھا اے صبا
آشیاں اب گلستاں کا تنکا تنکا ہوگیا

وہ جو اک ذوق تماشا تھا نگاہ شوق میں
جلوۂ حیرت اثر سے وہ بھی جلوا ہوگیا

چار دن کی زندگی تھی ختم آخر ہوگئی
میں نثار انتظار روز فردا ہوگیا

اک زمانہ ہوگیا دیکھے ہوئے حسن ازل
اب تو پھر یکساں مجھے دیکھا نہ دیکھا ہوگیا

بیکسی سارے زمانے کی سمٹ کر آ گئی
مرکز صد یاس و غم مدفن ہمارا ہوگیا

دیکھتی کس طرح اس کو طور پر چشم کلیم
اپنے ہی جلووں میں جب گم جلوہ آرا ہوگیا

کس کا جلوہ دید کیسی۔ جلوہ گاہ ناز کیا
مل گیا دریا میں جو قطرہ وہ دریا ہوگیا

آرزوئے سجدہ تھی نقش کف پا پر کبھی
اب تو سجدہ آپ ہی نقش کف پا ہوگیا

اہل ساحل رہ گئے افقؔ کلیجا تھام کر
غرق اپنا جب لب ساحل سفینا ہوگیا

خاتونِ مشرق مغرب پرست شوہر سے

صفی احمد

مرے سرتاج کیوں اندوہگیں معلوم ہوتے ہو
کہاں کرتے ہو پہلی سی وہ میری ناز برداری
کہاں لاتے ہو اب سامان زیبائش مری خاطر
کہاں بننے سنورنے کی مجھے تاکید ہوتی ہے
کہاں اب دورہی سے مسکراتے پاس آتے ہو
تنا و مجھ سے کیوں آنکھیں نہیں اب چار کرتے ہو
تمہیں آرام دینے کو میں کب حاضر نہیں رہتی
تمہاری خدمتیں کرنی عبادت سے نہ کم جانا
دل اپنا گرچہ اندر سے بہت مغموم پاتی ہوں
امیدوں حسرتوں کو خاک میں میں ملا ڈالا
تمہاری دید سے میں جس گھڑی محروم رہتی ہوں
میں ہر آفت سہوں گی جو زمانا مجھ پہ ڈھائے گا
مرے مالک سنو اگر اس لیے تم مجھ سے ہو نالاں
نئی تہذیب کو کیوں لعنت ملامت کہتی ہوں
ضرر اپنا سمجھتی ہوں میں کیوں روشن خیالی میں
میں کیوں حصا نہیں لیتی کلب میں اور کھیلوں میں
فرنگی تتلیوں کی طرح عشوا گر نہیں بنتی
تپان مغربی سی کافری مجھکو نہیں آتی
نگاہوں کی شرافت شوخ چوری میں نہیں کرتی
تمہاری مغربیت سے مجھے الجھن سی ہوتی ہے
اگر تم میری ذہنیت بدل دینے کے خواہاں ہو
اگر مشرق کے خال و خط مٹا دینے کو کہتے ہو
اگر غم جنگ کرنا چاہتے ہو میری فطرت سے
تو سن لو یہ جواب صاف اے جان جہاں اس کا
میں عصمت ریزا پیٹو ڈیٹ بیوی ہو نہیں سکتی

نہ جانے کیوں وہ پہلے سے نہیں معلوم ہوتے ہو
وہ ہلکی سی ہنسی ہونٹوں تلک بھی میں نہیں پاتی
مرے سر کی قسم بولو یہ کیسا کھیل کھیلا ہے
تمہارا یہ سراپا ہے کہ بیوا کی جوانی ہے
کہاں کہتے ہوا نے منھ سے اب جان جہاں مجھکو
کہاں ہر ماہ اب آتی ہے میرے واسطے ساری
مکاں کی اب کہاں ہوتی ہے آرایش مری خاطر
نئے تیور سے الفت کی کہاں تجدید ہوتی ہے
خمار شوق سے بے کیف ہیں انگڑائیاں میری
مری مشتاق رالوں کو کہاں رنگیں بناتے ہو
خدارا کیوں یہ میری زندگی دشوار کرتے ہو
طلب جس جا کیا تم نے نہیں آمادا نہیں رہتی
تمہاری شادمانی کو خوشی اور غم کو غم جانا
مگر پھر بھی تمہارے واسطے میں مسکراتی ہوں
تمہارے واسطے میکہ کو بھی دل سے بھلا ڈالا
کلیجا منھ کو آتا ہے بہت مغموم رہتی ہوں
مگر میری محبت میں نہ کوئی فرق آئے گا
کہ میں کیوں مغربیت کو سمجھتی ہوں بلا سے جاں
میں کیوں پردے کی حامی ہوں میں کیوں پردے میں رہتی ہوں
لہو عصمت کا کیوں ہوں دیکھتی غازہ کی لالی میں
مرا جی کیوں نہیں لگتا ہے شیطانی جھمیلوں میں
وقار ایشیا کے واسطے تھوکر نہیں سہتی
وہ شوخی وہ ادا وہ دلبری مجھکو نہیں آتی
گلے میں ڈال کر باہیں ہوا خوری نہیں کرتی
یہ فیشن کی پری دل میں مرے نشتر چبھوتی ہے
اگر تم مشرقیت سے میری حد درجہ نالاں ہو
اگر مغرب کے در پر سر جھکا دینے کو کہتے ہو
اگر واقف نہ ہو تم مجھ بھی نفسیات عورت سے
برا مانو بھلا مانو نہیں ہے اختیار اس کا
شرافت کی متاع بے بہا کو کھو نہیں سکتی

(بہاری)

بس ہوں خاتون ہندی مشرقیت کو چھوڑوں گی
مبارک ہیں یہ زنجیریں انہیں ہرگز نہ توڑوں گی

محسوسات

آہ وہ دل کی خلش غضب ہیں جو الٰہی نہ جائے
ہائے وہ میرے جوانی ہے بھی تنہائی نہ جائے

اصطلاح حسن میں اس کا محبت نام ہے
وہ خلش جو خود بخود محسوس ہو پائی نہ جائے

اے خدائے عشق اس عالم میں کوئی کیا کرے
جب طبیعت تازہ دم ہو دل بے بھی بہلائی نہ جائے

ان کے آنے تک کہاں دل کے خلائے ہائے ہائے
وہ جو آجائیں تو پھر آغوش پھیلائی نہ جائے

اے خیال یار تیری دل دہی کا شکریہ
ہم کو خاطر اس قدر تکلیف فرمائی نہ جائے

جرم انسانیت ہا ہا ایسا ہو سکتا نہیں!
نشہ کی جب تک محبت بن کے پرچھائی نہ جائے

ماہر القادری

غزلیات

تمنا ہے نیا پیدا کروں میں اک جہاں پھر سے
نظر آئیں نہ مجکو یہ زمین و آسماں پھر سے
خشی میں چاک داماں ہو گئے تھے سارے دیوانے
یہ سن کر آنے والی ہے بہار گلستاں پھر سے
جو سن کر بھی نہ سنتا ہو کوئی بتلائے پھر مجکو
سناؤں کس طرح میں اس کو دل کی داستاں پھر سے
نہ اب صیاد کا ڈر ہے نہ خوف باغباں مجکو
بناؤں گا میں شاخ گل پہ اپنا آشیاں پھر سے
نظر آئے گا جلوا یار کا چشم حقیقت سے
جناب شیخ دیکھیں تو کسی کا آستاں پھر سے
بجھا سکتا نہیں ہے تو زمانا حشر تک جامی
ہوا ہے اس طرح روشن چراغ آشیاں پھر سے

حکیم جامی جامعی الوارثی (جگدیشپوری)

خدارا اے اجل لے چل جہاں وہ ہیں وہاں پھر سے
کہ حاصل مجکو ہو جائے حیات جاوداں پھر سے
نشیمن جب بناتا ہوں چمن والے مٹاتے ہیں
بنائے اس چمن میں کیا کوئی آب آشیاں پھر سے
لبوں پر مہر خاموشی لگا دی حسن جاناں نے
سناؤں کس طرح اب قصہ درد نہاں پھر سے
خزاں ہوتے ہوئے بھی وہ گلستاں ہیں جو آجائیں
ابھی گلشن میں آجائے بہار دلستاں پھر سے
عقیدت شرط ہے جا کر زمین کوئے جاناں میں
جناب شیخ دیکھیں تو کسی کا آستاں پھر سے
کلیم وارثی کو بھی دکھا دو اپنا تم جلوا
کہ وہ بھی دیکھ لے برق تجلا کا سماں پھر سے

موسیٰ کلیم وارثی (جگدیشپوری)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

(ریڈیائی تقریر)

مولانا ابوالکلام آزاد
وزیر تعلیم حکومت ہندستان

تقریروں کے جس سلسلے کو میں آج شروع کر رہا ہوں ان کے لیے یہ مضمون رکھا گیا ہے۔

"ہندستان کی قومی تعلیم کا نقشہ آیندہ کیا ہونا چاہیے" یہ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تقریروں کے لیے زیادہ وقت نہیں نکالا جا سکتا۔ اس لیے اس تھوڑے سے وقت کے اندر جو میرے لیے نکالا گیا ہے میں کوشش کروں گا کہ اس مضمون کے ایک اہم پہلو پر اپنے خیالات ظاہر کر دوں۔

ملک کی آزادی کے بعد جن مسئلوں پر ہمیں خاص طور پر سوچ و بچار کرنا پڑا ہے ان میں ایک بڑا مسئلہ قومی تعلیم اور اس کے نظام کا ہے۔ میں نے نظام کا لفظ اس معنی میں بولا ہے جس معنی میں انگریزی کا لفظ "سسٹم" بولا جاتا ہے۔ آج ہر طرف سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ ملک کا تعلیمی نظام ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہماری حالتوں اور ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا سدھارنا ہونا چاہیے لیکن اگر پوچھا جائے کہ اس تعلیمی نظام کی اصلی خرابی کیا ہے؟ اور اگر اس کی درستگی کی جائے تو کن باتوں میں کی جائے؟ تو میں خیال کرتا ہوں کہ بہت کم آدمی ایسے ہوں گے جو اس کا جواب دے سکیں گے لوگوں کے سامنے یہ بات تو آ گئی ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام میں کچھ خرابی ہے لیکن "یہ کچھ خرابی" ہے کیا؟ اور اس کا علاج کیا ہے اس پر بہت کم آدمیوں کو غور کرنے کا موقع ملا ہے۔

ہمارے تعلیمی نظام کی ایک کھلی خرابی جو آج ہر شخص کو دکھائی دے رہی ہے یہ ہے کہ عام آدمیوں کو ان کی حالت اور ضرورت کے مطابق تعلیم نہیں ملتی اور خاص خاص آدمیوں کو یونیورسٹیوں کی جو عالی تعلیم مل رہی ہے وہ انہیں کام پر نہیں لگا سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر برس ہزاروں آدمی یونیورسٹیوں سے ڈگری لے کر نکلتے ہیں۔ لیکن ان کی بڑی تعداد اپنے لیے کوئی کام نہیں پاتی۔ اور بے کاری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں آج کل تین سے لے کر ساڑھے تین لاکھ تک وہ دیار تھی تعلیم پا رہے ہیں۔ ایک ایسے ملک کے لیے جس میں ۳۵ کروڑ آدمی بستے ہیں یہ کوئی بڑی تعداد نہیں ہے۔ تاہم ہمارے تعلیمی نظام میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ اتنی تعداد بھی ملک میں کھپ نہیں سکتی۔ اور اس کا بڑا حصہ بیکاری کی زندگی بسر کر رہا ہے

تعلیم کا سب سے بڑا مقصد جو ابتدا سے لوگوں کے سامنے آیا ہے سرکاری نوکری ہے جو آدمی بھی یونیورسٹی کے اندر قدم رکھتا ہے اسی مقصد کے لیے رکھتا ہے لیکن سرکاری نوکری سب کو نہیں مل سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم نے ایک عجیب طرح کا روپ پیدا کر لیا ہے یہ تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو سماج کا ایک کارآمد فرد بنائے لیکن ہماری تعلیم لوگوں کو بے مصرف آدمی بنا رہی ہے۔ وہ اگر تعلیم نہ پاتے تو محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لیتے اب وہ اس کام کے بھی نہ رہے۔

میں آج اس معاملے کے اسی پہلو کی نسبت اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتا ہوں

تعلیم کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جو ملک کے ہر باشندے کو ملنی چاہیے۔ اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ سب کے لیے اس کا انتظام کرے۔ دوسری قسم وہ ہے جو ہر آدمی حاصل نہیں کر سکتا اور ہر آدمی کو حاصل کرنا بھی نہیں چاہیے وہ صرف ایک محدود تعداد ہی حاصل کر سکتی ہے پہلی قسم کی تعلیم کے لیے اس طرح کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ سماج کو اپنے

کاموں کے لیے اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہ تعلیم اس لیے نہیں دی جاتی کہ سماج میں اس کی کوئی خاص طرح کی مانگ ہے بلکہ اس لیے کہ سماج کے ہر فرد کا یہ پیدائشی حق ہے اس تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کا ہر باشندہ اپنی دماغی قوتوں کو ٹھیک طریقے پر ابھار سکے اور ایک اچھی زندگی بسر کر سکے۔ اس لیے یہ تعلیم سب کو ملنی چاہیے۔ اس قسم کی تعلیم کس درجے کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اسے اس درجے کی تعلیم ہونا چاہیے جسے ہم "سکنڈری" درجے کے نام سے پکارتے ہیں ہم اس کا انتظام سب کے لیے فوراً نہیں کر سکتے۔ ہم ابھی تک ابتدائی تعلیم کو بھی عام اور جبری نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمارا رخ اسی طرف رہے۔ ہمیں قومی تعلیم کا جو نیا نقشا بنانا چاہیے وہ یہ بات سامنے رکھ کر بنانا چاہیے کہ سکنڈری تعلیم ملک کے ہر باشندے کے لیے ہوگی۔

سکنڈری تعلیم کے تین درجے ہیں۔ ابتدائی، درمیانی اور آخری۔ ابتدائی اور درمیانی درجہ نہایت اہم ہے کیونکہ قومی تعلیم کی پوری عمارت کی بنیادی اینٹیں ان ہی درجوں کے اندر رکھی جاتی ہیں۔ یہ بنیاد اگر غلط ہوئی تو پوری عمارت غلط ہوگی۔ ہم نے ان درجوں کے لیے "بنیادی تعلیم یعنی "بیسک ایجوکیشن" کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ یہ ڈھنگ ہماری قومی تعلیم کے لیے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری قومی تعلیم کی درستگی اس بات پر موقوف ہے کہ بیسک تعلیم کا نقشا جس طرح کا بنایا گیا ہے اس کی اہمیت پوری طرح سمجھی جائے۔ اور اسے ٹھیک عمل میں لایا جائے۔

تعلیم کی دوسری قسم وہ ہے جسے عالا تعلیم یا یونیورسٹی ایجوکیشن کہتے ہیں۔ یہ تعلیم ہر شخص کے لیے نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف اتنے ہی آدمیوں کو ملنی چاہیے جتنوں کی سماج کو ضرورت ہو جس طرح بازار کے ہر مال کے لیے یہ بات دیکھنی پڑتی ہے کہ "مانگ" اور "تیاری" میں یعنی ڈمانڈ اور سپلائی میں مناسبت رہے اسی طرح یہاں بھی ڈمانڈ اور سپلائی میں مناسبت ہونی چاہیے جس درجے اور جس طرح کا ڈمانڈ ہو اسی کے مطابق سپلائی ہونی چاہیے۔ اگر سپلائی ڈمانڈ سے کم ہوئی تو ترقی رک جائے گی۔ اگر زیادہ ہوئی تو بیکاری پھیلے گی۔ ہمارے آج کل کے تعلیمی نظام کی ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں اس بات کی کوئی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ سرکاری نوکریوں کے لیے یونیورسٹیوں کی ڈگری کی شرط رکھی گئی ہے اس لیے ہر آدمی ڈگری کے پیچھے دوڑتا ہے لیکن جب ڈگری اسے مل جاتی ہے اور نوکری کی ڈھونڈ میں نکلتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کے پیچھے اس نے اپنی زندگی اور روپیا لگا دیا تھا اس کی بازار میں کوئی مانگ نہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس خرابی کی اصلاح ہو تو ہمیں تعلیم کا نظام اس طرح کا بنانا چاہیے کہ تعلیم پانے والوں کی بڑی تعداد سکنڈری درجے تک کی تعلیم پا کر مختلف پیشوں دست کاریوں انڈسٹریوں اور ہنروں میں لگ جائے اور ایک چھوٹی تعداد اوقات کی حالت اور مانگ کے مطابق یونیورسٹی میں رہ جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کو یونیورسٹیوں میں داخل ہونے سے جبراً روک نہیں سکتے۔ لیکن ہم ایسی حالت پیدا کر سکتے ہیں جس کے بعد چند سمجھ دار لوگوں کا رخ بدل جائے۔ اور یہ جو آج کل ہر آدمی بے سمجھے بوجھے یونیورسٹی کی ڈگری کے پیچھے دوڑ رہا ہے یہ حالت باقی نہ رہے۔ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ مجھے صرف اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

اس سلسلے میں ایک دوسرا سوال بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ ہر طرح کی سرکاری نوکریوں کے لیے جس طرح اور جس درجہ یونیورسٹی کی ڈگری پر زور دیا گیا ہے کیا وہ ٹھیک ہے؟ موجودہ حالت یہ ہے کہ سرکاری نوکریوں کے لیے بنیادی شرط ڈگری کی رکھی گئی ہے۔ اگر ایک امیدوار ڈگری نہ رکھتا ہے تو وہ خواہ کتنا ہی قابل ہو۔ اسے سروس کمیشن بات چیت کرنے کے لیے بھی نہیں بلائے گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کی ساری اہمیت لوگوں کے دھیان میں اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ

بغیر اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یونیورسٹی کی ڈگری سرکاری نوکری کا پاسپورٹ بن گئی۔ تعلیم پانے والوں کی نظر اس بات پر نہیں رہتی کہ وہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ قابلیت پیدا کریں۔ صرف اس بات پر رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح نوکری کا یہ پاسپورٹ انہیں مل جائے

ہماری یونیورسٹی پر بھی اس صورت حال کا گہرا اثر پڑا۔ انہوں نے اس کا ارادا کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر حالت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ امتحانوں میں ڈھیلے پن نے جڑ پکڑ لی ہے عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جتنے زیادہ اودیار تھی یونیورسٹی میں داخل کیے جا سکتے ہیں داخل کر لیے جائیں۔ اور جتنے زیادہ آدمیوں کو ڈگری مل سکتی ہے ملنے دی جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کا درجہ روز بروز گرنے لگا۔ اور اب جس قدر گر چکا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہیں ڈگری پائے ہوئے امیدواروں سے ملنے اور ان کی قابلیت کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔

دوسرے ملکوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری نوکریوں کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے مثلاً انگلینڈ کو لیجیے وہاں ان نوکریوں کے لیے تو ڈگریوں کی شرط رکھی گئی ہے جو پروفیشنل قسم کی ہیں جیسے ڈاکٹر، انجینیر اور پروفیسر کی جگہیں لیکن عام نوکریوں کے لیے ڈگری پر زور نہیں دیا گیا ہے صرف عمر اور کام کی قابلیت کی شرط رکھی گئی ہے۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کیوں نہ ہم بھی ایسا ہی طریقہ اختیار کر لیں؟ کیوں یونیورسٹی کی ڈگری کو سرکاری نوکری کا پاسپورٹ بنایا جائے؟ شرط لیاقت کی ہونی چاہیے نہ کہ ڈگری کی۔ مثلاً جن نوکریوں کے لیے آج کل یہ بنیادی شرط رکھی گئی ہے کہ امیدوار بی اے ہو اگر اس کی جگہ یوں کر دیا جائے کہ امیدوار کی عام علمی لیاقت ایسی ہونی چاہیے جو ایک گریجویٹ کی ہوتی ہے تو جہاں تک قابلیت کا تعلق ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوگی لیکن جو غلط روڈ ڈگری پر پڑ گیا ہے وہ باقی نہیں رہے گا۔ تمام تر زور قابلیت پر آ جائے گا اور صرف اتنی سی بات سے پڑھنے والوں کی ذہنیت ساتھ ان پر جلد سے جلد غور کرنا چاہیے۔ (۵) اس بات پر بھی ہمیں غور کرنا چاہیے کہ سرکاری نوکریوں کے لیے عام طور پر جو یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی شرط پر بہت گہرا اثر پڑے گا تعلیم کے بارے میں ان کا پورا نقطہ خیال بدل جائے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں تک پروفیشنل کاموں کا تعلق ہے یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط رکھے بغیر کام چل نہیں سکتا۔ ہمیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی چاہیے جس تبدیلی پر میں غور کر رہا ہوں اس کا تعلق عام قسم کی نوکریوں سے ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تبدیلی کی وجہ سے سروس کمیشنوں کا کام بہت بڑھ جائے گا۔ انہیں تمام امیدواروں کا پورا امتحان لینا پڑے گا۔ بہت ممکن ہے اس صورت میں کمیشنوں کی تعداد بڑھا دینی پڑے اور ان کا اسٹاف بھی بہت زیادہ بڑھ جائے لیکن اگر یہ بات ضروری ہے تو ہمیں اس خرچ کا انتظام کرنا چاہیے

تعلیم کے نظام کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے اب مختصر لفظوں میں اس کا خلاصہ سن لیجیے۔

(۱) ہمیں اپنا تعلیمی نظام نئے سرے سے ڈھالنا چاہیے۔ نیا نظام ایسا ہو جو پڑھنے والوں کی بڑی تعداد کو سکنڈری درجے تک کی تعلیم دے کر مختلف پیشوں، انڈسٹریوں، دستکاریوں اور ہنروں میں لگا سکے۔ اور ایک چھوٹی تعداد کو عالا تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں میں بھیجے۔ یہ چھوٹی تعداد ایسی ہی ہونی چاہیے جو وقت کی مانگ کا ساتھ دے سکے

(۲) اس سلسلے میں بڑی تبدیلی سکنڈری درجے کی تعلیم میں ہونی چاہیے ہماری موجودا سکنڈری تعلیم کا نقشا اس خیال سے بنایا گیا تھا کہ یہ یونیورسٹی میں جانے والوں کے لیے ایک ریلے کا کام دے گا مگر اب ہمیں ایسا نقشا بنانا چاہیے جو صرف "ذریعہ" ہی نہ ہو بلکہ بہتوں کے لیے تعلیم کا مقصد یعنی حتمی حد بھی ہو

(۳) ہم نے ابتدائی اور درمیانی درجے کے لیے جو بیسک تعلیم کا ڈھنگ اختیار کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم محض کتابی کے ذریعے نہ ہو بلکہ اس کا ایک بڑا حصا کام کاج کے ذریعہ ہو۔ یہ بات ہماری تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہماری قومی تعلیم کا ایک بنیادی اصول ہے سکنڈری درجے میں یہ ڈھنگ قایم رہنا چاہیے۔

(۴) جب سکنڈری تعلیم کو ہم یہ روپ دینا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کا نقشا ایک ہی طرح کا بنا ہوا اور بندھا ہوا نہ ہو۔ اس میں ایسی لچک ہونی چاہیے کہ وہ مختلف لوگوں کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کا ساتھ دے سکے سکنڈری کمیشن کی آبجکٹیو کمیشن نے اس سلسلے میں نہایت اہم سفارشیں کی ہیں ہمیں امید ہے کہ

مسٹر بور

ایاز عصمی

گلے میں جھولتی ہوئی میلی چادر، بوسکی کی بوسیدہ شیروانی جیسے برسوں سے غریب نے دھوبی خانے کا منہ تک نہ دیکھا ہو، پریشان بال، بڑی ہوئی داڑھی، ناک مانو پیاز کی آدمی بھانک قدنستعلیق حبشہ دیکھو تو جان پڑے ابھی ابھی کسی سینی ٹوریم سے بھاگ چلے آرہے ہیں۔ اور طرایہ کہ مذاق کو دیکھو کہ اس کا دعوا ہونے کا دعوا۔ منشی دھرم چند کے شاگرد ہونے پر فخر کا اظہار، فخار الحق مزاج کے لنگوٹیا یار ہونے کے چرچے اور جو کہو کہ بھائی اپنے منہ میاں مٹھو ہونے سے کوئی بات نہیں بنتی تو فوراً خطاب حاضر "جاہل بچے، گنوار، صاحبزادے" اور جانے کیا کیا۔

اب بتائیے ایسے سر پھرے کو "مسٹر بور" نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

باتیں کرو کچ۔ جواب دیں گے کچ۔ ہر تین منٹ کے بعد یہ ذہن نشین کراتے جائیں گے کہ انہیں وقت کا سب سے بڑا ادیب اور شاعر نہ ماننے والا کافر ہے۔ لایق سرزنش ہے یکے گردن زدنی ہے۔

کرو تنقید کی باتیں۔ سنانے لگیں گے اپنی تازہ غزل، اور (خدانخواستہ) کبھی ترنگ میں آکر یا کلیجے پر پتھر رکھ کر غزل سنانے کی فرمایش کر دو تو فوراً اچھل کر کہیں گے "میاں! کوئی گھٹیا شاعر سمجھ لیا ہے کیا؟ جہاں تہاں غزل سنانے کی فرمایش کی گھسو سے پسو سے کرتے تو خیر ایک حد تک ٹھیک تھی یہاں پیدایشی شاعر ہیں۔ پیدایشی!" وہ یہ سب کچھ اس طرح اکڑ کر کہیں گے کہ آپ گی فرمایش اپنا سا منہ پیٹ لے گی۔ ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا۔ اور جان کو چھٹ گئے۔ پس جب دیکھو دھرے ہوئے ہیں۔ بور کرنے پہ آگئے تو اتنا بور کریں گے کہ خدکشی کرنے کو جی چاہنے لگے۔ کئی بار سمجھایا کہ بھئی دنیا میں ایک تمہاری ہی نہیں ہر کسی کو آنا پیدا ہے اور ہر تین منٹ کے بعد آپ کا یہ لغو راگ مجھے وقت کا سب سے بڑا شاعر اور ادیب تسلیم کرلو! ایک قطعی ناجایز اور غلط مطالبہ ہے۔ تشہیر ہی مقصود ہے تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے تو کہیں بہتر ہے کہ ریڈیو سیلون (CEYLON) سے کنٹراکٹ کرلو۔ اشتہار دینے کے لیے اس سے بڑا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اشتہار کچ بس قسم کا ہو "ہندو پاک" کے بہترین ادیب و شاعر کارٹون چناچوروی کا کلام پڑھیے اور سر دھنیے"۔

"اگر آپ نے کارٹون چناچوروی کا کلام سن کر اپنا سر نہیں پھوڑ لیا تو آپ جاہل ہیں"۔

"علمیت کی سند لینے کا آسان طریقہ ــــ کارٹون چناچوروی کا کلام بلاغت نظام پڑھیے" ــــ مگر آپ ہیں کہ اس بات پر ہی بضد ہیں کہ بغیر کسی تشہیر کے ہی لوگ انہیں وہ، سب مان لیں جو آپ منوانا چاہتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے کہ اس دور میں دو دو تین تین چھٹانک کے بچے تک خدکو کچ سمجھتے ہیں تو کوئی انہیں بغیر اشتہار بازی کے کیسے بڑا شاعر تسلیم کرلے۔ پھر زمانا ٹھہرا اشتہار بازی کا۔ اور فی زمانا تو ہیرے کی انگوٹھی سے لے کر روزانا استعمال ہونے والے نمک تک کو اشتہار بازی کے بغیر لوگ بیچنا اور خریدنا ناپسند کرتے ہیں تو یہ بے چارے کس گنتی میں ہیں۔ کہنے لگے۔

"ایاد صاحب! خلوص کے تو آپ پتلے ہیں" ــــ سمجھ گیا کہ یقیناً انہیں جج سے کوئی خطرناک کام لینا ہے۔ ورنا یہ تعریفاتی حملا نہ کرتے۔

عرض کی "آپ کہتے ہیں تو پھر ہی کہتے ہوں گے"۔ (کسر نفسی یوں بھی ظاہر کی کہ وہ یہی سمجھتے رہیں کہ بیوقوف بنا لیا گیا) پھڑک کر بولے "کیا مصرع کہا ہے واللہ پوری نظم ہے نظم" ــــ عرض

کیا۔ "مولانا مصرع کسی اور کا ہے ۔۔۔۔ موہ مرنے کی چوبیچ کی طرح لٹک گیا۔" اچھا!!" اور موضوع رخ بدلنے کو جلدی سے بولے "کسی کام وام کا کوئی بندوبست کیجیے نا ۔۔۔" اور بندوبست کر دیا گیا۔ پانچویں دن پتا چلا کہ آپ "پابدست دیگرے و دست بدستہ دیگرے" بیک بینی و دو گوش لکال دیے گئے "اللہ خیر کرے"۔ میری زبان سے نکلا اور پوچھ گچھ پر معلوم ہوا۔ "تیکلی" تھے۔

"یعنی" معاملا یقیناً تشریح طلب تھا۔ اور ان کے شاگرد نے تشریح کی۔ پہلے دن کھانے پر گوشت تھا۔ چوچ کر بولے "آپ لوگ بھی گوشت کھاتے ہیں۔ کم سے کم میں گوشت کھانے والوں کی عزت نہیں کر سکتا۔" دوسرے دن دسترخان پر سبزی آئی اعتراض فرمایا "کل جن ہاتھوں نے سالن پکایا تھا یہ سبزی ان ہاتھوں کی ہوتی نہیں جان پڑتی۔" تیسرے اور چوتھے دن بھی بات بدلے جانے کا احساس تیزی سے انہیں ہوتا رہا۔ اور پانچویں دن انہیں "رہائش بدلنے کو کہہ دیا گیا"۔ یہ تھی ان کی "خلد" سے نکلنے کی داستان۔ پیراڈائز گین (PARADISE GAIN) کی تھی تو پھولے نہ سماتے تھے۔ بس اکڑے اکڑے چلتے تھے۔ گویا تو آدم کے بیٹے۔ شجر ممنوعہ یعنی گھر کی عورتوں کی بات کی اور "آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے"

چھٹے دن مجھ سے لڑنے لگے "قبلہ میں وہاں بھلا کیسے رہ سکتا تھا۔ وہاں تو لوگ گوشت کھاتے تھے اور ۔۔۔۔۔۔" "اور بات بھی تقریباً روز انا ہی بدل جاتے تھے" میں نے ان کا جملہ پورا کر دیا۔ موہ سمجھی کولن دو (SEMI COLON) کی طرح لٹکا کر بولے "جی ۔۔ جی ۔۔ بات یہ ہے کہ میں ذرا حساس واقع ہوا ہوں۔ اور ۔۔۔۔۔۔"

"اور سنکی بھی" میں نے پھر ان کا جملہ پورا کر دیا۔

"جی ہاں گڑبڑا گئے "یعنی میں ۔۔۔ یعنی کہ میں ۔۔۔۔!"

"جی یعنی کہ بالکل آپ ۔۔۔ یعنی کہ قطعی آپ ۔۔۔۔!"

"سلام علیکم" انہوں نے سلام لڑکایا اور بڑھ گئے۔

"وعلیکم سلام" جواب عرض کیا گیا۔ مگر وہ بھی ہوئی سلامتی کے رینج (RANGE) سے باہر نکل چکے تھے مگر دعا ہے۔ سلامت رہیں۔ ورنہ ایسی لونگ "ہستی پھر کہاں لے گی۔

پاگل

سنتوشنا رائن ماتھر

(۱) اس کی نظر ادھا کا انتقال ہو گیا۔ وہ اداس تھا لیکن روتا نہ تھا۔ خاموش تھا۔ ساکت بت کے مانند۔ رادھا سے اسے بے انتہا محبت تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ہنسی خوشی بھی جاتے رہی۔ کسی سے بات چیت اور نہ کسی سے ہنسی مذاق۔ یہاں تک کہ وہ کبھی مسکراتا بھی نظر نہ آتا تھا۔ اکثر سرد آہیں بھرتا اور "رادھا رادھا" کہہ کر چلا اٹھتا تھا۔ لوگ اسے دیوانا کہتے تھے۔ ایک دن کسی نے اسے مجنوں کہہ کر پکارا۔ وہ مسکرا دیا۔

اس کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی صحت بگڑ رہی تھی۔ سوز دل سوہان روح بن رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا علاج صرف چند قطرے آنسوؤں کے نکل آنے کو ٹھہرایا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔ اف صرف دو آنسو! فی فی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا۔ ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوند کو ترستی تھی۔ ہیلن اس کے پاس گیا اس کے آگے سر خم نیاز ہو کر دست بدعا ہوا "یا خدا تجھی تو فیق مجھ میں بھی عطا کر" اس نے مجھے اپنا سمجھا روم خیال سمجھ کر گلے لگا لیا اور زار و قطار رونے لگا۔ اس کے بوڑھے ماں باپ نے مجھے اسارے سے بلا کر گلے لگا لیا۔ بلائیں لیں۔ دعائیں دیں۔ اور ہلکتے ہوئے کہنے لگے "بیٹا تم دھیرج ہو اس کے آنسو نکل آئے۔ اب اس کا غم ہلکا ہو جائے گا" لیکن اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لوگ اسے پاگل کہتے ہیں۔

(۲) چند دن بعد یکایک کسی صدمے سے اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی اس کے آخری الفاظ تھے "رادھا۔ میں آرہا ہوں ۔۔۔ رادھا ۔۔۔ رادھا" اس کے انتقال پر میں نے تاسف تو کیا لیکن تعجب نہیں۔ میرے کانوں میں اس کے ماں باپ کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس کے آنسو نکل آئے اب اس کا غم ہلکا ہو جائے گا۔ اور اس کا وہ قہقہہ بھی۔ کیا وہ واقعی پاگل تھا۔؟

دلی سے کشمیر تک

اندرا کماری

جنت نظیر کشمیر کی حسین وادی کی سیر کرنے کی خواہش بہت عرصے سے میرے دل میں چٹکیاں لیتی تھی اور میں اس خطے کے قدرتی مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ آخر کار اس برس ہم نے کشمیر کی یاترا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

ہم نے ہوائی جہاز یا ریل کے ذریعے کشمیر جانے کی بجائے دلی سے سری نگر تک موٹر کار میں ہی سفر کرنے کا فیصلا کیا۔ ضروری پرمٹ اور مختصر سامان لے کر ہم ۳۰ جون کی صبح کو یہاں سے چل پڑے۔ پہلے دن ہم نے ۲۲۰ میل سفر کر کے رات جالندھر میں قیام کیا۔ جہاں سے دوسرے روز براستہ پکریاں سیدے پٹھان کوٹ ہوتے ہوئے رات کو جموں جا پہنچے رستے میں ہر مقام پر کھانے پینے اور رہنے کا تسلی بخش انتظام موجود تھا۔ جموں شہر ایک پہاڑی کے دامن میں دریائے توی کے کنارے واقع ہے۔ اور سنہری کلس والے مندروں کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔

جموں سے کد تک چڑھائی کے ساتھ ساتھ آس پاس کا نظارہ زیادہ حسین اور دل کش ہوتا جاتا ہے۔ قدرتی آبشاریں تیز رو ندیاں۔ ڈھلوانوں پر دھان کے سرسبز کھیتوں میں بکھری ہوئی اکی دکی جھونپڑیاں عجب سماں پیدا کر رہی تھیں۔

جب ہم کد پہنچے تو رات بڑ چکی تھی۔ اور ہمیں وہیں ٹھہرنا پڑا۔ دوسرے روز ہم سویرے اٹھے اور آبشار کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کے بعد ہم بٹوٹ کی جانب روانا ہو گئے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مشہور صحت افزا مقام ہے جس کے گرد و نواح میں چیل اور دیودار کے گھنے جنگل ہیں۔ رستے میں کئی جگہ ہم برلب سڑک چشموں کا ٹھنڈا پانی پینے کے لیے رک جاتے تھے اور اس طرح رام بن اور رام کھیرا نی۔ اشنت ناگ ویرناگ ہوتے ہوئے دربانہال جا پہنچے۔ ہم بادلوں سے اوپر جا چکے تھے۔ برف پوش چوٹیوں سے گھرے ہوئے مناظر آبشاریں اور پہاڑی ندیاں دیکھ کر ہم حیرت زدا ہو رہے تھے۔ پیر پنچال کی سرنگ میں سے گذر کر آگے بڑے یہیں بتایا گیا کہ اس جگہ نو مہینے سے ہی برف پڑنی شروع ہو جاتی ہے اور یہ رستا جنوری تک بند رہتا ہے اب حکومت بانہال گاؤں سے دریائے جہلم کے منبع و بری ناگ تک سرنگ بنا کر نے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ رستا سارا سال کھلا رہے۔ دربانہال سے آگے وادی کشمیر میں اترائی شروع ہو جاتی ہے یہاں سے مناظر کی خوبصورتی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ٹیلوں سے لدے ہوئے درخت اور سرسبز کھیت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسن خود مجسم ہو کر اس وادی میں اتر آیا ہے۔ ہم گرد و پیش کے نظارے سے محظوظ ہوتے ہوئے سری نگر پہنچنے تک ہم نے نیچا کیے دریا پار کیے تھے۔ ہم جھیل ڈل کے کنارے ایک ہوٹل میں ٹھہرے رات کے وقت بجلی کی روشنی میں جھیل اور جگ مگ کرتی ہوئی شنکرا چاریا پہاڑی کا نظارا جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ جھیل میں بے شمار کنول کے پھول کھلے رہتے ہیں اس کا پانی اتنا شفاف ہے کہ ارد گرد کی تمام عمارتوں اور مناظر کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ دن بھر محنت مزدوری کرنے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹنے والے کشتیوں کے میٹھے گیت اس دل کشی کو اور بھی دوبالا کر دیتے ہیں۔ جھیل میں تیرتے ہوئے کھیت تو یہاں کی اضافی خصوصیت ہے بعض دفعا کھیت چوری بھی ہو جاتے ہیں۔ یہاں سبزیاں بہت زیادا گتی ہیں۔ جھیل ڈل کے کناروں پر واقع مغل باغات دنیا بھر میں اپنی خوب صورتی کے لیے مشہور ہیں دور دور سے لوگ چشمہ شاہی برف جیسا سرد پانی پینے اور اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے آتے ہیں۔ شالامار باغ اور نشاط باغ میں بادام۔ اخروٹ۔ خوبانی سیب اور انگور بری بہتات میں دستیاب ہوتے ہیں۔ سری نگر سے پہلگام ہو کر ہم لوگ امرناتھ یاترا کی یاترا کر لے گئے۔ رستا بہت دشوار گذار ہے۔ چندن واڑی شیشناگ اور پنچ ترنی ہو کر ہم پورن ماشی کے دن امرناتھ پہنچے اور خیر خیریت سے درشن کر کے واپس سری نگر لوٹ آئے۔ کشمیر کے دیگر قابل دید مقامات سونا مرگ گلمرگ اور پہلگام ہیں۔

میں سلام کرتا ہوں

اجمل رشید (عادل آبادی)

اس کہانی کے کردار اور واقعات تخیلی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ جو ایک مدت تک میری نظروں کے سامنے فلمی تصویروں کی طرح ناچ کر پلک جھپکتے میں کہیں غایب ہوگئے۔ مگر ایک گہرا تاثر آج بھی دل و دماغ پر نشتر چبوتا رہتا ہے۔ اجمل رشید

نہ جانے کیوں آج تم بہت یاد آرہی ہو ــــ جیسے کوئی سینے میں بلور رہا ہو۔ تصور کے پردوں پر تمہارے مرتسم مگر مبہم نقوش آج پھر اجاگر ہو رہے ہیں۔ کیوں؟ جانتی ہو ــــ آج میں پھر اسی جگہ کھڑا ہوں جہاں تم اور میں اکثر بات چیت کیا کرتے تھے ــــ ان دنوں کی طرح آج پھر بہار آگئی ہے۔ اسی طرح بلکل اسی طرح آج پھر تالاب کے بند کو پر بہار دیکھ رہا ہوں۔ دھانوں کے کھیت اسی طرح جھوم رہے ہیں۔ آنبوس اور جہوے کے درختوں میں ہوا اسی طرح سرسرا رہی ہے لہریز تالاب کی الھڑ موجیں اسی طرح اٹھلا اٹھلا کر امڈتی چلی آرہی ہیں۔ جیسے تمہارے قدم ڈگمگایا کرتے تھے۔ سفید کنول انہیں دنوں کی طرح آج پھر مسکرا رہے ہیں۔ کتنی پیاری ہے کنول کے پھولوں کی مسکراہٹ، بلکل تمہاری مسکراہٹ کی طرح۔ اور مجھے معلوم ہو رہا ہے جیسے ہر کنول کے پھول میں بیٹھی ہوئی تم مجھ سے کچھ پوچھ رہی ہو نہ جانے کیا ــــ؟ تمہاری تصویر میرے ہاتوں میں ہے اور میں تمہیں دیکھنے میں محو ہوں، تمہارے یہ ساکت ہات یہ مچلتی ہوئی ٹیڑھی لٹیں یہ سیندھیائی ہونٹ جن پر ایک ہلکی سی منجمد مسکراہٹ ہے اور یہ شوخ اٹھی ہوئی نگاہیں نہ جانے کیوں آج تمہیں پھر دیکھنے کے لیے مجبور کر رہی ہیں۔ کیوں جانتی ہو ــــ ایک دن میری نگاہوں کا تمہاری نگاہوں سے تصادم ہوا تھا یہ ساکت ہات کسی دن میرے ہاتوں میں تھے اور تم ایک وفادار محبوبا کی طرح اپنا سب کچھ "نثار" کیے حق محبت ادا کر رہی تھیں۔

ہماری پہلی ملاقات کیسے ہوئی مجھے کچھ یاد نہیں، کچھ بھکی بھکی لجائی نگاہیں تھیں۔ بہکے بہکے ٹوٹتے ہوئے الفاظ تھے اور پھر ہم ایک دوسرے کے دلوں میں اترتے گئے یہاں تک کہ میں اور تم ایک ہوکر رہ گئے ــــ تمہارے ساکت ہونٹ اس وقت پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ کنول کی حسین گلابی پنکھڑیوں کی طرح ــــ ان لبوں میں تشنگی تھی۔ شادابی تھی کچھ رس تھا ایک مدھر کیف تھا ایک حسین دعوت تھی ایک انجان اشارا تھا ــــ تمہاری جھکی ہوئی نگاہیں، کپکپاتے ہوئے ہونٹ گلابیاں اگلتے ہوئے گال مجھے بے حد حسین نظر آرہے تھے اور تم ــــ تم بلکل خامش تھیں۔ ایک مرمر کی ترشی ہوئی مورتی کی طرح جس پر یونانی حسن کی چھاپ ہے کچھ تکمیلی ہے کچھ معصومیت ہے۔ مگر تمہاری شوخی اور شرارت نہ جانے کہاں غایب ہوگئی تھی۔ میں تمہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسی تالاب کے کنارے شام کے جھٹپٹے میں ــــ تم گم سم سی بیٹھی ہوئی نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں اور پھر جب میں نے تمہارا ہات اپنے ہات میں لے لیا تو تم چھوٹی موٹی بنے پسینا پسینا ہوگئیں۔ تمہارے گلنار رگوں پر پسینے کے قطرے دوڑنے لگے تھے ــــ سورج کی ترچھی کرنوں کا انعکاس اس منظر میں اور لطف پیدا کر رہا تھا۔ تالاب کے سفید کنول جیسے قہقہے لگا رہے تھے تمہاری اس خامشی پر ــــ اور تم ایک ہات میں چھوٹا سا کنکال لیے زمین کرید رہی تھیں ــــ میں نے پھر اپنے سوال کا جواب مانگا مگر پھر بھی تم چپ ہی رہیں۔

شاید اس ایک سوال پر ہندستان کی ہر لڑکی چپ ہو جاتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر سنوں و زرقی تالا لگ جاتا ہے کیونکہ یہ تالا ابتدا سے آفرینش ہی سے ہر لڑکی کو ورثے میں ملتا چلا آرہا ہے اور پھر شاید اس تالے کی مضبوطی میں اور بھی استحکام پیدا ہوتا چلا جائے گا ــــ اس لیے کہ تم ایک متوسط طبقے کی لڑکی ہو۔ اور ایک متوسط طبقے کی لڑکی کو اپنی شرافت کا پورا پورا ثبوت دینا پڑتا ہے شاید

اسی لیے تم ٹخنوں کے نیچے تک شلوار پہنے اور اپنے جسم پر ڈھیلا ڈھالا قمیص نما کفن لپیٹے سر پر ڈوپٹا ڈالے چہرے پر شرافت کا میل لگائے جب سے ملنے چلی آتی تھیں مجھے ہنسی آتی ہے تمہاری اس ملاقات پر ـــــ تمہارے اس ڈگمگانے ہوئے قدموں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ جو کسی منافی کیفیت سے نہیں بلکہ اس خوف سے ڈگمگاتے تھے جو جھانڈا پھوٹ جانے پر تمہیں ایک ناقابل برداشت خفت اٹھانی پڑتی تھی۔ اور کوئی تعجب نہیں تمہارے اس طبقے میں تمہارا مستقبل مایوس کن ہو جاتا ـــــ میں تمہاری اس کریہ انگیز مکراہٹ سے اچھی طرح واقف ہوں جو تم محض میری خشنودی کے لیے مسکرایا کرتی تھیں۔ بعض دفعا کسی غیر دلچسپ بات پر بھی تمہارے ہونٹ مسکرا اٹھتے تھے میں تمہارے ان لوٹتے ہوئے الفاظ کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جو تم جھجک جھجک کر ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا کرتی تھیں اس لیے کہ تمہاری زبان سے کوئی دل دکھانے والی بات نہ نکل جائے اور تمہیں یہ خوف رہتا کہ تمہاری کسی بات سے ناراض ہو کر میں تمہیں ٹھکرا نہ دوں ـــــ جب بھی تم مجھ سے بات چیت کرتیں۔ تمہاری آنکھیں چھلک چھلک جاتیں دل کی گہرائیوں سے ایک بال سا پیدا ہو جاتا اور تم اپنے حلق میں کسی چیز کو پھنستا ہوا محسوس کرتیں اور پھر نہ چاہتے ہوئے رکنے پر مجبور ہو جاتیں۔ تمہاری نگاہوں میں اپنی دو بڑی بہنوں کے چہرے تیرتے اور ڈوبنے لگتے

میں تمہاری بڑی بہنوں کے ایمیے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور تمہارے اس درد کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں جو بہنوں کی بدبختی کو دیکھ کر تم رو دیا کرتی تھیں اور تمہیں شدت سے اپنے اپنے مستقبل کا احساس ہونے لگتا ـــــ تمہارے تصورات میں جب بھی کوئی حسین شہزادہ "شہریار" بنے تمہیں اڑا لے جاتا تو اچانک ایک بھیانک دیو ایک زوردار سی چنگھاڑ مار کر تمہارے سامنے کھڑا ہو جاتا اور تمہارے تصوراتی حسین شہزادے کے بازو شل ہو جاتے اور تم ایک ہیبتناک چیخ مار کر بستر سے اٹھ پڑتیں۔ اور پھر ساری رات بستر پر کروٹیں بدلنے میں گذر جاتی۔

تمہاری بڑی بہنیں بھی تو خواب دیکھا کرتی تھیں حسین خواب۔ ان خوابوں میں ایک ارم نما سا حسین باغ ہوتا اور وہ ہونیں پھر بڑے ہی انتظار کے بعد ایک حسین شہزادہ اپنے پورے اشتیاق کے ساتھ انہیں سمیٹ لیتا اور پھر وہ عالم رنگ و بو میں کھو جاتیں کتنی پر کیف اور حسین تھی وہ دنیا جہاں پہنچ کر تمہاری بہنیں زندگی بھر کا دکھ بھلا دیا کرتی تھیں اور پھر خواب اچھی طرح مکمل بھی نہ ہونے پاتا کہ ایک خوفناک دیو سامنے کھڑا ہو جاتا اور پھر یہ خواب روز ہی نظر آنے لگتا۔ روز ہی ارم نما باغ ہوتا اور ایک حسین شہزادے کے بعد ایک دیو بھی آ جاتا ـــــ اور پھر یہ خوفناک دیو آہستہ آہستہ تمہاری بہنوں کی زندگی میں بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ تمہاری بڑی بہن خون تھوکتے ہوئے [illegible] سکراتی سال لیے خواب دیکھ رہی۔ [illegible] دیو آہستہ آہستہ [illegible] میں رینگتا چلا جا رہا ہے۔

آج تمہاری بڑی بہن مایوسی [illegible] ہیں دق ہو گیا ہے ایک ہیبتناک مرض جس کے سننے سے ہی [illegible] کیونکہ تر پھڑپھڑانے لگتے ہیں اور آدمی کانپ کانپ کر رہ جاتا ہے اس لیے کہ دق کا مریض مشکل ہی سے بچتا ہے اور جب تمہاری بڑی بہن خون تھوکتی ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ متوسط طبقے کی شریف لڑکیوں کو یہ طبقہ ضد دق کے جراثیم کھلانے پر مجبور ہو جاتا ہے ـــــ

اپنی بڑی بہنوں کی طرح آج تم بھی خواب دیکھ رہی ہو اور تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی خواب دیکھ رہی ہے۔

یہ خواب تم ہی نہیں بلکہ ہزاروں لڑکیاں آئے دن دیکھتی رہتی ہیں۔ اپنے سر پر ڈوپٹا ڈالے دیکھتی ہیں چہرے پر شرافت کی چھاپ لگائے دیکھتی ہیں اور روز ہی تمہارے بھائی اور بھائی تمہیں یہ خواب دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کیونکہ تمہاری قسمت کا رستا تمہارے ہاتھ میں نہیں بلکہ تمہارے بھائی اور بھائی کے ہاتھ میں ہے جن کے جسم میں ایک عجیب سی لہر دوڑ رہی ہے متوسط طبقے کی نمائشی لہر ـــــ جو تمہارے مختار کل ہیں اور ان کی یہی تمنا ہے کہ تمہاری زندگی کی ڈور کسی "نمائشی" ہی کے ہاتھ دے کر [illegible]

دی جائے۔

یاد ہے ایک دن تم نے مجھے ایک لمبا آمیز خط لکھا تھا تمہارا مستقبل بڑا ہی بھیانک ہے اور کوئی نصیب نہیں تم صدر کشی پر آمادہ ہو جاؤ اور پھر تم نے مجھے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ "اگر آپ کسی خوف ناک جنگل میں بھی رکھیں گے تو میری زبان پر کسی قسم کا شکوہ دید کی لفظ تک نہ آئے گا۔ پروا نہیں اگر آپ بحر پر دنیا بھر کے ظلم و ستم ڈھائیں مگر میں آپ کے قدموں سکھ کی نیند سونے کے لیے تیار ہوں۔ پروا نہیں اگر میں بھوک سے بلبلا اٹھوں مگر آپ کا قرب میری بھوک مٹا دے گا"

یہ اس طویل خط کے دو ایک جملے ہیں جن کو لکھنے کے لیے تم نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دی تھیں۔ خط کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لیے تم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ آسانی سے میرا قرب مل جائے گا جبکہ تمہارے بھائی اور بھابی سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ تم میری زندگی میں چلی آؤ جبکہ میں ایک مزدور قسم کا نوجوان ہوں جو تمہاری معاشرت میں نیچی نظروں سے دیکھا جاتا ہوں جبکہ میرے پاس ظاہر داری کے حربے نہیں ہیں۔ جھوٹی نمائش کے لیے میرے پاس وہ ٹھمراق نہیں ہے جو تمہاری بھابی اور بھائی کو متاثر کر سکیں۔ میری حقیقت پسندی کو دیکھ کر تمہارے پڑھے لکھے بے شعور بھائی نے مجھے دبے لفظوں میں "آوارا" کہا۔ میری شرافت میں تمہاری بھابی جان کو دنیا بھر کے عیوب نظر آئے۔ اس لیے کہ میری معاشرت میں وہ حس نہیں ہے جو تمہارے بھائی اور بھابی نے جنگ و دولا کے جھوٹے دسترخوان پر عیش کے قصے اڑا اڑا کر پروان چڑھایا ہے ——

ان کے سینے سے وہی سانسیں نکلتی ہیں جہاں ان شاہ نماؤں نے سسکتی ہوئی زندگیوں کو قدموں تلے روند کر چھوڑی تھیں۔ ان کی رگ رگ میں ان کے روئیں روئیں میں کنواری زندگیوں کو ڈس لینے والا فاسد خون سوئیں مار رہا ہے وہ یہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ تم میری زندگی میں چلی آؤ جبکہ میرے پاس ان خصوصیات کا فقدان ہے تمہاری بڑی بہن کا تیسواں کنوارا سال گذر رہا ہے جو

دق کی مریض بنے بڑی شدت سے موت کا انتظار کر رہی ہیں۔ اور تمہاری دوسری بہن اپنی بڑی بہن کو قبر کی راہ دکھلانے کی سعی کر رہی ہیں کیوں جانتی ہو —— تاکہ وہ بھی زندگی سے ہم کنار ہو جائیں جو ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے اور یہ دوسری بہن کی خواہش اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمہاری بڑی بہن کی شادی نہ ہو جائے یا پھر دق ہی اس معاملے کا فیصلہ کر دے —— دوسری بہن بایوس نہیں بلکہ دل کے گوشوں میں ایک انجان سی مسرت لیے اپنی بڑی بہن کی تیمارداری میں مصروف ہے انہیں معلوم ہے کہ ان کی آپا جان اس وقت دق کے تیسرے اسٹیج (STAGE) پر زندگی اور موت کے درمیان جھول رہی ہیں۔ ہزاروں آرزوؤں اور حسرت کے لیے پناہ انبار کا مدفن نے جلد سے جلد موت سے ہم کنار ہونا چاہتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمہاری دوسری بہن بھی موت کا شکار ہو جائے گی۔ تم پر بھی دق کا حملا ہوگا —— جب تک تمہارے بھائی اور بھابی کی معاشرت میں ظاہر داری اور جھوٹی شرم کی حس باقی ہے۔

تمہاری بڑی بہن یوں ہی ایڑیاں گھستی رہیں گی خون تھوکتی رہیں گی۔ تمہاری دوسری بہن اپنی پچیس سالا ویران بہاروں کا چمن نما کھنڈر۔ اٹھائے روز ہی کھڑکی میں کھڑے دور بہت دور افق کے بھی اس پار خلاؤں میں جھانکتی ہوئی کسی کا انتظار کریں گی اور پھر سارا دن کہ آنچل میں ہلکی ہلکی سسکیاں ڈوبتی رہیں گی پلکوں پر آنسوؤں کی جھلملاہٹیں، اور پھر روز ہی ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس کھینچ کر دھڑام سے پلنگ پر ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر جائیں گی —— تمہارے بڑے بھائی کا سر یوں ہی جھکا رہے گا۔ بدنامی کا احساس یوں ہی دل و دماغ میں نشتر چبوتا رہے گا۔ جب تک ان چار جوانیوں کا "نیلام" نہ ہو گا بھائی صاحب ہی اطمینان کا سانس لے سکیں گے اور نہ بھابی ہی سکھ کی نیند سو سکیں گی جب کہ بھائی صاحب روز دفتر کے بہانے "شغل شاہانہ" کی طرح فلش (FLESH) اور رمی (RUMMY) سے جی بہلا کر چرمراتی ہوئی گڈیوں کو جیبوں میں ٹھونسا کر قمار خانے سے آجاتے ہیں اور بھابی صاحب —— بھابی صاحبا کو تو تم روز ہی دیکھتی ہو چن کی چلی کٹی روز ہی تم

پر پڑتی رہتی ہے یہ تمہیں مصروف رکھ کر دروازوں سے جھانکتی رہتی ہیں۔ یا پھر تم چار بہنوں کے "تاج محل" کی داروغا گیری کے فرائض انجام دیتی رہتی ہیں۔ اور بھابی جان کو ہمیشہ اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ اس "تاج محل" کی شفاف دیواروں پر کوئی پنسل کی لکیر نہ کھینچ دے کوئی اس کا پلستر نہ اکھیڑ دے۔

ایک دن مجھ پر قہقہوں کا دورہ پڑا ــــ میں اسے دورے ہی کہوں گا اس لیے کہ بات ہی کچھ ہنسنے کی تھی چاہتا تو تم لوگوں کی طرح بستر پر الٹے سیدھے آنسو ضرور بہا لیتا۔ مگر اس کے برخلاف دیر تک ہنستا رہا ــــ جب کبھی تمہاری تصویر دیکھتا ہوں تو چاہے نہ چاہے میرے ہونٹ طنزیہ مسکرا اٹھتے ہیں اور تمہاری بھابی صاحبا کا ایک خط بڑی تیزی سے گھومنے لگتا ہے جو انہوں نے اپنے شوہر کو لکھا تھا۔ اس خط کے چند جملے مجھے اب بھی یاد ہیں اور شاید ہی ان جملوں کو میں بھول سکوں جن کو پڑھ کر دیر تک بھائی اور بھابی صاحبا کی ذہنیت کا ماتم کرتا رہا۔ تمہاری بھابی لکھتی ہیں ــــ

"ہاں تو آپ کے حسب الحکم آج جمعہ ہے۔ انشاء اللہ چار بجے جاؤں گی ــــ تاز کو بھی ہمراہ لے جاتی ہوں۔ اس کے ہاتھ "منت" کر کے نارا بندوا تی ہوں۔ شاید اس معصوم کی دعا قبول ہو جائے آمین ــــ آپ نے لکھا ہے کہ مجلس کروا دوں لیکن "منت" کر کے صرف پھول اور نذر رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ جب ہماری مراد بر آئے گی تب مجلس کر کے جو بھی چڑھانے کی نیت کیے ہوں چڑھاتے ہیں اس لیے میں صرف پھول اگربتی نذر کے لیے پیسے اور کچھ شیرینی لے جاتی ہوں۔ یہ فضل خدا ضرور یہ ضرور دعا قبول اور ہم لوگوں کی پریشانی دور ہو گی آمین۔"

اور پھر اس "پریشانی" کو دور کرنے کے لیے بھابی صاحبا کو جیسے پر لگ گئے تھے رکشاؤں میں اڑی اڑی پھرنے لگیں۔ شہر کی چند ایک مخصوص درگاہوں اور مزاروں پر خدا اور اس کے رسول کا واسطا دے دے کر گڑگڑا گڑگڑا کر التجائیں کی گئیں۔ نئی نئی نذر کے زرد لیے رنگ برنگ کی ڈوریاں بندوائی گئیں۔ مجلس کی گئی۔ لمبی لمبی مرادیں مانگی گئیں ــــ نیاز شریف کے لیے نئے نئے چھپڑے میں چھپت پر روپے باندھے گئے۔ نذر کے لیے پیسے پیش کیے گئے اور عذاخہ اکر کے بڑی مدت کے بعد تمہاری بہن نمبر دو کے لیے ایک گاہک آیا اور گاہک بھی وہ جو قبر میں پاؤں لٹکائے کسی دوسری دنیا کی "لو" لگائے بیٹھا تھا جسے مات مات پر اتقاہو اکرتا تھا جو ایک موٹی رقم کے عوض تمہاری نمبر دو بہن کو خریدنا چاہتا تھا اس خوش خبری کو سن کر بڑی بہن صاحبا چھوٹ چھوٹ کر رونے لگیں اور دل ہی دل میں ہزاروں کوسنیاں اپنے ہونے والے شوہر کو سنا ڈالیں دبی دبی زبان کی زد سے بیچارے سالہ والے بھی نہ بچ سکے۔ جو درگاہوں اور مقبروں میں بیٹھے بیٹھے اللہ میاں سے تمہاری بہن کے لیے ایک عدد شوہر کا انتظام کر چکے تھے۔ تمہاری بھابی سمجھا ہی تھیں کہ ــــ

"ٹوٹا ہووے تو گیا ہو اجکے اس کا سلسلہ لب کسی جنگلی بہادر سے ملتا ہے اور دولت گھر کی لونڈی بنے قدم چومتی رہے گی تم راج کرو گی راج ــــ اور پھر شاید دولت میں ڈوب کر ہم سب کو بھول جاؤ گی۔"

اور پھر جب تمہاری بہن نے نفی میں سر ہلایا تو بھابی صاحبا کا چہرا لال بھبھوکا ہو گیا بیتوری پر بل پڑ گئے سارے گھر بھر پر ایک خوف ناک سناٹا چھا گیا اپنی محنت کو یوں ٹھکرانے لگتے دیکھ کر بہن نمبر دو کو پھٹکارتی ہوئی باورچی خانے میں گھس گئیں۔ اپنا غصا ساس کی نہڑ یا پر اتار ڈالا۔ تمہارے بھائی سویخ رہے تھے۔ پیشانی پر شکنیں ابھر ابھر کر کسی گہرے تناؤ کا پتا دے رہی تھیں بوڑھا اپنا پوپلا موہ لیے کچھ بڑبڑا رہا تھا جس کی تائید میں بھابی صاحبا کی دھنی ہوئی آنکھیں اور اندر دھنسی چلی گئیں۔ پھر زبردستی کی ایک مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر بڑی ہی عاجزی اور انکساری کے بعد معذرت چاہتے ہوئے اس معاملے کو مستقبل کے لیے چھوڑ دیا گیا ــــ

اس خط کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری نسبت بھی کہیں طے ہو چکی ہے اور ربیع الاول کے مبارک مہینے میں تمہارے سہرے کے پھول مسکرانے والے ہیں شاید بھابی کی بھاگ دوڑ کامیاب رہی۔ اللہ والوں کی دعائیں قبول ہو گئیں عرش کے کنگرے بھابی

کی گرگراہٹ پر ہل کر رہ گئے اور بہ نفس نفیس خدائے عزوجل نے بھابی کی دکھ بھری داستان سن کر تمہارے لیے ایک موزوں شوہر کا انتخاب کر لیا ہے ——

وہ تمہاری آخری رات تھی جب تم مجھ سے آخری بار ملنے آئی تھیں —— تمہارے قدم ڈگمگا رہے تھے جسم کانپ رہا تھا۔ الجھے ہوئے بال آنکھوں میں آنسو لیے ہوا اس بات کی چاپ آکر میرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ اور پھر تمہاری انگلیاں میرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ تمہاری آنکھوں میں شاید اس وقت طوفان مچل رہے تھے اور تم ایک ایک سوال کا جواب مجھ سے مانگنے آئی تھیں اور میں شاید اس وقت تم ہی کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اچانک تمہارے سلگتے ہوئے آنسوؤں نے مجھے جگا دیا میں حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا تمہیں دیکھنے لگا —— مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ تم رات کے بارہ بجے کیسے آگئیں —— پھر اچانک تم چھوٹ چھوٹ کر رونے لگیں۔ تمہارا سر ڈھلک کر میرے سینے سے آ لگا۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان تم نے مجھے بتایا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اور جانے بوجھے تمہیں کنوئیں میں جھونکا جا رہا ہے۔ اور پھر تمہارے وہ الفاظ کہ ——

"تم سوائے میرے کسی سے شادی نہ کرو گی اور بھائی صاحب کو صاف صاف کہہ دینگی کہ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکی کی رضامندی مقدم ہے۔"

مگر اس کے چند دن بعد ہی تمہارے ان جذباتی الفاظ کا پول کھل کر آگیا۔ تمہارے الفاظ شرمندۂ عمل نہ بن سکے بلکہ تمہاری گردن جھکی ہی رہی۔ اس لیے کہ تم ایک شریف طبقے کی شریف بیٹی ہو۔ جس کی زندگی کی حدیں صرف گھر کی چار دیواری تک محدود ہوتی ہیں۔ تمہاری اپنی زبان تمہاری بھابی اور بھائی کی زبان ہے۔ بھابی اپنی محنت شاقہ کو رائیگاں ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں بلکہ تمہارا وجود خاموش لفظوں میں ان کی چھاتی پر مونگ دلنے کے برابر ہے۔

کتنے طمطراق سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ یہ اپنے بھائی صاحب کے دل سے پوچھو جن کے ہونٹ بار بار مسکرا اٹھتے ہیں مگر اس لیے نہیں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اس لیے کہ وہ ایک زبردست بوجھ اپنے سر پر سے اتار کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تحت الثریٰ کی گہرائیوں میں پھینک رہے ہیں —— تمہاری بھابی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی پڑ رہی ہے محض اس لیے کہ ایک بہن کی کمی سے بھابی کو کچھ سکون ملے گا۔

تمہاری شادی ہو گی اور ضرور ہو گی نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں شادی کرنی ہو گی زبردستی تم اپنے شوہر کے ساتھ ہانک دی جاؤ گی۔ تمہیں مہندی لگائی جائے گی۔ مگر تمہاری امیدوں کا خون کر کے —— تمہیں سہرا باندھا جائے گا۔ مگر تمہاری کومل تمناؤں کو نوچ کر —— کتنی اداسی ہے تمہارے چہرے پر —— تمہارا دل رو رہا ہے، مسکراتی ہوئی مہندی کی رنگت رو رہی ہے تمہارے یہ پھول سسکیاں بھر رہے ہیں جو تمہارے مجبور آنسوؤں کو چھپائے ہوئے کسی مرقد کی سوگواری سی پیش کر رہے ہیں —— بھائی اور بھابی میں جیسے سرگوشیاں سی ہو رہی ہیں اس لیے کہ تمہارے ایک مددگار کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی کا نیلام کیا گیا ہے اور تمہارا شوہر ایک ٹوئیڈ کے سوٹ میں ملبوس نہیں لینے کے لیے کھڑا ہے شوہر کے چہرے پر مسکراہٹ ہے اس لیے کہ سودا سستا چھوٹ رہا ہے ایک متوسط طبقے کی لڑکی کی ڈور حیات ایک متوسط طبقے کے ایسے شخص کے ہاتھ میں پکڑا دی جا رہی ہے جس کے جسم پہ ظاہرداری ہے نفاست ہے جھوٹی شرم کا ملمع چڑھا ہے جو دو دن کا جھوکا ہے مگر بھائی اور بھابی کو مرعوب کرنے کے لیے کرائے کے سوٹ پہنا ہے تمہارے سرپرست ٹوئیڈ کے کپڑوں کے حوض سلاک کی ایک گٹھڑی ہو لے کر رہے ہیں ——

آج پھر میں اسی تالاب کے بند پر کھڑا ہوں جہاں تم اور میں دل کی دھڑکنیں سنا کرتے تھے۔ آج بہار پھر لوٹ آئی ہے۔ آبنوس اور جہوے کے درختوں میں ہوا اسی طرح سرسرا رہی ہے صندر و جھولوں کی حسین جھاڑیاں اسی طرح سرسرا رہی ہے۔

خدوخال پھولوں کی حسین جھاڑیاں اسی طرح سر اٹھائے کھڑی ہیں لیرز تالاب کی مغرور لہریں اسی طرح اپنا سر غرور سر اٹھائے چلی آرہی ہیں۔ چاندنی کی پہنائی تمہارے نہ ہونے پر بھی آج رقص کر رہی ہیں۔ کوئل کی کوک آج میں نے پھر سنی ہے مگر ایک اور تبدیلی میں ــــ تمہاری تصویر کی آنکھیں نہ جانے کیوں آج جھک گئی ہیں معلوم ہو رہا ہے جیسے زندگی کا ماتم کر رہی ہوں تمہاری اپنی زندگی کا ماتم ــــ آج تم بھی تو ایک ماتمی لباس میں ملبوس ہو۔ تمہاری حنائی رنگت گہرے سرخ رنگ میں بدل ہو گئی ہے جیسے تمہاری بڑی بہن کے خونی تھپڑوں کو نچوڑ نچوڑ کر ٹپکایا گیا ہو سہرے کے پھول جیسے پاکیزگی کھو چکے ہوں اور ان پھولوں کی آڑ میں تمہاری آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں دبی دبی سسکیاں گھٹی گھٹی ہچکیاں ابھر کر معدوم ہوتی جا رہی ہیں ہونٹ کپکپا رہے ہیں جیسے ان پر آتش قنچیوں کے چلنے کا خوف ہو شاداب گال آج زرد ہیں جیسے ہلدی کھنڈی ہوئی ہو تمہارے چہرے پر ــــ تم جا رہی ہو مگر اپنی کومل کلیوں کو نوچ کر بھائی اور بھابی کی نادانستہ ذہنیت سے مجبور ہو کر ــــ متوسط طبقے کی معاشرت سے گھٹ گھٹ کر پس پس کر آج تم پھر اسی طبقے میں سانس لینے جا رہی ہو۔ جہاں تمہاری خواہشوں کو پھلنے پھولنے سے پہلے ہی جلا کر رکھ دیا جائے گا۔ جاؤ ضرور جاؤ۔ مگر میری اس محبت کو نوچ کر پھینک دو جو تمہارے قدم پکڑ رہی ہے۔ تم اس ڈولی میں ضرور بیٹھ جاؤ۔ جس میں نہ جانے بیٹھ کر کتنی لڑکیوں نے آنسوؤں کے موتی پروئے ہوں گے۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ ضرور جاؤ۔ مگر یہ سمجھ کر نہیں کہ متوسط طبقے کی ایک بے زبان لڑکی ہو جس کا مختار کل صرف سرپرست ہوتا ہے بلکہ یہ سمجھ کر کے مستقبل میں تمہیں ایک اچھی ماں بننا ہے۔ اچھی معاشرت پیش کرنا ہے تمہاری گود میں کھیلتی ہوئی ہونہار زندگیاں ایک پیغام لائیں گی حسین پیغام جس میں نہ گھٹ گھٹ کر دم توڑا جائے گا اور نہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے غم کے آنسو بہیں گے۔

میں سلام کرتا ہوں۔ تمہاری اس بڑی بہن کو جو آج بستر میں پڑی ہوئی ایڑیاں گھس گھس کر خون تھوک تھوک کر اپنی بتیسواں سال کر رہی ہے جس کی آنکھیں آج بھی اپنے بھائی اور بھابی کی طرف لگی ہوئی تاش التجائیں کر رہی ہیں ــــ میں سلام کرتا ہوں اور اس بہن کو جو ایک بہن کی موت کی دعائیں مانگتی ہوئی خود بھی دق کے جراثیم کھانے پر مجبور ہو رہی ہے ــــ "میں سلام کرتا ہوں" تم کو ــــ ہاں تم کو میرا سلام ہے جو ڈولی میں بیٹھی ہوئی ایک نیا گھر بسانے جا رہی ہو ــــ ان رنگین نغمے الاپنے والی شہنائیوں کو سلام جو مستقبل میں ایک مرتعش نغمے سے مردا دلوں میں مسرت کی روح پھونک دیں گی ــــ تمہاری خون میں ڈوبی ہوئی حنائی رنگت کو سلام ــــ تمہارے جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کو سلام جن سے کئی دفعا آنسو ٹپکے مگر پتھر دل پسیج نہ سکے ــــ اور پھر تمہاری اس مایوس زندگی کو سلام۔ جو مستقبل میں مسکراہٹ چھپائے گی، امن اور شانتی کے گہوارے میں جھولے گی ــــ

لیو طالستائی

عظیم روسی ادیب کی ۱۲۵ ویں سال گرہ کے موقع پر ایک نئی دستاویزی فلم "لیو طالستائی" (تیار کردہ مرکزی دستاویزی نگار خانہ) ماسکو کے سینماؤں میں، کلب گھروں اور تہذیب محلوں میں نمائش کے لیے جاری کی گئی ہے۔

اس فلم کا منظر نامہ مشہور سوویت ادیب ل۔ لیونوف نے س۔ بوبریکف کے اشتراک سے تیار کیا ہے اس فلم میں طالستائی کی زندگی اور کام اور ان سے عوام کی بے پناہ محبت دکھائی گئی ہے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء کی خبروں کی فلمیں جن میں طالستائی دکھائے گئے ہیں اس دستاویزی فلم میں شامل کر لی گئی ہیں۔ طالستائی کے ڈراموں کے کچھ مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں جو ملک کے بڑے بڑے تھیٹروں کی اسٹیج پر سے فلمائے گئے ہیں۔

روس میں تلسی داس کی رامائن سے دلچسپی

ہندستانی قوم کے بیش بہا اور قدیم کلچر سے سوویت عوام گ کو ہمیشہ گہری دلچسپی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ تلسی داس کی مشہور نظم رامائن کے روسی ترجمے کی اشاعت سے قارئین اور سائنسدانوں کے عام طور پر بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ تلسی داس کی رامائن درمیانی دور کے ہندستانی ادب کی ایک بہترین یادگار ہے۔

اس میں ہندستانی ادب کے سائنٹیفک مطالعے کی بڑی قدیم روایات ہیں۔ (۔ مینا الف و لر ۔ س اولدن برگ ف شچر با تسکوائی اور دوسرے روسی سائنسدانوں کے ہندستان کے قدیمی اور درمیانی دور کے ادب کے یادگاری شہ پاروں کی علمی تحقیق میں بیش بہا حصہ ادا کیا ہے اب سے بہت پہلے انقلاب سے پہلے کے زمانے میں سنسکرت زبان کے ادب کے شہ پاروں مثلاً کالیداس کے لافانی شاہکار شکنتلا کے روسی ترجمے روس میں شایع ہوئے تھے۔

اکتوبر اشتراکی انقلاب عظیم کے بعد ہندستان کی قوموں کی تاریخ اور کلچر کے مطالعے کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ قدیم اور درمیانی دور کے ہندستانی ادب کا مطالعہ جاری رکھا گیا اکیڈیمیشین ف شچر با تسکوئی اور س اولدین برگ نے بڑی محنت کی کئی ادبی یادگاروں کو جزوی ترجموں کے ساتھ شایع کیا سنہ ۱۹۳۱ء میں قدیم ہندستانی افسانوں کا مجموعہ پنچ تنتر شایع ہوا۔ پھر سنہ ۱۹۳۴ء میں الولال جی کی تصنیف پریم ساگر چھپی جس کا ترجمہ اکیڈیمیشین الف برانی کوف نے کیا تھا۔ یہ کتاب جس میں مفصل مضمون اور تبصرے شامل ہیں۔ لسانیاتی تحقیق کا ایک کارنامہ ہے اور سنہ ۱۹۵۱ء ہی میں قدیم ہندستانی رزمیہ مہابھارت پہلی بار شایع ہوئی جس کا روسی ترجمہ سنسکرت کے سوویت عالم وکیلیا نوف نے کیا تھا۔ لیکن سوویت علم ہند میں جدید ہندستانی زبانوں کے ادب کے مطالعے اور تشہیر پر سب سے زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ مشہور سوویت ماہر علم ہند اکیڈیمیشین ابرانیکوف کی سائنسی تحقیق میں ہندستان کے کلاسکی ادب کے ورثے کے بہترین نمونوں کو مقبول عام کرنے میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اکیڈیمیشین برانیکوف نے ہندستانی اور سنسکرت سے کئی ترجمے کئے۔ ہندستانی کلاسیکی ادب میں سے شاید سب سے زیادہ اہم ترجمہ اور ساتھ ہی ساتھ برانیکوف کی سائنسی سرگرمیوں کا شاید سب سے بڑا نتیجہ تلسی داس کی رامائن کا روسی زبان میں منظوم ترجمہ ہے جو سوویت یونین کی سائنسی اکیڈیمی نے سنہ ۱۹۴۸ء میں شایع کیا تھا۔

رامائن کا ترجمہ دس برس سے بھی زیادہ مدت کی سخت محنت کا نتیجہ ہے ہندی میں کلاسیکی ادب کے ممتاز نمائندہ تلسی داس کی تصنیفات کا برانیکوف نے جو مکمل اور بہتر پہلو مطالعہ کیا تھا اور ان کے زمانے کی زندگی کے بارے میں انہوں نے جو تحقیق کی تھی اس کا ایک ابتدائی نتیجہ ان مضامین کی صورت میں ظاہر ہوا تھا جو سنہ ۱۹۴۶ء اور سنہ ۱۹۴۷ء میں سوویت یونین کے مختلف سائنسی رسالوں میں شایع ہوئے تھے ان میں خاص طور سے قابل ذکر مضمون "تلسی داس کا فلسفہ" اور ہندستانی شاعری پر اظہار کے ذرایع" ہیں ان میں سے پہلے مضمون میں رامائن کے مصنف کے فلسفے اور اس کے ساتھ سولہویں صدی عیسوی میں ہندو مذہب کے فلسفے اور فکر کے خاص رجحانات پر تحقیق اور بحث کی گئی ہے۔

سوویت یونین کی سائنسی اکیڈیمی کے مشرقی مطالعات کے علمی ادارے نے تلسی داس کی رامائن کا ترجمہ شایع کیا سوویت علم ہند کی یہ ایک نمایاں کامیابی ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اکیڈیمیشین برانیکوف نے رامائن کے اس سائنٹیفک ایڈیشن کو استعمال کیا۔

چوٹی کے ہندستانی سائنس داں شیام سندر داس کی اودت میں اور ان کے تبصروں کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں الہ آباد سے شائع ہوا تھا لیکن جیسا کہ خود اکیڈیمیشین برانیکوف نے بتایا ہے کہ اس نظم کے ترجمے کے دوران میں بہت سے ہندستانی اصل نسخوں اور ان کے تبصروں سے بھی استفادہ کیا گیا" متن کا ترجمہ نظم میں کیا گیا ہے جو اصل تصنیف کے طرز بیان اور بحر کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتا ہے ترجمے میں زیادہ سے زیادہ صحت کے پیش نظر اکیڈیمیشین برانیکوف نے ہندستانی فن شعر گوئی کے تمام تصورات کو بعینہ برقرار رکھا ہے اور اسی قارئین کے لیے ان کی تشریح کر دی ہے۔ اکیڈیمیشین برانیکوف نے رامائن کے اس روسی ترجمے کا ایک پیش لفظ بھی لکھا ہے جو بطور خود ایک مکمل تاریخی و ادبی تحقیق کا درجہ رکھتا ہے۔

رامائن کے ترجمے نے سوویت قارئین کے وسیع حلقوں کو ہندستانی کلاسیکی ادب کی ایک نمایاں تصنیف سے روشناس کرادیا ہے۔ لیکن رامائن کی اشاعت کی اہمیت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ متن اور اس کے ساتھ تبصرے تشریحات ہندستانی دیومالا کی حقیقی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں اور اب مطالعے کے لیے عام پڑھنے والوں کو مہیا ہے اس کے علاوہ رامائن کے ترجمے کی اشاعت نے سوویت تاریخ دانوں اور ماہرین علم ہند کو جدید ہندستانی زبانوں میں درمیانی دور کے ادب کی یادگاروں کا مطالعہ کرنے اور تاریخی مواد حاصل کرنے کے ذریعے کی حیثیت سے متوجہ کر لیا۔

تلسی داس کی رامائن کے ترجمے نے سوویت عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔

سوویت یونین میں تلسی داس کی عظیم تخلیق رامائن کے روسی ترجمے کی اشاعت سے پتا چلتا ہے کہ سوویت عوام میں ہندستانی قوموں کے ادب اور فنون لطیفہ میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اس سے سوویت یونین اور ہندستان کے تہذیبی تعلقات کو بھی تقویت ملتی ہے۔ اکیڈیمیشین برانیکوف کو بھی اپنے کام کے اس مقصد کا احساس تھا۔ چونکہ رامائن کے اس ایڈیشن کے پیش لفظ میں انہوں نے لکھا تھا "جس کتاب کے سلسلے میں میں نے کئی برس تک کام کیا تھا وہ تاریخ کے ایک نہایت اہم زمانے میں شائع ہوئی ہے جبکہ سوویت یونین اور ہندستان کے درمیان سفارتی تعلقات قایم ہو گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ دونوں ملکوں کو تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک لائے گی"

ماسکو کے کالجوں میں سال اول کے ۲ ہزار طلبا

سوویت یونین میں ایسے نوجوانوں کی تعداد ہر سال بڑھتی جا رہی ہے جو عالا تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔

اس سال ماسکو یونیورسٹی نے تین ہزار نئے طلبا کو داخلہ دیا ہے ان میں سے ایک ہزار آٹھ سو سے زیادہ طلبا ایسے ہیں جنہوں نے ثانوی اسکول کا امتحان سونے اور چاندی کے تمغے لے کر پاس کیا ہے۔ ماسکو یونیورسٹی کے بارہ شعبوں میں آج کل سولہ ہزار طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ماسکو کا اعلیٰ مکینیکل کالج ملک کے قدیم ترین عالا تعلیمی اداروں میں سے ہے اس میں ایک ہزار نئے طلبا داخل ہوئے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جو آلوں اور مشینوں کے ڈزائن بنانے اور مشینوں کے بنانے کے ماہر بننا چاہتے ہیں۔

مختلف اوزاروں کے انسٹی ٹیوٹ علمی ادارے نے رات اور دن میں تعلیم کے دونوں شعبوں میں نئے طلبا کو داخلہ دیا ہے۔ ڈیڑھ سو مزدوروں فورمینوں اور مشینوں کے ماہروں نے جو انجینیرنگ اور آلات سازی کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں خط کتابت کے ذریعے تعلیم کے نصاب میں داخلہ لیا ہے۔

مجموعی طور سے ماسکو کے تعلیمی اداروں نے ۲ ہزار نوجوان مردوں اور عورتوں کو اس سال نئے طلبا کی حیثیت سے داخلہ دیا ہے۔

نہ ہوئی میں میاں

عصمت آپا عصمت

(ان تمام بہنوں سے معذرت کے ساتھ جو میاں بننے پر بیوی ہی بنی رہنے کو ترجیح دیتی ہیں)

سجدا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دن رات چولہے میں پھنکو، بچے کا خیال کرو، یہ کرو وہ کرو اور میاں ہیں کہ گھر میں داخل ہوئے تو بس ہوائی گھوڑے پر سوار۔ بس ناز فرما رہے ہیں "بیگم کما کے آرہا ہوں" جیسے ساری قوم پر وہ احسان کیا ہے کہ قوم کبھی بھی اس احسان سے سبکدوش نہ ہو سکے گی۔ چاہتے ہیں کہ جب تک گھر میں رہیں بس فرمائشیں ہوتی رہیں۔ لوگ ہاتھ باندھے مودب کھڑے رہیں ــــ سوچتی ہوں "نہ ہوئی میں میاں" ورنہ میاں صاحب کو (جو اس صورت میں میری بیوی ہوتے) ایسا تیکھی نمکی ناچ نچاتی کہ چھٹی کا کھایا پیا یاد آجاتا۔ اس وقت میں اپنی روزمرہ زندگی کو ایک روٹین (ROUTINE) کی صورت میں ڈھال لیتی۔

صبح بستر پر چائے (بیگم کے ہاتھ کی بنی ہوئی) سات بجے تا ساڑھے سات بیگم کے ہاتھ کا بنا ہوا کیونکہ ایک عدد بیگم کی موجودگی میں خانساماں رکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کر سکتی تھی۔ نو بجے دلکھانا کھانے پر ساگ میں شوربا ضرور ڈھونڈتی، بات بات پر "ہیں نخ" لگاتی "بیگم! تم میرے کاموں میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتیں ایک ذرا سا کھانا تو عدا طریقے سے تم سے پکتا نہیں ....." ایسے وقت میں "انہیں" تو پکے بولنے ہی نہیں دیتی۔ ذرا پکے بولنے کی کوشش کی نہیں کہ جھٹ ٹوک مٹھتی "بیگم! تم جھوٹ ہی ہو کہ گھر شریفوں کا ہے" (اس وقت میرا انداز شوہرانا کم ہوتا اور خیلیانا زیادہ) اگرچہ ساری شرافت اب صرف سفید ٹیلون اور رگوں میں دوڑتے ہوئے خون تک ہی محدود ہے اور یہی شریفوں کا خون "رگ یہ رگ" منتقل ہوتا ہوا بچے تک پہنچا ہے اور چونکہ یہ ایک مفروضہ نہیں حقیقت ہے کہ میری رگوں میں شریف خون ہے۔ لہذا یہ گھر بھی ایک شریف کا ہے جسے دیکھ کر بیوی کی روح تک کانپ جائے۔ میاں کو تو بس ایسا ہونا چاہیے جیسے کسی ملک کا خدمتگار اور فاشسٹ حکمران اور بیوی کو زر خرید لونڈی اس سے آگے کچھ سوچنا ہوتا۔

اور شریف گھروں کی بہو بیٹیاں جوتیاں تک کھا کر میاں کے موہ نہیں آیا کرتیں۔ سمجھیں۔ اچھا جاؤ بچارہ رو رہا ہے ....." یہ تو ہوئی روز صبح کی روٹین اس پر عمل درآمد کرنے کے بعد ظاہر ہے کہ دفتر چلی جاتی اور شام کے پانچ بجے گھر لوٹتی تو شرق پر ایک جلال ہوتا اور چہرا لال بھبوکا جیسے کسی سے پٹ پٹا کر آرہی ہوں یا صاحب نے سخت سست کہا ہے اگر اس طرح کرسی پر گر پڑتی جیسے دفتر سے نہیں لوٹی ساری قوم پر ایک بھاری احسان کر کے لوٹی ہوں اور اس احسان کا بدلہ بیگم (جو خیر بھی قوم کی ایک فرد ہیں) اس طرح ان کے مسلسل خدمتیں کیے جائیں جوتے اتروائیں، کپڑے بدلوائیں۔ نہانے کا پانی گرم کریں وغیرہ وغیرہ ساتھ ہی تھاپہ بھی دھیان میں رکھیں کہ کہیں بچا نہ روپٹے ورنا دن بھر کے جلے کے میاں کے مزاج کا گھوڑا الف ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر الٹی سیدھی ہانک کر بیگم کو اکیلی چھوڑ کر خدا کسی دوست کے یہاں چل دیتی یا سینما۔ کبھی رات کا کھانا باہر کھانے کی دھمکی دے کر بیگم کو سہما دیتی اور کبھی رات کے دو دو بجے تک بیگم کو انتظار کراتی اور میری اس حرکت پر بیگم ناراض ہوتیں یا ناک بھوں چڑھاتیں تو ایک تگڑی سی ڈانٹ پلا دیتی اور اگر آس پاس کوئی موجود ہوتا تو رعب جمانے کو دو ایک چانٹے بھی جما دیتی اور اگر کوئی میری اس حرکت کو غلط کہتا تو شوہر نہار کا وہ قول نا دیتی کہ کیا تم اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہو یا تو اپنا ہنٹر ساتھ لینا نہ بھول جانا" بیگم کی تمام خاطر مدارات کو نظر انداز کر کے گھر پر ایک مکمل ڈکٹیٹر شپ قایم رکھتی۔ آخر میں میاں ہوتی نا۔ اور میاں ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ میاں کہاں ہوتا ہے اور بیوی۔ وہ تو ہمارے ملک میں پاؤں کی جوتی سے زیادہ اوقعت کی مستحق سمجھی ہی نہیں جاتی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میاں تو بس میاں ہوتا ہے آپ "میاں مٹھو" نہ سمجھ لیں۔ میری مراد صرف میاں سے ہے۔

خوراک کے بارے میں ہمارے توہمات اور غلط فہمیاں

متوازن خوراک کے موضوع پر سائنسی تحقیق کے اس زمانے میں بھی متعدد لوگوں میں کھانے پینے کے بارے کئی توہمات پائے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی مختلف چیزوں کی غذائیت کے بارے میں جدید تجربوں کی روشنی میں لوگوں کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ صحت کے نقطۂ نگاہ سے روز روز کی خوراک میں شامل کی جانے والی مختلف کھانے پینے کی چیزوں کا صحیح انتخاب کر سکیں۔

مختلف کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں عام لوگوں کی لاعلمی کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ بعض کی رائے میں کیلے کا استعمال جسم انسانی میں موٹاپا پیدا کرتا ہے اور اس کے عین برعکس کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کیلے کھانے سے انسان کے وزن میں کمی ہوتی ہے یہ دونوں رائیں بالکل خلاف ہیں اور دونوں ہی کم سچائی رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی غذا یہ طور خود وزن میں اضافے کا سبب نہیں ہو سکتی۔ دوسرے پھلوں کے برابر کے وزن کے مقابلے میں کیلا جسم کی حرارت کی زیادہ اکائیاں مہیا کرتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ کیلے کے استعمال سے لازمی طور پر وزن میں اضافہ ہوگا صحت کے نقطۂ نظر سے کسی شخص کی روز روز کی خوراک میں حرارت کی کتنی اکائیاں شامل ہونی چاہئیں۔ اس کا انحصار مستقلاً اشخاص کی حیاست اور اس کے کام کاج کی نوعیت پر ہے اگر کسی شخص کی خوراک سے حاصل ہونے والی حرارت کی اکائیوں کی تعداد اس کے جسم کی ضروریات سے زیادہ ہو تو اس خوراک کے استعمال سے مستقلاً اشخاص کا وزن بڑھنا شروع ہو جائے گا۔

حرارت کے علاوہ کیلے میں بعض ایسے معدنی اجزا اور وٹامن بھی پائے جاتے ہیں جو صحت کے لیے مفید ہیں اس لحاظ سے وزن میں کمی کرنے کی غرض سے منتخب غذا میں کیلے کو شامل کرنا تو مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن کیلے میں بذات خود وزن میں کمی کرنے کی خاصیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دوسری کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ان میں بطور خود جسم انسانی کو موٹا یا دبلا کرنے کے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچی پیاز کا استعمال انسان کو نزلے اور زکام سے محفوظ رکھنے میں مفید ثابت ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ جسم کو کافی مقدار میں معدنی اجزا اور وٹامن مہیا کرنے والی غذا صحت کو بہتر بناتی ہے اور اس طرح انسان کو متعدی امراض لاحق ہونے کا اندیشہ کم ہو جاتا ہے لیکن کوئی بھی غذا جسم انسانی کو کسی خاص قسم کے جراثیم کے حملے سے مکمل طور پر محفوظ رکھنے کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کوئی بھی صاف ستھری غذا کسی قسم کی بیماری پیدا کرنے کا باعث نہیں بن سکتی اور بعض لوگوں کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ کھیرے کے استعمال سے زکام اور شکر کے استعمال سے زیابیطس کی شکایت ہو جاتی ہے۔

غذائیت کے لحاظ سے لہسن کو کھانے پینے کی بہترین چیزوں میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن محض وہم کی بنا پر اس کے استعمال سے کی جو صلاحیت کی جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ لہسن کی بو بہت تیز ہوتی ہے لیکن یہ ناک و گلے کے لیے صرف اسی حالت میں مضر ثابت ہوتا ہے جبکہ اسے زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے اس کے استعمال پر ایک طرح کی جو سماجی پابندی لگائی گئی ہے وہ غیر معقول ہے تین اہم معدنی اجزا کیلشیم، پوٹاشیم اور فاسفورس لہسن میں پائے جاتے ہیں لہسن کو غذا میں سے خارج کرنے والے لوگ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں اس میں آیوڈین کی تھوڑی مقدار اور کافی مقدار میں الکلی کے عنصر بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس کے

ہم لہسن کے استعمال سے کافی مقدار میں وٹامن بی اور سی اور تھوڑی مقدار میں وٹامن اے حاصل کر سکتے ہیں لہسن کا استعمال کئی بیماریوں پر قابو پانے میں مفید ثابت ہوتا ہے یہ بھوک کو چمکاتا، ہاضمے کے فعل کو تیز کرتا اور پیٹ میں ہوا پیدا ہونے یا ریاح کے عمل میں مانع ثابت ہوتا ہے خون کے زیادہ دباؤ میں کمی کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال مفید ثابت ہوتا ہے۔

عام طور پر ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ کسی ایک چیز کے کثرت سے کھانے کے برے اثرات کو کوئی دوسری چیز کھا کر زایل کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر اگر آپ زیادہ مقدار میں مرود (جام) کھالیں تو اس کے اثر کو زایل کرنے کے لیے آپکے ادرک استعمال کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اسی طرح آلو زیادہ مقدار میں کھا لینے کی صورت میں گرم مسالے یا سوڈا استعمال کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اس قسم کا مشورہ دینے والے لوگ غذائیت کے سائنسی اصولوں کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ اکثر غذا کی مقدار میں کسی غذا کا استعمال مفید ہے تو اسے زیادہ مقدار میں استعمال کرنے سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اس سائنسی اصول کو بھلا دیتے ہیں کہ متعلقہ غذا کی جو فالتو مقدار جسم میں ٹھونسی جائے گی جسم اس سے مستفید نہیں ہو سکے گا بعض والدین اپنے بچوں کو کھوے کی ٹھنڈیاں مکھن اور گھی اس خیال سے وافر مقدار میں کھلاتے ہیں کہ ان چیزوں میں وٹامن زیادہ ہوتے ہیں اور ان کے استعمال سے ان کے بچے موٹے تازے ہو جائیں گے۔ یہ بھی محض غلط فہمی ہے اور اس کا الٹا نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں میں بیماری کی مدافعت کی قوت کم ہو جاتی ہے۔

اچھی صحت قایم رکھنے کے لیے ہنری اصول یہ ہے کہ آپ اپنی روزمرہ کی خوراک میں مختلف کھانے پینے کی چیزیں شامل کریں۔ کھانے کا فعل ہمارے لیے باعث مسرت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے اس کے ساتھ ہمیں خوراک کے لیے مختلف چیزوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے استعمال سے ہم زیادہ صحت مند انا اور پر مسرت زندگی بسر کر سکیں۔

سرسراتے ہوئے پتو!

محمودہ خویہ۔ ادیب فاضل
نشی فاضل

سرسراتے ہوئے پتو! تم اس طرح سرنگوں کیوں ہوتے جا رہے ہو؟ تمہاری تازگی کی جگہ حزن آلودگی نے کیوں لے لی۔ اور اٹھکھیلیوں پر خوف و تھرتھراہٹ جاری ہے۔

فکر نہ ذرا تو اس رلانے کی کا باعث نہیں یا خزاں کی سرد مہری نے تمہاری مسرتوں کو چھینے اڑا دیا ہے نہیں تو ہو سرگوشی تو! تم جھولے ہوئے خاکیوں ھرا رہے ہو فضا کو اور بھی وحشت ناک بنا رہے ہو شفق کی ارغوانی روشنی آفتاب کی حامل بن کر آتی ہے لیکن ھنرات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں روپوش ہو جاتی ہے۔

دریائی پرجوش لہریں ابھر ابھر کر لوریاں سناتی ہیں لیکن اپنے ساحل سے ٹکرا کر خود ہی پاش پاش ہو جاتی ہیں۔

نظام کائنات تو روز ازل سے یہی رہا ہے اور ابد تک یہی طرح رہے گا یہاں ہر تاریکی حیات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اپنی روح کو اس کی گہرائیوں میں نہاں۔ نڈھال اور پژمردا پاتو تم فرط غم سے آپ ہی لپٹے جا رہے ہو کسی مخفی سے خطرے کی آمد آمد کے احساس سے بے قرار رہو۔

غالب اس فکر میں کہ کوئی شوریدہ جھونکا، شاخ یا درخت سے علیحدہ کر دے یا مرگ ناگہانی پیغام شکست ہم آہنگی ہو۔

لیکن گردش تقدیر تو انسان کو بھی محو حیکر رکھتی ہے۔ اشرف المخلوقات ہو کر بھی وہ فطرت کی شوخ پری کا ایک فریفتہ ہے اور اس کی آخری باربوت پر ختم۔

یہاں ال وستا اور آشفتا نوا رہو یا مسرور و شاداں!

فطرت کا پالنا کبھی نہیں پلٹ سکتا اس کی درندگی تو بازی تمنا و حمات میں ہی مسکرایا کرتی ہے ہنسی ہنس کر ہی جلاتی ہے۔

تمہاری دھیمی دھیمی سرسراہٹ کسی سوز نہاں کی سرگم ہے اور نشاط پیہم روحانی الجھنوں کا باعث لیکن وجہ نمود کائنات تو یہ ہے کہ اک حقیر ذرہ دہر بھی پتھر سے محفوظ نہیں۔ ناسازگاری موسم کا شکار ہے بھی ہونا پڑتا ہے اور کشمکش حیات و فنا سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی خاموش تفسیر کی ہے تو جام مے لبریز ہو۔ یا خالی ہاتھ دست ساقی کی ہر جنبش پہ پریشان ہونا پڑتا ہے۔

کہا تم نے ہو یہ تو حیات مستعار ہمارے ضرور نہیں محمودہ ولمحات زیست میں کرب و الم کا ذکر کیا اور شعب ذیادہ اسٹیج کم ہونے کا شکوہ۔

آگ میں پھول

قمرالدین قمر

ایکایک کالی گھٹا اٹھی اور حدِ نظر تک کھپ اندھیارے نے اپنا پر پسار لیا۔

ہواؤں میں یخ بستا خنکی آگئی۔ کچی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں سے گرد و غبار اڑ اڑ کر اپنے نزدیک کے چھوٹے چھوٹے جنگلی پودوں دھان کی لہلہاتی بالیوں اور نظر آتے ہوئے ایکے دکے مویشیوں کو چھپا لیتی۔

..... رات کے دس بج چکے تھے ــــ ابھی ایک میل اور دور جانا تھا۔ رستے نا ہموار ہونے سے گاڑی ہچکولے کھاتی ٹک ٹک ٹک ..... بھاگی جا رہی تھی۔

کوچوان نے آسمان کو سر پر کھڑا دیکھ کر تشاخ... تشاخ چابک ہوا میں لہرا کر مارا اور گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا ــــ پل پار کرتے ہی بارش جھر جھر ہونے لگی۔ بجلی کی کڑک کڑ کڑ... اور چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں۔ اس کا کپڑا بھیگ کر خشک ہو چکا تھا۔ جاڑے کا موسم اس پر ہوا کے ساتھ بارش نے اس کے جسم کو بلکل سرد کر دیا جس کی وجہ سے بدن میں کپکپی خاص طور پر نمایاں ہو چکی تھی۔ اس نے کوٹ کے کالر کو الٹ لیا اور مفلر گردن میں لپیٹے ہوئے پوچھا۔

"اور کتنی دور ہے؟"

"ابھی تو پل پار ہوا ہے جناب۔ ادھر پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے گھائی شروع ہوتی ہے ــ گر ہوا کا زور کافی ہے" ــــ

کوچوان نے چابک پھر ہوا میں لہرایا۔ تشاخ.... اور بولا ہوا کم ہوتے ہی کم گھائی پر چڑھ جائیں گے اور پھر نیچے گاؤں ہے بھئی جتوڑی دو ــــ"

گاڑی ٹک ٹک بھاگی جا رہی تھی۔ بجلی کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور بارش کم ہو چکی تھی لیکن ہم کو بھگا دینے والی ہواؤں برابر چل رہی تھیں۔

"کیا یہاں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ــــ؟"

کوچوان نے سنا نہیں کہ وہ ہر ممکن جلد پہنچنے میں کوشاں بار بار تشاخ تشاخ چابک لہراتا رہا۔ اس نے جب دوبارہ پوچھا تو کوچوان نے کہا۔

"ایسی تو کوئی جگہ نہیں جناب ــ گر وہ جو دور مکھیے کی بتی جل رہی ہے نا" کوچوان نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔

"وہاں ایک کٹیا ہے اگر حکم ہو تو....."

"ہاں ہاں!!" اس کے دانت سردی سے بج رہے تھے اسے ڈر محسوس ہو رہا تھا کہیں بیمار نہ پڑ جائے اگر ایسا ہوا تو اس چھوٹے سے گاؤں میں شاید ہی کوئی ڈاکٹر ہو ــ لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ رہا۔

گاڑی اب قریب مکھیے کی بتی کے پاس ٹھہر گئی۔

اس نے ٹورچ روشن کی اور پیچھے کی اولتی سے بھیگتے ہوئے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے لگا ــــ کچھ توقف کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک ضعیف العمر شخص نے جس کی داڑھی سفید ہو چکی تھی لمبا سا کرتہ اور تہبند پہنے ہاتھ میں لالٹین لیے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کون راہی! باہر طوفان ہے آؤ اندر آجاؤ۔" وہ بوڑھے کے پیچھے چپ چاپ چلنے لگا ــ کمرے میں اندھیرا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو کمرے، چھوٹا سا آنگن، آنگن میں ایک کنواں اور اس کے قریب آم کا ایک بڑا سا درخت۔

اس گھٹے گھٹے ماحول میں قدم رکھتے ہی اس کا دم گھٹنے لگا لیکن مصلحت کے مطابق وہ خاموش رہا۔ بوڑھے نے آواز دی۔

"مراغ جلا دے بیٹا" اور لالٹین کو کھونٹی پر ٹانگ کر چارپائی

پر اسے بیٹھاتے ہوئے خود بھی بیٹھ گیا۔

"شہر سے آرہے ہو؟"

"جی"

"ارے تم تو بلکل بھیگ گئے۔ کپڑے بدل لو، بیٹا میدان میری تہبند دینا۔"

"جی تکلیف ..... جی بلکل ..... زیادا نہیں بھیگا ہوں"

اتنے میں کوچوان سوٹکیس لے کر آگیا۔ سوٹکیس زمین پر رکھ کر وہ خود بھی قریب بیٹھ گیا ۔ بوڑا آہستہ سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر لپیٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ طوفان برابر یوں ہی آتا ہے۔ شاید گلزار نگر جارہے ہو"

"جی"

"ہمیشا طوفان کے موقع پر یہاں راہی آتے ہیں۔ آج تم بھی آئے ہو تو بیٹھ رہو" بوڑے کی آواز کانپتی لیکن اس نے فوراً ہی کھا نسنے ہوئے کہا۔

"آج یہیں سورہو صبح اٹھ کر چلے جانا"

وہ خاموش رہا ..... کوچوان بیٹھے بیٹھے اونگنے لگا تھا کہ اتنے میں میدان بڑی بڑی آنکھوں والی لانبے لانبے زلفوں والی اور گندمی رنگ لیکن چہرا انزاہوا آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ اور ہونٹوں پر جیسے ہنسی آتے آتے رک گئی ہو یا کسی نے چھین لی ہو۔ اور یہی تین میں برس کی عمر ـــــ ایک تھالی میں جوکی روٹی مٹی کے پیالے میں ساگ لے کر آگئی۔ اس نے چٹائی بچھائی۔ لوٹے میں پانی بھر کر رکھا۔ بوڑے نے کوچوان کا شانا پکڑ کر ہلا دیا ـــــ

"لو روٹی کھاؤ آئے ہوئے مہمان کو بھوکا کس طرح رکھا جائے ۔ راہی گو کہ جب سے میں یہاں آباد ہوا ہزاروں راہی آئے ..... اور آج سے ایک سال پہلے اسی وقت ایسی ہی ایک بھیانک اور ڈراونی رات تھی ارے تم تو کھانے ہی نہیں ۔ کھاؤ کھاؤ" اور خود ہی ہنس کر کہنے لگا ۔

"جوکی روٹی اور ساگ حلق میں پھنس رہی ہے شاید"

وہ چونک پڑا۔ بوڑا خاموش ہو چکا تھا۔ میدان قریب کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھیں بھی میدان کے اس مفلسانا حسن کا طواف کر رہی تھیں۔ مگر جب بوڑا کہتے کہتے رک گیا تو اس نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا"

"پھر ..... پھر وہ میری کل جمع پونجی لے گیا۔ مجھ بوڑھے پر اسے ذرا بھی ترس نہ آیا۔ وہ میری لڑکی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہو۔ اچھا تم روٹی کھاؤ"

بجلی کے کڑکڑ کڑکنے کی آواز سن کر بوڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہیں بجلی گری" ـــــ آگ کی ایک لمبی سی لکیر اس نے سامنے کونے تک پھیل گئی۔

فضا تھوڑی دیر کے لیے جگمگا اٹھی۔ جیسے اندھیرے میں کسی نے دیا جلا دیا ہو۔ مگر ہوا کا جھونکا آیا۔ اور اسے گل کر گیا نظریں اس اندھیرے میں شاید کسی نامعلوم چیز کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔

"بجلی برابر گرتی ہے۔ راہی اور غریبوں کے آشیانے پر ہی گرا کرتی ہے"

"سمجھے، ارے جوکی روٹی کے ساتھ اچار کیوں نہیں کھاتے" میدان نے انگیٹھی سلگا دی۔ جب وہ لوگ کھانا کھا چکے تو سب انگیٹھی کے پاس گھیرا ڈالی کر بیٹھ گئے۔ انگیٹھی کی آگ چٹختی رہی اور باہر گھوڑا بھیگتا ہوا ہنہنانے لگا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا" بوڑے نے پوچھا۔

اس نے ایک بار بوڑے کی طرف دیکھا۔ پھر میدان کی طرف اور بولا۔

"آغا انور"

"مجھ بوڑے کو شمشیر علی کہتے ہیں۔ لیکن اب تو اس شمشیر کی دھار کٹ چکی ہے ....."

"اسی لیے تو آج ایک سال ہوا میں نے شکست کھائی۔ ورنا ....."

شمشیر علی کی بوڑھی آنکھوں کی چمک اب بھی ویسی ہی تھی ویسے ہی غم کی ڈورے اور ہلکی ہوئی آنکھیں دلوں کے پار ہو جاتیں کسی میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ ایک ثانیے کے لیے آنکھیں چار کر لے آغا کی آنکھیں اٹھیں تو تھیں مگر اس کی تاب نہ لا کر فوراً ہی جھک گئیں۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے۔ اچھا سو رہو۔ ہم دونوں باپ بیٹی دوسرے کمرے میں سو رہیں گے۔"

شمشیر یہ کہتا ہوا اٹھا۔ اس نے ایک جائی لی اور چارپائی پر لیٹ کر سو گیا۔

صبح کی دودھیائے کرپھیں چکی تھی ــــ اندھیرے کے کہرے کو چاک کرتی ہوئی جب سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں جھینگی سبزہ اور نرم گھاس پر سے رینگتی ہوئی کمرے کی کھڑکی پر پڑیں تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے ایک لمبی انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ کوچوان باہر گھوڑے کو تازی گھاس چرانے لے گیا تھا جب وہ لوٹا تو اس نے چلنے کو کہا۔ اتنے میں شمشیر علی ہاتھ میں دراتی لیے ہوئے آیا اور بولا۔

"دودھ پی کر جانا"

"اتنی تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ بابا" ــــ اس نے کہا۔

"بیٹا۔ سیدان راہی کے لیے دودھ لے آ" ــــــــ

بوڑھا باہر دور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سیدان پیتل کے لوٹے میں دودھ اور ایک چھوٹی سی رکابی میں بتاشے لے کر آ گئی۔ اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور گلاس لانے باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔ وہ سیدان کی ناگنوں کی طرح بل کھاتی چال کو دیکھتا اور اس کی لطیف چاپ کو سنتا رہا جس میں میٹھا میٹھا درد ..... لطیف چبھن اور نہ جانے کیا کیا پنہاں تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بالکل بے خبر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس چمک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جواب سے پہلے کبھی جھلمل جھلمل چمکا کرتی تھی۔ لیکن ہزار ڈھونڈنے کے اسے صرف ایک ہلکی سی رمق کے سوا کچھ نہ مل سکا ہم اپنا کام کریں۔ اگر ہم ایسے راہیوں کا دکھ درد مول لیں تو ہم غریبوں کی زندگی ہی اجیرن ہو جائے گی ..... اور وہ دونوں اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

جو یادگار کے طور پر بچ رہا تھا۔ اس نے سوچا "اگر وہ پہلے آتا تو شاید ....."

"دودھ پی لو راہی" ایکا ایک بوڑھے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سیدان کے ہاتھ سے گلاس لے لی۔ انگلیوں کی لمس سے اس کے سارے بدن میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔

"لیکن تماشا تو کھاؤ"

اور وہ مسکرا دیا۔ سیدان کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی۔ لیکن اس سے پہلے تو اسے مرد کی ہر ادا اچھی لگتی تھی پوڑھے نے سیدان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چاند کو دیکھا کرتے ہیں۔ اسے چھونے کی کوشش نہیں کیا کرتے بیٹا"

کوچوان بولا "ٹھنڈ سے ٹھنڈ نے نکل چلیے۔ تو بجے ہم گلزار نگر پہنچ جائیں گے۔" اس نے پھر بوڑھے سے سیدان کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شمشیر علی نے اس کی طرف شفقت آمیز نگاہ سے دیکھا لیکن کچھ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک پڑی۔

"اور اع ــــ گاڑی ٹک ٹک بل کھاتی پگڈنڈی پر ہولی سیدان دور تک گاڑی کو دیکھتی رہی۔ اور دونوں باپ بیٹی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ شمشیر کے ہاتھ میں درانتی اور سیدان ٹماٹر کی بوریا لیے پیچھے پہاڑی کے دامن پر چھوٹے چھوٹے جنگلی پودے لہلہا رہے تھے۔ جنگلی گلاب کے پھول کو دیکھ کر سیدان نے چاہا بڑھ کر توڑ لے کہ بوڑھا بولا۔

"پھول کو سونگھا کرتے ہیں۔ توڑا نہیں کرتے بیٹا" اور گاڑی ٹک ٹک چلی جا رہی تھی ــــــــ

سیدان حسرت بھری نظروں سے بار بار گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی بوڑھے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ــــــــ

"بیٹا! ایسے راہی تو ہر روز آیا جایا کرتے ہیں۔ ان آنے جانے والوں کا اتنا سوچا ہی کیا، بھول جاؤ بھی۔۔۔۔ یہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور سیدان کی سیلی آنکھوں سے گہرا سیدار کی سی چمک لیے دو آنسو ٹپک پڑے بوڑھے نے اپنی برنم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا "چلو اگر

سس کے نام

صبا نقوی

کاشانۂ غم

بہار تمنا!

رنگین و شاداب رہو!

تم نے رخصت نہ کیا۔ لیکن میں بہر حال یہاں پہنچ گیا ہوں اور جب وعدہ خط لکھ رہا ہوں تو اگر تمہیں بھی اپنا کوئی ایسا ہی وعدہ یاد ہو تو جواب کا منتظر رہوں گا۔

تمہیں معلوم ہے میں تمہارے گاؤں کیوں آیا تھا؟ حالانکہ دریام نگر سے یہاں تک کا سفر سیدا زیادہ آرام دہ اور آسان ہے میں وہاں تم سے ملنے کے لیے پہنچا تھا.... صرف تمہاری ملاقات کی خاطر۔ تمہارے سوا میرا وہاں ہے بھی کون؟ ..... تمہارے گھر پہنچ جانے کے باوجود تم سے دو دن تک ملاقات نہ ہو سکی۔ میں اپنے انتہائی ضروری پروگرام کے باوجود واپس بھی نہ ہو سکا۔ میں تم سے ایک بار ضرور مل لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں سفر پہ جا رہا تھا۔ ..... دور ..... بہت دور ..... اور زندگی کا بھروسا؟ ..... دو دن انتہائی کریب و بے چینی میں گذرے بغیر تم سے ملے آ بھی کیسے سکتا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل تر ہوتی گئیں۔

بارے ایک نہایت مبارک اور سعید گھڑی آئی ——

تم باورچی خانے میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ میں موقع کی تاک میں دروازے میں جا کھڑا ہوا —— تم نے گردن اٹھا کر دیکھا آنکھیں۔ زلفیں ..... اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم ایک دوسرے میں سما گئے ہیں۔ ایک لذیذ سی بے خودی کا احساس ہوا۔ ایک کیف آور خمار چھا گیا۔ اور ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر خدا جانے کتنی دیر اسی طرح کھڑے رہے ——

اور بار مجبوری لوٹ کر اسی دنیا میں آنا پڑا۔ تو وہیں بیٹھ گئے —— تھوڑی دیر کی تنہائی، غنیمت تھی..... تم نے شکایتیں کیں... میں نے جفا کا شکوہ کیا۔ گلے شکووں کے بعد عہد و پیمان کا نمبر آیا۔ کیا کیا وعدے نہ کیے گئے..... اور آخر میں تمہارے کوثر و تسنیم میں دھلے ہوئے لبوں کا..... داستان ملاقات کتنی سادا ہے..... لیکن جی چاہتا ہے کہ اسی داستان کو بار بار دہراے جاؤں۔ اور ——

دوسرے دن صبح رخصت ہونے کے لیے تمہارے گھر پہنچا ..... تم نے الوداعی ملاقات کو منظور نہ کیا —— ٹھہرنا نامناسب تھا —— واپس ہو گیا..... اسٹیشن پر واپس آتے وقت پھر تمہارے گھر گیا۔ لیکن اس دفعہ تمہاری صورت بھی نظر نہ آئی —— اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی میں دیر تھی —— ایک کوشش اور کی ۔ پھر ناکام رہا —— آخر گاڑی پر سوار ہوتے وقت اس کی اس حسرت نے خلش کی صورت اختیار کر لی ——

تمام رستے ایک بے انتہا تکلیف دہ ذہنی کشاکش میں مبتلا رہا ہوں اور اب تک پریشان ہو ہو جاتا ہوں —— عقدے کا حل ہونا تو درکنار، میری سمجھ میں اب تک یہ عقدہ ہی نہ آ سکا ہے —— استقبال کے وقت اس قدر گرم جوشی اور بے خودی۔ اور رخصت کے وقت ایسی جانگداز سرد مہری —— کچھ بھی تو نہیں آتا سمجھ میں —— ممکن ہے تمہیں موقع ہی نہ ملا ہو۔ شاید خود رسوائی تمہیں لبیک کہنے سے باز رکھا ہو۔ یا تم ناراض ہو گئیں مجھ سے، کیا میں نے بے جا شکوہ کیا تھا کوئی؟ لیکن اس وقت تو تمہاری جبیں پر کوئی شکن باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے۔ اگر واقعی مجھ سے کوئی زیادتی ہو گئی ہو تو معافی کا خواستگار بھی ہوں —— تمہارا جواب آنے تک پریشانی دور نہ ہو گی۔

ابھی کہنا تو شاید اور بھی بہت کچھ۔ لیکن شاید گفتگو اتنا طول پا رہا ہے ——

بچوں کیلئے فلمیں

پروفیسر کینرک مکسن
ماہر بچوں کی نفسیات

(ایک نفسیاتی تجزیہ)

ہر ہفتے کی صبح کو برطانیا کے تقریباً دس لاکھ بچے جن کی عمر ۵ سال سے ۱۵ سال تک ہوتی ہے سینماؤں میں فلموں کے خاص شو دیکھتے ہیں۔ برطانوی بچے سینما کلبوں کو بہت پسند کرتے ہیں لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان سے قوم کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔

سینما کلبوں کا سلسلہ ۱۹۴۳ء کو شروع ہوا تھا۔ جب جے۔ آرتھر رینک نے اوڈین تھیٹر میں بچوں کا پہلا سینما کلب قایم کیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ بچے ایسی فلمیں دیکھتے ہیں جو ان کے لیے ناموزوں ہیں ان ہی بچوں کی بھلائی بہتری سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بچوں کے کلب منظم کرنے کا فیصلا کیا تاکہ ان کلبوں میں بچوں کو ایسی فلمیں دکھائی جاسکیں جو ان کی ضروریات کے برابر ہوں

کلبوں کا قیام تو کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن بچوں کے لیے موزوں فلمیں تلاش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا یہ معلوم ہوا ہے کہ بچوں کی پسند اور ناپسندی بہت زبردست ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لڑکے ایسی فلمیں پسند کرتے ہیں جن میں پر شور واقعات ہوں اور جن سے ان کے دل میں جوش پیدا ہو۔ لڑکیاں پر سکون واقعات دکھانے والی فلموں کو پسند کرتی ہیں جن فلموں میں محبت کے سین ہوتے ہیں ان سے بچے اکتا جاتے ہیں لڑکے لڑکیاں حیوانوں اور بوڑھوں کو دیکھنا بہت پسند کرتے ہیں اگر فلموں میں ان کی اپنی عمر کے بچے کام کر رہے ہوں تو بھی وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

فلموں کا بچوں پر ردعمل

فلموں کا بچوں پر جو ردعمل ہوتا ہے وہ اس ردعمل سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو بڑوں پر ہوتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بچوں پر بڑوں کے مقابلے میں فلموں کا اثر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ جے۔ پی۔ میر نے اپنی کتاب "سوشالوجی آف فلم" میں فلموں میں دکھائے جانے والے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے بچے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جھولوں۔ ڈاکوؤں، ڈوبنے اور پھانسی دینے کے نظاروں آگ اور سیلاب کے نظاروں وغیرہ کا بچوں پر گہرا اثر پڑتا ہے اس اثر کی وجہ سے بچوں میں چیخنے چھیننے دانتوں سے ناخن کاٹنے آنکھیں بند کرنے ڈر کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ چمٹ جانے اور اس قسم کی دوسری عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ سینما دیکھنے کے بعد بعض بچے اپنے گھروں کو بھاگتے ہیں۔ تاریک کوچوں اور سڑکوں سے دور رہتے ہیں۔ سائے سے ڈرتے ہیں۔ کھڑکیوں کو کھلا نہیں رکھتے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ سو رہے ہوں تو روشنی جلتی رہے یا ان کے ساتھ کوئی سوئے۔

بچوں کو اس قسم کے اثرات سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے لیے اچھی تفریحی فلمیں بنائی جائیں۔ مسٹر رینک کو ان کی ضروریات کا پورا احساس تھا۔ سینما کلب قایم کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۴۳ء میں ایک خاص شعبا قایم کیا جس کا کام صرف بچوں کے لیے اچھی اور تفریحی فلمیں بنانا تھا۔۔۔ مس میری فیلڈ اس ادارے کی ڈائرکٹر مقرر کی گئیں اس ادارے کی نگرانی ایک مشاورتی کونسل کرتی تھی جس میں ہوم آفس اسکاٹش آفس لڑکے اور لڑکیوں کی انجمنیں۔ ٹیچروں کی انجمنوں اور بچوں کی بھلائی بہتری سے دلچسپی لینے والی دوسری انجمنوں کے نمایندے شامل تھے اس ادارے نے متعدد فلمیں بنائیں۔ جنہیں بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اس کی بنائی ہوئی ایک فلم "یہ اسرار فنکاری" دنیا کی ایک بہترین

فلم قرار دی گئی ہے۔ ایک اور فلم "نئی رقاصا" کو بھی بے حد پسند کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس ادارے نے اپنا نام "چلڈرنز انٹرٹینمنٹ فلمز" رکھ لیا تھا۔

بچے فلموں پر اپنے طریقے سے پوری طرح تبصرہ کرتے ہیں وہ فلموں سے متعلق اپنے خیالات لکھ کر ادارے کو براہ راست بھیجتے رہے ہیں۔ یا وہ اپنی مکلب کمیٹیوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے تبصروں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے بدقسمتی سے "چلڈرنز انٹرٹینمنٹ فلمز" کو معاشی اسباب کی بنا پر ۱۹۵۰ء میں بند کرنا پڑا تھا۔ اب اس کی جگہ برطانیا کی تمام بڑی فلم کمپنیوں کی ایک انجمن نے سنبھال لی ہے اب اس کا نام "چلڈرنز فلم فاونڈیشن" رکھا گیا ہے۔

بچوں کے سینما کلبوں اور فلموں کا بچوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ بچوں کی فلموں کا معیار بہت اچھا ہو گیا ہے۔ دس سال کے عرصے میں بچوں کے لیے دو سو سے زیادہ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ بعض فلموں نے تو فلمی میلوں میں تو انعام جیتے ہیں اور بین قومی شہرت حاصل کی ہے۔

ازبکستان کی عورتوں کا اسکول

علم تعلیم کا خیوا مدرسہ لسوال ۱۹۳۴ء میں قائم ہوا تھا اور ازبکستان میں عورتوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے جس سے یہ اسکول قائم ہوا ہے اب تک سینکڑوں ازبکستانی استانیاں کنڈرگارٹنوں اور بان گھروں کی قابل استانیاں اور نرسیں تربیت پا چکی ہیں۔

آج کل اس اسکول میں ساڑھے تین سو ازبکستانی لڑکیاں تربیت حاصل کر رہی ہیں اور ۸۰ لڑکیوں نے اس سال نصاب تعلیم مکمل کر کے اپنی جماعتوں کو پڑھانے کی سند حاصل کر لی ہے۔

اس سال خزاں میں بہت سی لڑکیاں علم تعلیم کے اس اسکول میں داخلہ لیں گی۔

ماسکو یونیورسٹی کی نئی عمارت کا افتتاح

پہلی ستمبر ۱۹۵۳ء کو لینن پہاڑی پر ماسکو یونیورسٹی نئی عمارت کے افتتاح کی تقریب ہوئی۔ سوویت عوام کی تہذیبی تاریخ کی اس اہم تقریب میں بہت سے لوگ شامل ہوئے۔

علم و ادب کے اس عالیشان محل سے سب ہی بڑے متاثر ہوئے۔ یہ پینتیس منزلوں کی عمارت ہے جس میں علم جغرافیا اور ارضیات کے سبھی مکینکس اور ریاضیات کے لیکچر ہال مختلف شعبوں کے تمام مشترک محکمے ایک سائنسی لائبریری ڈیڑھ ہزار نشستوں کا ایک ہال اور یونیورسٹی کے دوسرے تعلیمی اور تحقیقی شعبے ہیں۔ اس کے علاوہ طبیعیات اور کیمیا کے شعبوں کی عمارت طبعا کے رہائشی مکانات جن میں کمروں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سات سو چون ہے نیز پروفیسروں اور مدرسوں کے لیے ایک سو چوراسی رہائشی مکانات نباتاتی باغ اور اس سے متعلق تعمیرات جو تقریباً ایک سو پانچ ایکڑ کے رقبے میں واقع ہیں کی ایک تہذیبی ادارے اور کھیلوں سے متعلق تعمیرات بھی ہیں۔

یونیورسٹی میں مجموعی طور پر ۳۷ خاص عمارتیں اور دس ملی ہوئی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں جن کا مجموعی حجم ۲۶ لاکھ ۱۱ ہزار مکعب میٹر ہے یونیورسٹی کی نئی عمارتوں میں ۱۴۸ لیکچر ہال ایک ہزار سے زیادہ تحقیقی اور تعلیمی تجربے خانے نیز لائبریری کے کمرے بھی ہیں جن میں بارہ لاکھ کتابیں رکھنے کی گنجائش ہے۔ تجربے خانوں اور مطالعے کے کمروں میں برقیوں سے متعلق (ELECTRONICS) جدید ترین آلے علم نور سے متعلق مخصوص آلے اور ایکسرے کا سامان مخصوص حالت کے غیر شعوری عوامل اور غذا کے جزو بدن ہونے کے مشاہدے کے نئے نئے کمرے اور دوسرے جدید ترین سائنسی آلے وغیرہ موجود ہیں۔

روٹری انٹرنیشنل ——— یو سیس

امریکا میں عوام کی معلومات میں اضافا کرنے اور دنیا کے لوگوں کی مختلف نوعیت کی خدمات بجالانے اور باہمی مفاہمت بڑھانے کے لیے بیسیوں اقدام کیے جاتے ہیں۔ روٹری انٹرنیشنل ان کی ایک روشن مثال ہے۔

پچھلے دنوں جب ۳۰ ملکوں کے طلبا کو ایک امریکی تنظیم دی روٹری کلب کی طرف سے ۹۵ وظیفے دیے جانے کا اعلان ہوا تو اس کی سرگرمیوں کا بڑا چرچا ہونے لگا۔ یہ ایک عالمگیر سروس گروپ یعنی سماج سیوک جماعت ہے جس کی ۴۸ ویں سالگرا ابھی پچھلے دنوں ۲۳ فروری ۱۹۵۳ء کو منائی گئی تھی۔

دوسرے ملکوں میں جاکر مطالعا کرنے کے لیے طلبا کو وظیفے دینا روٹری انٹرنیشنل کی ان سرگرمیوں کا ایک حصا ہے جن کے مطابق یہ دنیا میں بین قومی مفاہمت۔ خیر سگالی اور امن کو ترقی دینے کے لیے سرگرم عمل ہے۔

اس غیر سیاسی، غیر فرقا وارانا تنظیم میں تقریباً ہر پیشے اور ہر کاروبار کے لوگ جو کسی کمیونٹی میں ہوتے ہیں ان کے نمایندے شامل ہیں۔ اور اس کے مقاصد اوپر بیان کیے ہوئے امور کے متعلق لوگوں کی خدمت بجالانا جان پہچان پیدا کرنے سے خدمت گذاروں کے مواقع نکالنا تجارت اور اپنے اپنے پیشوں میں انتہا درجے کی ایمانداری کو ترقی دینا وغیرا وغیرا جیسے عالی آدرش شامل ہیں۔

سب سے پہلا روٹری کلب ۱۹۰۵ میں شکاگو میں قایم کیا گیا تھا۔ یہ تحریک اب سارے براعظموں میں پھیل گئی ہے اور ۸۴ ملکوں میں اس کے ۷۶۲۹ کلب ہیں جن میں پچھلے اکتوبر تک ۴ لاکھ ۶ ہزار ممبر تھے۔ یہ کلب ۲۰۰ سے زیادا ضلعوں میں منظم کیے گئے ہیں اور سالانا اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ ۳۰ جون کو ختم ہونے والے مالی سال کے آخر تک ۴۳ ملکوں میں ۴۵ نئے کلب قایم کیے گئے تھے۔

جولائی کے آغاز میں امریکا کینیڈا۔ برمودا کے علاقے میں ۷۶۲۵ روٹری کلب قایم تھے۔ جن میں ۴۳۴۹۹۲ ممبر تھے۔

ہندستان، پاکستان، برما اور لنکا کے علاقے میں ۱۱۰ سے زیادا کلب ہیں یہ علاقا پانچ روٹری ضلعوں میں تقسیم ہے اور ممبروں کی تعداد ۵ ہزار سے زاید ہے۔

ہر سال روٹری انٹرنیشنل کا سالانا کنونشن منعقد ہوتا ہے اس سال کنونشن ۲۴ سے ۲۸ مئی تک پرلس میں ہوا۔ ہر ایک کلب نے نمایندگی کی اور ہر ۵۰ ممبروں میں سے ایک ممبر ڈیلی گیٹ چنا جاتا ہے۔ یہ ڈیلی گیٹ روٹری انٹرنیشنل کے نظم ونسق کے متعلق قواعد مرتب کرتے ہیں اور کلب کے آئین میں تمام متفاق کلبوں کے نظم ونسق کے لیے تبدیلیاں کرتے ہیں۔ تاہم ہر ایک متفاق کلب آئین میں اپنی ضروریات کے برابر ذیلی قواعد بنا سکتا ہے۔

اس سال ۲۳ فروری سے ۲۸ فروری تک اطلاعات کا ہفتا روٹری انفارمیشن ویک منایا گیا۔ روٹری انٹرنیشنل کے صدر مسٹر ایچ۔ جے برنیر (سان فرانسسکو کی کیلی فورنیا) نے اس ہفتے کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ہفتا اس طرح منایا جائے کہ اس سے تاریخ، روٹری کلب کے اغراض و مقاصد آدرش اور نوع انسانی کی خدمت بجالانے کے مواقع کے متعلق تعلیم اور پرچار کی مہم سال بھر جاری رہے۔ روٹری انٹرنیشنل کے پیغام سے سب میں خدمت خلق کی تحریک پیدا ہو۔

روٹری کلبوں اور اس کے ممبروں کی سرگرمیوں کو چار

بڑی بڑی شاخوں میں نیچے کے طریقے پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

کلب سروس

کلبوں کے چلانے اور نظم و نسق سے اس کا تعلق ہے۔ وکیشنل سروس (پیشوں سے متعلق) اس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) تجارتی انتظام بیچنے والوں اور گاہکوں کے درمیان تعلقات، باہمی تجارتی مقابلا کرنے کے تعلقات، کارخانہ داروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات اور بین قومی تجارتی تعلقات۔

کمیونٹی سروس

اس میں شہری اور معاشرتی خدمت بجا لانا اور کمیونٹی کو مجموعی طور پر فائدہ پہنچانے والی سرگرمیاں مثلاً نوجوانوں کی سروس معذور بچوں کی خدمت طلبا کے لیے فنڈ اور تفریحات اور گاؤں اور قصبوں کے لوگوں کے درمیان شناسائی پیدا کرنا وغیرہ اور انٹرنیشنل سروس بین قومی سطح پر خدمت کرنا یہ۔ وٹری کلب اپنے پروگراموں اور بحث مباحثوں کے فورموں کے ذریعے ان مسایل کے متعلق رائے عامہ کو بیدار اور عوام کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں جن کا دنیا کو سامنا ہے مثلاً یو۔ این۔ او کے چارٹر کے متعلق عوام کو واقفیت بہم پہنچانے کے لیے روٹری انٹرنیشنل نے "اب سے آگے" فرام ہیئر آن (FROM HEREON) کے نام سے ایک کتابچہ ۹۶ صفحات پر مشتمل شایع کیا۔ جس کی ایک لاکھ سے زاید کاپیاں انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں دنیا بھر میں تقسیم کی گئیں۔

روٹری انٹرنیشنل ایک ماہنامہ روٹرین کے نام اور پمفلٹ پروگرام اور مختلف معلوماتی اور نظم و نسق سے متعلق جرایدہ اور لٹریچر وغیرہ شایع کرتا ہے۔ روٹری فاؤنڈیشن کو جو وظیفے دینے کا شعبہ ہے اسے ۱۱ لاکھ ڈالر کا چندا ملتا ہے ۱۹۴۷ء میں جب سے یہ وظیفے دیے جانے شروع ہوے ہیں ۵۴ ملکوں کے پانسو نوجوانوں کو ۱۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ کے وظیفے دیے گئے ہیں۔ ان وظیفوں کی رقم ۸۰۰ ڈالر سے ۴۰۰۰ ڈالر تک ہوتی ہے۔

انجام

رفیع صدیقی

وہ ایک شاعر تھا۔ دیکھنے والی آنکھ، سوچنے والے دماغ اور بیقرار و مضطرب دل کا مالک۔

شام کو جب سورج میدان جنگ سے بھاگتے ہوے سپاہی کی مانند اپنا چہرا پہاڑوں کے پیچھے چھپا لیتا تو وہ سوچتا "کیا میرے ہم وطنوں کا خون اتنا سنجمد ہو گیا ہے کہ ان کے جسموں میں گرمی بھی باقی نہیں رہی ہے! کاش میرا وطن بھی آزاد ہوتا" اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے دل بے شمار خیالات کی آماجگاہ بن جاتا اور اس کے خیالات شعر کی شکل میں کاغذ پر اترتے۔ اس کی نظموں نے ملک والوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اور جب اس نے لکھا "اے میرے پیارے وطن! کیا تیرے نوجوان بلکل مردا ہو چکے ہیں کیا ان میں ذرا بھی حمیت و خودداری باقی نہیں۔ ان کی وہ بہادری کیا ہوئی جس سے شیروں کے بھی دل دہل جاتے تھے؟ کیا ان کی تلواروں کی آب اتر گئی ہے؟ نہیں اے مادر وطن ہرگز نہیں وہ سوے ہوے شیر ہیں۔ ان کی تلواروں کی زہر اگلا زنگ سے ابھی تک فضا لبریز اور دشمن لرزاں براندام ہے"

"اٹھو! اے جوانان وطن۔ تمہاری تلوار دشمن کے لہو کی پیاسی ہو رہی ہے۔ تمہارے بازو ظلم و استبداد کی بنیادوں کو ہلا دینے کے لیے بے چین ہیں اور مادر وطن آزاد ہونے کے لیے بیقرار"

نوجوانوں کا لہو جوش مارنے لگا۔ انہوں نے اپنی پرانی زنگ آلود تلواریں سنبھالیں اور دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

زمین خون سے سرخ ہو گئی۔ آزادی کی دیوی نے انسانی خون کی پھینٹ چڑھ چکی تھی اور ان کا ملک آزاد تھا۔

جب نوجوان شاعر کے گھر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بستر پر نڈھال پڑا ہے کھلی ہوئی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں اور جسم بلکل بے حس و حرکت ہے۔ انہوں نے شاعر کو آزادی وطن کی خوش خبری سنائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ پھر اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کا مقصد حیات پورا ہو چکا تھا۔ اور اس کی روح کو ابدی اطمینان نصیب ہو گیا۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!!

اوپر کے عنوان کے تحت اس مہینے سے ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ یوں تو شروع ہی سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ رسالہ کے مضامین میں زیادہ سے زیادہ تنوع ہو۔ مقالے، مضامین اور غزلیں نظمیں تو چھپا ہی کرتی ہیں لیکن اچھے افسانوں کی ہمیشہ ہی سے ایک حد تک کمی رہا کی۔ مگر اس کمی کو "ہندستانی ادب" کے مستقل افسانا نگار ابا بگھمی اور ان کی جیون ساتھی عصمت آرا، قمرالدین قمر، صبا نقوی، اجمل رشید، مرزا اشتاق علی بیگ، ظفر عالمگیر اور شہباز پرویز نے بڑی حد تک پورا کیا لیکن پچھلے دو سال میں ڈرامے اور فیچر کی بڑی حد تک کمی رہی۔ ضرور ہم نے بھی اس خلا کو محسوس کیا۔ افسوس ہے کہ اس کی تکمیل سے ہم معذور رہے۔ اس سال ہماری یہ کوشش رہے گی کہ جہاں تک ہو سکے افسانوی اور ڈرامائی لٹریچر زیادہ سے زیادہ پیش ہو۔ ہماری یہ کوشش لکھنے والوں کے تعاون بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے افسانا نگار اور ڈرامانویس حضرات سے اپیل ہے کہ وہ اس طرف خاص طور پر دھیان دیں۔

جس طرح سے افسانے، ڈرامے اور فیچر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اسی طرح ہماری رائے میں ادیبوں کے خطوط بھی انسانی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک فیاض ادیب دو اور دو چار کے برابر خط میں صرف اپنے مقصد اور مطلب کو ظاہر کر دے گا لیکن ایک دیدہ ور قلم زندگی کے کونوں اور گوشوں کو تلاش کیے بغیر نہ رہے گا۔ ادیب کا قلم ایسے نقاط اور پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں تک ہو سکے افسانوی اور ڈرامائی لٹریچر زیادہ سے زیادہ پیش ہو۔ ہماری یہ کوشش لکھنے والوں کے تعاون بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے افسانا نگار اور ڈرامانویس حضرات سے اپیل ہے کہ وہ اس طرف خاص طور پر دھیان دیں۔

جس طرح سے افسانے، ڈرامے اور فیچر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اسی طرح ہماری رائے میں ادیبوں کے خطوط بھی انسانی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک فیاض ادیب دو اور دو چار کے برابر خط میں صرف اپنے مقصد اور مطلب کو ظاہر کر دے گا لیکن ایک دیدہ ور قلم زندگی کے کونوں اور گوشوں کو تلاش کیے بغیر نہ رہے گا۔ ادیب کا قلم ایسے نقاط اور پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں زندگی اجیرن بن گئی ہو اور انسانیت کا خون ہو رہا ہو۔ ادیب کی نظر وسیع ہوا کرتی ہے وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس کو محسوس بھی کرتا ہے اور اپنے انہیں احساسات کو تحریری شکل میں پیش کرنے پر اپنے آپ کو مجبور بھی پاتا ہے۔ اس کیفیت کی مثال بالکل اس لاوے کی سی ہے جو جمع ہونے کے بعد پھٹ پڑے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح ایک ادیب کے خیالات کا لاوا بھی لازمی طور پر کسی نہ کسی رنگ میں نمودار ہو کر رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ادیب کی طبیعت اور فطری رجحان کا لحاظ کرتے اس کے احساسات اور خیالات کا لاوا، افسانوی یا ڈرامائی رنگ اختیار کر لے یا طنز و مزاح کی شکل میں ظاہر ہو یا اس کی ایک آخری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خطوط میں موقع موقع سے وہ اپنے احساسات کی ترجمانی کرے۔

وہ اپنی بیتا بھی بیان کرے گا اور زمانے کی ستم طریفیوں کا پردہ بھی چاک کرے گا۔ اس کا قلم غریبوں اور مفلسوں کی فلاکت بھری زندگی کا نقشہ بھی کھینچتا جائے گا۔ جہاں وہ پریشان حال اور مصیبت زدوں کی ہمدردی میں آنسو بہائے گا تو وہاں امیروں اور دولت مندوں کو ان کی زیادتیوں پر بے نقط سنائے گا کبھی وہ اپنا گھریلو دکھڑا سناتا ہے تو کبھی اپنے ہی جیسوں کی زندگی پر بھی روشنی ڈالتا ہے کبھی کبھار اس کے طنز کے کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تو بعض اوقات اس کے مزاحیہ انداز کی گھلاوٹ سے جی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ادیب زندگی کا نباض ہوا کرتا ہے اس لیے حیات انسانی کا کوئی بھی پہلو اس کے قلم سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ زندگی کے انہیں مختلف پہلوؤں کو وہ مختلف زنگوں میں جاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کی یہ کوشش بعض وقت ناز یانے کا سا کام کر جاتی ہے جس اصلاحی سبق بھی حاصل کیا جا سکتا ہے بہرحال ہماری بھی یہی کوشش رہے گی کہ ادیبوں کے ایسے خطوط آپ کی سیوا میں پیش کیے جائیں جن سے کچھ نہ سہی تو کم سے کم ادیبانہ شان ہی ٹپکتی رہے۔ ایڈیٹر

محترم بھیا خان!

ڈھاکا (مشرقی پاکستان)

۱۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

نہیں ملے گرچہ جو بتایا ہے وہ انصاف اور بیان ہے کہ ڈاکیا کبھی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ ہاں ڈاک والوں کی کوتاہیوں کی تذکرہ گر کوئی خط ہو جائے تو پھر تو کچھ کہنا ہی عبث ہے۔ پچھلے دنوں "سچیٹ" اور "پیٹ بڑا ہاتھیا

آر۔ احمد کے نام مرسلہ خط طالب ہے کہ اس سے پہلے کے خطوط

ہے بابا۔۔۔" ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ غالباً ملا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ عصمت نے ان دنوں کوئی کہانی نہیں لکھی مگر آپ کے خط نے تو جیسے ان میں ایک زندگی بھر دی۔ اور انہوں نے خد بھی اس عرصے میں کئی کہانیاں لکھیں اور مجھ سے بھی لکھوائیں۔ اس لیے میری کہانی میں "آمد" "کم ہے اور" آورد" زیادہ۔ ویسے کہانیوں کی پرکھ آپ مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہیں کیونکہ آج تک میں نے خد کو افسانہ نگار کبھی سمجھا ہی نہیں۔ بلکہ میری حیثیت ایک ٹائپ ایمپریشن جیسی ہے جو الفاظ کو سینسٹو پیپر پر بکھیر دے سکتی ہے اسے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غلط ہے یا صحیح۔ اغلاط نکالنا تنقید یا تنقیص دوسروں کا کام ہے میرا نہیں۔

آر۔ احمد کے نام کا خط براہ راست مجھے ہی ملا شاید یہ خط مجھے ایک دن بعد ملتا مگر عجیب اتفاق تھا کہ آر۔ احمد کی جگہ میں ڈیوٹی پر تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محکمے کے ایک ہی سکشن میں کام کرتے ہیں میں اپنے خطوط ان کے نام سے یوں منگاتا ہوں کہ مصلحت یہی درست ہے اور چونکہ اس محکمے سے جس میں ہم کام کرتے ہیں تبادلے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اس لیے پتے کے تبدیل ہو جانے کا بھی احتمال نہیں ہے۔

رسالے پابندی کے ساتھ ملتے رہے ہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ باوجود تمام تر مشکلات کے آپ پرچا وقت پر نکال لیتے ہیں اپنا پرچا ابھی نکلا ہے اور نہ مستقبل قریب میں نکلنے کی امید ہے۔ یہاں اردو زبان کی ہی مٹی پلید ہے۔ یہاں کسی بھی اردو رسالے کا ایک سال تک زندہ رہنا سمجھ آسمجھا جاتا ہے اور چونکہ اس قسم کا معجزہ دکھانے کی صلاحیت مجھ میں اب تک پیدا نہیں ہو سکی ہے اس لیے پرچے بازی کو کاغذی اسکیم ہی سمجھیے۔ پچھلے دنوں چنوں ایک بار پھر تیزی سے ابھرا تھا۔ مگر سوڈے واٹر کے بال کی طرح فوراً ہی معاملا ٹھنڈا پڑ گیا۔ بات کچھ یوں ہے کہ رسالا نکالنے کی "دولگن" ہی میری زندگی کا سب سے زیادہ ویک پوائنٹ ہے اس سلسلے میں یہاں کی زمین ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو بھی بڑھا پہلے ہی قدم پر پھسل گیا اور بہت جلد چلا تو دو چار قدم اور بس۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ اب ان دنوں آپ کی طبیعت کیسی ہے کچھ تزاجم رہم دوچار ہیں۔ اکتوبر کے اوراق سے آپ پر سب کچھ واضح کر دیا ہوگا اس کے بعد آپ جیسے ہمدردوں کا کام ہے کہ اس ادارے کے مالیے کو مستحکم بنانے

وغیرہ کے انتہائی نظر سے گذرے کہیں یہ علالت اسی محنت کے سبب تو نہیں۔ تو جیسا محنت کم کیا کریں۔ خدا "ہندوستانی ادب" کو سلامت رکھے۔ یہی علم و ادب کی خدمت کیا کم کر رہا ہے کہ اوپر سے آپ اور اتنی محنت کریں کہ بیمار پڑ جائیں۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ کے اگلے خط مجھے نہیں ملے ورنہ یہ ناممکن تھا کہ میں چپکا بیٹھا رہتا۔ یہ تعریف نہیں ایک حقیقت ہے کہ صحافتی دنیا میں آپ جیسا پر خلوص، ملنسار نیک دل انسان کم سے کم مجھے تو نہیں ملا۔ اور جو بھی کوئی اس خلوص کی قدر نہ کر سکے اسے میں بھلے ہی کچھ سمجھ لوں۔ انسان نہیں سمجھ سکتا۔ دیکھا گیا کہ لوگ کسی رسالے کے ذریعے اچھل جانے کے بعد اس رسالے کو بھول جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں کوئی ڈینگ ہانکنا تو نہیں چاہتا۔ مگر آنے والا وقت ضرور یہ روشن کر دے گا کہ میل وروں سے کچھ مختلف ہوں۔ دیکھیے نا بات ہی بات میں خدا ہی پر اتر آیا۔ بھئی بات یہ ہے کہ میں کی "انا" برابر بیدار رہتی ہے۔ جہاں بھی ہو کسی ہی حالت میں "میں" کے ساتھ کسی کیے ہوئے یا آیندہ کرنے والے کارنامے کا اعلان یا تشہیر کر کے انسان ایک روحی سکون محسوس کرتا ہے اور بعض حالتوں میں تو یہ "انا" اتنی بیدار رہتی ہے کہ انسان اپنے علاوہ باقی سب کچھ سمجھتا ہی نہیں یہ بھی انسان کی ایک کمزوری ہے۔ مگر اسی کمزوری کا دوسرا نام انسان ہے یہ لفظ "میں" (I AM E) ہی تو ہے جس نے دختوں پر رہنے والے درندا صفت انسانوں کو دھرتی کا راجا بنا دیا۔ بہر حال آپ کی طبیعت کیسی ہے ضرور ضرور لکھیں ——

عصمت اور بے بی اختر جی اچھے ہیں۔ عصمت آپ کے سلام کہہ رہی ہیں اور بے بی "نونہاں" سے آگے نہیں بڑھنا چاہتیں تو اسے ہی سلام سمجھ لیں۔ عصمت کہتی ہیں کہ ان کے دو افسانوں میں انکا انداز تحریر مردانا ہو گیا ہے یعنی انہوں نے ہیرو کا روپ دھار لیا ہے مگر یہی کچھ ہو سکتا ہے دوسرے افسانے جلد ہی روانا کریں گی۔ بقیا سب خیریت ہے

ایڈیٹر ——

ہماری خدمات کو یوں ہی سراہتے رہنے سے کام چلے گا انہیں جاری رکھنے کے اسباب پیدا کر کے "ہندوستانی ادب" سے اپنے خلوص و دردی لگاؤ کا ثبوت دینا ضروری ہے جس کے لیے تصور نے ایک علمی ادبی رسالے کے اجرا سے آپ کو باز رکھا ہے اس کی کشمکش سے آج

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے اعظم پورہ۔شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

قیمت ایک چار آٹھ آنے

جلد ۱۴ نمبر ۳

بہمن ۱۳۶۳ف دسمبر ۱۹۵۳ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	انفرموہانی	۳	
سپاہی کی دلہن	چرن سرن ناز	۴	
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	ڈاکٹر ذاکر حسین	۶	
ناکام آرزو	عزیز الحسن ضیا	۷	
پیٹ بڑا ہشیار ہے بابا	ایاز عصمی	۸	
جھیل کے کنارے	اسحاق حسینی	۹	
کشمیر کے تاثرات	علی سردار جعفری	۱۰	
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	دلنواز		
	برٹش گی آنا		ب۔ا
	بدنامی کے چوراہے پر		صبا نقوی
	بیوفا		علی احمد
	ادیبوں اور فن کاروں کی دوسری کل ہند کانفرنس		ج۔ا
	سنگیتی یا دیں		عصمت آرا عصمت
	فلموں ٹیلی وژن ریڈیو اور فوٹو گراف		یوسیس
	ریکارڈوں کے ذریعہ تعلیم		
	سندباد جہازی اور کلرکی		قمرالدین قمر
	ایڈیٹر		

۱۲ ۱۳ ۱۵ ۲۰ ۲۱ ۲۳ ۲۵ ۲۷ ۳۱

ہمارے خیالات

دو حادثے

سلیمان ندوی

پچھلے مہینے یہ خبر نہایت ہی افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ مولانا سید سلیمان ندوی پاکستان میں انتقال کر گئے۔ مولانا ایک زبردست عالم فاضل اور ادیب تھے آپ کی ساری عمر محض علمی اور ادبی خدمت میں گذری۔ آپ کا ایک بھاری کارنامہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے۔ اس ادارے نے اب تک بیکڑوں ہی مستند اور عالا پایا کتابیں چھاپ ڈالی ہیں۔ اگرچہ خود مولانا نے اپنی پچاسوں ہی تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں اور اگر مرحوم ایک بھی تصنیف اپنے پیچھے چھوڑ نہ جاتے تو بھی آپ کے نام کو زندا جاوید رکھنے کے لیے دارالمصنفین جیسا اہم کارنامہ کافی تھا۔

مولانا سلیمان ندوی اگرچہ پکے مذہبی آدمی تھے لیکن وہ ادبی ان کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ ان چند ہندستانیوں میں سے تھے جو ہندستان کے لیے ایک مشترکہ لچر اور ملی جلی زبان چاہتے تھے۔ اس کا ثبوت مرحوم کے اس پیام سے مل سکتا ہے جو انہوں نے "ہندستانی ادب" کے اجرا کے وقت دیا تھا چنانچہ لکھتے ہیں۔

"حیدرآباد دکن ہندستان کی مشترکہ زبان اور اس کے ادب کی ترقی کے لیے جو کوشش اب تک برسرکار لا چکا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ یہ نیا ماہانہ مجموعہ اس سلسلے کی ایک مزید ترقی یافتہ کڑی ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ ضرورت تھی کہ ہندستان کی مشترکہ ادبی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جس سے اس ملک کے سارے رہنے والوں میں متحدہ ذہنی و ادبی تصور پیدا ہو۔" مولانا نہ صرف تحریری حد تک اس نظریے کے قایل تھے بلکہ عملی طور پر بھی انہوں نے اس کا ثبوت دیا ہے یعنی جب ہندستان کی ملی جلی زبان "ہندستانی" کے سلسلے میں گاندھی جی اور مولوی عبدالحق میں بات چیت ہو رہی تھی اس وقت مولانا سید سلیمان ندوی بھی پیش پیش تھے اور یہ خود بھی چاہتے تھے کہ ہندستان کی ملی جلی بھاشا کا نام "ہندستانی" قرار پائے۔ صرف اس ایک واقعے سے مولانا کی فراخدلی اور روادارانہ ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک کٹر مولوی ہونے کے باوجود وہ کتنے وسیع نظر اور بلند خیال واقع ہوئے تھے۔ ایک ایسی مجموعہ صفات ہستی کے ہم سے چھوٹ جانے پر ہم جس قدر بھی رنج و غم کا اظہار کریں کم ہے۔ آخر میں ہم مرحوم کے پسماندوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ان کے علمی کارنامے کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔

باقی

عبدالقیوم خاں باقی کے بھی ہم سے بچھڑ جانے کا افسوس ہے باقی جامعہ عثمانیا کے اُم۔ اے تھے اور طالب علمی کے دور میں "مجلہ عثمانیہ" کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ ابتدائی ملازمت تعلیمات میں اختیار کی اور بعد میں یونیورسٹی میں منتقل ہو گئے۔ چنانچہ انتقال کے وقت نظام کالج میں ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ باقی کی عمر زیادہ نہ تھی۔ پچاس کے لگ بھگ ہوں گے۔ موٹے تازے صحت مند اور توانا تھے رات دل کا دورہ پڑا اور صبح ہونے ہونے تک ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

باقی کو شروع ہی سے علم و ادب سے لگاؤ تھا چنانچہ عمر بھر وہ انہیں مشاغل میں منہمک رہے وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور نثار بھی ماہر بھی تھے اور موسیقی داں بھی۔ ان میں صلاحیتیں تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ مگر جیسا کہ چاہیے انہوں نے ان سے کام نہ لیا۔ نظم میں ان کا کلام اور نثر میں بھی چند ایک مضمون سے ان سے یادگار ہیں جو ممکن ہے جلد یا دیر سے کتابی شکل میں منظر عام پر آجائیں جس طرح ہر شخص میں خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی ہوا کرتی ہیں باقی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ ان کی انانیت اور تلون کے سبب کئی شخص ان سے چھٹتا چھٹا سا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی بھی ان کا ایک مستقل حلقہ احباب پیدا نہ ہو سکا۔ ان میں ایک بھاری کمزوری یہ بھی تھی کہ عمر بھر انہوں نے کسی پر بھی اعتماد نہ کیا۔ اسی لیے ان کے نظم اور نثر کے کارنامے مرتے دم تک کبھی کتابی صورت اختیار نہ کر سکے۔

ان کمزوریوں کے باوجود ہماری دلی تمنا تو یہی تھی کہ عبدالقیوم خاں باقی رہتے اور زیادہ سے زیادہ علمی ادبی خدمت انجام دے کر عثمانیا برادری کے کارناموں میں چار چاند لگاتے۔ بہرحال یہاں اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ ان کی بے وقت موت سے علمی ادبی دنیا کو واقعی نقصان پہنچا ہے اگر وہ اور چند سال زندہ رہتے تو ممکن تھا کہ اس سے بھی زیادہ علمی ادبی خدمات انجام دے سکتے۔ آخر میں ہم باقی مرحوم کے پسماندوں سے

حقایق و معارف

افقؔ موہانی وارثی

کم سے کم اتنا تو ہو جاے سکون دل مجھے
موت ہی سمجھا دے آکر درد کا حاصل مجھے

تم پریشاں اب ہو رہنے بھی دو بسمل مجھے
موت کے نزدیک پہنچا دے گا درد دل مجھے

تو یہی کہہ دو کہ منظور نظر ہے دل مجھے
اس سے کیا حاصل بنو قاتل کرو بسمل مجھے

تم نہیں پہلو میں تو مشکل ہے جینا بھی مجھے
تم جو پہلو میں ہو تو کوئی نہیں مشکل مجھے

دیکھ لیں ہاں اہل دل انجام الفت دیکھ لیں
رو رہا ہوں دل کو میں روتا ہے میرا دل مجھے

اک زمانا وہ بھی تھا منزل کی جب تھی جستجو
ڈھونڈتی پھرتی ہے یا اب آپ منزل مجھے

شکوۂ بے مہری اغیار اے دل ہے عبث
جو ہیں اہل دل سمجھتے ہیں وہ اہل دل مجھے

تم اگر چاہو تو ہر مشکل مجھے آسان ہے
تم نہ چاہو تو ہے آسان بات بھی مشکل مجھے

کون ہوگا مجھ سے بڑھ کر اور ناکام حیات
موت بھی آئی تو آئی ہے سر منزل مجھے

خاب سے بھولا سا اک ہنگامہ طوفاں مگر
یاد ہے جوش و خروش دامن ساحل مجھے

کھول دی ساری حقیقت زندگی کی نے
اب دھوکا دے طلسم ہستی باطل مجھے

ہو گیا دشوار افقؔ دو گھڑی کا بیٹھنا!
درد دل لے کر دیا ہے سوز محفل مجھے

سپاہی کی دلہن

چرن سنگھ نازؔ

بیری ہے ساون کا مہینا
دوبھر ہے ایسے میں جینا
آندھی، پانی، بادل، بجلی
موجوں پر ہے اپنا سفینا

اودے اودے بادل چھائے
کویل میٹھے بول سنائے
من کا پپیہا پی پی بولے
مجھ برہن کو کچھ نہ سہائے

سبزا سبزا، بوٹا بوٹا
مہکا مہکا، لہکا لہکا
تال تلیا، بن اور کیاری
ہر سو جوبن نکھرا نکھرا

کھٹی میٹھی اور رسیلی
باغ کی جامن دیکھ سکھی ری
دیکھ ادھر وہ جھولا لگا آیا
دیکھ ادھر وہ سیکر ٹپکی

ایسے سنگھی پردیس گئے وہ
من پہ لگا کے ٹھیس گئے وہ
بھار دو ہر سنگار ہے تن پر
دے کر دکھ کا بیس گئے وہ

دیکھ سکھی ہنستی ہے سکھیا
جھولے جھولی رہی ہے رودھیا
بیاہی ان بیاہی ہر ایک کی
سنگی سنگی جوڑ پہ انگیا

دیکھ کے اپنے تن پر چولی
کر نہ سکی میں من سے ٹھٹھولی
پی پی کہہ کے پاپی پپیہا
بولے نس دن بولی ٹھٹھولی

من میں لاکھ بیروگ لیے ہوں
غم کھائے اور نیر پیئے ہوں
کچھ پردیسی کا بھی غم ہے
کچھ سنگھ پر ہے ہونٹ سیئے ہوں

گھور رہا تھا کل ایک راہی
کوٹھے پر بے سدھ میں کھڑی تھی
مسکی چولی ڈھلکا آنچل
پھر بھی مجھ کو لاج نہ آئی

روپ کی قیمت بھول گئی میں
لاج کی عظمت بھول گئی میں
مانگ روپ جوانی کی بھی
ہر ایک عادت بھول گئی میں

دکھتی رگ چھو لیتا آکر
مست پون کا جھونکا اکثر
ساجن کا سندیس نہ سن کر
کانپ اٹھتا میرا تن تھر تھر

سات سمندر پار سے اڑ کر
بادل چھایا نیل گگن پر
اس سے پی کا حال جو پوچھا
آنگن میں برسا وہ جھر جھر

جیون میرا ان کا ہے غم
جانے ہیں کس حال میں پریتم
پلکوں پر ملتے میں آنسو
پھولوں پر گرتی ہے شبنم

ساجن لام پہ بڑھتے ہوں گے
طوفانوں پر چڑھتے ہوں گے
گرتے پڑتے لڑتے بھڑتے ہوں گے
جلتے بجھتے، کڑھتے ہوں گے

دشمن سب کا پیار سکھی ہے
یہ کیسا سنسار سکھی ہے
مل جل کے رہنے کے بدلے
کھینچتی کیوں تلوار سکھی ہے

کیسا روپ ہا جوانی کیسی
جگ کی پریم کہانی کیسی
کانٹوں کے بستر کے اوپر
کومل روپ کی رانی کیسی

نفرت کا ہنگاما ہر سو
زخمی پھول اور گھایل خوشبو
کو ملتا سندرتا زخمی
عشق کا جوبن بے رنگ و بو

کل کی مہاگن سپنے دھوئے
نل کے لیے دمینتی روئے
پہلی بار جو سجی دلہن
بیچ پہ تنہا سوئے

مرد پہ اے سکھی ناز نا کرنا
پریت کے ساز پہ ہات نہ دھرنا
تلواروں سے مرنے والے
کیا جانیں گے پیار سے مرنا

پیار کا آنسو کھیل ہے ان کا
ایک چھلاوا میل ہے ان کا
مایا موہ سے یہ بچتے ہیں
ناری کا گھر جیل ہے ان کا

یہ تہذیب کے ہیں نرمانتا
سکھ کے بیری دکھ کے داتا
اڑتے ہیں آکاش کے اوپر
جوڑیں گے پر لوک سے ناتا

سورج چاند پہ جلے ہوں گے
پھر بھی نہ پورے سپنے ہوں گے
نیل گگن کی بستی میں بھی
ہر چھن ان کے چرچے ہوں گے

پگ پگ پر ایک لاش بچھا دی
شیطان کی تضحیک اڑا دی
کیا سندر فرماں ہے ان کا
مرگھٹ کی تصویر بنا دی

نر بل کو ہر مرد بلی ہے
پھل سے ادھک ہر مرد چھلی ہے
ان کی سمے کی ہر دھارا میں
کاغذ کی بھی ناؤ چلی ہے

ہات میں ان کے جام جم ہے
ہائیڈروجن اور ایٹم بم ہے
نبض ہوا کی یہ پہچانیں
طوفاں کا سر ان پر خم ہے

آؤ سکھی ایک اگیت سنا دیں
زخمی دلوں میں ایک پیار جگا دیں
پرچم میں ہے خون کی بد بو
آؤ لال آنچل لہرا دیں

لال آنچل میں پیار ہے پہلا
دلہن کا سنگار ہے پہلا
لال آنچل کے لہرانے میں
پیار کا ہی اظہار ہے پہلا

پہلے پیار کی ضد پر آ کر
جائے گا یہ مرد کہاں پر
اس کو امن سے رہنا ہوگا
توڑوں گی میں اس کا خنجر

آؤ سکھی ایسے مسکا دیں
امن کی ہر سو جیوتی جگا دیں
فطرت کی آواز بدل کر
انساں کو انسان بنا دیں

(نیا ہند سے سکریے کے ساتھ)

(۲)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

ڈاکٹر ذاکر حسین

پچھلے نمبر میں اسی موضوع پر ہم نے ہندستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی نشری تقریر پیش کی تھی اور اب علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی نشری تقریر پیش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اہم اہم موضوع پر کبھی ایک تقریروں کا انتظام آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہندستان کے کئی ایک چوٹی کے ماہران تعلیم کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اس سلسلے کی اور بھی تقریریں "ہندستانی ادب" کے آنے والے نمبروں میں پیش ہوتی رہیں گی ۔۔۔ ایڈیٹر

ہندستانی جنتا کے مستقبل کا انحصار ہندستان کے آئندہ تعلیمی ڈھانچے پر ہے۔ اپنے دیش کے طریق تعلیم کو بہتر بنائے بغیر لوگوں سے دیانت دار انہ، منصفانہ اور اشتراک عمل کی زندگی بسر کرنے کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے اور ان میں لوٹ کھسوٹ سے برابر متنفر کا و غیر طبقاتی سماج قایم کرنے کا جذبا کیوں کر پیدا کیا جا سکتا ہے! ہندستان میں تعلیم کے مستقبل کا مسلا ہم سب کی گہری دل چسپی کا مرکز ہے کیونکہ ہندستانی تہذیب کی بنیادوں پر قایم کیے ہوئے سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھنے اور دوسرے لوگوں کو اس سے روشناس کرانے کے تاریخی فرض کی ادائیگی کا انحصار اس مسلے کا کامیاب حل تلاش کرنے پر ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ہندستان میں تعلیمی سہولتوں کی کمی تشویشناک ہے ہمارے ملک کی آبادی کا صرف ۱۰ فی صدی حصا پڑھا لکھا ہے اور تعلیمی سہولتوں میں وسیع پیمانے پر توسیع درکار ہے مجھے اندیشا ہے ہم آئین میں مندرج اس ہدایت کو عملی جاما نہیں پہنا سکیں گے کہ آئین کے نفاذ کے بعد عرصہ دس سال کے اندر اندر تمام بچوں کے لیے چودا سال کی عمر تک لازمی اور مفت تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ پانچ سالا پلان کے تعلیمی پروگرام کو عملی جاما پہنانے کی رفتار بھی سست ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ ہم پہلے پانچ سالا پلان پر عمل کے دوران حاصل کیے ہوئے تجربے سے فایدا اٹھائیں گے اور تعلیمی ترقی کی آیندا سکیموں کو زیادا زیادا تیز رفتاری سے عملی جاما پہنائیں گے۔

چھ سے چودا سال تک کی عمر کے تمام لڑکے اور لڑکیوں کے لیے بنیادی تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا پہلی اسٹیج کے کامیاب طلبا کی ۴۰ فی صدی تعداد کے لیے ثانوی تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا، ہائی اسکولوں کا امتحان پاس کرنے والوں کی دس فی صدی تعداد کے لیے یونیورسٹی کی تعلیم کے انتظامات کرنا ملک کے وسعت پذیر معاشی نظام کی ضروریات کے مطابق ٹیکنیکل تعلیم کی سہولتیں پیدا کرنا اور بنیادی اور ثانوی تعلیم کے اسکولوں کے لیے تقریباً ۷½ لاکھ استادوں کو تربیت بہم پہنچانا ہمارے قومی تعلیمی پروگرام میں شامل ہے اور اس کے متعلق ضروری نظم ونسق تجویز کرنے کے لیے ۲۵ سال کا عرصا درکار ہے اس کا شمار دنیا کی سب سے وسیع تعلیمی تنظیموں میں ہوگا لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم اتنی زبردست تنظیم سے فایدا کیوں کر اٹھائیں گے۔

طریق تعلیم میں اصلاح کے بارے میں کئی تجاویز پیش کی جاتی ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہوائی قلعے بنانے کی بجائے اس مسلے کو بخوبی سمجھکر سائنٹیفک نقطہ نگاہ سے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ مہاتما گاندھی نے اس امر پر زور دیا تھا

کہ چودہ سال کی عمر تک کے لڑکے اور لڑکیوں کو جسمانی محنت کے ذریعے تربیت دی جائے انہوں نے تعلیم کے بارے میں ایک ایسا بیش بہا نظریہ پیش کیا ہے جو مستقبل میں تعلیمی منصوبا بندی کی کسی بھی منزل پر ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ بچوں میں عملی طور پر کچھ کرنے کا ایسا مادہ موجود ہوتا ہے جسے نشو و نما کا موقع دے کر بچوں کی سرگرمیوں کو محض کتابوں کی ورق گردانی تک ہی محدود رکھنا کوئی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ بنیادی تعلیم کے عرصے میں طلبا کی ذہنی نشو و نما میں انفرادیت کا رنگ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور مستقبل کے تعلیمی سسٹم میں ثانوی تعلیم کے ایسے اسکولوں و کالجوں کے قیام کی گنجایش رکھنا لازمی ہے جہاں طلبا کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق ادب سائنس، فن اور زراعت وغیرہ کی تعلیم دی جا سکے اس کے باوجود طلبا کے انفرادی رجحانات کے لیے تسلی بخش انتظامات کرنے میں ناکامیاں رہ جائیں گی۔ چنانچہ اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی طالب علم کا سارا وقت اسکول کے مقررہ کام میں ہی صرف نہ ہو جائے بلکہ طلبا کو ان تہذیبی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے بھی وقت دیا جائے۔ جنہیں اسکول کے مقررہ پروگرام میں جگہ نہیں دی جا سکی۔

مستقبل میں ہمارے تعلیمی اداروں میں معلومات کو تعلیم خلط ملط نہیں کیا جائے گا۔ اسکول میں محض ادھر کی معلومات ہی مہیا نہیں کی جائیں گی بلکہ ذہنی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ہمارے آئندہ تعلیمی سسٹم میں بنیادی اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیمی نقطہ نگاہ سے تخلیقی کام کی اہمیت پر زور دیا جائے گا یہ کام ذہنی بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی بھی شرط صرف یہ ہے کہ یہ سرگرمیاں ہمیں نئے خیالات سے روشناس کرائیں۔ اور مختلف خیالات کو نئے ڈھنگ سے ایک جا کرنے میں معاون ثابت ہوں لیکن اس طرح ذہنی سرگرمیوں میں مصروف اشخاص میں سماج سے بے رخی کا جذبا پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہے جس کے لیے تعلیم کے سماجی پہلو کی طرف توجہ دینا ضروری ہے ادب، فن اور سائنس کے ماہرین کی خدمات سے سماج کو فائدہ پہنچنا چاہیے۔ مستقبل میں ہمارے تعلیمی اداروں کو اجتماعی ترقی کے لیے صحت مند انا اجتماعی مساعی کی تجربہ گاہ ہوں کی حیثیت حاصل ہوگی۔ جہاں طلبا کو عملی زندگی و کام کے ذریعے اپنے حسن کارکردگی و حسن اخلاق کو بہتر بنانے کا موقع ملے گا۔ علم کی اہمیت اسی وقت ہے جب اس سے کوئی کام لیا جائے۔ بعض لوگ اوپر کے خیالات کو ایک خواب سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ ہوں گے لیکن میرے خیال میں ہمارے ملک میں اس قسم کے تعلیمی سسٹم کے وجود میں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اور ہمارے تعلیمی ادارے محض ایک طرفہ نظری تعلیم کے مراکز ہی نہیں رہیں گے بلکہ ان میں انسان کی نشو و نما کے لیے ہر پہلو عملی تربیت کے انتظامات بھی کیے جائیں گے اور یہ طلبا میں خدمتانہ مقاصد کی تکمیل کی بجائے سماجی بھلائی و بہتری کے لیے کام کرنے کا جذبا پیدا کرنے کے مراکز ثابت ہوں گے۔

ناکام آرزو

عزیز الحسن ضیا (عثمانیا)

خیال تھا کہ حق و صداقت کے راستے میں ہم دونوں اس قدر آگے نکل جائیں کہ دنیا کی آویزشیں ہمیں نہ پا سکیں۔
آرزو تھی کہ ہماری زندگی بلور کی طرح شفاف اور موتی کی طرح پاک و صاف ہو جائے۔
تمنا تھی کہ ہماری زندگی وقف ہو محبت کے لیے۔
لیکن ——!
ان خیالات کی تکمیل میں تم نے میرا ہات نہ بٹایا۔ اور تم مجھے ان کٹھن راہوں میں چھوڑ کر مجھ سے بچھڑ گئیں——!
میں تمہاری رفاقت میں وہ سب کچھ کر سکتا تھا جس کا حصول ناممکن سمجھا جاتا ہے —— کیوں کہ ——
تمہارا وجود میرے خیالات کے لیے باعث بلندی اور جذبات کے لیے موجب فزاوانی تھا!

کشمیر کے تاثرات

علی سردار جعفری

کشمیر ایک سبز فام مشوقا ہے جو بانہال کے اس پار دریائے جہلم کے کنارے پھولوں سے بھری وادی میں لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے بال صدیوں سے کسی نے نہیں گوندے اور جسم افلاس کی گرد میں اٹا ہوا ہے۔ کشمیر پہنچ کر شاید پہلا اثر ہر دیکھنے والے پر یہی جان پڑتا ہے اور میں نے بھی یہی محسوس کیا کہ کشمیر کا حسن بے پناہ ہے لیکن وہ افلاس کی چادر میں چھپا ہوا ہے اگر کوئی اس چادر کو سرکا دے تو کشمیر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جگمگا اٹھے گا۔

میں نے کشمیر پہنچ کر جو پہلی نظم کہی اس میں یہی جذبہ کارفرما تھا میں نے محسوس کیا کہ کشمیر جتنا امیر ہے اتنا ہی غریب ہے جتنا ملبوس ہے اتنا ہی عریاں ہے۔ جتنا دلنواز ہے اتنا ہی بدصورت ہے

اے سرزمین کاشمیر شاعر کی فردوس نظر
جنت کی تصویر حسیں آباد روئے خاک پر
ہر شاخ، شاخ گل ہے، یہاں ہر شاخ گل شاخ ثمر

اے سرزمین کاشمیر . . . . . .

نیلم کے کہساروں کے دامن میں زمرد کی زمیں
موتی کی جھالر سے حسیں موج رواں کی آستیں
بہتے ہوئے دریاؤں میں پگھلے ہوئے شمس و قمر

اے سرزمین کاشمیر . . . . . .

سونا اگلتی ہے زمیں چاندی لٹاتی ہے فضا
پی کر شراب لالہ گوں وادی میں آتی ہے ہوا
گویا شراب ارغواں کے جام میں گل ہائے تر

اے سرزمین کاشمیر . . . . . .

یہاں ذرے ذرے کے لیے فطرت کی دولت عام ہے
ہر سنگ کو انعام ہے ہر خشت کو اکرام ہے
انساں کی قسمت میں مگر رد دل و درد جگر

اے سرزمین کاشمیر . . . . . .

پتھر کے ٹیلوں کو ہوا ملبوس برفان عطا
ہے جہاں مناظر کے لیے بھی سبزہ و گل کی قبا
عریاں بدن لیکن ترے فرزند لخت جگر

اے زمین کاشمیر . . . . . .

بانہال سے پہلے کی پہاڑیاں جن کی گود میں دریائے چناب بہتا ہے اور جس کے کنارے کنارے بانہال کی ۹ ہزار فٹ کی بلندی سے گذر کر جب مسافر دوسری طرف پہنچتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے کشمیر کی خوب صورت وادی آجاتی ہے یہ منظر اس طرح اچانک سامنے آتا ہے کہ نظریں حیران رہ جاتی ہیں ابھی چند منٹ پہلے پہاڑ اجاڑ تھے اور اب سامنے ہری گھاس کی مخمل بچھی ہوئی ہے۔ دھان کے کھیتوں کا سمندر موجیں مار رہا ہے سفیدے کے نازک اندام پیڑ ہیں جن کی دور دور پیا قطاریں سڑک کے کنارے پہرا دے رہی ہیں اور جا بجا چنار کے تناور درخت ہیں جن کے گھنے سایے ٹھنڈے بھی ہیں اور دلنواز بھی۔ پہاڑوں کے سینے سے میٹھے پانی کے چشمے چھوٹ رہے ہیں جو نہ معلوم کہاں سے ابلتے چلے آتے ہیں۔ یہ چشمے صدیوں سے بہہ رہے ہیں اور ان کا خزانہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ کشمیر کے مہمان نواز انسانوں کی طرح یہ چشمے ہر مسافر کی پیاس بجھاتے ہیں۔

یہیں بانہال سے گذرنے کے بعد وہ جگہ ہے جہاں سے دریائے جہلم نکلتا ہے اور کشمیر کی وادی کو سیراب کرتا ہوا ولر کی حسین جھیل میں مل جاتا ہے اور پھر اس کے دوسرے کنارے سے پھوٹتا نکلتا ہے اور پاکستان کی سرحد میں داخل ہو کر سمندر میں مل جاتا ہے یہ ویری ناگ کا نیلے پانی کا چشمہ ہے جو دریائے جہلم کے دھانے کے پاس ہے یہاں مغل عہد کا ایک خوب صورت

باغ ہے جس کے بیچوں بیچ چشمہ بہتا ہے اور آگے چل کر جہلم بن جاتا ہے۔
جہلم کے کنارے جہلم کی پوری تاریخ آباد ہے اس کے دونوں کناروں پر کشمیر کی وادی کی باہنیں پھیلی ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے آغوش میں صدیوں کو سمیٹ رکھا ہے اس کے کنارے پامپور کا وہ علاقہ ہے جس کی زمین زعفران اگلتی ہے۔ یہ معشوقۂ کشمیر کا زعفرانی جسم ہے۔ کیسر کی کیاری میں سولہویں صدی میں ایک زعفران کا پھول کھلا تھا جس کا نام جہ خاتون ہے یہ کشمیر کی قومی شاعرہ ہے جس کے نغمے آج بھی کسانوں اور کشمیری عوام کی زبانوں پر ہیں۔ اس کے گیت اب بھی فضا میں تیرتے ہیں ایک کسان لڑکی جس کا نام زون تھا۔ زون کشمیری زبان میں چاند کو کہتے ہیں زون اپنے گھر میں زون تھی۔ اس کی شاعرانہ فطرت اور دل موہ لینے والی آواز اسے شاہی محل میں لے گئی جہاں کہ وہ ملکا جہ خاتون بن گئی اور اب وہ کشمیر کے دل کی ملکا ہے۔

پامپور سے آگے سری نگر کا تاریخی شہر ہے۔ یہ ہے سلت پلوں کا شہر جو کئی میل لمبا ہے۔ کشمیر کے طوفانوں کا گہوارا رہ چکا ہے۔ اس شہر کے آس پاس پانی نے اپنی چاندی کی چادر بچھا رکھی ہے اور ڈل کی خوب صورت جھیل ہے۔ جس میں طرح طرح کے بوٹ اور شکارے ہیں۔ اور کنول کے پھول تیرتے رہتے ہیں ڈل کے گرد نئے چاند کی طرح مغل باغات کا ہالا ہے اب صرف نشاط اور شالیمار باغ ہیں لیکن کہتے ہیں کہ مغل بادشاہوں نے اس جھیل کے گرد ۷۷ باغات بنائے تھے جن میں لاکھوں روپے کے گلاب کے پھول ہوتے تھے۔

اس شہر نے کشمیر کے اہل علم کی پرورش کی۔

اس نے مغلوں کو اپنے دامن میں لیا جنہوں نے کشمیر کو اپنی عیاشیوں کے لیے دلہن کی طرح سجایا تھا۔ اس نے پٹھانوں اور سکھوں کا راج دیکھا اور پھر اس نے کشمیر کو فروخت ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کو مختلف قسم کی سازشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں قبائلیوں کا حملہ بھی ہوا جس کے خلاف کشمیر کی حفاظت کرنے اس شہر کے سپوت اٹھے اور پھر پہلی بار کشمیر میں کشمیریوں کا راج آیا۔

اس شہر کے آگے ولر کی جھیل ہے جو بارہ میل لمبی ہے اور ہمیشہ پرسکون اور خواب آلود رہتی ہے اور جھیل میں آکر جہلم مل جاتا ہے جہلم کشمیر کی جان ہے اس کی شاہ رگ ہے۔ جہلم کا پانی خون کی طرح کشمیر کی رگوں میں دوڑتا ہے اور اس دریا سے معلوم نہیں کتنے گیت پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے بھی ایک نظم کہی ہے۔۔۔ "جہلم کا ترانا" اس کے دو چار بند یہ ہیں۔

مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں
ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں رہتا ہوں میں

وادی میں لہراتا ہوا
سبزے سے اٹھلاتا ہوا
سو پیچ و خم کھاتا ہوا
ہنستا ہوا گاتا ہوا

ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

موجوں کی زلفیں کھولتا
قطروں کے موتی رولتا
معشوقۂ کشمیر کے
پہلو میں اترا تا ہوا

ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

الماس پاش انجم فشاں
پیراہن آب رواں
دوشیزۂ مہتاب کو
آئینا دکھلاتا ہوا

ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

کھیتوں کے دامن میں یہاں
باغوں کے سائے میں وہاں
اپنی شراب ناب کے
ساغر کو چھلکاتا ہوا
ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں تنہا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

مثل بتان سیم تن
وادی یہ وادی گام زن
موج نسیم صبح کی
جنبش کو شہ دیتا ہوا
ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں تنہا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

جو ذرہ ہے سیراب ہے
جو خاک ہے شاداب ہے
خون بہار جاوداں
رگ رگ میں دوڑاتا ہوا
ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں تنہا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

فطرت مری آوارگی
آزادگی و سرکشی
طوفاں سے ملتا ہوں گلے
ساحل سے ٹکراتا ہوا
ہر دم رواں ہر دم دواں ہر دم جواں تنہا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

جہلم کی اس روانی میں کشمیر کا مستقبل بھی پوشیدہ ہے یہاں بہتے ہوئے پانی کی افراط ہے جس سے ساری وادی بجلی کی روشنی سے جگمگا سکتی ہے۔ یہاں کی زمین میں بے شمار دھاتیں اور دولت چھپی ہوئی ہے۔ جو کشمیر کے افلاس کو دور کر سکتی ہے۔ یہاں کے پھول عطر دے سکتے اور پھل شربت اور مختلف قسم کے شوربات۔

جس دن کشمیر کے جسم سے افلاس کی چادر اتر جائے گی وہ حسین سے حسین تر ہو جائے گا۔

شاعر کو یقین ہے کہ نکھر آئے گا اک روز
وہ حسن جو افلاس کی چادر میں ہے پنہاں

دلنواز!

رزمی

دلنواز! تم میری روح میں اس طرح سما گئی ہو جیسے شراب میں کیف و مستی اور پھول میں رنگ و بو۔ اگر میں تمہیں بھولنے کی کوشش کروں تو یہ میرے لیے ایسا ہی محال ہے جیسے کسی شخص کا ریشم کی گرہ کا کھولنا جس کے ناخن تراش دیے گئے ہوں۔

یہ میرے دل کا ایمان ہے کہ تم کرک شب تاب کی روشنی میں مسکراتی ہوئی کلی سے زیادہ شاداب ہو اور پھولوں میں اٹکھیلی کھیلنے والی حسین تتلیوں سے زیادہ معصوم.....

دنیا رموز عشق کیا جانے!

وہ دنیا جو امرت جیسے میٹھے پریم کو نیم کے تیل اور حنظل سے زیادہ کڑوا جانتی ہو۔ اس کی غلط فہمی بجا اس کا برا کہنا درست اسے برا کہنے دو۔ تم اس کی پروا نہ کرو۔

میری تمنا ہے۔

جب سوختہ جگر کوئل کی "کو" بھیگی فضا میں تڑپنے لگے تو تم سبزاوڑنی اوڑھے ادھر سے گذر جانا۔ میں رنگ و بو کے مہین پردوں سے تمہیں دیکھوں گا۔

اس وقت ——

تمہارا جلوہ، رخ میرے لیے جلوہ سحر۔ تمہاری لو سے زلف میرے لیے مشام گل۔ تمہارے کان کے آویزے صبح کے دو جھلملاتے تارے اور تمہاری "طوطی پر" ایسی سبز چوڑیوں کی جھنکار بلبل ہزار داستان کی نغمہ سنجی سے زیادہ دل کش معلوم ہوتی ہے۔ . . . . .

برٹش گی آنا

ب۔ ا

برٹش گی آنا جنوبی امریکا کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے اور یہ ایک برطانوی نوآبادی ہے۔ اس جگہ دو اور نئی آبادیاں بھی واقع ہیں ایک کا نام ہے نیدرلینڈز گی آنا اور دوسری کا نام ہے فرینچ گی آنا۔ برٹش گی آنا کا رقبہ ۸۳ ہزار مربع میل ہے اور جارج ٹاؤن اس کی راجدھانی ہے۔ ۱۹۴۶ء کی مردم شماری کے برابر اس نوآبادی کی مردم شماری ۴۵۱، ۳۷۵ تھی۔ اور اندازا لگایا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء کے ختم پر آبادی ۴۳۷، ۰۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ مختلف نسلوں کے لوگوں کی تعداد یہ ہے۔

ایسٹ انڈینز	۱۹۷، ۶۹۶
افریقی	۱۵۸، ۹۴۵
امریکی انڈینز	۱۷، ۴۲۴
پرتگالی	۸، ۷۱۲
یورپی	۳، ۸۶۵
چینی	۳، ۵۲۷
ملی جلی نسلوں کے لوگ	۴۶، ۸۵۵
دوسری نسلیں	۳

قدرتی ذرائع

برٹش گی آنا کے ایک بہت بڑے حصے میں جنگلات پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۰۰ ایکڑ سے کچھ زیادہ زمین زیر کاشت ہے جس میں سے ۱۶۷، ۰۰۰ ایکڑ زمین میں گنے کی کاشت کی جاتی ہے نوآبادی کے اندرونی حصے میں، سونا بہت ہے۔ باکسائٹ (جس سے ایلومینم بنایا جاتا ہے) پہلے ہی سے دریافت ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں وہاں ٹینگسٹن کا بھی پتا لگا ہے۔

نئے آئین کے تحت تمام بالغوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا تھا۔ اپریل میں جو انتخابات کرائے گئے تھے ان میں جیت پیپلز پروگریسو پارٹی کی ہوئی تھی۔ یہ ایک بائیں بازو کی پارٹی ہے اس نے ۵۱ فی صدی ووٹ حاصل کیے اور ہاؤس آف اسمبلی کی ۲۴ نشستوں میں سے ۱۸ پر اس کا قبضہ ہو گیا باقی ۶ نشستوں میں سے ۲ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی اور ۴ آزاد امیدواروں کے حصے میں آئیں۔

آئین کے برابر اگزیکٹو کونسل کے ۱۱ ممبران میں سے ۶ پیپلز پروگریو پارٹی سے لیے گئے۔ برٹش گی آنا کا نیا آئین ایک کمیشن کی سفارشات کے برابر بنایا گیا تھا۔ شمالی روڈیشیا کے سابق گورنر سر ای۔ جے آرنگٹن اس کمیشن کے چیرمین تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر وی۔ ٹی ہارلو اور فیبین نوآبادیاتی بیورو کے آنریری سکریٹری ڈاکٹر ریٹا ہنڈن کمیشن کے ممبران تھے۔

کمیشن کی سفارشات پر تبصرا کرتے ہوئے وزیر نوآبادیات نے کہا تھا کہ "میں کمیشن کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ برٹش گی آنا اب سیاسی ترقی کی ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا ہے جب وہاں کے عوام کو حکومت کے معاملات میں بہ نسبت زیادہ حصہ لینے کا موقع ملنا چاہیے۔ چنانچہ میں عام رائے دہندگی مجلس قانون ساز میں منتخب کیے۔ ممبران کی اکثریت منتخب کیے ممبران کی جانب ونمائندگی ذمے داری کے متعلق کمیشن کی سفارشات کو اصولاً منظور کرتا ہوں۔"

نئے آئین کے تحت برٹش گی آنا کی لیجسلیچر دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ایوان زیریں ——— یعنی ہاؤس آف اسمبلی میں منتخب کیے ممبران کی اکثریت ہے اور ایوان بالا یعنی اسٹیٹ کونسل کے ممبران کو گورنر نامزد کرتا ہے اس ایوان کے چھ ممبروں

گورنر خدا نماز کرتا ہے۔ دو ممبروں کو وہ ایکزیکیٹو کونسل کے چھ منتخب کیے ممبران یعنی وزیروں کی سفارش پر نامزد کرتا ہے اور ایک ممبر کو وہ ہاوس آف اسمبلی کے اقلیتی گروپوں وہ آزاد ممبران کے مشورے سے نامزد کرتا ہے۔

ہاوس آف اسمبلی کے سبھ منتخب شدہ ممبران اور اکیس آفیشو (سرکاری ممبران) ممبران ہیں۔ اسپیکر کو باہر سے مقرر کیا جاتا ہے۔ ہاوس آف اسمبلی کے ممبران ڈپٹی اسپیکر کو خود مقرر کرتے ہیں۔ اسپیکر کو جسے گورنر مقرر کرتا ہے کاسٹنگ ووٹ (رائے جو دو برابر کے فریقین میں فیصلا کرے) دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی تجویز پر ایوان مساوی طور پر بٹا ہوا تو وہ مسترد کر دی جاتی ہے۔ ایوان کے چھ ممبران کو وزارتی عہدے دیے جاتے ہیں۔

لیجسلیچر کی میعاد چار سال ہے اور بعض حالات میں گورنر دونوں ایوانوں کا ایک ملا جلا اجلاس بلا سکتا ہے جس کی صدارت کے فرایض اسپیکر سرانجام دیتا ہے۔

ایکزیکیٹو کونسل میں گورنر، تین سرکاری ممبران ایک ممبر جسے اسٹیٹ کونسل چنتی ہے اور چھ وزرا شامل ہیں۔ ایکزیکیٹو کونسل کی صدارت کے فرایض گورنر سرانجام دیتا ہے اور اسے کاسٹنگ ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ چیف سکریٹری فینانشل سکریٹری اور اٹارنی جنرل سرکاری ممبران ہیں گورنر کو مخصوص اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن عام طور پر وہ کونسل کے مشورہ پر عمل کرتا ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں نسلی تعلقات کے شعبے کا قیام

آکسفورڈ یونیورسٹی میں سیسل رہوڈس کی سو سالانگرہ کی یادگار کے طور پر ایک نیا شعبا کھولا جا رہا ہے جس کا نام نسلی تعلقات کا شعبا ہوگا۔

کلچرل میدان میں برٹش کونسل کا کارنامہ

برٹش کونسل کی سالانا رپورٹ بابت ۵۳-۱۹۵۲ء حال ہی میں شایع ہوئی ہے اس رپورٹ سے ظاہر ہے کہ برٹش کونسل نے اس سال کے دوران سمندر پار سے آئے ہوئے ۳۵۰۰ مہمانوں کی دیکھ بھال کی ذمے داریاں اپنے سر لیں۔ ۶۷۰ مہمان دولت مشترکا کے ممالک سے آئے تھے ان میں سے بعض لوگ تو برٹش کونسل کی مدد سے برطانیا آئے تھے اور دوسرے کو لمبو منصوبے کے تحت یا اقوام متحدا یونیسکو اور عالمی صحت ادارے کے وظیفوں پر برطانیا آئے تھے۔ برٹش کونسل نے دولت مشترکا کی یونیورسٹیوں کے درمیان تبادلے کی جو اسکیم جاری کی ہے وہ بہت کامیاب رہی ہے اور آشا ہے کہ اس سال اس اسکیم سے زیادا دلچسپی لی جاے گی۔ اس سال سال کے دوران کونسل نے کامن ویلتھ یونیورسٹیوں کے ٹیچروں اور تلبا علین کو سفر کے لیے ۴۰۰ وظیفے دیے تاکہ وہ برطانیوی یونیورسٹیوں کا معائینا کر سکیں۔ اس وظیفے ہندستانی باشندوں کو دیے گئے۔ برٹش کونسل کی شاخیں دنیا بھر میں کام کر رہی ہیں۔ ہندستان میں اس کونسل نے دہلی۔ بمبئی، کلکتا اور مدراس کے مقامات پر اپنے دفتر قایم کیے ہوے ہیں ہندستان میں کونسل کے مقرر کیے ہوے ایجوکیشن افسران نے انگریزی زبان اور برطانیا کے تعلیمی طریقوں کے متعلق متعدد کورسوں کا انتظام کیا ہے۔ ہندستان میں برٹش کونسل برطانوی کالجوں وہ یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی امور کے متعلق لوگوں کو اطلاعات بہم پہنچاتی ہے۔ بمبئی۔ کلکتا اور مدراس میں اس کے قایم کیے ہوے کتب خانے لوگوں کو پڑھنے کے لیے مختلف موضوعات پر کتابیں دیتے ہیں۔ فلم شو دکھاے جاتے ہیں۔ نمائشیں منعقد کی جاتی ہیں اور طلبا کو وظایف دیے جاتے ہیں رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ برطانیا اور دولت مشترکا کے کلچری رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے برٹش کونسل سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔

بدنامی کے چوراہے پر

صبا نقوی

پیاری سیکلا! ——

تم سے تمہارے مکتوب کی تلخی کا شکوا کیوں کر کر سکتی ہوں جبکہ تم ہمیشا کی جلد باز ہو۔ اگر تم نے ایسی ویسی باتیں سن کر میرے متعلق غلط اندازے قایم کر لیے تو نہیں قصوروار کیوں کر گردانو ——— یہ تو تمہاری فطرت کا تقاضا تھا ——— جسے تم نے پورا کر دیا میں تمہاری اس محبت کو کیسے بھلا سکتی ہوں۔ جس کے رشتے کو واہگا کی بلند و بالا آہنی دیوار بھی منقطع نہیں کر سکی ——— تم مجھے پہلے سے زیادہ پیاری ہو ——— کاش تمہاری پیاری صورت کی بلائیں لینے کو کسی طرح تم تک پہنچ سکتی ——— تعجب ایک بات کا ہے کہ آخر تمہیں میرے متعلق اتنی دور بیٹھے آخر یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا میں جانتی ہوں کہ چاہے کتنی ہی قسمیں اٹھاؤں ——— تمہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں۔ لیکن تم ماننے والی کب ہو۔ ہے تو شاید آج تمہیں وہ سب کچھ بتا دینا پڑے جسے اب تک سوائے میرے کوئی نہیں جانتا ——— دنیا والے مجھے قصوروار ضرور کہتے ہیں۔ اور انہیں ایسا کہنا بھی چاہیے ——— انہیں بات بنانے کے لیے کسی موضوع کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ کسی بات کی وجہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتے ——— وہ مجھے چاہے کتنا ہی گناہگار کہیں لیکن میں تمہاری قسم کھاتی ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ——— میں نے عہد کیا تھا کہ میں یہ راز اپنے سینے میں ہی لے جاؤں گی لیکن آج دیکھتی ہوں کہ بلا کہے نہیں بنتی۔ اور یہ بھی میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ تم اپنے اس اعتماد کو ——— پہنچنا پسند نہیں کرو گی جو میرے دل میں ہے۔

تم بھول تو نہیں گئی ہو گی کہ ہماری آخری ملاقات اس پیارے اور حسین شہر کے اسٹیشن پر ہوئی تھی جس کے چپے چپے کے ساتھ ہماری مشترکا یادیں وابستا ہیں۔ جس کے در و دیوار اب تک ہمارے قہقہوں کو نہیں بھلا سکے۔ اور جہاں کے گرلز اسکول کے ذرے ذرے سے ہماری الھڑ کھی شرارتیں جانے کب تک ابلتی رہیں گی۔ تم مزید تعلیم کے لیے لاہور چلی گئیں۔ اور انقلاب نے تمہیں ادھر کی ادھر واہگا کے پار لیجا پھینکا۔ میری قسمت کو ابھی نئے نئے گل کھلانے تھے ——— مجھے اپنے والدین۔ گھر ——— خاندان، کنبا اور برادری کے لیے کلنک بننا تھا۔ میرے والد کا تبادلا اس شہر کا ہو گیا۔ جہاں کا ہر نوجوان آج میرے نام سے واقف ہے۔ جہاں کی ہر گلی میں کوئی نہ کوئی ایسا نوجوان مل سکتا ہے جو میرے خلاف زہر اگلنا مذہبی فرایض سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہے اور جس کے گالوں پہ میری انگلیوں کے نشان ہر دیکھنے والے کو نظر آ سکتے ہیں۔ اسی شہر میں آج بھی میں ہر بزرگ کی زیر دست سے زبردست بد دعاؤں کے باوجود زندا و سلامت موجود ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں اس وقت تک زندا رہوں گی جب تک میرا انتقام پورا نہیں ہو جاتا۔

یہاں آتے ہی ہمیں ایک بہت اچھا مکان مل گیا تھا۔ اور مجھے بھی اپنے لیے علٰحدا کمرا حاصل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سردی کا موسم تھا اس لیے میں نے چھت پر بھی اپنے لیے ایک کرسی رکھ چھوڑی تھی۔ صبح کے وقت علوم کتاب یا رسالے کر اوپر چلی جاتی۔ اور تازا دھوپ کی نرم اور گرم شعاعوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب مشغلا مطالعے میں بھی مصروف رہتی۔

ایک دن میں حسب معمول دھوپ میں بیٹھی کوئی غیر دلچسپ سی کتاب پڑھ رہی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ سامنے والی چھت سے

مجھے کوئی گھورے جا رہا ہے۔ نظر اٹھائی تو ایک خوبرو نوجوان سامنے والی چھت کی مینڈھ کا سہارا لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ جھینپ سا گیا اور جیسے بالکل بے تعلق ہو کر ادھر ادھر تکنا شروع کر دیا۔ لیکن جانے کیوں مرے دل میں ایک نامعلوم سی خواہش پیدا ہوئی کہ یہ لڑکا میری طرف یوں ہی دیکھتا رہے۔

پندرہ اور پچیس سال کا درمیانی زمانہ بڑا نازک ہوتا ہے خصوصاً عورت کے لیے۔ کیونکہ سماج میں جہاں مرد کی بے شمار دانستہ خطائیں بھی قابل معافی ہوتی ہیں وہاں عورت کی کوئی نادانستہ معمولی سی لغزش اس کے لیے تمام عمر کا پچھتاوا بن سکتی ہے لیکن ہمارے ہاں لڑکیوں کی تربیت اس قدر محتاط ہوتی ہے کہ انہیں اپنے گھر میں نوجوانی کی معصومیت کے کسی سوال کا جواب نہیں ملتا اور جب اندھی جنجوان کے سوالوں کے جواب تجربات کے ذریعے ہم پہنچا دیتی ہے تو معصومانہ سوالوں پر انہیں جھڑک دینے والے بزرگ انہیں ہی مورد الزام بھی ٹھہرانے لگتے ہیں۔

مجھے بھی اس دن رات گئے تک نیند نہیں آئی۔ میں اسی لڑکے کے متعلق سوچتی رہی۔ مجھے رہ رہ کر اس کی گھورتی ہوئی نظروں کا خیال آ رہا تھا اور ایک عجیب قسم کی خمگشار سی لذت محسوس ہوتی تھی اور سردی محسوس نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے گرد لپٹی ہوئی رضائی کو غیر ارادی طور پر اور زیادہ لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دوسرے دن میں جلد ہی چھت پر پہنچ گئی۔ اگرچہ بظاہر ہر طرف سے بے تعلق ہو کر کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ مجھے عین کل والی جگہ سے دو آنکھیں گھورتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے گردن اٹھائی تو وہی لڑکا کھڑا تھا اور آج وہ واقعی کھڑا رہا۔ نظریں ملیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ جیسے میرے بدن میں خون کا ہر قطرہ شراب بن گیا ہو۔

اب میں زیادہ اوپر ہی رہنے لگی۔ نیچے دل ہی نہیں لگتا تھا۔ کام تو پہلے بھی کونسا تھا لیکن اب تو نیچے بیٹھ کر اخبار کی چٹیلی سے چٹیلی خبر بھی دلچسپ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اور دلچسپ سے دلچسپ کتاب بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ذرا سا موقع بھی ملتا تو اوپر پہنچ جاتی اور اس وقت تک اترنے کا نام نہ لیتی جب تک کسی کام سے بلائی نہ جاتی وہ بھی ہر وقت جیسے میرا منتظر ہی کھڑا رہتا تھا۔ اب لڑکا ہوں کی زبان کے ساتھ ساتھ اشاروں سے بھی کام لیا جانے لگا۔

اگرچہ اس مسلسل نظر بازی کی یکسانیت سے اکتا تو میں بھی گئی تھی۔ اور ذرا اور آگے بڑھنے کو دل رہ رہ کر مچل جاتا تھا مگر اپنی فطری شرم و حیا مانع ہوتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے ہی ہمت کی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو کوئی چیز ایک جھٹکے کے ساتھ دکھ ہاتوں سے نکل کر میرے قدموں میں آ پڑی۔ کھول کر دیکھا تو اینٹ کے چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ بندھا ہوا محبت نامہ تھا۔ میں پڑھ کر جھوم جھوم گئی۔ کیسی پاکیزہ اور پیاری تحریر تھی۔ اور حسب موقع اشعار گویا انہیں کہا ہی اس موقع کے لیے گیا تھا۔ اور پھر اس کا والہانہ اظہار محبت اور آخری دم تک اسے نبھانے کا پیمان ——— میں جیسے زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑی جا رہی تھی ———

اب اگرچہ یہ ہمارا معمول بن گیا تھا اور ہر روز کم سے کم ایک دو پرچوں کا تبادلہ ضرور ہو جاتا تھا۔ کچھ ہلکے پھلکے تحائف بھی ایک دوسرے کو بھیجے گئے لیکن فطرت انسانی نے کچھ اور آگے بڑھنے کا تقاضا کیا اور اس تقاضے پر اس کا اصرار تشنا زیادہ بن گیا تو ایک دن ہم نے راکسی سینما میں دوسرے شو پر ملنے کا پروگرام بنایا۔ گھر سے ایک سہیلی کے ہاں جانے کی اجازت لی اور میں وقت پر مقررہ جگہ پر پہنچ گئی۔ وہ باکس ریزرو کرائے پہلے سے میرا منتظر تھا۔ ہم فوراً ہی اندر جا بیٹھے ——— کھیل شروع ہوا۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی انگلیاں رینگتی ہوئی میری انگلیوں میں پیوست ہو گئیں۔

میرے تمام بدن میں جیسے میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی۔ دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی اور میں کچھ ایسی کھو سی گئی کہ بات چھڑانے کا ہوش بھی نہ رہا۔

وہ ایک مالدار گھرانے کا لڑکا تھا۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اور اب اپنے ذاتی کاروبار کے سلسلے میں یہاں مقیم تھا۔ ہمارے پڑوس کا پورا مکان کرایے پر لے رکھا تھا۔ کھانا ہوٹل سے کھاتا تھا مزید خدمت کے لیے ایک ملازم رکھے ہوئے تھا جو اپنے فرائض کی انجام دہی سے فارغ ہو کر رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

سینما کی پہلی ملاقات کے بعد اس کی برابر یہ کوشش رہی کہ ہماری دوسری ملاقات جلد سے جلد ہو۔ لیکن میرے لیے یہ بات اتنی آسان نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ دوسری ملاقات اس کے اپنے مکان میں ہو لیکن مجھے وہاں جاتے کچھ انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا۔ اکیلا اگر ــــ وہ اور میں ــــ اف! جانے وہ کیا کر بیٹھے میں اس پر رضامند نہ ہوئی لیکن دوسرے ہی ہفتے ہماری دوسری ملاقات کا سامان پیدا ہو گیا۔

اس دن بھی سینما کا پروگرام بنا۔ مجھے اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ پر جانا تھا۔ وہاں سے جلدی جلدی فارغ ہو کر نکلی اور سیدھے سینما چلی گئی۔ وہ حسب توقع منتظر تھا۔ باکس ریزرو ہو چکا تھا۔ ہم جب اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھے تو کھیل شروع نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج اس کے ہاتھ نے میرے ہاتھ تک پہنچنے کے لیے تاریکی کے سہارے کی ضرورت نہ سمجھی اور جانے میں بھی کیوں مزاحمت نہ کر سکی ــــ

ہال کی روشنی گل ہوئی فلم شروع ہوئی لیکن میں تو کوئی ایک سین بھی پورا نہ دیکھ سکی۔ اس نے اندھیرا ہوتے ہی میری کرسی کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کر دیا ــــ تھوڑی دیر میں قریب سے قریب تر ہو گیا ــــ پھر اپنی پوری قوت سے اس نے مجھکو اپنے بازوؤں میں جکڑ لینے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے فوراً ہی اسکو بری طرح سے پھٹکار دیا اور میں بالکل از خود رفتہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اور جب اس نے پھر سے میرے قریب ہونے کا ارادہ کیا تو میں نے اس کو منع کر دیا۔ اور میں جیسے کھوئی کھوئی سی ہو گئی۔ بعد میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی خفیف سا ہو گیا تھا ــــ

دن گذرتے رہے ــــ ہماری محبت شوق و تمنا کی منزلیں طے کرتی رہی۔ میں یہی سمجھی تھی کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے میں نے اس کے ہر عہد کو سچ جانا۔ اور ہر وعدے پر اعتبار کر لیا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے پیار کے پردے میں بڑا زبردست دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اور ایک حسین جال بچھا کر مجھے پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مرد دھوکے باز جھوٹے ــــ فریبی ــــ وعدہ خلاف اور مکار لٹیرے ہوتے ہیں ــــ مجھے خبر نہ تھی کہ مردوں کے عہد و پیمان ایک مٹی کے پیالے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جنہیں انسان استعمال کرتا ہے اور بلا کسی رد و کد اور افسوس کے توڑ دیتا ہے کیونکہ بازار سے ویسے ہی کتنے پیالے اور مل سکتے ہیں۔ عورت بالکل معصوم اور بھولی بھالی ہوتی ہے۔ وہ پاکیزہ فطرت پیدا ہوئی ہے لیکن مردوں کی ہوس کاری نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ بیوا ــــ طوائف ــــ کسبی ــــ ایکٹرس ــــ پیشہ ور عورتیں کیا کیا بن کر رہ گئی۔ مرد ہزاروں لاکھوں گناہوں کے بعد بھی پاک و صاف رہتا ہے۔ لیکن عورت عورت کے لیے نادانی کی ایک معمولی لغزش بھی عمر بھر کا کلنک بن جاتی ہے ــــ اس کے بعد وہی مرد اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس پر نام رکھتے ہیں ــــ اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اس کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں ــــ وہی مرد جنہوں نے کبھی اپنی مکاریوں کے سہارے اس معصوم عورت کو سات پردوں کے پیچھے سے نکال کر چوراہے میں لا بٹھایا تھا ــــ اور جن کی ہوس پرستی اب بھی اس کے شبستان میں بار پانے کی آرزومند ہوتی ہے ــــ

ہاں! تو مجھے بھی کچھ اس قسم کے حالات سے واسطا پڑا۔ پہلی دو ملاقاتوں کے بعد کی ملاقاتیں معمولی اور غیر رسمی سی تھیں۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ مجھے کسی مرد سے اپنی زندگی میں پہلی مرتبا ایک ایسی حیثیت سے ملنا پڑا کہ اس ملاقات کی نوعیت نے اپنے لیے آخری مرتبے کا درجا بھی حاصل کر لیا۔ اس نے اپنے مسلسل پیہم اور پرزور اصرار سے مجھے اس بات پر راضی کر لیا کہ میں اس سے اس کے گھر جا کر ملوں۔ اس سے بڑی دلیل یہ تھی کہ وہاں خوب دل کھول کر باتیں کر سکیں گے۔ جس کا موقع اور کہیں میسر نہیں ہو سکتا۔ میری بھی بڑی تمنا تھی کہ جی بھر کر پیار و محبت کی باتیں کروں۔ رازو نیاز کی دنیا کی سیر ہو۔ محبت کے عہد و پیمان پر پختگی کی مہریں ثبت ہوں اور کبھی جدا نہ ہونے کے وعدوں کے سہارے ایک نئی دنیا کی تعمیر کا پروگرام بنایا جائے۔

وہ اپنے بازوؤں کا سہارا دیے مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جہاں مدھم نیلی پرا سرار سی روشنی نے فضا کو بڑا جذباتی بنا رکھا تھا۔ اور جہاں طرح طرح کی تیز خشبوؤں کا سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ رنگین اور نہ خشنما پردوں کے درمیان رنگ برنگ کے خشبودار پھولوں سے ڈھکا ہوا پلنگ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بڑے ہی رومان پسند نوجوان دل کا انتظار کر رہا ہو۔ میں اس پرا سرار ماحول میں پہنچکر جانے کیوں یہ محسوس کرنے لگی کہ میں ایک ایسی دنیا میں آ گئی ہوں جو میری اپنی ہے اور جہاں سے مجھے واپس کھینچنے والا کوئی نہیں ــــ میں کھو سی گئی اور وہ اپنی شخصیت سے مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میں بلکل بے بس ہو گئی۔ وہ شرابیوں کی طرح جھوم کر مجھے یوں گھورنے لگا جیسے کئی روز کا بھوکا شیر اپنے شکار کو ہڑپ کر لینے کا تہیا کر چکا ہو۔ اس نے اپنے مضبوط بازوؤں میں مجھے آہنی مضبوطی سے جکڑ کر اس زور سے بھینچا کہ میری سانس رک کر رہ گئی۔ وہ دفعتہ جذبات میں اور زور سے بھینچا چلا گیا ــــ یہاں تک کہ میری ہڈیاں چرچرا گئیں ــــ اب تک تو خیر تھی لیکن جب اس نے اس سے بھی آگے بڑھنا چاہا تو میں مچل گئی۔ اس کی بے باک انگلیاں میرے جسم کو ٹٹولتے ہوئے حد سے آگے گزرنے لگیں تو میں نے انہیں روک دیا ــــ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے تیزی سے ہوس کاری ــــ کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے واپس آجانے کی کوشش کی۔ لیکن اب رستا بند ہو چکا تھا ــــ میرے پاؤں شل ہو گئے تھے ــــ اس کے وعدوں۔ پیمانوں اور عہدوں کے سبز باغ نے مجکو دھوکا دیا تھا اس کے جذباتی ہتھکنڈوں نے مجھے بہکا دیا تھا۔ میں بے بس اور مجبور سی ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود میں نے اس کو اس کے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

یہ واقعا میری زندگی میں پہلی بار پیش آیا تھا۔ میں کئی دن تک بڑی کھوئی کھوئی سی رہی۔ ایک ڈر اور خوف مجھ پر ہر وقت سوار رہتا تھا۔ جس کی خبر مجھے معلوم نہیں تھی۔ مگر اس کی تسلیوں نے جلد ہی مجھے اپنی پہلی جگہ لا کھڑا کیا۔ مگر طبیعت بحال ہوتے ہی ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا یعنی پہلے والے صاحب کے کان میں بھنک پڑتے ہی انہوں نے مجکو بدنام کرنا شروع کر دیا ــــ میں ابھی اس مصیبت کا مقابلا کرنے کی بابت سوچ ہی رہی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اسے بھی مطمئن کر دوں لیکن وہ اچھے زمانے کے ساتھیوں کی طرح مشکلات سے فرار حاصل کر کے جا چکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے باہر چلا گیا ہے میں انتظار کرتی رہی ــــ پروگرام بناتی رہی ــــ نئی نئی ترکیبیں سوچتی رہی۔ تدبیروں کی ادھیڑبن میں مبتلا رہی لیکن میرے انتظار کی شام نے صبح کی طرف رینگنے سے انکار کر دیا۔ اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ میرے دل میں شکوک و شبہات ابھرتے اور جتنا ابھرتے رہے یقین کا رنگ اختیار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے پختا یقین ہو گیا کہ مجھے

دھوکا دیا گیا ہے کیونکہ ہمارے سامنے والے مکان میں کوئی نئے کرایہ دار آرہے تھے۔

شکیلا پیاری! اس وقت کا تصور کرکے کانپ اٹھتی ہوں۔ میں اب تک حیران ہوں کہ ایک مشرقی گھرانے کی باعزت لڑکی ہونے کے باوجود اس وقت میں نے خودکشی کیوں نہیں کرلی کتنی اذیت اور کرب کا ہفتہ تھا وہ ایک ہفتہ ــــ جس کا ایک لمحہ بھی کسی میرے ماحول کی لڑکی کو مل جائے تو جان ہی لے کر ٹلے۔ لیکن میں زندہ رہی ــــ بالکل اسی عالم میں ــــ پورے ایک ہفتے تک ــــ شاید قدرت میرے ذریعے ان مردوں سے انتقام لینا چاہتی تھی جن سے مجھ جیسی لڑکیوں کو ہر روز واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

بہن! اس حادثے کا میرے دل اور دماغ پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ میں واقعی بیمار پڑ گئی تھی۔ مگر بظاہر کوئی مرض دکھائی نہ دیتا تھا۔ گھر بار پریشان تھا علاج ہوتا رہا ــــ عرصا بعد مجھکو صحت ہو گئی اور اب میں بالکل ہی صحت مند اور اچھی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں ہر وقت بے حد پریشان سی دکھائی دیا کرتی ہوں۔ نہ معلوم کیوں ــــ ؟

ــــ تو شکیلا! یہ ہے وہ داستان جسے میرے بعد صرف تم جانتی ہو۔ جس سے گھر والے بھی واقف نہیں۔ جن کے ساتھ میں ہر وقت رہا کرتی تھی۔ تمہاری محبت بھری شکایت مجبور نہ کر دیتی تو شاید میری زبان کبھی اس سے واقف نہ ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے مردوں سے نفرت ہے شدید نفرت، بے انتہا نفرت والدین کے لیے میں اب تک معما ہوں انہیں معلوم ہے کہ میں مردوں سے گہری نفرت کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں مردوں کی طرف اب بھی مایل ہو جاتی ہوں ــــ اور ساتھ ہی ان کا کوئی ذریعہ اس بات کی تصدیق نہیں کر سکا کہ میرے چال چلن میں کوئی جھول ہے سہیلیاں مجھے چوٹ کھایا ہوا سمجھتی ہیں ــــ ان میں سے ہر ایک کی تمام ممکن کوششیں بھی میری زبان سے کوئی مطلب کا لفظ نہیں نکلوا سکی ہیں۔ شادی کے بارے میں ہر متعلقہ شخص اپنی تمام تر کوششوں کے بعد خاموش ہو گیا ہے۔ گویا ایک طرح سے دنیا کے ساتھ کوئی رشتہ قایم نہیں ہے۔ ویسے کہنے کو والدین کے ساتھ رہتی ہوں بھائیوں اور بہنوں کی بہن ہوں۔ سہیلیاں بھی ہیں ــــ لیکن تجربہ بڑی چیز ہے لوگوں کی نظروں کو پہچاننا خوب سکھا دیتا ہے۔ اب تو میں تقریباً اس کی ماہر بن گئی ہوں۔

ہاں! اب شاید تم یہ پوچھو گی کہ میں اتنی مشتبہ کیوں ہو گئی ہوں کہ اس شبہ کی جھنک ہمالا سے بھی زیادہ مضبوط دیوار کو پار کرکے تمہارے کانوں تک پہنچ گئی۔ تو بات یہ ہے کہ میں مردوں سے انتقام لے رہی ہوں۔ میں اپنا مشن پورا کر رہی ہوں۔ جس کے لیے قدرت نے مجھے خدکشی سے بچا لیا اور جس کی تکمیل کے لیے اب بھی مجھ میں زندہ رہنے کی آرزو ہے جبکہ دنیا میں میرے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دنیا والوں نے بلا مانگے میری محبوب چیز ــــ تنہائی مجھے بخش دی ہے ــــ اچھی کتابیں کتنی بہترین رفیق ــــ مشیر اور استاد ہوتی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب مطالعے سے تھک جاتی ہوں اور میرے پاس کوئی کام نہیں ہوتا ــــ تو جانتی ہو میں کیا کرتی ہوں ــــ حیران مت ہونا ــــ میں ناول پڑھنے لگتی ہوں۔ یقین جانو تنہائی اور خصوصاً پریشانی اور الجھن کے وقت کا اس سے بہتر رفیق کوئی نہیں ــــ

لو اب تمہیں سب کچھ معلوم تو ہو ہی گیا۔ خط ختم کرنے سے پہلے اپنے انتقام کا طریقہ بھی بتا دوں؟ ــــ مردوں کو متوجہ کر لینا تو ہے ہی بہت آسان بات اور پھر مجھ جیسی لڑکی کے لیے۔ جس کا نام معروف ہو چکا ہو۔ ہر مشہور رسالہ کی نام اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے ــــ مرد میری طرف متوجہ ہوتے رہتے ہیں میں انہیں بلاتی رہتی ہوں۔ اپنی محبت کا یقین دلاتی ہوں اور جب وہ اپنے کو صرف میرا سمجھنے لگتے ہیں تو میں اپنے سرکار کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیتی ہوں۔ عورت ڈاکو بن جائے تو مردوں کو لوٹ لینا دنیا کا سہل ترین کام ہوتا ہے۔

اور مرد کو ہوش اس وقت آتا ہے جب وہ اپنا تن من دھن ہر چیز گنواں بیٹھتا ہے۔ میں بھی جب اپنے شکار کا دل ۔ دولت ۔ چین آرام اور نیندیں تک چھین لیتی ہوں تو بلا کسی معاوضے کے اسے رستا بتا دیتی ہوں ۔ اب ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا کہ بزعم خود میری بدنامی کا باعث بنیں ۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ اس طرح غیر ارادی طور پر میرے لیے شہرت کا سبب بن کر میرے نام میں مزید کشش پیدا کر کے اپنے بھائیوں کے لیے مصیبت بن رہے ہیں۔

سچ مانو شکیلا ان نالائق مردوں کی مفت ہات آنے والی دولت کے طفیل میرا ذاتی بنک بیلنس یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ میں اپنی تمام عمر بغیر کسی سہارے کے مزے سے بسر کر سکتی ہوں۔ اور میرے بعد میرے جیسی دکھی عورتوں کے لیے ایک آرام گھر بھی تعمیر ہو سکتا ہے۔

اوہو شکیلا! تم اکتا تو نہیں گئیں ارادہ تو نہیں تھا اتنا لمبا خط لکھنے کا ۔ لیکن موڈ ذرا دیر سے رکا ہوا تھا نا! اور سنو! ان مردوں سے ذرا بچ کر ہی رہنا ۔ ہاں! کہیں بھیا جی کو نہ دکھا دینا یہ خط ۔ انہیں میرا سلام اور تمہارا لمس منا ۔ کتنا پیارا لگتا ہے تصویر میں ۔ میری طرف سے اسے خوب بھینچ کر پیار کرنا ۔ جواب میں دیر تو نہیں کرو گی نا ۔

فقط

تمہاری اپنی

نیلوفر

آکسفورڈ میں ایک نئی ہندستانی انجمن دھرنگدھرا کے مہاراجا نے جو کرائسٹ چرچ کالج آکسفورڈ کے طالب علم ہیں ایک نئی سوسائٹی قایم کی ہے جس کا مقصد ہندستانی تاریخ فلسفہ۔ فنون لطیفہ۔ ادب، مذاہب رسوم وغیرا پر

بیوفا

سید علی احمد

تیرا حسین چہرا جب کبھی میری تصوری دنیا کے سامنے ٹھہر جاتا ہے تو میرے سوئے ہوئے جذبات اور میرے خیالات کی دنیا جاگ اٹھتی ہے۔ تیرا حسین مکھڑا اور تیرا خوب صورت چہرا مجھے اس مادی دنیا سے دور روحانی دنیا کی سیر کراتا ہے جب میں نے پہلی مرتبا تجھکو دیکھا تھا تو تیرا حسن مجھ پر جادو کا سا اثر کر گیا۔ اور تیری یاد مجھ کو مجبور کرنے لگی کہ میں تجھ سے محبت کروں۔

میں نے تیرے خیال کی بنیاد اور تیرے حسین چہرے کے تصور کے لیے اپنا بیشتر وقت ضایع کیا تھا اور تجھے اپنا سمجھنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

جب میں نے تجھے پہلی مرتبا دیکھا تو بے اختیار تیری اور میری آنکھیں شرم سے نیچے گڑ گئیں۔ تجھے ایک نظر دیکھنے کے بعد میں تجھے اپنا بنانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اور تو بھی یہی سمجھتا ہوگا کہ میں تیری ہو کر رہ جاؤں اور ہم ایک دوسری دنیا آباد کریں لیکن جب یہ سب طے ہو چکا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اقرار کر چکے کہ ایک دوسرے کی دنیا میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن جب میں اپنی ماں سے ملنے گئی اور ایک قلیل مدت کے بعد واپس آئی تو تیری حالت میں خاصا تغیر دیکھا۔ جب تک میں وہاں رہی ہمیشا تو مجھے یاد آتا تھا۔ اور تیرا حسین خیال نظروں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ میں نے تیرے حسین کھینچے عود اور لوبان کے دھوئیں دے دے کر پاسے تھے اور جب تیرے خطوط آتے میں انہیں شوق سے پڑتی اور اپنے دل میں محسوس کرتی کہ ابھی تک تو میرا ہی ہے۔

مگر اے سنگدل تو اس قلیل عرصے میں کیا سے کیا ہو گیا شاید تیرے حسن کا کوئی اور پجاری ہو گیا ہو اور شاید تیرے حسن کا جادو کسی اور پر چل گیا ہو۔ پھر بھی تو میرے دل کا مالک ہے میں تیری پرستش کروں گی تجھے اپنے دل کا مالک سمجھوں گی۔ میری محبت وہی رہے گی جو پہلے تھی ——!

چ۔ا

ادیبوں اور فن کاروں کی دوسری کل چین کانفرنس

چین کے چوٹی کے ادیب اور فن کار پیکنگ میں حال ہی میں ادب اور آرٹ کے نفیس اور زیادہ سے زیادہ اشتراکی تخلیق کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کا مقصد لوگوں کی بڑھتی ہوئی کلچری مانگوں کو پورا کرنا اور ان کی قومی تعمیری کاموں میں سرگرم شمولیت کو تقویت پہنچانا تھا۔ یہ ادیبوں اور فن کاروں کی دوسری کل چین کانفرنس تھی اور پہلی کل چین ۱۹۴۹ء میں قومی آزادی کے فوراً بعد پیکنگ میں ہوئی تھی۔

اس کانفرنس میں بڑے وزیر چو۔این لائی نے گھریلو اور بین قومی صورت حال اور چینی ادیبوں اور فن کاروں کے موجودہ رول کا جایزہ لیا۔ آپ کے ایڈریس کا پرزور خیر مقدم کیا گیا۔ کانفرنس میں ۵۶ چوٹی کے ادیبوں اور فن کاروں، گیتوں کی دھن تیار کرنے والوں، اسٹیج ڈائرکٹروں، سینما کے کارکنوں، رقاصوں، موسیقاروں اور ادب اور آرٹ کے دوسرے نمایندوں کا چیرمین ماؤزے تنگ کے جھنڈے تلے اجتماع کل چین کے عوامی کارکنوں کے اتحاد کی علامت تھا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی اور چین کی تدریجی صنعت بندی اور اس کی سوشلزم میں تبدیلی کے لیے تاکید دو کی دلیل تھا

ادیبوں اور فن کاروں میں مشہور شخصیتیں بھی تھیں مثال کے طور پر کو۔ مو۔ جو، ما ورتون۔ چاو چنگ، تنگ لنگ، الا ورسیہہ مے۔ لان، فانگ، شینو یے۔ نہاک چی۔ پائی، شیہہ ما۔ زے۔ چنگ۔ تائی۔ آئی لین اور چاو۔ شی۔ لی۔ انہوں نے چین کے ادب اور فن میں محنت کش طبقے کی صفوں سے ابھرے ہوئے نوجوان ادیبوں کے ساتھ نمایاں اور تابناک حصا لیا ہے۔ اس تاریخی کانفرنس میں روایتی اور عوامی اسلوب کے ادب اور آرٹ کے پیدا کرنے میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں، منگولیا، تاتار اور دوسری اقلیت والی قومیتوں کے موسیقاروں اور رقاصوں کی پورے طور پر نمایندگی کی گئی۔

اپنے افتتاحی ایڈریس میں اس کانفرنس کے مرکزی کاموں کا جایزہ لیتے ہوئے کورمور جو کل چین کے ادبی اور فنی حلقوں کی فیڈریشن کے چیرمین نے اعلان کیا کہ "یہ کانفرنس پچھلے چار سالوں میں ادبی اور فنی کام میں حاصل کیے گئے تجربے کا خلاصا پیش کرے گی یہ ہماری ادبی اور فنی کوششوں کو دو چند کرے گی۔ اچھی اور وافر تخلیقات کے سلسلے میں ادیبوں اور فن کاروں کی حوصلا افزائی کرے گی۔ ان میں آج سے بھی زیادا استحاد پیدا کرے گی اور ان کی جتھا بندی کو اور بھی مضبوط اور ان کی لیڈرشپ کو بہتر بنائے گی تاکہ ہم ادبی اور فنی تخلیقات کی لیے بنا اور ترقی کو تیز تر کریں

آپ نے اس بات کی وضاحت کی۔ اگرچے پچھلے چار سالوں میں ادب اور فن میں نمایاں ترقی کی گئی ہے پھر بھی ملک اور جنتا کی ضرورتوں کے اعتبار سے یہ ابھی تک بہت پیچھے ہے۔ جوں جوں چینی جنتا دھیرے دھیرے چین کی صنعت بندی اور سوشلزم میں اس کی تبدیلی کی طرف بڑھ رہے ہیں فنی اور ادبی تخلیقات کے لیے ان کی مانگ مقدار، انفاست اور پختگی کے اعتبار سے مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔

کورمور جو نے اعتماد کا اظہار کیا کہ چیرمین ماؤ۔زے تنگ کی نظریاتی رہنمائی میں متحد چینی ادیب اور فن کار

موجودہ عظیم دور کے شایان شان عظیم تخلیقات کی پیداوار کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے۔ ۱۹۴۹ء کی پہلی کانفرنس کے بعد ادب اور آرٹ کے میدانوں میں کامیابیوں کا خلاصا بیان کرتے ہوئے کورسو رجو نے کہا "چیرمین ماؤ زے تنگ کی رہنمائی تمام ادیبوں اور فن کاروں کے لیے لائحہ عمل بن چکی ہے۔ ان کی صفیں پھیلیں اور ان کی تخلیقات کا معیار بلند ہوا۔ ٹریڈ یونینوں کی کل چین فیڈریشن کے چیرمین اور کانفرنس میں پہلے مہمان مقرر لاؤ جو لونے کہا "تعمیر کے دور میں تخلیقی محنت اور محنت کشوں کی جدوجہد ادیبوں اور فن کاروں اور ان کے اہم قارئین کے لیے تخلیقی موضوعات کا اہم سرچشمہ ہے۔ آپ نے ادیبوں اور فن کاروں پر زور دیا کہ وہ متاثر کرنے والے تخلیقی ادب پاروں کے ذریعے اشتراکی نظریات محنت کشوں کے ذہن و دل میں بٹھائیں۔ ان کو اور زیادہ متحد کریں اور ان کے سیاسی، کلچری اور تکنیکی معیاروں کو بلند کریں۔" آپ نے ادیبوں اور فن کاروں کو تاکید کی کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی تعلیم کا کام جاری رکھیں تاکہ ان میں اتحاد اور تعاون کو مزید تقویت پہنچے۔

جنتائی انقلابی فوجی کونسل کے جنرل سیاسی محکمے کے ڈپٹی ڈائرکٹر فو چنگ نے ادیبوں اور فن کاروں پر زور دیا کہ وہ فوجیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ تخلیقات پیش کریں۔ "ادب اور فن کا کام" آپ نے کہا "حقیقت کی آئینہ داری اور اس کی رہنمائی ہے۔" چین میں پچھلے بیس سالوں سے بھی زاید عرصے کی انقلابی جنگیں بہت بڑی حقیقت ہیں۔"

چین کی انقلابی حقیقتوں اور ہتیار بند جدوجہد کے کل عرصے کی آئینہ داری ادب اور فن کی تخلیقی قوت کے لیے اولین کام ہے۔ ادبی اور فنی تخلیق میں ہتیار بند جدوجہد کی روداد اور جنتائی فوج کی شجاعت کی کہانی کبھی نہ ختم ہونے والے موضوعات ہیں۔ قومی آزادی کی جدوجہد کی تحریک نئی زندگی کی قوت بخش تازگی اور دوسرے پہلوان موضوعات میں آئینا سما ہیں۔ آپ نے اعلان کیا۔

چین کی نئی جمہوری یوتھ لیگ کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری ہو۔ یاو پانگ نے ادیبوں اور فن کاروں کو نئی پود کی طرف سے پرجوش نیک خواہشات پیش کیں۔ آپ نے کہا "نئے چین کی بہادر شخصیتوں کا تذکرہ چین کی نئی زندگی میں نئے اور پرانے کے درمیان تصادم کی زوردار نقاب کشائی اور ہماری پارٹی اور ہمارے رہنماؤں کی موثر حکمتِ عملی ہمارے نوجوانوں کے لیے عظیم دلچسپی کا باعث ہیں۔"

ہو۔ یاو۔ پانگ نے ادیبوں اور فن کاروں پر زور دیا کہ وہ آنے والی نسل یعنی ٹین اور پرائمری اسکولوں کے لاکھوں طالب علموں اور نوجوان کارکنوں کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر تخلیقات پیش کریں۔ جرمن ادیبوں کی انجمن کے نایب چیرمین اسٹفین ہرملن کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ آپ نے جب جرمن ادیبوں کی طرف سے اپنے چینی ساتھیوں کو برادرانہ نیک خواہشات کا پیام دیا آپ نے کہا "جرمن ادیب اس کانفرنس میں اور چین کے ادیبوں اور فن کاروں کی تخلیقات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ چین میں دلچسپی رکھنے کا رجحان جرمن جمہوری جنتائی ری پبلک کے دل میں گھر کر چکا ہے۔ لڑتے ہوئے چین اور غیر متزلزل چین سے جرمن جنتا پیار کرتے ہیں اور یہ پیار مختلف ادبی تخلیقات میں پیدا ہے اور ان کے ذریعے پھیلایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اناسگھرز کا ناول "کامریڈز" اور جرمنی میں اسکول کے بچے چینی نوجوان اور چینی آرٹ اور ادب کے شیدائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ہندستانی ادب کے خریدار بن کر ہمیں علم و ادب کی بیوا کا موقع دیجے

سلگتی یادیں

وہ دن ——— وہ آخری دن ———

——— جبکے فضا میں روپہلی دھوپ نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح شباشت اور نازکی بھر دی تھی۔ میں نے تمہارے گلنار ہونٹوں کو چوم لیا تھا اس دن کے بعد سے آج تک مجھے ایک پل چین نہ ملا، ذہنی سکون (نفسیب نہ ہوا۔ ہر گھڑی جیسے وہ جلتے ہوئے ہونٹ میرے ہونٹوں کو جھلستے رہتے ہیں۔

وہ دن ——— وہ پہلا دن جس دن میں نے تمہیں دیکھا ——— میری نگاہیں تیکھی تھیں اور وہ دن بھی قدرے خشگوار ہونے کے ساتھ بڑا منحوس تھا کہ اس دن کے بعد مجھے دیکھتے ہی تم بھاگ جاتیں۔ کہیں چھپنے کی کوشش کرنے لگتیں اور میری آنکھیں تو سے ہوئے یتیم بچے کی طرح مچل کر رہ جاتیں آنسو چھوٹ پڑتے۔ پھر تم اس ماحول میں بلکل نئی بھی تو تھیں مگر تمہیں شاید میرے آنسوؤں پر رحم آگیا۔ اور پھر تم میرے سامنے رہنے لگیں۔ میری چھیڑ پر مزاحمت نہ کرتیں۔ مگر تمہارا چہرا گواہی دیتا کہ تم برا مان رہی ہو۔ سب کچھ بادل ناخواستہ کر رہی۔ میں جان نہ سکا تم ایسا کرنے پر کیوں مجبور تھیں یہ تمہیں باوجہ بھی چھیڑتا اور ایک چھیڑ پر ——— جب میں نے تم سے پوچھا "نورو! برا تو نہیں مانا؟" یہ سوال اگرچے میری زبان سے ادا ہوا تھا۔ مگر دل کی روح کی گہرائی سے نکلا تھا۔ مگر تمہاری چپ نے اس کی مٹی پلید کر دی۔ تم چپ رہیں بلکے یوں کہو اس دن کے بعد سے تمہیں ایک چپ سی لگ گئی۔ جیسے مسکراتا ہوا چاند گہن میں پھنس گیا مجھے دیکھتے ہی تمہارے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی چھا جاتی۔ تم میرے سامنے آنے تک سے احتراز کرتیں۔ پتا نہیں میری کس بات نے تمہارے دل میں اتنی شدید نفرت بھر دی تھی کہ تم میرے سامنے آنیں

عصمت آرا عصمت

(اس پہیلی سے معذرت کے ساتھ جسکا ایک پرانا پوسٹ کارڈ مجھ کو یہ سطریں نوک قلم سے ٹپک پڑیں۔)

عصمت

بھی تو اس طرح جیسے مجھ سے کبھی کی ملاقات نہ تھی۔ کوئی واسطہ نہ تھا۔ اگرچے ہم بظاہر دور دور تھے، مگر میری روح محسوس کرتی اور تمہاری نگاہیں گواہی دیتیں کہ ہم نزدیک بلکل نزدیک آگئے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا شاید تم شرما رہی ہو لجا رہی ہو۔ کبھی تمہارا نظریں چرا کر موڈ پھیر کر چلے جانا دل پر ایک تیر سا بر سا جاتا۔ دل کے ٹکڑے ہو جاتے۔ آنکھیں نقش کف پا کو گھورتی رہ جاتیں۔ آنسو ضدی بچے کی طرح نکل پڑنے کو مچلنے لگتے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ میری آنکھیں بھری ہوئی ہیں اور چھوپی اماں آگئیں کیوں بھی کیا ہوا یہ آنسو کیسے؟

"کچھ نہیں چھوپی جان، آنکھ میں جانے کیا پڑ گیا ہے" یہ بہانے بنا کر باہر نکل جاتا۔

اور تین طویل سالوں تک میری محبت کا نانک پودا تمہاری بے رخی کی مہیب چٹان کے تلے دبا سسکتا رہا۔ مگر تمہارا رویہ نہ بدلا۔ بس دیکھنے کے دیکھتے الوار کی بارش کرنے لگتیں اور اچانک کالی رات ڈال کر دل کی دنیا میں اندھیرے بھر دیتیں اور میں سوچتا رہتا شاید میں اس لیے تمہاری نگاہ التفات کا حق دار نہیں بن سکتا کہ میں نادار تھا۔ غریب، فقیر، میں تمہارے لیے کوئی امٹ یادگار نہ ہو سکتا تھا۔ تمہیں موٹروں کی سیر نہ کرا سکتا تھا تمہارا خیال درست تھا کہ میری زندگی سراسر خاری خار تھی اور ہے اور تمہارے لیے یہ شاید ضروری تھا کہ اپنے حسن کی ایک لافانی یادگار تعمیر کروا سکنے والا تلاش کر والیسے قدرشناس کو ڈھونڈ لو جو تمہیں موٹریں دے سکے سونے میں پیلی کر دے سکے ..... مگر ..... میں بھی کتنا جاہل ہوں کہ تمہیں طعنے دینے بیٹھ گیا۔ بعض وقت انسان

اپنے آپے سے اس طرح باہر ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی اوقات کا بھی خیال نہیں رہتا لیکن کیا کیا جائے انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ کانٹا لگتا ہے تو ایک آہ لبوں کو چھو لینے کے لیے بڑھتی ہے۔ کبھی کبھی ایک چیخ نکل جاتی ہے اور کبھی آنسو بھی چھلک پڑتے ہیں۔

کہتے ہیں جب برے دن آتے ہیں تو اپنا روا ن بھی اپنا دشمن بن جاتا ہے۔ دیکھو نہ میرے خیالات بھی مجھ سے دشمنی پر تل گئے ہیں۔ ان کا بہاؤ مجھے ان حسین دنوں کی یاد سے دور لیے جا رہا ہے جو میری زندگی کا سبب ہے۔ وہ حسین دن جب تمہارا قرب حاصل تھا لطف نہ سہی قہر ہی سہی۔ کسی نہ کسی بہانے تمہاری جھلک تو دیکھنے میں آ ہی جاتی ہے پھر نہ جانے کیوں میری زندگی کی "دھوپ چھاؤں" بھی مجھ سے چھن گئی۔ ہاں یہ "دھوپ چھاؤں" ہی تو تھی۔ کبھی تمہارا لطف و کرم میرے دل کو شہ دیتا اور تمہاری بے اعتنائی حوصلوں کے قدم لڑکھڑا دیتی۔

اور پھر وہ دوپہر ــــ وہ آخری دوپہر آ گئی۔ ــــ پھوپی جان اوپر کا کمرا صاف کروا رہی تھیں ــ اور میں ڈرائنگ روم میں تمہارے خیال کی گہرائی میں غرق دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہوا اس وقت مجھے کوئی دیکھتا تو یقیناً یہ سمجھ لیتا کہ میں اونگ رہا ہوں۔ کہ اچانک تم نیچے آ گئیں تمہارے سنہرے بال کمر کے گھنا ونے جالوں سے بھرے اور گرد سے اٹے ہوئے تھے چہرے پر پسینے کے قطرات جگمگا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تم جھجکیں ٹھٹکیں۔ پھر جانے کیا سوچ کر آگے بڑھیں۔ ۔ ۔ ۔ اور جانے کیوں۔ ۔ ۔ ۔ کہوں! ؟ میں نے لپک کر تمہارے ہونٹ چومنا چاہے۔ تم پسینے میں شرابور ہو گئیں اور گرتی پڑتی بھاگ گئیں۔

وہ دن ــــ وہ آخری دن۔

جبکے فضا میں روپہلی دھوپ نے نئی نویلی دلہنوں کی سی شناشت اور تازگی بھر دی تھی۔ میں نے تمہارے گلنار ہونٹوں کو چومنا چاہا تھا۔ اس دن کے بعد آج تک مجھے ایک گھڑی چین نصیب نہ ہوا۔ ایک پل ذہنی سکون نہ ملا۔ ہر گھڑی دیکھتے ہوئے ہونٹ جیسے میرے ہونٹوں کو جھلستے رہتے ہیں اس کے بعد میں، میں خود تمہارے سامنے جانے کی ہمت نہیں پاتا مگر اس دن کی سلگتی یادیں میرا ذہن، میرا سکون، چین، آرام اور میرا اپنا آپ تک جھلسا جا رہا ہے، جلا جا رہا ہے۔ پھنکا جا رہا ہے۔

برٹش کونسل کی جانب سے بمبئی میں ایک لائبریری کا قیام

برٹش کونسل نے اپنی لائبریری کی جگہ جو آگرہ قایم کی گئی تھی۔ بمبئی میں ایک مرکزی لائبریری کھولی ہے جس میں تقریباً ۱۲۰۰۰ کتابیں رکھی گئی ہیں۔ سوشالوجی آرٹ کامرس، سائنس۔ طب، ادب فنون لطیفہ کے شعبوں پر خاص توجہ دی گئی ہے اور امید ہے کہ ریسرچ اسکالروں اور ٹیچروں کی ضروریات ان کتابوں سے کافی حد تک پوری ہو جائیں گی۔ مرکزی اور شمالی ہندستان کے باشندوں کے لیے پوسٹل ممبرشپ کی بھی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔ برٹش کونسل نے ۵۹ ممالک میں ۱۰۰ لائبریریاں قایم کر رکھی ہیں جن میں دس لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔

یونیسیں فلموں، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور فونوگراف ریکارڈوں کے ذریعہ تعلیم

تعلیم کو عام فروغ دینے اور اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی ذرایع کو زیادہ آسان زود فہم اور سریع الاثر بنانے کے لیے زیادہ جدید کی ایجادات ریڈیو فونوگراف فلموں ٹیلی ویژن سے امریکا بھر میں وسیع پیمانے پر کام لیا جا رہا ہے دوسرے ملکوں میں بھی ایسا ہونے لگا ہے۔ ہندستان میں بھی تعلیمی مقاصد کے لیے ان کو کام میں لانے کی ضرورت ہے

اگر آج کوئی شخص امریکا کے کسی اسکول کو دیکھنے جائے تو اسے اس بات پر حیرانی نہیں ہوگی کہ آج بھی جماعتوں کے کمروں میں وہی بلیک بورڈ اور گلوب رکھا ہوا ہے جو اب سے تیس چالیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ تاہم جماعت کے کمرے میں وہ پردہ سیمیں اور بجلی سے چلنے والا فونوگراف دیکھ کر ضرور نئی دلچسپی محسوس کرے گا۔ اور اسے معلوم ہوگا کہ اس قسم کا سامان تمام اسکولوں میں اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ اور میکانیکل اور بصری سامان خاکے اور نقشے اب پڑھانے والے عملے اور جدید معلموں کی امداد کر رہے ہیں۔ اس جدید قسم کے امدادی سامان کو اصطلاحاً "بصری اور سماعی" (دیکھنے اور سننے) تعلیم کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

فلموں اور ریکارڈوں کا استعمال

پچھلے دس پندرہ برس سے فلمی پروجیکٹروں اور ریکارڈوں کے ذریعے تعلیم دینے کا طریقہ امریکا کے اسکولوں میں بہت پھیل چکا ہے۔ یہ بات دوسری عالمی جنگ میں ہتھیار بند فوجوں کو معلوم ہوئی کہ مختلف قسم کی فوجی اور ٹیکنیکل نوعیت کی تعلیم مختلف قسم کی عمریں رکھنے والے لوگوں کو فلموں کے ذریعے آسانی سے دی جا سکتی ہے۔ مثلاً جنگ کے دنوں میں فوجی محکمے نے متحرک فلموں کے ۶۰ ہزار پروجیکٹر خریدے جن میں سے اکثر تعلیمی کاموں کے لیے استعمال کیے گئے۔ ان فلموں کی مدد سے لوگوں کے بڑے بڑے گروہوں کو ایک ہی دن میں بڑی آسانی سے مضمون سمجھائے جا سکتے تھے۔ معلموں کو بھی زیادہ محنت نہ کرنی پڑتی اور وہ تھکاوٹ کے بغیر کام جاری رکھ سکتے تھے۔

اسکولوں میں

اس بات نے اسکولوں کے معلموں اور تعلیمی ماہروں کو اسکولوں میں دیواری نقشوں زمین کے گلوبوں اور خاکوں اور نقشوں کے ساتھ فلمی سامان رکھنے کی بھی ترغیب دی۔

اب اس "سماعی اور بصری" امدادی سامان کی وجہ سے چھپی ہوئی کتابوں کے ذریعے یا زبانی تعلیم دینے کا کام آسان ہو گیا ہے۔

امریکا میں ہر طرح کی تعلیم میں سماعی اور بصری سامان استعمال کیا جا رہا ہے مثلاً ایک گرامر اسکول میں امریکا کے بڑے بڑے مقامات کی دیوقامت تصویریں سکرین پر دکھائی جاتی ہیں

واشنگٹن کی جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں غیر ملکی زبانوں کے نصاب پڑھانے کے لیے فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

بچوں کی گنڈرگارٹن جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیم تک اٹ ٹیکنیکل ذرایع سے تاریخ۔ سائنس جیومیٹری نظمیں دکانوں میں مشینوں کا استعمال اور بیسیوں مختلف

مضمون سکھائے جاتے ہیں۔

ٹاکی فلم

سماعی اور بصری ذرائع سے تعلیم دینے کے طریقوں میں سب سے موثر ٹاکی فلم ہے یہ نہ صرف بھاری اجتماع کو بہ یک وقت دکھائی جا سکتی ہیں بلکہ دیکھنے والوں میں عام طور پر فلموں میں کام کرنے والوں کے کردار سے اپنے آپ کو مشابہت دینے کا ایک خاص رجحان پایا جاتا ہے (جس سے ان پر فوری اثر ہوتا ہے) اس کے علاوہ فلموں کے ذریعے واقعات کی زیادہ اچھی طرح وضاحت کی جا سکتی ہے اور کلوز اپ اور آہستہ آہستہ فلم کو حرکت دینے سے نفس مضمون آسانی سے سمجھایا جا سکتا ہے جب ایک فلم دوبارہ دکھائی جائے تو طلبا کو ایک مشکل مضمون کے سمجھنے میں بڑی سہولت ملتی ہے

مزید نئے طریقے

پچھلے چند برسوں سے ایک نئی تکنیک کی دریافت کی وجہ سے آوازوں اور گانوں وغیرہ کے ریکارڈ بھرنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ نئی قسم کا ایک دھات کا فیتا بنایا گیا ہے جو آوازوں کو مقناطیسی طریقے پر جذب کر لیتا ہے اور آواز کا ریکارڈ بھرنے کے فوراً بعد ہی اسے سنا جا سکتا ہے۔

ان آوازوں کو اس فیتے پر سے فوری طور پر مٹایا بھی جا سکتا ہے اس قسم کا فیتا دوسری زبانیں اور بولیاں وغیرہ سکھانے میں بہت ہی مفید ثابت ہو رہا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن

امریکا بھر میں اگرچہ تعلیمی مقاصد کے لیے ریڈیو کا استعمال بھی ہو رہا ہے چنانچہ ایک سو کے قریب ایسے ریڈیو اسٹیشن ہیں جو صرف تعلیمی پروگرام نشر کرتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن کو تعلیمی اغراض کے لیے اب زیادہ وسیع پیمانے پر کام میں لایا جائے گا۔

اپریل ۱۹۵۲ء میں مرکزی سرکار نے ۲۴۲ مختلف ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کو تعلیمی مقاصد کے لیے مخصوص کر دیا اور تین نئے ٹیلی ویژن اسٹیشن بنائے گئے۔ ایسے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں پر تجارتی اشتہارات نشر کرنے کی ممانعت ہے اس لیے ان کو مالی مشکلات کا سامنا بھی ہے تاہم ریاستی حکومتیں۔ یونیورسٹیاں اور دوسری تنظیمیں اسکولوں اور کالجوں میں ٹیلی ویژن کو رائج کر رہی ہیں اس کے علاوہ یہ پروگرام اپنے اپنے گھروں میں بھی دیکھے اور سنے جا سکتے ہیں۔ چونکہ فلموں اور فونوگراف ریکارڈوں وغیرہ پر بہت لاگت آتی ہے۔ اور بہت سے اسکول اتنے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اس لیے اس مشکل کا حل اس طرح نکالا گیا ہے کہ ایسے تعلیمی سامان کے مرکز قایم کیے گئے ہیں۔ جن سے اسکول یہ سامان مستعار کرائے پر لے سکتے ہیں۔ اور امریکا کی لائبریریوں یا پرائیویٹ کمپنیوں سے بھی یہ چیزیں بلا کرایا کرائے پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

زمانا جدید کی یہ تعلیمی سہولتیں معلموں اور استادوں کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ اور نہ انہیں نصاب کی کتابوں کے بدلے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کی ضرورت بدستور قایم ہے لیکن ان جدید دریافتوں کی وجہ سے نصابوں کے مطالعے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملتی اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ریڈیو فلموں ٹیلی ویژن کے ذریعے اس طرح آواز۔ رنگ اور روشنی سے مرکب ایک نئی دنیا طلبا کے سامنے آجاتی ہے اور انہیں جماعت کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ایسے ایسے تجربات اور مطالعے کی مختلف چیزیں میسر آجاتی ہیں جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کر کے چندا منی آرڈر کر دیجیے

سندباد جہازی اور کلرکی

قمرالدین قمر

سندی الف لیلیٰ کا سندباد جہازی نہیں تھا بلکہ اس کا نام سندباد جہازی یوں پڑا کہ اس کو بچپن ہی سے سیاحت کا شوق تھا اس نے دریائے ہگلی سے بحر کاہل تک کا سفر کیا تھا مگر جبکہ اس کے والدین فوت ہو گئے تو وہ اپنے چوتھے سفر میں سلہٹ پہنچ کر پارٹنر شپ میں آسمانی چائے کی سول ایجنسی لے لی چنانچہ چند مہینے بیش و عشرت میں کٹے لیکن پانچویں مہینے اس کے پارٹنر نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے پپوٹوں کو پھلا کر اور اور بہی کھاتا اس کے آگے سرکاتے ہوئے کہا "لو جناب حساب بیباق ہے۔ دو مہینے میں چار ہزار کی بچت اور تین مہینے میں سوا دس ہزار کا خسارا ہوا۔ اس لیے ہمیں کمپنی کا سائن بورڈ الٹ دینا پڑیگا"

گو کہ سندی اپنے پارٹنر کی بلی جیسی آنکھوں کی عیاری کو سمجھتا تھا اور خوب جانتا تھا مگر اسے سفر نامہ لکھنے سے کب فرصت ہوئی جو وہ اس طرف دھیان دیتا یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنے چوتھے سفر سے لوٹا تو اس نے نہ یاران طریقت کی مجلس ہی منعقد کی اور نہ ہی اپنا سفر نامہ پڑھ کر سنایا۔ بلکہ اداس اداس اور مغموم خاطر رہا اس کے بعد اسی طرح کئی مہینے گذر گئے آخر اس نے اللہ کا نام لیا اور اپنے پانچویں سفر کی تیاری کی۔

سندی کی جیب میں کم و بیش چار سو روپے تھے اس کا ارادا تو بہت کچھ تھا۔ مشرق کی طرف چل نکلے لیکن وہ مغرب کی سمت چل کھڑا ہوا۔ رستے میں دو سو روپے میں مال تجارت خرید اکہ اللہ میاں برکت دے تو اس سے پانچ سو پیدا کرے گا لیکن پاکستان اور ہندستان کی سرحد پر اس کا مال ضبط کر لیا گیا آخر کار وہ لٹا پٹا کسی طرح کلکتہ پہنچ گیا۔

شام کو جب وہ کافی ہاؤس سے کافی پی کر لوٹ رہا تھا تو اس کی ملاقات رائے سے ہوئی جو اس کا کلاس فیلو تھا اور جسے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے فلم ایکٹر بننے کا زیادہ شوق تھا گویا وہ دلیپ کمار کا سکنڈ ہینڈ ایڈیشن نمبر ۲ سے ملا۔ پھر باتوں باتوں میں اس نے بتایا۔

"کل کرسمس ہے اور سال رواں کا پہلا دن
سناہے وائسرے کپ تو نہیں مگر ہاں ریس
بڑے عالا پچانے پر ہوگا چلو گے نا سندی"

سندباد جہازی نے سگریٹ کی ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔ اور آہستہ سے بولا "دیکھا جائے گا" لیکن جب دوسرے روز دونوں ریس کورس میں گئے تو رائے نے ایک سو ٹیڈ بو ٹیڈ لڑکی کو آنکھ مارتے ہوئے کہا "تمہارے پاس کتنی رقم ہے پیارے!" سندی نے حساب کرنے کے بعد بتایا۔

"ایک سو نوے اور چار چونا نوے روپے
آٹ آنے چھ پائی"

"ویری گڈ ——— تو پھر سو روپے ڈربی کی (MISTY MOON) پر لگا دو نا میرے یار" سندباد جہازی نے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور اپنے تئیں وہ سوچنے لگا کہ بھلا رائے نے یہ کیا کہا اور وہ کیا سن رہا ہے لیکن رائے بہ ضد تھا۔

"یہ بھی ایک تجارت ہے سندی۔ مسٹی مون۔ سر آغا خان کا فیوریٹ FAVOURITE گھوڑا ہے جسے انہوں نے ایک انگریز کو تحفتہً دیدیا۔"

وہ دونوں مسٹی مون پر سوار و پلے لگا کر پانچ روپے والی سیٹ پر گیلری میں جا بیٹھے۔ بازی چھوٹ چکی تھی اور وہ چھٹی بازی کے چوتھے گھوڑے مسٹی مون کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

وکٹوریا ـــــ للی ـــــ کرشنا ـــــ ہوسٹی مون ـــــ سات ـــــ آٹ ـــــ چھ ـــــ چار ـــــ اسی ترتیب سے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ اسے قدرے مایوسی ہوئی مگر وہ ناامید نہ ہوا۔ دیکھتا رہا۔ دور۔۔۔۔ گھوڑے سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ پل بھر میں اس نے پلکیں جھپکائیں اور دیکھا تو نقشا بدل چکا تھا۔ چار۔ سات آٹ ـــــ رامے، رومال سے پسینے کو خشک کرتے ہوئے بولا۔ "NERYOUS نہ ہو سندی تو ضرور جیتے گا" اور اس کی پیش گوئی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے جب لاؤڈ اسپیکر نے اعلان کیا اور بورڈ پر لکھا ہوا نمبر ۴۔ ۷۔ ۶ نشانے مارنے لگا تو رامے نے اسے ایک نازک سی عورت کی طرح چمٹا لیا "ہپ ہپ ہرے"

مختصر یہ کہ اس تجارت میں سندباد کو پورے ایک ہزار کا فائدہ ہوا۔

رات عیش و عشرت میں گذری مگر جب صبح سندی نے آنکھ مل کر اپنے چاروں جانب دیکھا تو رامے کی جگہ خالی پڑی تھی۔ سمجھا باہر ضرورت سے گیا ہوگا۔ مگر جب اپنے سوٹ کیس کا جائزہ لیا تو اس کا قفل ٹوٹا پایا۔ اور رقم ندارد۔ وہ بہت حیران و پریشان ہوا۔ اسی پریشانی کا سبب تھا کہ اس نے چائے بھی نہ پی اور اپنا سا موں لے سامان لے کر ہوٹل کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اس پر بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ تن تنہا پردیس میں، دوسرے یہ کہ پونجی بھی غائب ہو چکی تھی لیکن دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے ایک پرائیوٹ فرم میں کلرک کی نوکری مل گئی اور وہ ایک چھوٹی کوٹھری میں رہنے لگا۔ آگے چل کر وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے ـــــ

"مجھے بچپن ہی سے خوب صورت چیزوں سے انس تھا۔ میری فطرت سی ہوگئی تھی کہ میں قوس قزح کے رنگوں میں اور قدرت کے دل کش مناظر میں پہروں کھویا رہتا اور ہر حسین چیز کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ ان کی قدر کرتا ان سے پیار کرتا اور جیکے میں نے اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک پیاری سی دوشیزا کو دیکھا تو اس کے حسن و جمال کی تعریف میرے منہ سے بے ساختہ نکل گئی۔"

"اس نے مجھے ایک بار غور سے دیکھا اور دوسری بار غور سے دیکھا، اور دوسری بار کھڑکی بند کر کے چلی گئی ـــــ لیکن ہر شام جب میں دفتر سے واپس آتا اور چائے پی کر چھت پر چڑھتا تو وہ مجھے نظر آتی۔ اس کی محجوب نگاہیں جھکی جھکی سی ہوتیں کبھی کبھی وہ بے بس نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر رہ جاتی۔ اور اسی کے انداز کو میں سمجھ جاتا۔ لیکن میں اسے کیسے سمجھاؤں۔"

"کہ اے مقدس عورت! تو میری محبت کے گیت نہ گا۔ ایک کلرک کی محبت کے گیت کیونکہ یہ گیت حسین پیانو کے سرگم پر نہیں، ممولی ڈھولک کی تھاپوں پر گائے جاتے ہیں۔ اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ یہ گیت ادھورا نہ رہ جائے۔"

"اور اس روز اس نے میری آنکھوں کو شاید پڑھ لیا تھا جس روز اس کا بات ایک نالے قد کے آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا اس لیے کہ وہ ایک کلرک نہیں بلکہ ایک بڑا آدمی تھا میری پسند کی ہوئی چیز کو میری آنکھوں کے سامنے کسی اور نے خرید لیا۔ کیونکہ دنیا کے بازار میں ہر چیز کی تجارت ہوتی ہے جس طرح منڈی میں چیزیں بکتی ہیں اسی طرح انسان، اس کی پاک محبت اور اس کا پیار بھی بکتا ہے۔

وہ معصوم لڑکی ایک کھلونے ہی کی طرح تو تھی بے زبان اور گونگی جیسے کھلونے بول نہیں سکتے۔ صرف دیکھا کرتے ہیں۔ چاہے اسے وہ شخص لے جائے جسے وہ پسند کرتے ہوں۔ یا کوئی اور۔۔۔"

باقی سفرنامے کے اوراق سادا تھے۔

اس نے اپنی محبت کے گیت گائے بھی نہ تھے کہ اس کا نغمہ بکھر گیا اور ساز کے تار ٹوٹ گئے پھر جب وہ ایک روز کافی ہاؤس میں بیٹھا گنگنا رہا تھا تو ایک عورت ہلکے آبی رنگ کی ساڑی میں ملبوس ہمہ تن حلاوت کی تفسیر بنی اس کے میز پر آ بیٹھی اس نے بھی ایک نظر اس کی طرف ڈالی اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک برق اس کے خرمن ہستی پر گر پڑی۔ تنے ابرو، غزالی آنکھیں ..... وہ ایک عجیب سی کیفیت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اور مسکراتی رہی۔

"اکسیوزمی پلیسز۔ آپ کون سا گیت گا رہے تھے" اس نے سندی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی میں؟"

"ہاں" وہ پھر مسکرائی۔

"گا نہیں گنگنا رہا تھا ——" جس پر وہ ہنس دی اس نے دو کپ کافی منگوائی۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ اور پینے لگی مگر وہ سوچ رہا تھا کہیں یہ ایک حسین خواب تو نہیں کیونکہ جب سے وہ بچھڑا ہوا تھا یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ ایک حسین عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا پھر جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو وہ چونک پڑا اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اب اس پر یہ بات عیاں ہو گئی۔ نہیں یہ خواب نہیں حقیقت ہے اس طرح وہ دونوں بہت کم سمے میں اتنا گھل مل گئے جیسے برسوں کے ملاقاتی ہوں۔ مگر نہ وہ اسے جان سکا تھا کہ یہ کون ہے کیا کرتی ہے کہاں رہتی ہے اور نہ کبھی اس نے ہی پوچھا تھا۔ سندی انہیں کہتے "روپلے ماہوار ملتے ہیں ——" بس وہ ایک دوسرے کے دوست بنے اس سے آگے کچھ بھی نہیں لیکن جب وہ ایک روز پکنک منانے آبادی سے کافی دور نکل گئے تو اسے احساس ہوا وہ تنہا ہیں۔ وہ بھی ایک مرد اور ایک عورت۔ وہ ہچکچا اٹھا اور فوراً واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔

"جوتی شام ہو چکی اب واپس لوٹ چلو"

"نہیں ڈارلنگ! ابھی افق کی سرخی ہے —— آؤ اور آگے چلیں"

آگے گھنے گھنے درختوں کے قطار بنے تھے جس پر مختلف قسم کے پرندے چہچہا رہے تھے۔ دور حدِ نگاہ تک کہیں بستی کا کوئی نشان نہ تھا صرف گھنے درختوں کا لامتناہی جال بچھا ہوا تھا۔ ان جالوں کے درمیان نیلی جھیل تھی اور بڑے بڑے ٹیلے جو دیو کی طرح کھڑے انہیں اپنی گود میں سمو لینا چاہتے تھے وہ بڑھتے ہی رہے ان چٹانوں کی طرف جس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے اور اس گھنے جنگل کی طرف جہاں سے کوئی بھوکا درندہ نکل کر انہیں چٹ کر جائے گا اور اس وقت تک بڑھتے رہے جب تک کہ اندھیرے کے سائے ان سے بلکل چمٹ گئے۔ سان کے چہرے دھندلے پڑ گئے ان کی چالیں ڈگمگانے لگیں۔ صرف متحرک سائے تھے اور رات کی تاریکی جب انہوں نے ایک بڑے سے ٹیلے کے قریب پہنچ کر اپنے وجود کو اندھیرے میں بلکل گم کر دیا تو وہ اس کے شانے سے ٹکراتی ہوئی بولی "سندی تم مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔ بہت ہی سویٹ"

وہ خاموش ہو رہا ——

"تم سوچتے ہو گے میں پاگل ہو گئی ہوں لیکن یہ جوانی۔"

"بھی تو پاگل ہوتی ہے"

"اچھا تمہاری عمر کیا ہے"

"بتیس اور دو بائیس" —— جوتی۔ اس کے بالوں سے کھیلتی رہی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر یکایک جیسے چونک پڑی۔ اور بہت ہی جذباتی لہجے میں بولی ——

"—— اچھا ہوا کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ میں تم سے چھ سال

بڑی ہوں۔ میری عمر اٹھائیس برس کی ہے اور اب میں نہیں چاہتی کہ عورت اتنی ذلیل ہو جائے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھائی کے روپ میں نہیں۔ ہوس کار یوں کی آگ بجھانے کے لیے محض ایک مرد کے روپ میں دیکھے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ سندی۔ یہ میرے ماحول کا اثر ہے جس نے مجھے گمراہ کر دیا۔ اور جو مجھے جھنجھوڑے جا رہا ہے"

اس نے جوتی کی طرف دیکھا مگر رات کی تاریکی اتنی گہری ہو گئی تھی اس کے چہرے کے خدوخال دھندلے پڑ گئے تھے مگر جوتی کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور ڈگمگاتے ہوئے قدم سنبل سنبل کر اٹھ رہے تھے۔ ان کے سائے آسیب کی طرح پراسرار نظر آ رہے تھے۔ اور دیوہیکل ٹیلے زیادہ خوفناک زیادہ بھیانک معلوم دے رہے تھے۔ پھر جب وہ گھر آیا تو اس نے اپنے سفرنامے کو پھر سے لکھنا شروع کیا

"میں سخت پریشان تھا کہ جوتی کو میں اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد بھی سمجھ نہ سکا کہ وہ کون تھی۔ مگر اب میں نے سمجھا ہے کہ وہ ایک ایسی سوسائٹی گرل تھی جس کی زندگی کو صرف ایک حسین تصویر سمجھ کر خوب صورت زیلواروں میں آویزاں کر دنیا ان کے سرپرستوں نے آسان سمجھ لیا تھا۔ اور اپنی گذشتہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک لیبارٹری ڈھونڈ رہے تھے جو ان کی کسوٹی پر کھرا اتنے۔ اس وقت بھی وہ اپنی غلطیوں کو محسوس نہ کر سکتے جبکہ وہ خوب صورت تصویر دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ جاتی ہے اس لیے کہ وہ محض ایک تصویر ہی نہیں ایک عورت بھی ہے اور بہت سی عورتیں مردوں سے زیادہ احساس اور سوچنے سمجھنے کا مادہ رکھتی ہیں"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ سوچنے لگا ــــ

ایسی کتنی جوتی اور کتنے راے اس سماج میں موجود ہوں گے اور کتنے کلرکوں کی زندگیاں پھیکی پھیکی سی ہوں گی کہ وہ محبت نہیں کر سکتے وہ محبت کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ اور کتنی معصوم لڑکیاں ایسی ہیں جو اپنی امنگوں کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ کر خاموش رہ جاتی ہیں ــــ اور پھر لکھتا ہے

"تیری دنیا کو میں نے دیکھا جہاں صرف وہی لوگ جی سکتے ہیں جو تیرے بھرم کے ہوں۔ مگر ان لوگوں کا کیا ہوگا جنہیں تو نے ابھرنے سے پہلے کچل دیا جنہیں تو نے جان بوجھ کر گڑھوں میں ڈھکیل دیا کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔ بلکہ اپنے بوسیدہ کھنڈروں میں پڑے سسکتے رہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو تیری یہ دنیا مجھے پسند نہیں ــــ میں ایک ایسی دنیا کی تلاش میں جاؤں گا جہاں کلرک بھی محبت کے گیت گا سکیں۔ جہاں راے ایسے نوجوان کی زندگی سدھر سکے اور جہاں جوتی ایسی عمر کی لڑکیاں صرف اس لیے کنواری نہ رہیں کہ بھارتوں اور کار کے مالک ان کے شوہر نہ بن سکے اور وہ کسی روز ڈگمگاتی ہوئی بدنامی کے گڑھوں میں نہ گر جائیں۔ اس لیے مجھے ایک ایسی دنیا کی تلاش ہے جہاں میں جی بھر کر خوب صورت چیزوں سے پیار کر سکوں کہ یہ میری ہیں۔ یہ افق سے پھوٹتی ہوئی لالی اور یہ کھلے ہوئے رنگیں پھول میرے ہیں"

دوسرے روز جب وہ دفتر گیا تو اس نے اپنا استعفا داخل کر دیا۔ کہ وہ اب کلرکی نہیں کرے گا بلکہ اپنے چھوٹے سفر کی تیاری میں مصروف ہو جائے گا۔

ــــ اور پرسوں روز بعد سندباد جہازی اپنے چھوٹے سفر پر چلا گیا۔

دیکھیے وہاں سے وہ اپنے سفرنامے میں کیا لکھتا ہے۔

ملایا کی نئی یونیورسٹی

ملایا یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر سڈنی کین نے اپنے ایک بیان میں بتایا ہے کہ ملایا کی نئی یونیورسٹی کی تعمیر پر خرچ کا اندازہ ۱ پہلے ۰۰۰،۰۰۰،۱۳ ڈالر (ملائی) تھا اب خیال ہے کہ اس پر ۰۰۰،۰۰۰،۱۰ ڈالر (ملائی) کی مزید رقم صرف کی جائے گی۔

ایڈیٹر

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

باہمہ سجانہ تہ

مکرمی خانصاحب زادہ شفیق ـــــ دعا وسلام

بقایا تینوں پرچے پہنچ گئے۔ شکریا اور فقر نوازی کا احسان پچھلے مضمون "تاشا دکاپوری" کی اشاعت کا انتظار ہے خدا کرے تلف نہ ہوگیا ہو۔

آئندہ کے لیے غریبات کے ۵ پرچے مع ایک مراسلا یعنی دربار واپیل "ہندستانی ادب" روانا ہے قبول ہو۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔ خیریت نامہ کا انتظار کروں گا۔ بحمداللہ فقیر بھی بہ خیریت ہے۔ گوزندہ درگور سہی پھر بھی غنیمت ہے۔

"دیوانے پہ کیا گذری"

ایک زمانا تھا جب مولانا حسرت موہانی کے "اردوے معلیٰ" پر نازک وقت آگیا تھا اور تمام آسان ذرایع طباعت واشاعت کے مفقود و مسدود ہوگئے تھے تو ہم نے دیکھا تھا کہ مولانا ے محترم مرحوم اپنے ہات سے خدکتابت فرماکر چار ورق پر "اردوے معلیٰ" کو طبع و شایع فرماتے رہے اور یہ سلسلا ایک دو ماہ نہیں بلکہ "اردوے معلیٰ" کے آخری چار پانچ سال تک برابر جاری رہا۔ مگر پرچے کی پالیسی اور میعار میں ان چار اوراق میں بھی کوئی فرق نہ آیا وہی تیور اور وہی انداز دیکھنے والوں کو نظر آتے رہے بالآخر "جب یاوں ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی۔"

مولانا کی پیرانا سالی اور تباہ حالی نے جب اس قابل بھی نہ رکھا تو مجبوراً اردوے معلیٰ خدہی بند ہوگیا اور اس کے کچھ سال کے بعد مولانا بھی اللہ کے پیارے ہوگئے۔ رہے نام اللہ کا۔

یہ اس لیے لکھا گیا کہ بعینہٖ آج "اردوے معلیٰ" کا ایک ننھا سا منظر ہمیں اپنے چودا سالا رفیق "ہندستانی ادب" میں نظر آرہا ہے کہ اشاعتی تمام وسایل اور ذرایع فوت ہوجانے پر بھی اس کے اہل ہمت اور صاحب عزم بالجزم مدیر محترمی جی ام خان صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی انہماک اور میعا کے ساتھ ہر ماہ نکال رہے ہیں گو بظاہر اس کی طباعت و اشاعت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا ہے صاحبان شوق کی بے نیازی و ناقدری یکطرف۔ طبع و نشر کے گراں بہا مصارف آے دن کی نئی نئی ذمے داریاں۔ بقدر شوق آزادی و آزگار ش کا فقدان اس پر لے یار و مددگار آے دن کی علالتوں کا شکار الا ما فی الحفیظ ایک طوفان مصیبت ہے جو ہمت اور ارادے کی کشتی کو پاش پاش کر رہا ہے مگر اس عالم میں بھی سفینے کی ناخدائی سے نہ پھرنا۔ خداہی کی دی ہوئی توفیق کے سوا اور کوئی طاقت نہیں جو چلا سکے۔

پھر بادی النظر ابھی تک کوئی ایسی نمایاں کمی بھی پرچے میں نظر نہیں آئی۔ بجز اس کے کہ کسیقدر حجم ضرور کم ہوگیا ہے اور بس۔ ورنا وہی آب و تاب وہی مضامین کی اہمیت میعاری شذرے اور مفید مراسلے و تنظیمات جو کبھی اس کو صحافت کے عالا مقامات پر فایز کیے ہوے تھے۔ آج بھی تمام دکان نظر آتے ہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اس انحطاط میں بھی حشو و زوائد کو دخل نہیں ہے گو کم سہی مگر جو کچھ ہے حاصل اول و رآں صحافت ہے ایسے باہمت ارادوں کے مستقل بلند نظر اور کسی حالت سے مرعوب نہ ہونے والے اہل قلم اب کہاں ملیں گے۔

حیف ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوے بھی علم و ادب کا خون کیا جاے اور "ہندستانی ادب" کو قایم و برقرار

رکھنے کی کوئی عملی صورت ارباب حل وعقد نہ اختیار فرمائیں۔ اس سے بڑھ کر ملک و قوم کی بدنصیبی اور کیا ہوگی جہاں کے علم دوست اور صاحبان ذوق وشوق ایک ایسے معیاری اور کارآمد پرچے سے اس طرح بے نیازی و روگردانی فرمائیں۔ ورنہ بات ہی کونسی ایسی اہم ہے جو بنائے نہیں بن سکتی۔ محض سو پچاس خریداروں کی فراہمی یا کچھ اپنے خزانے سے علم دوستی کے ایثار میں عطیہ مرحمت فرما دینا یہ کونسی ناقابل برداشت زحمت ہے جو کسی طرح انجام نہیں پا سکتی ہے اور پھر صاحبان ہمم و ارباب استطاعت کے ہاتھوں کچھ بھی مشکل نہیں ہے مگر توجہ شرط اور ہمت و ایثار لازم ہے۔" ہندستانی ادب" اب ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے یا زمانے نے پہنچا دیا ہے کہ اس کی مقبولیت فنا کے آخری مقام پر نظر آرہی ہے اور جس کے بعد اس کی ہستی آغوش عدم کے ہم کنار ہو جائے گی۔ اس وقت دیکھنے والے حیرت کریں یا افسوس مگر ہوتا ہی کیا ہے اس لیے ابھی سے اس کی بقا اور استواری کی سبیل نکالنا چاہیے۔ جو مخلصانہ سی بات کی مقتضی ہے کہ ؎

دل بیتاب کا سنبھلنا کیا دیکھ لو پیار کی نگاہوں سے

ہماری سنتا ہی کون ہے اور ہم کہیں بھی تو کیا کہیں فقیر کا کام دعا گوئی ہے۔ عرض حال کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ مبادا کہ ہو ہمارا ہندستان اہل چمن تم کو خدا رایہ نہ بھولو پھول اپنے دیوانے پہ کیا گذری

افقر موہانی
ایڈیٹر

حکم کی تعمیل میں اپیل چھاپ دی گئی ہے۔

اپیل کے ساتھ ساتھ شخصی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہوا کرتا ہے ان کوششوں کے اجاگر کرنے میں آپ کے ان گنت شاگرد اور ملنے جلنے والے آپ کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

جب تک "ہندستانی ادب" کا ہر پرچا ہمدرد ذاتی طور پر توجہ نہ دے اس وقت تک سالے کی مشکلات اور معیشت کا دور ہونا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ آپکے احباب اور شاگرد اس اپیل سے متاثر ہو کر ایک نیک کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

بھئی جان حقیقت یہ ہے کہ "ہندستانی ادب" نکالنا بس آپ جیسوں کے ہی دل گردے کا کام ہے۔ اپنے رام تو گنتی کے چنبیں بول گئے ہوتے ریڈیو والوں سے گفتگو کر کے ضرور جواب لکھوں گا۔ عصمت اور بے بی اچھے ہیں۔ جواب کا انتظار رہے گا۔ ایاز

ڈھاکا (مشرقی پاکستان)

خط لکھ کر ختم ہی کیا تھا کہ دوسرا کارڈ ملا۔ جواب دینے میں "ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" اور باعث تھا آپ کی فرمائش بلکے مطالبا۔ عصمت نے ان کے لکھ مارے اور تھوپ دیا میرے سر کہ لو صاف کرو بیٹھ کر ——

پتے کے متعلق عرض ہے کہ تپا گرچے درست ہے مگر ڈھاکا ایئر پورٹ پہلے لکھا کریں۔ اور ٹیلیفون ایکسچینج بعد کو۔ چونکہ ایکسچینج یہاں کئی ایک ہیں۔ اس لیے ذرا سی الٹ پھیر سے خط کے ادھر ادھر ہونے کے امکانات تقریباً ختم ہو جاتے ہیں۔ زیادہ لکھنے کا حکم سر آنکھوں پر۔ حکم بجا لاتے ہوئے دو خطوط لکھ رہا ہوں۔ ایک طویل اور ایک طویل مختصر یقین رکھیں ہفتے عشرہ کے اندر اور دو تین مزاحیا اور نیم مزاحیا مضامین بھیج دوں گا۔ لکھنے کو تو آپ کی دعا سے آنا پکھ لکھتا ہوں کہ سودات سے چاے گرم ہوتی رہتی ہے مگر جو معیت ہے وہ صاف کرنا بسیار نویسی کا یہ عالم ہے کہ انیس فسانے اور مضامین نیز مطبوعا ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے اپنے متعلق ایک بردست غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اور یہ خیال ہو چلا تھا کہ حیدرآباد دکن کے کسی ہیشر سے اپنے ان طنز یا مضامین کا مجموعا چھپوانے کی بات چیت کروں۔ جو ہندستان کے اچھے رسالوں مثلاً شاہراہ، پریت لڑی، ترقی اور پاکستان کے افکار، نگار اور دکن کے "ہندستانی ادب" میں شایع ہو چکے ہیں۔ خدا کا شکر ہے یہ غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔

لیجیے صاحب! آپ نے لکھا ہے تو گرمی اور چستی کو ضرور سوار کیے ہی لیتے ہیں۔

"مٹھائی" کا مطالبا ذرا تشریح طلب ہے وہ یوں کہ ایک تو بیٹھے بٹھائے آپ کو بھاجان بنوا دیا۔ الٹے مٹھائی بھی ہونا یوں چاہیے تھا کہ میرے دوست احباب، ملاقاتی، بزرگ اور چھوٹے بڑے مٹھائی مجھے کھلاتے مگر صاحب اس دنیا کی ہر بات الٹی سب کو کھلا چکا ہوں آپ کو بھی کھلا دوں گا۔ اس فکر میں ہوں کہ ڈھاکا میں اس قسم کی مٹھائی ملتی ہو تو بذریعہ جوائی میں ڈال یا پوسٹ کارڈ پر بھیج کر آپ کو بھیج دوں۔

ہندستانی ادب کی ایک مدت سے ایک کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ ہر زبان کے ادب میں ایک ایسے رسالے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ادب کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی ادبی، سماجی اور ذاتی زندگی کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے۔ ہندستانی ادب کی یہ کمی ایک حد تک "ہندستانی ادب" نے پوری کر دی ہے۔ اس کے مضامین سے ہندستانی ادب کی ترقی کی رفتار کا بھی پتہ چلتا ہے اور ادیبوں کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے مضامین بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہر ادیب کو اس کا مشترک ہونا چاہیے۔ ہندستانی ادب کی ایک مدت سے ایک کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ ہر زبان کے ادب میں ایک ایسے رسالے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ادب کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی ادبی، سماجی اور ذاتی زندگی کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے۔ ہندستانی ادب کی یہ کمی ایک حد تک "ہندستانی ادب" نے پوری کر دی ہے۔ اس کے مضامین سے ہندستانی ادب کی ترقی کی رفتار کا بھی پتہ چلتا ہے اور ادیبوں کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے مضامین بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہر ادیب کو اس کا مشترک ہونا چاہیے۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن (۲)

حکومت، پنجاب، میسور، اور بھوپال کا منظور شدہ

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے — قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

جلد (۱۴) — نمبر (۶)

اردی بہشت ۱۳۶۳ف — مارچ ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقائق و معارف	فقر موہانی	۳
کھولو نیلا پردہ	معصوم رضا	۴
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	ڈاکٹر بی۔وی کیسکر وزیر اطلاعات و نشریات	۵
کشمیر کی سیر	ایچ۔آر۔وھرا حکومت ہندستان	۷
جنگ بازوں سے	ایاز عصمی	۸
برطانیا کی سیول سروس	ب۔ا	۹
جسم انسانی میں دوران خون کا عمل	ا۔ا	۱۰
انقلاب عظیم کا علمبردار لینن اعظم	تاس	۱۱
	فنی	
علم و جہل	عزیز الحسینی (عثمانیا)	۱۳
نئے چین میں سائنٹی تحقیق	بچ۔ا	۱۴
ایک تاریخی عمارت "دی کیپٹل"	یوسیس	۱۸
سپاہی نے پکارا	سہام مرزا	۲۰
راگ کا لامصوری کے نادر نمونے	ا۔ا	۳۱
خیالی محبوبا	ثمر (گلبرگوی)	۲۲
آکسفورڈ یونیورسٹی	ہیلن ڈینیٹ	۲۳
اور سورج۔۔۔ڈوب رہا تھا	اجمل رشید (عادل آبادی)	۲۴
صنعتی کاموں میں الیکٹریسٹی کا استعمال	یوسیس	۳۰
ابراہیم شفیق		۳۱

ہمارے خیالات

ہندستانی بھاشا کی اہمیت

ان صفحوں کے لیے یہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے اسی عنوان پر ہم انہیں کالموں میں ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں اور موقع موقع سے ہندستان کی ملی جلی بھاشا "ہندستانی" کی اہمیت جتانے کی کوشش کی ہے یہ ضرور ہے کہ موقعے مختلف اور مثالیں بھی ایک دوسرے سے الگ ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ اسی اصول کے پیش نظر آج بھی ہم ایک نئی ہی نظیر پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہندستانی پارلیمنٹ کی تشکیل اور اس کے ڈھانچے سے غالباً ہر پڑھا لکھا ہندستانی واقف ہے پالسو ممبروں کے اس ایوان میں ہندستان کے سب صوبوں یا اسٹیٹ کے نمایندے موجود ہیں ان میں آسامی، بنگالی، اڑیا، پنجابی، کشمیری، گجراتی مرہٹی، تلنگی، تامل کنڑی، ملایالم، انگریزی، ہندستانی اور دیس کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی بھاشائیں بولنے والے بھی شامل ہیں۔

ہر نمایندے کو اپنے اسٹیٹ کی بھاشا میں بولنے کی آزادی حاصل ہے لیکن عموماً ممبر انگریزی ہی میں تقریریں کیا کرتے ہیں۔ جو ممبر انگریزی نہیں جانتے وہ، بلا تکلف دیس بھاشا "ہندستانی" میں بولا کرتے ہیں۔ ان بھاشا میں کی ہوئی تقریروں کو تقریباً ہر ممبر سمجھ لیتا ہے جنوبی ہندستان کے بعض نمایندے جو کنڑ اور راشٹر قسم کے ہیں وہ اپنی ہی صوبائی بھاشا میں تقریریں کرنا پسند کرتے ہیں چنانچہ جب کبھی کوئی ممبر ملایالم یا کنڑی یا تلنگی یا تامل میں تقریر کرتا ہے تو تقریباً پورا ایوان کھو یا کھو یا سا دکھائی دیتا ہے نہ صرف ہاؤز آف دی پیپل بلکے کونسل آف اسٹیٹ میں بھی ایسا بھیانک منظر نظر آتا ہے۔ انگریزی تقریریں ۵، فی صد ممبر سمجھ لیتے ہیں اور "ہندستانی" تقریروں کو بلا مبالغہ پارلیمنٹ کا ہر رکن سمجھ سکتا ہے۔

ان دونوں ایوانوں سے ہٹ کر جب ہم اسٹیٹ اسمبلیوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو مدراس اور آندھرا کو چھوڑ کر باقی سب اسمبلیوں میں انگریزی اور ہندستانی کا بول بالا ہے۔

حیدرآباد اسٹیٹ اسمبلی بھاشائی اعتبار سے چوں چوں کا مربّا کہلوائی جا سکتی ہے۔ اس اسمبلی میں تین صوبائی بھاشائیں تلنگی مرہٹی اور کنڑی کے علاوہ انگریزی اور ہندستانی جملہ پانچ بھاشاؤں میں تقریریں ہوا کرتی ہیں لیکن ان سب میں "ہندستانی" بھاشا کو خاص اہمیت حاصل ہے جس کے مظاہرے یہاں پر آئے دن ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں وزیر مال اور آبکاری زنگارریڈی پر مختلف حلقوں سے انگریزی کنڑی اور مرہٹی بھاشاؤں میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی یہ بے چارے صرف تلنگی اور ہندستانی جانتے ہیں۔ اس لیے ترجمان کے ذریعے ان سوالات کا متن سننے کے بعد انہوں نے بہ قول نمایندہ اے۔ پی۔ آئی، فصیح اور بلیغ ہندستانی میں جوابی تقریر کی۔ اگر یہ چاہتے تو اپنی ماوری بھاشا تلنگی میں اس سے زیادہ فصیح تقریر کر سکتے۔ لیکن انہیں معلوم تھا کہ سوالات کرنے والے اس سے ناواقف ہیں۔ اور اس کے برعکس ان میں کا ہر شخص ہندستانی بھاشا سمجھ سکتا ہے۔

ہندستانی بھاشا کی ہمہ گیری اور اہمیت کی ایک اور تازہ ترین مثال بھی ملاحظہ ہو!

حال ہی میں اعظم پورا مڈل اسکول کا "اسکول ڈے" منایا گیا۔ اس تقریب میں ہم بھی مدعو تھے یہ تقریب تنگم لکشمی بائی بی۔ اے نایب وزیر تعلیمات کی صدارت میں منائی گئی ہیڈ ماسٹر نے رپورٹ انگریزی میں سنائی اور دوسروں نے تقریریں "ہندستانی" میں کیں ہم صدارتی تقریر سننے کے لیے بے چین تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ کم از کم طالب علموں اور مدعو مجمع کا لحاظ کرتے تقریر لازماً "ہندستانی" میں ہونی چاہیے چنانچہ ہماری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ اور صدر محترمہ نے "ہندستانی" میں تقریر کی اس کے سوا اگر وہ تلنگی یا انگریزی میں بولتیں تو حاضرین کی اکثریت ان کی تقریر سمجھنے سے مجبور رہتی انہوں نے مجمع کی نوعیت کا اندازہ لگا لیا تھا اسی لیے ایک

عالم فاضل صدر نے تقریر شاہی

حقایق و معارف

افقر موہانی

حرم کا دل میں خیال بھی ہے، صنم کدہ کا جمال بھی ہے
جو سر پہ وہ خاک آستان ہو تو زندگی کا مآل بھی ہے

اگر امید حیات ہے کچھ تو موت کا احتمال بھی ہے
کہ غم شریک نشاط جاں ہے خوشی شریک ملال بھی ہے

جو مر چکے ہیں تری رضا میں جو مٹ گئے ہیں وفا میں
ملال کیسا نصیب اعدا تجھے کچھ ان کا خیال بھی ہے

غرض کبھی کیف معرفت سے ملے گی خالی نہ بزم ساقی
جو بیخود حال ہیں ہزاروں تو ان میں اک اہل حال بھی ہے

اب اسکو سمجھوں فریب جلوہ کہ اپنے ذوق نظر کا دھوکا
دم نظارا وہی نظر ہے وہی حجاب جمال بھی ہے

وہ صبح عشرت کی زندگی ہو کہ شام فرقت کی سخت جانی
جو آپ چاہیں تو پھر ہے آسان آپ چاہیں محال بھی ہے

اب اے دل اس سے زیادہ داد خرام کیا محو ناز ہوگی
کہ فرش راہ قدم میں آنکھیں متاع دل پائمال بھی ہے

تمام ہستی ہے شوق بے حد تمام ذوق نظارہ حیراں
نہیں ہے کچھ دل ہی وقف جلوہ نگاہ محو جمال بھی ہے

عجب ہے افتاد زندگانی کبھی ہے پیری کبھی جوانی
عروج کیسے عروج بھی ہے زوال کیسے زوال بھی ہے

نہ پوچھ صیاد ہو رہی ہے جو کچھ اسیروں کی دل کی حالت
ملال قید قفس ہی تنہا نہیں چمن کا خیال بھی ہے

دلوں پہ ہنس ہنس کے بجلیوں کے گرانے والے بتا خدارا
یہ داغ یوں ہی رہیں گے سوزاں کہ صورت اندمال بھی ہے

عجب کشاکش میں جان مضطر ہے اپنی دو روزہ زندگی میں
کبھی رم کا ہے شوق دل میں کبھی سفر کا ملال بھی ہے

کلیم ہنگام دید جاناں نظر ہو خیرانہ دل پریشاں
کہ شوق دیدار تو ہے آساں نظر ملانا محال بھی ہے

سمجھ لیں خدا اہل کفر و ایماں اب اس سے افقر کا دین و مذہب
غلام پیر مغاں اگر ہے تو بندہ ذوالجلال بھی ہے

کھولو نیلا پرچم

معصوم رضا

بدھ کی اگنی گپھاؤں سے جیون کی جوہی کھلائے
بدھ یعنی ہر رات اماوس بدھ یعنی ہر دن گہنایا

لے کی ڈوری ٹوٹ رہی ہے گائے تو بھونرا کیسے گائے
دیوالی بھی دیپ کو ڈھونڈے بدھ سے چارو اور اندھیرا

شبنم انگاروں کی قیدی، کون کلی کی پیاس بجھائے
بدھ یعنی دیوار بنی بیٹھیں بدھ یعنی شمشان ہو دنیا

کاجل کی کوتیا مٹتی ہے نین کٹوروں میں نیر بھر آئے
بدھ یعنی سڑکوں پہ بگڑے سارا رنگ چاو کلا کا

جیون کی بینا پر کوئی چھیڑ رہا ہے موت کا سرگم
بدھ یعنی ہر گھنگھور روے بدھ یعنی روے ہر پرچم

کھولو نیلا پرچم ساتھی کھولو اپنا نیلا پرچم
کھولو نیلا پرچم ساتھی، کھولو اپنا نیلا پرچم

اگن سے لپٹا ہے اندھیرا ڈالر سائے دیپ بجھائے
بدھ یعنی کلیاں جل جائیں دھوپ پڑے اور لاشیں چٹکیں

باپ کی لاٹھی ٹوٹ رہی ہے کیوں اسے گرنے سے بچائے
گھنگور سنگینوں پر اچھلیں موت کے تال پر لاشیں ناچیں

لوری کا جھولا ٹوٹا ہے ماں کیسے بچے کو سلائے
بالوں کی خوشبو مرجھائے سڑتی گلتی لاشیں مہکیں

موت کھلونوں میں بیٹھی ہے بچپن کو یہ کون بتائے
بدھ یعنی سڑکوں پر لاشیں گھر اور سکولوں میں لاشیں

ویر ہوئی تو کرتا ہوگا جیون کے سپنوں کا ماتم
دھرتی زخموں سے بے دم ہے آؤ لگائیں امن کا موسم

کھولو نیلا پرچم ساتھی کھولو اپنا نیلا پرچم
کھولو نیلا پرچم ساتھی کھولو اپنا نیلا پرچم

جیون کی کومل تا پر اب رینگ رہے ہیں کیڑے کیڑے
دھرتی کے سوکھے ہونٹوں پر امن کا ٹھنڈا رس ٹپکاؤ

کھیتوں کی ہریالی میں اب ہوتے ہیں بم کے چرچے
جیون کے مندر میں جاکر امن کے سندر دیپ جلاؤ

بدھ سے دوکانوں میں ہلچل، مل کو اک پل نیند نہ آئے
دنیا بھر کے نغمے ملا کر جیون کا سنگیت بناؤ

بدھ آکاش کے گیان کا دشمن بدھ سے ساگر کا دل کانپے
جیون کے پیغام سناؤ

دھرتی کی یہ آس نہ ٹوٹے رستے میں ہے پھولوں کا موسم
جیون کی بینا پر چھیڑو امن کی دھن پر مدھم مدھم

کھولو نیلا پرچم ساتھی، کھولو اپنا نیلا پرچم
کھولو نیلا پرچم ساتھی، کھولو اپنا نیلا پرچم

(نیا ہند سے شکریہ کے ساتھ)

(۴)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

ڈاکٹر بی۔ وی کیسکر
وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہندستان

(طریق تعلیم ملکی ضروریات کے برابر ہونا چاہیے)

کسی بھی ملک میں طریق تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو وہاں کے باشندوں کے نہ صرف سماجی و تہذیبی تقاضوں کو پورا کرے بلکہ متعلقہ ملک کے تاریخی پس منظر سے بھی مطابقت رکھتا ہو۔ طریق تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ تعلیم پاکر طلبا اس قابل ہو جائیں کہ وہ ملک کی ہمہ گیر ترقی کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوں چنانچہ ہندستان میں اس مسئلے کو حل کرتے ہوئے ہمیں اوپر کے امور کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

ہندستان کے موجودہ طریق تعلیم کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ ماہرین تعلیم نے زیادہ تر موجودہ طریقہ تعلیم کے نقائص نکالنے اور مرمت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس منفی قسم کی بحث چیز سے مسائل نہیں ہو سکتا۔ ہر سمجھدار شخص طریقہ تعلیم میں ضروری تبدیلیاں کرنے کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔ البتہ ان تبدیلیوں کے بارے میں اختلاف رائے ممکن ہے ہمارے ملک میں موجودہ طریق تعلیم کی بنیاد آج سے ایک سو سال سے زیادہ عرصا پیشتر غیر ملکی حکومت نے رکھی تھی اور ظاہر ہے کہ اس کی ترتیب میں غیر ملکی حکومت کی اس وقت کی ضروریات کو زیادہ دخل حاصل تھا۔ تبدیل شدہ حالات میں یہ طریقہ فرسودہ ہو گیا ہے اور نئے حالات کے مطابق اس میں ضروری تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بہت کم تعمیری تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ صرف مہاتما گاندھی نے بنیادی تعلیم کی اسکیم کے ذریعے سے حل کرنے کے لیے اہم قدم اٹھایا تھا۔

اور اصل موجودہ طریق تعلیم وہی ہے جو انگریزوں کے زمانے میں رائج تھا۔ لیکن اس میں تبدیلیاں کرنے کی بجائے ہم اس کی توسیع میں لگے ہوئے ہیں۔ نئی یونیورسٹیاں اور کالج کھول رہے ہیں۔ گذشتہ چند سال کے دوران دیگر اہم سیاسی و قومی مسایل میں مصروف رہنے کے باعث ہم اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ اب ہم تعلیمی مسئلے کو جلد سے جلد حل کرنے کی کوشش کریں۔

تعلیمی نصاب میں تو می کیرکٹر کو مناسب مقام دینے کی ضرورت ہے چنانچہ برطانیا، امریکا اور جاپان وغیرہ ممالک کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا میں زندگی کے مسایل کے بارے میں اپنے اپنے ملک کی تہذیبی روایات کے مطابق سوچنے کا ایک ڈھنگ پیدا ہو جاتا ہے لیکن ہندستان میں حالت اس سے مختلف ہے۔ ہندستان کے تعلیم یافتا طلبا اپنے ملک کی تہذیبی روایات کو اپنے اندر داخل نہیں کر پاتے اور انہیں اپنے دیش کی بجائے برطانیا اور امریکا کی تہذیب کے بارے میں زیادہ علم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں میں پچھمی دیشوں کی تاریخ تہذیب و ادب کی واقفیت ہم پہنچانے کی طرف زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے سے ہمارے ملک میں عالا تعلیم انگریزی زبان میں دیجاتی ہے ظاہر ہے کہ انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کی صورت میں ہمارا زیادہ وقت انگریزی لٹریچر کے مطالعے پر ہی صرف ہوگا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہندستان کے تعلیم یافتا اشخاص برطانوی تہذیب سے اس حد تک متاثر ہیں کہ انہوں فیرارادی طور پر لندن کیمرج اور آکسفورڈ کو ہی اپنے تہذیبی مراکز سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ تہذیبی غلامی ہماری شخصیت

اور ہمارے خیالات کی نشو و نما میں زبردست رکاوٹ ہے۔ ذہین سے ذہین شخص بھی کسی غیر ملکی زبان کے ذریعے کردار کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ ہی تخلیق اور روحانیت جیسی صلاحیتیں اس میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ دنیا میں صرف ہندستان ہی ایسا ملک ہے جہاں لوگ غیر ملکی زبان میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ انگریزی کو تعلیم کا ذریعہ بنائے رکھنا ہمیشہ کے لیے برطانیا یا امریکا کے ثقافتی غلبے کو قبول کرنے کے مترادف ہے، اور جب تک ہم انگریزی کی جگہ اپنی زبان کو تعلیم کا ذریعہ قرار نہیں دیں گے تب تک ہندستان کبھی بھی بام عروج تک نہیں پہنچ سکتا۔

طریق تعلیم میں اصلاح کے بارے میں میری اپنی یہ تجویز ہے جہاں تک پرائمری تعلیم کا تعلق ہے نہ تمام گاندھی کی بنیادی تعلیم کی اسکیم اس مشکل مسئلے کا صحیح حل ہے۔ وسیع پیمانے پر بچوں کو تعلیم دینا مقصود ہو تو ظاہر ہے کہ طریق تعلیم سستا سادا اور گرد و نواح کے حالات کے مطابق ہونا چاہیے۔ موجودہ تعلیمی نصاب میں یہ نقص ہے کہ اس میں تعلیم کے کتابی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن ٹیکنیکل یا صنعتی تعلیم دینے کی کوشش نہیں کی جارہی۔ جس کی ہمارے ملک کو سخت ضرورت ہے۔ اس لیے اس لیے مڈل کی تعلیم میں بچوں کو میکانکی یا صنعتی نوعیت کے کسی نہ کسی مفید ہنر میں تربیت دینی چاہیے۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی وسیع پیمانے پر ٹیکنیکل و صنعتی اسکول قایم کیے جائیں۔ اور ان اسکولوں میں کھانا پکانے سے لے کر مشینی اوزاروں تک کی تربیت مہیا کرنے کے انتظامات کیے جائیں اس موقع پر اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں کہ بچے کو کس عمر میں عام تعلیم کی بجائے کسی خصوصی ہنر کی تربیت حاصل کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ تاہم ماہرین تعلیم کے تجربے کے مطابق بارہ اور پندرہ سال کی درمیانی عمر کے اکثر بچوں کو ہنری تربیت دینے کا کام شروع کیا جا سکتا ہے کیونکہ اپنے ہنر کو اچھی طرح سیکھنے کے لیے بھی انہیں چند سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ اسی طرح ہماری یونیورسٹیوں میں بھی تعلیم کے کتابی پہلو پر ہی زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ میٹرک یا مڈل کی تعلیم میں عملی مضامین کا انتخاب کرنے کے لیے طلبا کی حوصلہ افزائی کی جائے جنہیں اس سے خصوصی رغبت ہو۔ بہرحال اس قسم کا کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔ ورنہ محض بے معنی کتابی تعلیم دیے جانے کا نتیجہ بیروزگاری میں اضافے کی صورت میں ہی رونما ہوگا۔

طلبا کا امتحان لینے کا موجودہ طریقہ ابھی ایک مرض کی شکل اختیار کر گیا ہے اور ہمیں اس کی بجائے کوئی بہتر طریقہ اختیار کرنے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اس وقت ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا ایک خبط سا پیدا ہو چکا ہے اور یونیورسٹیاں محض ڈپلومانیکٹریوں کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ کسی طالب علم کی قابلیت کا اندازا کسی خاص امتحان سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں مطالعے میں طلبا کی باقاعدگی وغیرہ سے متعلق امور کو پیش نظر رکھنے کا کوئی طریقہ دریافت کرنا پڑے گا۔ ملک میں چند رہائشی یونیورسٹیاں قایم کی گئی ہیں اور یہ ایک خوش آئند رجحان ہے۔ صحیح معنوں میں رہائشی یونیورسٹیاں قایم کرنے کی طرف مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہمیں اس مسئلے پر قومی سطح پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے کسی تعلیمی سسٹم کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ طلبا کو صحیح قسم کی درسی کتب پڑھائی جائیں خصوصاً ہمیں اپنے ملک کی تاریخ کو از سر نو ترتیب دینی پڑے گی تاکہ طلبا ہندستان کی تاریخ کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکیں۔ تمام زبانوں میں موزوں درسی کتب تیار کرنے کے لیے قابل اشخاص مقرر کیے جانے چاہئیں۔ اس مسئلے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بھارت میں طریق تعلیم کی تنظیم نو کے مسئلے کی اہمیت کو اب بخوبی محسوس کیا جا رہا ہے اور توقع کرنی چاہیے کہ بھارت کے رہنما اور ماہرین تعلیم کسی قسم کی مزید تاخیر کے بغیر سنجیدگی سے اس طرف توجہ دیں گے۔

کشمیر کی سیر

ایچ۔ آر۔ وھرا

وادی کشمیر، اس قدر خوب صورت اور دل کش قدرتی مناظر کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے کہ انہیں بار بار دیکھنے پر بھی انسان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس جنت نظیر خطے کی قدرتی رنگینیاں بار بار انسان کو دعوت دید دیتی ہیں اور ہر بار انسانی آنکھوں میں اس کی خوب صورتی پہلے سے بھی زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔ مجھے کئی بار کشمیر کی سیر کرنے کا موقع ملا ہے اور اس بار موسم خزاں میں غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ میں پھر وہاں گیا۔ کشمیر کے لیے ہوائی سفر اختیار کرنا ان دنوں رواج بن چکا ہے۔ چنانچہ ہم بھی ہوائی جہاز میں روانا ہوئے لیکن رستے میں ہم نے ایک نوکھی بات یہ کی کہ ہم جموں میں ہوائی جہاز سے اتر کر ایک کار میں سوار ہو گئے۔ میرے ساتھیوں کو اس طویل سفر کے خیال سے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ البتہ میرے لیے یہ پرانی یادوں کو تازا کرنے کا ایک موقع تھا۔ چونکے میں پہلے ایک بار اپنی چھوٹی کار میں سری نگر جموں روڈ پر سفر کر چکا تھا۔ دوسرے نجی ہوائی جہاز کے مقابلے میں سست رفتار سواری سلسلے اس لیے بھی دل چسپی ہے کہ اس سے رستے کے قدرتی مناظر کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مغل بادشاہ کشمیر کی سیر گھوڑوں پر کیا کرتے تھے اور کون یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ وہ اس طریقے سے ان مناظر سے کچھ کم لطف اندوز ہوا کرتے تھے؟ اب گھوڑوں کی جگہ موٹروں نے لے لی ہے اور پختا اور چوڑی سڑکیں بن گئی ہیں۔ گھوڑوں پر سفر کا زمانا اب رہا نہیں لیکن کم سے کم اتنا تو ممکن ہے کہ کشمیر کے ذرے ذرے اور پتے پتے میں قدرت نے انتہائی فیاضی سے جو خوب صورتی سمو دی ہے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ہم موٹر کار یا بس کے ذریعے سفر کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہوائی سفر میں وقت کی بچت ہوتی ہے لیکن اس قیمت پر کہ ہم رستے کے مناظر سے لطف اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

ہم کافی رات گئے سری نگر پہنچے۔ یہ ایک دل چسپ سفر تھا اور اگر صرف میری مرضی پر ہوتا تو میں اسے دو دنوں میں ختم کرتا لیکن بدقسمتی سے مجھے کچھ جلدی تھی۔ ہم ابھی بانہال کی تمام چڑھائی چڑھے نہیں پائے تھے کہ اندھیرا ہو گیا اور اس پر مصیبت یہ کہ دھند چھائی ہوئی تھی۔ دس فٹ سے زیادہ فاصلے پر کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے غیر ملکی ساتھیوں کو اس امر کا علم نہیں تھا کہ یہ رستا کتنا پرخطر ہے اور نہ ہی میں نے انہیں اس موقع پر اس بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ رات کے نو بجے ہم بانہال کی سرنگ تک پہنچے اور ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دوسری طرف بھی گہری دھند چھائی ہوئی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے تقریباً نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ اور ہمیں اس پہاڑی سلسلے کو عبور کرنے کے لیے کم سے کم دو ہزار فٹ کی اور بلندی پر پہنچنا تھا بہر حال یہ سفر ہنسی مذاق میں کٹ گیا۔ اور جب ہم کازی گنڈ سے سیدی سری نگر جانے والی سڑک پر پہنچے تو ہم نے اپنے آپ کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ میں اس تجربے کو غالباً دہرانا نہیں چاہوں گا۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس تجربے سے گذر غلطی کی۔

آدھی رات کے قریب جب ہم سری نگر پہنچے تو میں سفر کی مشکلات کو بڑی حد تک فراموش کر چکا تھا اور اس

پریشانی کے کچھ آثار اگر باقی تھے تو وہ بھی صبح کے نمودار ہونے تک زایل ہو گئے۔

ایک مہینا پیشتر جب میں سری نگر میں تھا تو رنگا رنگ کے پھول اپنے جوبن پر تھے۔ ڈیلیا کے پھول نہایت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ اور اسی طرح سبزا اور طرح طرح کے دوسرے پھول من کو بہت بھاتے تھے۔ موسم گرما ختم ہو چکا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اب پھول مرجھا رہے ہیں لیکن اس سے کشمیر کی سیر کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے موسم خزاں میں دو دفعہ کشمیر کی سیاحت کی ہے اس موسم میں بھی وادی کشمیر کی اپنی ہی بہار ہوتی ہے چنار کے درخت زرد اور اس کے بعد آہستہ آہستہ گلابی سرخ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ تمام وادی میں پودوں اور پھولوں کے ایک نئے رنگ سے بہار آجاتی ہے۔ موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور رات کو اوورکوٹ پہننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس موسم میں بھوک خوب لگتی ہے۔ آدمی خوب کھاتا ہے۔ اور اپنے اندر ایک گھوڑے کی سی قوت محسوس کرنے لگتا ہے میں خزاں میں وادی کشمیر کی سیاحت کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ جون سے اگست تک موسم میں اتنی خنکی نہیں ہوتی اور بعض اوقات گرمی بھی ہو جاتی ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں میں نے وادی کشمیر میں برف پڑنے کا نظارہ دیکھا ہے۔ موسم جیسا کیسا ہی ہو۔ سیر و سیاحت کے لیے کشمیر سے بڑھ کر اور کوئی جگہ نہیں

جھیل ولر کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے اس کی لمبائی چودا میل ہے۔ کشمیری ماہی گیر اور ان کے بچے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں انہیں جھیل میں مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں جھیل کے کنارے پر کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں ہاؤس بوٹ میں رہنے کے لیے جھیل ولر کا کہا بہترین جگہ ہے انسان اس جھیل کے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے پانی پر نظریں جمائے اس کے کنارے کئی گھنٹے عالم محویت میں گذار سکتا ہے۔ ایک پرانی روایت ہے کہ کسی زمانے میں تمام وادی کشمیر ایک وسیع جھیل کی مانند تھی۔

کشمیر میں رہایش کا انتظام کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ وہاں تقریباً دو سو آراستا ہاؤس بوٹ ہیں پانی پر تیرتے ہوئے ان مکانوں میں رہایش کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ ایک عام ہاؤس بوٹ میں دو رہایشی کمرے دو یا تین سونے کے کمرے اور ایک غسل خانا ہوتا ہے۔ کچھ ہاؤس بوٹوں میں صفائی کی جدید سہولتوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ پہلی بار کشمیر جانے والا کوئی بھی شخص قدرتی طور پر ہاؤس بوٹ میں رہایش اختیار کرنے کو ترجیح دے گا کیونکہ اس طرح اسے زندگی کا ایک نیا تجربہ حاصل ہوگا۔

جنگ بازوں سے

تم نے اک نعرا لگایا جنگ کا
آدمیت چیخ اٹھی
اور انسانوں نے بھی
امن کے پرچم تلے
اک قسم کھائی کہ "ہر اس فرد کا
جو امن کی فاختا پر
لگا کر تیر ڈالے اس کا سر
اپنی ٹھوکر سے کچل ڈالیں گے ہم"
عزم انسانی کی اس للکار پر
زلزلے آنے لگے اور کانپ اٹھے ڈالر و ایٹم کے دھر
ڈالر و ایٹم کی چیخیں گھٹ گئیں
عزم انسانی کی طاقت دیکھ لی!

ایاز سمی

برطانیا کی سول سروس

ب۔ ا

ہر جگہ اس چیز کو تسلیم کیا گیا ہے کہ برطانوی سول سروس کا معیار بہت بلند ہے لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ برطانیا نے یہ معیار تقریباً سو سال کے عرصے میں قایم کیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ملک کی سول سروس کو بتدریج ایمانداری غیر جانب داری اور خلوص کی مستحکم بنیادوں پر تعمیر کیا جاسکتا ہے

موجودہ برطانوی سول سروس ۱۸۵۵ء کی اصلاحات کا نتیجہ ہے اس سے پہلے برطانوی سول سروس کی کوئی مقررا تشکل نہیں تھی۔ اس میں کوئی تنظیم نہیں پائی جاتی تھی۔ وزرا اپنے اپنے حلقے خود چن لیا کرتے تھے۔ تنظیم میں یکسانیت پیدا کرنے یا کسی محکمے کے اخراجات کو کنٹرول کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔

ایک تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات پر سول سروس کے بنیادی اصولوں پر عمل ہونے لگا وہ بنیادی اصول کیا ہیں؟ ایک اصول تو یہ ہے کہ سول ملازمین کو مقابلے کے امتحان کے ذریعے بھرتی کیا جائے۔ دوسرے ان کی ترقی قابلیت کے لحاظ سے ہو۔ بعد میں متعدد کمیشنوں کے کام کی بدولت سول سروس نے دھیرے دھیرے اپنا موجودا معیار قایم کرلیا اب برطانیا کی سول سروس میں یکسانیت پیدا ہوچکی ہے۔ ہر سول ملازم کو ملازمت کی یکساں سہولتیں حاصل ہیں۔ تمام سول ملازمین کو ایک ہی قسم کے ڈھنگ اور طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ اور برطانوی سول سروس بجا طور پر اپنے روایاتی ریکارڈ پر فخر کرسکتی ہے۔

لازمی خصوصیات

برطانوی سول ملازم مستقل خدمات سرانجام دیتا ہے اس چیز نے اس کی کارکردگی میں اضافا کردیا ہے اس کا کام سول نظم ونسق اور حکومت کے کام کی روزروز کی تفصیلات سے نمٹنا ہے۔ تمام سول ملازمین پر وزرا کے ذریعے جمہوری کنٹرول رکھا جاتا ہے ان کو ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر بھرتی کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں سول سروس کمیشن کے چیرمین نے وہ خوبیاں بتائی تھیں جو ایک سول ملازم میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً دماغی قوت شخصیت، ایمانداری عام سوجھ بوجھ وغیرا وغیرا۔

برطانوی سول سروس کو تین بڑے بڑے درجوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلا درجا تو ان ۳۷۰۰ سول ملازمین کا ہے جو وزرا کو پالیسی کے معاملات کے متعلق مشورا دیتے ہیں ان کو ایڈمنسٹریٹو سول ملازمین کہا جاتا ہے دوسرا درجا ایگزیکٹو سول ملازمین کا ہے ان کی تعداد ستر ہزار کے قریب ہے اور وہ حکومت کے روزروز کے کام کو چلاتے ہیں سول ملازمین کو تیسری جماعت کلرکوں پر مشتمل ہے ان کی تعداد ۲۰۹۰۰۰ کے قریب ہے۔ خط کتابت کرنا حساب رکھنا اعداد وشمار جمع کرنا، ریکارڈ رکھنا اور اس قسم کی دوسری باتیں ان کے فرایض میں شامل ہیں۔

ان تین درجوں کے علاوا ایک درجا ایسے سول ملازمین کا ہے جن کا تعلق سائنٹیفک اور ٹکنیکل کاموں سے ہے۔ ان کی تعداد ۸۹۰۰۰ کے قریب ہے ایک جماعت ٹائپسٹوں کی بھی ہے جن کی تعداد ۳۱۰۰۰ ہے اور دو کروڑ سے زاید ملازمین مثلاً ڈاکیے چپراسی ٹیلیفون یا بو وغیرا چھوٹے درجوں میں ہیں۔

پہلے تین درجوں کے ملازمین کو عام طور پر مقابلے کے امتحانات کے ذریعے بھرتی کیا جاتا ہے۔ کلرکوں کو اس بات کے کافی مواقع حاصل ہیں کہ وہ ترقی کرکے ایگزیکٹو درجے تک پہنچ جائیں۔

جسم انسانی میں دوران خون کا عمل ۱-۱

خوراک جو ہم کھاتے ہیں اس کا کثیر حصا چھوٹی چھوٹی آنتڑیاں جذب کرلیتی ہیں لیکن غلیاے جسمانی کی ایک بڑی تعداد جو اس جذب کیے مادے سے غذائیت حاصل کرتے ہیں جسم کے اس حصے سے دور واقع ہوے ہیں۔ چنانچہ اس جذب کیے مادے کو ان تک پہنچانے کا قدرتی نظام ہے۔ یہ کام خون کے ذریعے انجام پاتا ہے جو ہر وقت جسم کے تمام حصوں میں دورا کرتا رہتا ہے۔ اب تو یہ بات ہمارے لیے کوئی نئی نہیں لیکن جب ۱۶۲۸ء میں مسٹر ولیم ہاروے نے پہلی بار اس حقیقت کو منظر عام پر لایا تو اسے مصر کی تحقیق سمجھا گیا تھا۔ اس سے پیشتر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آنتوں سے غذا جگر تک پہنچتی ہے جہاں وہ خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اوپر کی تحقیق سے پہلے یہ خیال عام تھا کہ خون سارے جسم انسانی میں دورا نہیں کرتا بلکہ رگوں میں ہی اوپر نیچے حرکت کرتا رہتا ہے۔

خون مختلف سریانوں کے ذریعے سارے جسم میں دورا کرتا ہے اس عمل کا مرکزی عضو دل ہے جو سینے کے درمیانی حصے میں واقع ہے۔ دل ناشپاتی کی شکل کا ہوتا ہے اس کا حجم انسان کی مٹھی کے برابر اور وزن تقریباً نصف پونڈ ہوتا ہے۔ دل کے چار خانے ہوتے ہیں دو اوپر اور دو نیچے۔ دل عام طور پر ایک منٹ میں ۷۰ سے ۸۰ بار حرکت کرتا ہے اور دو گیلن خون خارج کرتا ہے اس خون کا کچھ حصا پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے جہاں یہ صاف ہوتا ہے۔ بچا ہوا خون جم کر باقی اعضا تک پہنچکر انہیں قوت بخشتا ہے دل کے دائیں طرف سے خون پھیپھڑوں تک پہنچتا ہے اور بائیں طرف سے شریانوں میں داخل ہوتا ہے۔ ان شریانوں سے خون کئی چھوٹی رگوں میں داخل ہوتا ہے اور چکر کاٹتا ہوا آخرکار بال اتنی باریک نالیوں میں پہنچتا ہے یہ نالیاں انسان کے سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ چکر پورا کرنے کے بعد خون واپس دل میں پہنچتا ہے اور نئے سرے سے اوپر کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

جسم میں خون کی باریک نالیوں کا ہروں کی مانند جال سا بچھا ہوا ہے جن کے ذریعے خون جسم کے تمام اعضا تک پہنچتا ہے خون کی اس تمام حرکت کا سرچشمہ دل ہے اس کام میں روزانہ جتنی قوت صرف ہوتی ہے وہ اوسط قد کے ایک انسان کو ۴۵ منٹ کی بلندی تک اٹھا کے لیے کافی ہے۔

خون سوائے ہماری یا حادثے کی حالت کے جسم کے ریشوں میں کبھی بھی داخل نہیں خون میں پانی کا جو حرشامل ہوتا ہے وہ تحلیل کیے دوسرے مادے کے ساتھ باریک نالیوں میں سے خارج ہوکر ریشوں کی درمیانی جگہوں میں داخل ہوتا ہے اور ریشوں کو تر رکھتا ہے لیکن خون سے اس سیال کا لگاتار اخراج ناقابل برداشت ہے۔ چنانچہ یہی رطوبت پھر جسم کی ان سریانوں میں پہنچتی ہے جن سے بے رنگ عرق نکلتا ہے اس کے بعد یہ رستا رہا دوسرے رگوں میں سے گذرتا ہوا آخرکار مواد بڑی رگوں میں جمع ہوجاتا ہے۔ یہ رگیں (ورید) کو دل کے بائیں طرف واپس پہنچاتی ہیں۔ اس طرح خون سے پانی اور دوسرے تحلیل کیے مادوں کی شکل میں جو رطوبت ریشوں تک پہنچتی ہے وہ پھر سے دوران خون کے عمل کا جزبن جاتی ہیں۔

ہندستانی ادب کے خریدار بن کر ہمیں علم و ادب کی سیوا کا موقع دیجے

انقلاب عظیم کا علمبردار لینن اعظم

تاس

آج سے تیس سال پہلے ۲۱ر جنوری ۱۹۲۴ء کو ساری دنیا میں یہ افسوسناک خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ترقی یافتہ انسانیت کے رہنما ایک نئی دنیا کے پیامبر، تمام محنت کش اور مظلوم عوام کے استاد اور دوست والادیمیر الی یچ لینن اس دنیا سے چل بسے۔

ہر جگہ جہاں بھی یہ خبر پہنچی لوگوں نے اپنا اپنا کام چھوڑ دیا گھروں سے نکل پڑے۔ اور جگہ جگہ مجمع لگ گئے۔ پورے سوویت دیس پر سوگ چھا گیا۔ پانچ دن اور پانچ راتیں ماسکو بیدار رہا۔ شدید کہر پڑ رہا تھا۔ اور سوگوار لوگوں کا لامتناہی سیلاب ستونوں کے ہال کی طرف امڈا چلا آتا تھا تاکہ اپنے رہنما کو وداع کر آئیں۔ یہ مظاہرا تھا ولادیمیر الی۔ یچ لینن سے عوام کی بے پناہ محبت کا۔

پارٹی اور تمام محنت کش عوام کے نام اپنے خطاب میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے کہا۔

"پرولتاریا کی تمام فی الواقعی عظیم اور بہادرانہ خوبیاں تمام کی تمام لینن کی ذات میں موجود تھیں۔ بے خوف دماغ، آہنی، بے لوچ اور ناقابل تسخیر عزم جو تمام رکاوٹوں پر عبور حاصل کر لیتا ہے غلامی اور ظلم و ستم کے مقابل اور شدید نفرت انقلابی جوش و خروش جو پہاڑوں تک کو ہلا دیتا ہے عوام کی تخلیقی قوتوں پر بے پناہ بھروسا اور زبردست تنظیمی صلاحیت، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ان کا نام نئی دنیا کی علامت بن گیا ہے۔"

اپنے دیس سے بے پناہ محبت کرنے والے ولادیمیر آئی یچ لینن اپنی زندگی اپنے عوام کی مسرت کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ اپنے وطن سے محبت ہی کی خاطر انہوں نے اپنے دیس کے عوام پر شرمناک ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے کے لیے محنت کش عوام کو جمہوریت پسندوں اور انتراکیوں کی باشعور زندگی سطح تک اٹھانے کے لیے جدوجہد کی۔ لینن کو اس بات پر فخر تھا کہ بہادری اور شجاعت کی لافانی مثالیں پیش کرنے والی سائنس اور کلچر کے زبردست کارہائے نمایاں سے بنی نوع انسان کو مالا مال کرنے والی روسی قوم ہی کو سرمایا دارانہ استبداد کے خلاف محنت کش عوام کی جدوجہد آزادی کا ہراول دستہ بننے کا اعزاز نصیب ہوا۔

ولادیمیر آئی یچ لینن اوایل عمر ہی میں انقلابی بن گئے تھے وہ یہ دیکھ کر کبھی بھی چین سے نہ بیٹھ سکے کہ ان کا خوب صورت دیس زارشاہی خونخوار قاتلوں اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے مختلف طبقوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنتا رہے مزدوروں اور کسانوں کی مظلومیت، مفلسی اور حقوق سے محرومیت زارشاہی افسروں کے ماتحت بیرروسی قوموں کی غلامی دیکھ کر انہیں کبھی بھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ ان کا عقیدا تھا کہ اس زمین پر لوگ خش و خرم رہ سکتے ہیں اور انہیں ایسے ہی رہنا چاہیے۔

جوان شالی ہی میں ولادیمیر آئی یچ لینن نے مارکسزم کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعا کیا تھا اور وہ مارکس اور انگلز کے پکے پیروکار ہو گئے تھے۔ لینن نے سمجھ لیا تھا کہ مارکسزم کا نظریا ہی محنت کش عوام اور مزدور طبقے کی فتح و نصرت کا ایک کارگر ہتھیار بن سکتا ہے اور مزدور طبقا ہی واحد اور

مستقیم قوت ہے جو تمام عوام کو مطلق عنان حکمرانوں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے جبر و استبداد سے نجات دلا سکتی ہے لینن نے مارکسزم کی تعلیمات میں سرمایہ داری کے ارتقا کے نئے حالات کے مطابق مزید اضافے کیے اور مزدور طبقے کی جد و جہد سے متعلق ہر شعبہ علم کو نئے تصورات سے مالا مال کیا

لینن نے اپنی زندگی اس کرۂ ارض پر ایک ایسے سماج کی تخلیق کے لیے وقف کر دی جس میں انسان کے ہاتوں انسان کی لوٹ کھسوٹ نہ ہو۔ جس میں تمام زمین اس کی تمام معدنی دولت اور زمین کی ہر شے محنت کش عوام کی ملکیت ہو۔ جس میں قومیں برابر کا درجہ رکھتی ہوں، اور آپس میں میل ملاپ سے رہتی ہوں ایک دوسرے کا احترام کرتی ہوں۔ جس میں ٹیکنیک کی تمام کامیابیاں، سائنس کلچر اور فنون لطیفہ کی تمام نعمتیں محنت کش انسان کی ہمہ گیر ترقی کے کام آئیں اور اس کی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

زار شاہی کے جبر و استبداد اور مزدور طبقے کے دشمنوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود لینن نے سوویت سماج کی رہنما اور رہبر قوت سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی تعمیر کی لینن کی زندگی اور سرگرمیوں کا سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی سے قریبی تعلق ہے۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں روس کے مزدور طبقے کی رہنمائی کی۔ جبکہ روس کی مطلق العنانی پر پہلی ضربیں لگائی گئیں۔ فروری ۱۹۱۷ء میں بورژوا جمہوری انقلاب کی رہنمائی کی جبکہ زمیندار کی و شہنشاہیت کا تختہ الٹا۔ اکتوبر اشتراکی انقلاب عظیم کی فتح کی قیادت کی اور سوویت یونین کے کروڑوں محنت کش عوام کو باشعور تاریخی تخلیق کے لیے اکسایا۔ سوویت یونین میں ایک اشتراکی نظام کی تعمیر کی ضمانت کی۔ محنت کش عوام کی ایک پارٹی تعمیر کی۔ جو اپنے مستقبل کو بے خوف دیکھتی ہے۔

ولادیمیر ائی یچ لینن کو جتنا کی بے پناہ تخلیقی قوتوں پر لا انتہا بھروسا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ "صرف وہی فتحیاب ہوگا اور اقتدار برقرار رکھ سکے گا۔ جو عوام پر بھروسا کرتا ہے جو عوام کی زندہ اور تابندہ تخلیقی کوشش کے چشمے میں غوطہ زن ہو جائے گا۔"

لینن کی تعلیم ہے کہ ریاست جتنا کہ باشعور ہونے سے مضبوط ہوتی ہے اس وقت مضبوط ہوتی ہے جبکہ جتنا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے جبکہ جتنا ہر بات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ریاست کی زندگی میں سوچ بوجھ کر حصہ لیتی ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ صرف سوشلزم کے ماتحت ہی جتنا کی زبردست فطری قوتیں نشو و نما حاصل کریں گی۔ عام لوگ اہم تخلیقی اور عظیم الشان کام انجام دینے پر مایل ہو سکیں گے۔ سوویت دیس کے تجربے سے اس کی شاندار تصدیق ہو گئی۔

ایک نئی زندگی کی تعمیر میں کروڑوں محنت کش عوام کے عملی تجربے وہی۔ آئی لینن نے بغور مطالعہ کیا اور اس سے عمومی نتایج اخذ کیے جب اکتوبر اشتراکی انقلاب کے بعد ولادیمیر ائی۔ ایچ لینن دنیا میں مزدوروں اور کسانوں کی پہلی حکومت کے رہنما بنے تو انہوں نے صنعت کی مختلف شاخوں کے مزدوروں، سوویت روس کے انتہائی دور افتادہ علاقوں کے کسانوں اور سابقہ محکوم اور مظلوم قومیتوں کے نمایندوں سے ملاقاتیں کیں۔ اور مختلف مسایل پر ان سے بحث کی۔ انہوں نے مزدوروں کسانوں اور دانشوروں کے بے شمار جلسوں اور محفلوں، مزدور سبھاؤں کی کانفرنسوں میں تقریریں کیں۔ اور محنت کش جتنا میں اس کی اپنی قوت پر اور جس مقصد کے لیے وہ جد و جہد کر رہی تھی اس کے صحیح ہونے اور ناقابل تسخیر ہونے پر اس میں اعتماد پیدا کیا۔

ولادیمیر ائی یچ لینن محنت کش عوام کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ بڑا خیال رکھتے تھے۔ ۲۶ اکتوبر (۸ نومبر) ۱۹۱۷ء کو اکتوبر اشتراکی انقلاب کی فتح کے اگلے روز سوویتوں کی دوسری کانگریس میں انہوں نے سوویت حکومت کے پہلے دو

فرمان جاری کیے ایک امن پر اور دوسرا زمین کے متعلق۔ لینن اور کمیونسٹ پارٹی کی زبانی نوخیز سوویت حکومت نے تمام حکومتوں کو جنگ کی مصیبتوں میں مبتلا تمام قوموں کو امن کی تجویز پیش کی۔ اور امن کے متعلق کسی بھی تجویز پر غور کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ تجویز کس ملک نے پیش کی ہے۔

زمین سے متعلق فرمان نے جس کے مطابق زمینداروں کی تمام زمین لوگوں کو بلا معاوضا دیدی گئی۔ کسانوں کے دیرینہ خواب پورے کیے کیونکہ وہ صدہا برس سے زمین حاصل کرنے کے لیے لڑ رہے تھے اور انہیں یہ زمین خود اپنی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہی سے ملی۔

اکتوبر اشتراکی انقلاب کے بعد لینن نے لکھا کہ آج "ٹیکنیک کے تمام عجوبے کلچر کی تمام نعمتیں تمام لوگوں کو مہیا کی جائیں گی۔ اور اب آئندہ انسانی دماغ اور فہم فراست کو نشہ و کاہلی یا لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ کبھی ہرگز نہ بننے دیا جائے گا۔ یہ جانتے ہوئے پھر کیا یہ مناسب نہیں کہ اس عظیم الشان تاریخی فریضے کی ادائیگی میں تمام تر کوششیں اور محنتیں صرف کردی جائیں"

جب خانہ جنگی کا خاتمہ سوویت حکومت کی فتح پر ہوا اور مداخلت کرنے والی غیر ملکی فوجوں کو بھگا دیا گیا تو ولادیمیر ایچ لینن نے قومی معیشت کی بحالی اور اس کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا ایک عظیم الشان منصوبا پیش کیا یہ منصوبا تھا۔ اشتراکیت کی اقتصادی بنیادیں تعمیر کرنے کا انہوں نے سوویت عوام کو صنعت اور زراعت کے لیے جدید اور بڑے پیمانے پر مشینیں تیار کرنے کے لیے نئی اقتصادی بنیادیں تعمیر کرنے کا کام سونپا۔ ملک کو برقیانے کا کام بنیاد بنا۔ اس منصوبے کی تکمیل نے سوویت ریاست کو سرمایا دار دنیا نے بے نیاز کر دینے کی ضمانت کی۔ عالا ٹیکنیک اور چھوٹے چھوٹے اور بکھرے ہوئے کسان گھرانوں کو بڑے پیمانے کی اجتماعی اور مشینی کاشتکاری میں متحد کرنے کی بنیاد پر لینن نے زراعت کی از سر نو تنظیم کا نقشا تیار کیا۔ اور اس طرح کسانوں کی تباہی و بربادی سے نجات ملی۔

ولادیمیر ایچ لینن کی وفات کے بعد سوویت عوام کمیونسٹ پارٹی کے پرچم تلے اور بھی اکٹھے ہوگئے اور لینن کے عظیم نظریات کو عملی صورت دی۔ سوویت دیس ایک طاقتور اشتراکی صنعتی اور پنچایتی کاشتکاری والی طاقت ہے اسے تمام ملکوں کے محنت کش عوام کا احترام اور محبت حاصل ہے اور وہ امن اور جمہوریت کے مجاہدوں کی صفوں میں قدم سے قدم ملائے چل رہا ہے۔

سوویت عوام اپنے رہنما استاد اور دوست ولادیمیر ایچ لینن کی مقدس یاد کا احترام کرتے ہیں ان کی نصیحتوں پر خلوص عمل کرتے ہیں اور ان کے لافانی نظریات کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں سوویت عوام سوویت ریاست کو مستحکم کرنے مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد کو اپنے دیس کی قوموں کی دوستی کو اور ان کے برادرانا تعاون کو اور محنت کش عوام کی بین قومی یکجہتی کو ہر طرح تقویت پہنچاتے ہیں۔

سرمیز الحسن

علم و جہل

ضیا الثمانیا

علم کی حمایت اور جہالت سے نفرت ہمارا نصب العین ہونا چاہیے اس سے بڑھ کر ہماری کوئی خواہش نہ ہو کہ مطلع کائنات سے جہالت کی گھٹا چھٹ جائے اور علم و ادب کا آفتاب طلوع ہو۔ اور انسان حق و صداقت کے سانچوں میں ڈھل جائے۔

دنیا میں نیکی کا وجود تعلیم یافتا اور طرح طرح کی برائیوں کا وجود غیر تعلیم یافتا لوگوں سے ہے۔

اگر تمام افراد تعلیم یافتا ہو جائیں تو دنیا سے فساد اور فوجداری کا قیام ختم ہو جائے۔

نئے چین میں سائنسی تحقیق

چ - ا

سائنسی تحقیق کے لیے نئے چین میں ۵۳ء میں قومی اخراجات گذشتہ سال کے مقابلے میں چار گنا زاید ہیں اور قومی آزادی کے پہلے کے کسی بھی سال سے ۵۰ گنا کے لگ بھگ زاید ہیں۔ سائنسی تحقیق کی طرف عوامی سرکار نے جو خاص توجہ دی ہے اس کی وجہ سے اس کام میں تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔

اس وقت چین کی سائنسی اکیڈیمی میں دو ہزار تحقیق کرنے والے کارکن ہیں یہ گنتی ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں جب سائنسی اکیڈمی قایم ہوئی تھی چوگنی ہے اس تعداد میں سیکڑوں مزید نئے کارکنوں کا اضافا کیا جائے گا۔ اور انہیں امسال یونیورسٹی کے بہترین گریجویٹوں میں سے چنا جائے گا۔

اس نئے رہنمایانا اصول کے تحت کہ نظریے کو عمل کے ساتھ جوڑا جائے۔ سائنس آج پر امن قومی تعمیر کی براہ راست خدمت کر رہی ہے چین کے سائنس دانوں کو اپنی صلاحیت اور ذہانت کے کمال دکھانے کا پورا موقع میسر ہے اور وہ ملک کی تعمیر میں اہم پارٹ ادا کر سکتے ہیں۔

۱۹۵۳ء نے چین میں سائنسی کاموں کے لیے ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ ملک آج جبکہ صنعت بندی کی شاہراہ پر گامزن ہو رہا ہے سائنس داں اور دوسرے ماہرین ملک کی قومی دولت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے عظیم کام میں رضاکارانا طور پر حصہ لے رہے ہیں ارضیاتی پیمائش کے کاموں اور تحقیق کے تمام پہلوؤں کو جو ان کاموں سے متعلق ہیں بے نظیر پیمانے پر توسیع دی گئی ہے چین کے طول و عرض میں ارضیاتی پیمائش اور معائنے کا کام جس میں ۲ ہزار اشخاص مصروف ہیں اس سال کے اوایل میں شروع کیا گیا تھا۔ نباتیات حیوانیات حیاتیات پانی کے تحفظ پیڈولوجی اور ارضیاتی معائنا اور دوسرے میدانوں کے ماہرین کا پہلا دستا دیہات کے مختلف حصوں کے لیے اپریل کے آغاز میں روانا ہوا تا کے ملک کے قدرتی ذرایع کا پتا لگانے کے لیے ملکی پیمانے پر جاری معائنے کی پہلی مہم میں حصالے سکے۔ ان ماہرین کا کام نمایاں نتایج برآمد کر رہا ہے چین میں کوئلا اور دھاتوں کے ذخیروں سے متعلق جو اندازا پہلے لگایا گیا تھا اس پر نظر ثانی کی گئی ہے اور پتا چلا ہے کہ وہ ۵۰ سے ۱۰۰ گنا تک زیادا ہیں۔ کچی دھاتوں کے نئے ذخیرے دریافت کیے گئے ہیں۔

کچے لوہے اتانبے اور پٹرول کے نئے ثروت مند ذخیروں نے سابقا اندازوں کی تردید کر دی ہے کہ چین قدرتی ذرایع کے اعتبار سے مفلس ہے۔

ان اعداد و شمار کو جمع کرنے میں سائنسی کارکنوں نے جن میں عورتیں اور بوڑھے سائنس داں شامل ہیں بہت سی مشکلوں پر اپنی ہنرمندی اور جوش و خروش کے ساتھ عبور حاصل کیا ہے اور ان کا یہ جوش و خروش نئے چین کے پرجوش اور نوجوان ولولوں کی آئینا داری کرتا ہے۔ بہت سے کارکن برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر چڑھ رہے ہیں جہاں انسان نے اس سے پہلے قدم نہیں رکھا تھا۔ بہت سوں کو دور افتادا علاقوں میں صحرا اور جنگل پار کرنے پڑے ہیں۔ ۹۰ ارضیاتی پیمایش کرنے والوں اور زرعی ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم کے بارے میں حال ہی میں پریس میں ایک رپورٹ شایع ہوئی ہے۔ یہ ٹیم تبت سے لوٹی ہے

اس ٹیم نے دھاتوں کی تیس اہم قسمیں دریافت کی ہیں جن میں تانبا، لوہا، سمانجست اور منگنیز شامل ہیں۔

میدانی علاقوں میں تحقیق کا کام کرنے والوں نے جتنا اہم پارٹ ادا کیا ہے اتنا ہی اہم پارٹ تجربا گاہوں میں تحقیق کا کام کرنے والوں نے ادا کیا ہے۔ سائینسی تحقیق اب حرارت سے متعلق اطلاعات تک محدود نہیں ہے جیسا کہ ماضی میں ہوا کرتا تھا لیکن اب تو اسے عملی استعمال کے ساتھ سختی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ٹیکنیکل سائینس میں اس بات پر زیادا عمل کیا جاتا ہے کہ فائیٹ اور اور پگلے لوہے کے استعمال کے طریقوں اور اس کی پیداوار کے سلسلے میں نمایاں تحقیقی کام کیا گیا اسی طرح سخت دھاتوں کے مرکبات / الٹکو کے حرارتی طرز عمل مینگنیز، لوہے سولبڈینم کی ریت اور گری فائیٹ کی کچی دھاتوں کو سنوارنے کے علاوہ کوارٹز جھولتی پلیٹوں کا قون کو دریافت کرنے والے مقناطیسی آلوں اور گیس کے انٹرفرو مٹروں کو بھی بڑی کامیابی سے تیار کیا گیا ہے۔

مختلف صنعتی اداروں میں کام کرتے ہوئے تحقیق کرنے والے کارکنوں نے چینی مٹی کے کیمیائی برتن اور بہت سی بیماریوں کی دوائیں تیار کرنے کے مواد کو بہتر بنانے میں بڑی ترقی کی ہے دونوں تجربوں میں اچھے نتایج برآمد ہوئے ہیں سویت روس کے ماہرین کی بے غرض اور پرخلوص امداد کی بنا پر چین کے سائینس دانوں نے دھاتوں کی صنعت، ارضیاتی پیمایش مشینیں تیار کرنے کی صنعت جنگل بانی اور مویشیوں کی پرورش اور دوسرے میدانوں میں بہت سے ٹیکنیکل مسایل کو حل کیا ہے۔

چین کے سائینس داں گھریلو خام مواد سے ایک ایسا مرکب تیار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو گندھک کے تیزاب کی تیاری میں مدد دیتا ہے۔ اس کامیابی نے اس اہم تیزاب کی بڑے پیمانے پر تیاری کو چین میں ممکن بنا دیا ہے۔

یہ سائینس دانوں کی کوششوں ہی کا پھل ہے کہ اب شمال مشرقی چین میں جو صنعت کا مرکز ہے گھٹیا کچے لوہے کے ۶۰ فی صدی عظیم ذخیرے کھود کر نکالے جا سکتے ہیں۔ یہ نتایج نئی سے دھاتوں کو سنوارنے کا طریقہ ایجاد کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔ سویابین کو آسانی سے جھاگ جھوٹر دینے والی پانی میں بھگو کر گاڑھے تیزاب حاصل کرنے کا یہ نیا طریقہ مقناطیسی طور پر دھاتوں کو سنوارنے کے مہنگے طریقوں سے کہیں بہتر ہے۔

سائینس داں خاص قسم کا پریس بورڈ کاغذ بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس سے بجلی کی مختلف لہروں کو الگ الگ رکھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ گندھک کے تیزاب سے مشینوں میں کام آنے والا ملا جلا تیل تیار کرنے کے سلسلے میں بھی کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ ایک خاص قسم کی گوند بنانے میں سائینس داں حال ہی میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ گوند چپک جانے کی زیادا قوت رکھتی ہے۔ اسے سمندری گھاس سے تیار کیا گیا ہے اور یہ گوند کپڑا ملوں، ربڑ کاغذ اور ایشیا خوردنی اور ادویات کی صنعتوں میں خاص استعمال کی چیز ہے چین لاکھوں پونڈ یہ مہنگی گوند ہر سال دوسرے ملکوں سے درآمد کیا کرتا تھا۔

ان کامیابیوں میں جن میں چین کی سرعت سے ترقی کرتی ہوئی صنعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا ایک اور کامیابی کا اضافا ہوا ہے کہ چین میں پہلی مرتبا پیچیدہ مشینیں اور باریک آلات تیار کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً ایکس رے اور خوردبین یہ خوردبینی چیزوں کو ۱۵ سو گنا تک پھیلا کر دکھاتی ہے۔ ان مشینوں کی پیداوار سے متعلق پیچیدا اور نازک مسلوں کو حل کرنے میں چینی سائینس دانوں نے حتی الامکان مدد کی ہے یہ صرف صنعت بلکے زراعت، جنگل بانی اور مویشیوں کی پرورش میں یعنی عملی طور پر ہر میدان میں سائینس دانوں کی ان ایجادوں نے پیداوار کو بڑا فائیدا پہنچایا ہے۔

چین کے ماہرین نباتیات اور مٹی اور زمین کے ماہرین

بنجر زمین کو قابل کاشت بناتے۔ درخت لگاتے اور مٹی اور پانی کو محفوظ رکھنے کے متعلق مسایل کا مطالعا کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں تحقیق کر رہے ہیں۔

ربر پیدا کرنے اور پشم وار پودوں کو کتھئی رنگ دینے کے سلسلے میں تحقیق کے بعد ابتدائی نتایج برامد کیے گئے ہیں۔ مشرقی چین کا صوبا ہوپے میں پھولوں اور پودوں کی باقاعدا تربیت کا کام شروع ہو چکا ہے۔

کیڑے مکوڑوں کے ماہرین نے کپاس کے کیڑوں کو ختم کرنے کا ایک احتیاطی طریقا ڈھونڈا ہے۔ اس تلاش نے شمالی چین میں کپاس کی فصل کو ان کیڑوں کے حملوں سے محفوظ کر دیا ہے۔ ان کیڑوں کی وجہ سے ہر فی صدی فصل تباہ ہو جایا کرتی تھی۔ گیہوں کے کالے روگ کو روکنے کے لیے جو انتہائی ضرر رساں زرعی کیڑوں کا نیتجا ہوتا ہے۔ ایک موثر ذریعا دریافت کیا گیا ہے۔ اور اس کا مشرقی چین میں تجربا بھی کیا گیا ہے۔ زرعی ماہرین نے سویابین کی پیداوار کو ۱۰ سے ۲۶ فی صدی تک بڑا دیا ہے یہ مقصد سویابین کے پودوں کی جڑوں میں ٹیکا لگا کر حاصل کیا گیا جو اس پودے کی جڑوں میں زیادا گانٹھیں پیدا کرنے کے عمل کو تقویت دیتا ہے تاکے زیادا سے زیادا نائیٹروجن ان میں جذب ہو سکے۔ شمال مشرقی چین میں ۱۵ لاک ہیکٹر زمین میں جہاں سویابین سوئی گئی تھی یہ طریقا لاگو کیا گیا شمال مشرقی چین دنیا کی کل سویابین کی پیداوار کا ۳۷.۵ فی صدی حصا پیدا کرتا ہے۔

کپاس اناج کے دوسرے پودوں پھلوں کے پیڑوں اور سبزیوں کے کیڑوں کے قلع قمع کے دوسرے طریقے بھی دریافت کیے گئے ہیں۔

زرعی ماہرین چین میں محورین کے طریقے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ محورین کے نظریات کے مطالعے کی غرض سے ایک خاص انجمن کو منظم کیا گیا ہے۔

لیبارٹریوں میں وسیع پیمانے پر تجربوں اور تحقیق کاموں نے چین کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ بہت سی ادویات تیار کر سکے۔ مثلاً سرپنٹو مائیسن (جو دق کو روکنے کی دوا) چین میں پہلے بدیسی سے درآمد کی جاتی تھی۔ حال ہی میں ماجرا سے وٹامن بی حاصل کی گئی ہے اور یہ وٹامن عوام کو کم قیمت پر مہیا کی جا رہی ہے۔ چین کے میڈیکل سائینس دانوں کی لیکن سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے امریکی جنگ بازوں کی چھیڑی ہوئی جراثیمی جنگ کو بڑی کامیابی سے ناکام بنایا ہے۔ کیڑے مکوڑوں اور جراثیم کے ماہرین حیاتیات داں اور ادویات کے ماہرین شمال مشرقی چین اور کوریا گئے تاکے انسان کی برسائی ہوئی پلیگ اور بیماریوں کے پھیلاو کو روک سکیں۔

چین میں سائینس نے کئی سمتوں میں ترقی کی ہے۔ سائینس دانوں نے ملک کی فوری ضروریات کو پورا کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کے ساتھ ساتھ سائینس کے دوسرے میدانوں میں بھی ترقی کی ہے اور بہت سے میدانوں میں نئی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ جن پر چین میں اس سے پہلے عمل نہیں کیا گیا تھا۔

چین کے ریاضی دانوں نے مثال کے طور پر کثیر ضربوں کی مقداروں سے متعلق علم ہندسا کے اپنے مطالعے میں ترقی کی ہے۔ مختلف میدانوں میں ان لمبی ضربوں کا خلاصا تیار کیا گیا ہے اور ثابت ہوا ہے کہ ان کا خطی مجموعوں کے نظریے کے سلسلے میں بڑا کام کیا گیا ہے۔ امسال جولائی میں علم ریاضی پر ایک اہم کتاب "مفرد اعداد کو جمع کرنے کا نظریا" کے نام سے شایع ہوئی ہے جس کے مصنف مشہور ریاضی داں ہوا۔ لوکینگ ہیں۔ علم طبعیات میں صدری علم طبعیات کے مطالعے کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ نظریاتی میدانوں میں روشنی کے مرکزی لازمی قوت کے بارے میں تخمینوں کا ایک سلسلا جمع کیا گیا ہے اور صدری قوتوں کی نوعیت اور رفتار کا پتا لگانے کے لیے ابتدائی تحقیق کی گئی ہے۔ ایکس رے کے تجزیوں کا ایک متنازعی

طریقوں سے زیادہ درست ہے۔

سائنسی کارکنوں نے چین میں سائنٹیفک اور ٹکنیکل معلومات کو مزدوروں، کسانوں اور فوجیوں تک پہنچانے کے لیے بھی گراں قدر خدمات انجام دیے ہیں۔ ان کا یہ کام چین کی وسیع پیمانے پر قومی تعمیر کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص ادارہ "سائنٹیفک اور ٹکنیکل معلومات کی نشر و اشاعت کی کل چین انجمن" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں قایم کیا گیا تھا۔

اس انجمن کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی ممبر شپ ۱۷ ہزار ہے۔ ان ممبروں میں سائنس داں، تکنیکل ماہرین میڈیکل ورکر، انجنیر، استاد اور دوسرے میدانوں کے ماہرین شامل ہیں۔ اس انجمن کی شاخوں نے سائنس پر ۱۵ ہزار لیکچروں اور سائنس سے متعلق ۱۵۴ نمائشوں کا انتظام کیا۔ اور ان میں ایک کروڑ ۱۰ لاکھ اشخاص نے شمولیت کی۔

نشر و اشاعت کے میدان میں اس انجمن نے مختلف اقسام کے ۲۰ سے زاید پمفلٹوں کی ۵ لاکھ کاپیاں شایع کیں۔ مختلف سائنسی انجمنوں کے زیر اہتمام ۱۶ جریدے شایع ہوتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے سائنسی اکیڈیمی نے ایک سہ ماہی پرچا "سائنسی اکیڈیمی کا ترجمان" کے نام سے انگریزی میں نکالا ہے جو بدیسیوں کے قارئین کو چین میں سائنسی سرگرمیوں سے آگاہ رکھتا ہے۔ چینی زبان میں بدیسی سائنسی اصطلاحات کے مستند ترجموں کو ترتیب دینے کا کام شروع ہو چکا ہے اور اسے قریب قریب ختم بھی کر لیا گیا ہے۔

قومی آزادی سے پہلے کی بچھڑی ہوئی سائنس کا نوازنا

جب گذشتہ چار سالوں میں چین میں تیزی سے سائنسی ترقی کے ساتھ کیا جاتا ہے تو نمایاں فرق نظر آتا ہے کہ متاثر چین میں سائنسی تحقیق رجعت پرست حکومت کے طاق کی زینت تھی۔ سائنسی کے عملی اطلاق کو بالکل نظر انداز کیا جاتا تھا۔ ٹکنیکل سائنس مثلاً دھاتیں تیار کرنے کی صنعت مشینیں بنانے کی صنعت اور اطلاقی برقیات کی صنعت میں تحقیق کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔

جاگیر دارانا تسلط کے طویل سالوں اور سامراجی مظالم کی ایک صدی نے چین کی پیداواری قوتوں کی نشو و نما کو روکے رکھا۔ لہٰذا قدیم چین میں سائنس پھل پھول نہ سکی۔

قومی آزادی کے بعد سے چین کی سائنس میں عظیم اور بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئی سائنسی اکیڈیمی نومبر ۱۹۴۹ء میں قایم کی گئی۔ مشہور دانشور۔ کو موجو اس کے صدر ہیں۔ پرانی تخصیصی انجمنوں کی از سر نو تنظیم نے سائنسی کام میں بد نظمی لیڈرشپ کی عدم موجودگی، تضیع محنت اور کام کے ادھورے پن کی خرابیوں کو دور کر دیا ہے۔ چین کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سائنسی کام کو عوام کی خدمت کے لیے منظم کیا جا رہا ہے۔

سویت روس کے سائنس دانوں نے جو شاندار قایم کی ہے وہ چین میں سائنس کی ترقی کے سلسلے میں ایک فیصلا کن حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ سائنسی اکیڈیمی نے خصوصی کلاسوں کا انتظام کیا ہے جن میں روسی زبان پڑھائی جاتی ہے تاکہ سائنس کے متعلق روس کی اصلی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جا سکے۔

آئی۔ پی۔ پاولف، مچورن اور دوسرے نامور روسی سائنس دانوں کے نظریات کا ایک خاص درسی سلسلا شروع کر دیا گیا ہے۔

اس سال سویت یونین میں تین مہینے گذارنے کے بعد چینی سائنس دانوں کی واپسی پر ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا ہے کہ سائنس داں قومی تعمیر کو درپیش فوری سائنسی مسئلے حل کرنے کے لیے چین کے حالات اور سویت روس کے تجربوں کو آپس میں متحد کریں۔ ملک بھر میں سائنس دانوں نے مباحثے بھی منعقد کیے۔

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کوپا کر کے چندا منی آرڈر کر دیجیے۔ وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا۔

ایک تاریخی عمارت "دی کیپٹل"

یو سیس

(امریکا میں جمہوریت کا گڑھ)

جس طرح نئی دلی میں دفاتر سکریٹریٹ کی شاندار اور پرشکوہ عمارت ہیں ہیں اور ایک عظیم دلکش اور فن تعمیرات کا نادر نمونا پارلیمنٹ ہاوس ہے اسی طرح امریکا میں سرکاری دفاتر کی عمارت "دی کیپٹل" ہے یہ امریکا کی راج دھانی۔ واشنگٹن میں ایک تاریخی اور نہایت اہم اور قابل دید عمارت ہے اس کی بنیاد جارج واشنگٹن نے اپنے ہات سے رکھی تھی۔ انگریزوں نے امریکا کے ساتھ جنگ کے دوران میں اس میں آگ بھی لگا دی تھی۔ باقی حالات نیچے ملاحظا فرمائیں۔

امریکا کی راجدھانی واشنگٹن میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر کی لاگت سے بنی ہوئی سرکاری دفتروں، امریکی سینٹ اور ایوان نمایندگان کے اجلاسوں کے لیے ایک شاندار پرشکوہ اور عظیم عمارت ہے جو ایک خوب صورت پہاڑی پر واقع ہے اس کا نام "کیپٹل" رکھا گیا ہے اس کے ارد گرد ۱۳۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا دل کش باغ ہے یہ عمارت شہر کے ہر گوشے سے دیکھی جاسکتی ہے تمام دوسری عمارتوں کے مقابلے میں یہ نہایت جاذب توجہ اور پرکشش ہے۔

جب دور سے اسے دیکھا جائے تو یہ ایک ساکن، اٹل اور ناقابل تغیر شاہانا ٹھاٹ رکھنے والی عمارت معلوم ہوتی ہے عملی طور پر اس کی چار دیواری کے اندر مسلسل تنوع جدوجہد اور تحرک و عمل کی کہانی پائی جاتی ہے۔

عمارت کے اندر بڑے بڑے ہال اور کمرے ہیں ان میں امریکی سینٹ اور ایوان نمایندگان کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ ملکی قانون منظور کیے جانے اور بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ ان کے ارد گرد سیکڑوں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں مختلف محکموں کے دفتر۔ نظم و نسق کا عملا اور کلرکوں اور دوسرے محکموں کے لیے دفتری کمرے ہیں۔ بہت سے ایسے ہال ہیں جن میں کئی قسم کی چیزیں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ جنھیں دیکھنے کے لیے سیاح اور دوسرے لوگ آتے رہتے ہیں اور ان کا ایک تانتا سا بندھا رہتا ہے۔

یہ عمارت عملی طور پر ایک شہر کی طرح ہے اس میں سٹورنٹ باورچی خانے۔ اسٹیشنری اور حجاموں کی دکانیں ہیں۔ ٹرنی اور دوسرے ایسے ہی لوگ بھی یہاں کام کرتے ہیں۔ ٹکٹ گھر بینکوں کے دفتر۔ ڈاک خانے ڈسپنسریاں اور ڈاکٹر وغیرا سب میسر پائے جاتے ہیں۔ اس میں ۳۵۴ کمرے ہیں اور ۱۴ ایکڑ زمین پر یہ عمارت پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ہزار ملازم اس عمارت کی دیکھ بھال اور نگرانی اور مرمت وغیرا کے لیے مقرر ہیں

جمہوریت کا گڑھ

جمہوریت کے اس گڑھ میں پرانی تاریخ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔۔۔۔ ان عظیم سیاسی رہنماؤں اور ان کے آپس کے بحث مباحثوں۔ ہماہمی اور گرم گفتار رہی بھی تک اس کی فضا میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جدید قسم کے دفتروں کی سنگ مرمر کے شفاف آتشہ الوں اور بڑے بڑے آئینوں میں ماضی کی تاریخ

کا عکس جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے ہر ایک کمرے اور برآمدے میں امریکا کے بڑے بڑے مدبروں سیاست دانوں اور جری اور بہادر سپاہیوں کی تصویریں ایک کہانی بیان کرتی ہیں۔

کیپٹل کی یہ عمارت محض آئین ساز مدبروں کی نشست گاہ کے لحاظ سے ہی اہم نہیں بلکہ یہ ملک کی ایک بہترین نمائش گاہ بھی ہے اس کی آرٹ کی گیلریاں خوب صورت ستونوں والے حال طرح طرح کی آرائش سجاوٹ اور دیگر اشیاء نہ صرف بجائے خود دلکش ہیں بلکہ امریکا کی تاریخ بھی بیان کرتی ہیں

کیپٹل میں حکومت کے تینوں بڑے شعبے موجود ہیں۔ پرانے سینیٹ کے ایک حلف ۱۸۰۱ء سے ۱۹۳۵ء تک امریکا کی عدالت عالیا (سپریم کورٹ) کے دفاتر اور اجلاس ہوتے رہے امریکا کے اکثر صدروں کے اس عمارت کے صدر دروازے کے سامنے کھلے حصے میں اپنی صدارت کے حلف اٹھائے ہیں۔

(پچھلے دنوں جب صدر آیزن ہاور امریکا کے صدر چنے گئے تو انہوں نے بھی اسی جگہ عوام کے سامنے حلف وفاداری اٹھایا تھا ــــ)

کیپٹل کی تعمیر بتدریج عمل میں آئی ہے اس کی تعمیر میں کئی دوسری کی شکلات کی وجہ سے بھی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہی ہیں

اصلی نقشا

کیپٹل کا اصلی نقشا ایک غیر پیشاور ماہر تعمیرات نے تیار کیا تھا جسے جارج واشنگٹن (اس وقت کے امریکی صدر) نے پسند کیا تھا۔ جس میں صدر موصوف کے منشا کے مطابق شان و شکوہ کے ساتھ سادگی اور ہر طرح کی سہولتیں پائی جاتی تھیں

۱۷۹۲ء میں ایک شخص ڈاکٹر ولیم تھارنٹن نے اس عمارت کے لیے نقشے پیش کرنے کے مقابلے میں حصا لے کر اپنے ہاتھ سے تیار کیا ہوا نقشا پیش کیا۔ جو منظور ہو گیا۔ اور اس کے صلے میں اس کو ۵ سو ڈالر کا انعام بھی دیا گیا۔ حالانکہ تھارنٹن پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر یعنی طبیب اور معالج تھا۔

سنگ بنیاد

جارج واشنگٹن کو یہ عمارت بہت ہی عزیز تھی۔ انہوں نے خود اج معمار کا لبادا پہنکر اس عمارت کا سنگ بنیاد ۱۸ ستمبر ۱۷۹۳ء میں رکھا تھا۔ اور اس وقت اس تقریب پر امریکی توپ خانے نے سلامی دی تھی۔

اس اہم تاریخی واقع کو پچھلے ستمبر ۱۶۰ برس کا عرصا گذر گیا۔

کسی بھی مکان بنانے والے کی طرح کانگریس کو بھی کیپٹل کی عمارت مکمل کرنے میں کئی مشکلات اور اخراجات کا سامنا رہا۔

تکمیل و آشتردگی

تاہم ۱۸۱۲ء میں کیپٹل کی عمارت اپنے نقائص کے باوجود مکمل ہو گئی اور اس زمانے کے مطابق بہت شاندار اور خوب صورت سمجھی جاتی تھی۔

اس کے بعد برطانیا کے ساتھ جنگ چھڑ گئی ۱۸۱۴ء میں (یعنی عمارت کی تکمیل کے دو برس بعد) برطانوی بحری فوج نے اس نہتے اور دماغی انتظامات سے محروم شہر پر قبضا کر لیا۔ اور اس عمارت (کیپٹل) کو آگ لگا دی جب ساری عمارت نہ جل سکی تو برطانوی سپاہیوں نے عمارت میں جتنی تصویریں، کتابیں اور نادر اشیا تھیں سب کو ایک حال میں جمع کیا۔ ان پر کوئلا چھڑک کر آگ لگا دی۔ اور سب کچھ بھسم کر دیا۔

بعد میں اس واقعے پر برطانوی افسروں کو بھی صدما ہوا۔ اور برطانیا کے اخباروں نے بھی اس وحشیانا حرکت کی شدید مذمت کی۔ آخر جب امن قایم ہوا تو اس عظیم عمارت کے صرف کھنڈر اور دیواریں ہی کھڑی تھیں۔

دوبارا تعمیر

بہرحال اس کی دوبارا تعمیر کے بعد کانگریس کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس میں ضرورت کے مطابق گنجایش کم ہے۔ اب امریکا کی ابتدائی ۱۳ ریاستوں کی یونین میں ۱۸۵۱ء تک بھاری اضافا ہوگیا تھا۔ دفتروں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ کلرک ایک دوسرے کے کھوے سے کھوا ملا کر کام کرتے تھے۔ لائبریری میں کتابوں کے لیے جگہ نہ رہی۔ برآمدے اور رستے میں کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے۔ عدالت العالیا کے پاس جہاں مقدمات اکثر اوقات ہوتے ہی نہیں تھے اب اس کا کام بھی بڑھ گیا۔ نئے محکمے دفتروں کے لیے مزید جگہ کی ضرورت میں لیے حد اضافا ہوگیا۔

چنانچہ "کیپٹل" کے دونوں طرف نئے مکان تعمیر کیے گئے جن میں آج ایک طرف امریکی سینیٹ اور دوسری طرف ایوان نمایندگان کی نشستیں ہوتی ہیں۔

اس نئی تعمیر کے دوران میں جہاں پچھلی جنگ (برطانیا کے ساتھ جنگ) کے دنوں کا قرضا بھی بڑھتا گیا۔ اور واشنگٹن کا شہر بھی اجڑنے کے قریب تھا۔ لیکن کیپٹل کا نیا گنبد اور نیلا تدریج مزید بلندی کی طرف بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی چوٹی پر آزادی کی دیوی کا مجسمہ بھی نصب کر دیا گیا۔

یہ گنبد مشرقی پلازا کی طرف سے ۲۸۵ فٹ اونچا ہے اور انجنیری اور فن تعمیرات کا یہ ایک معجزا سمجھا جاتا ہے اس میں جو لوہا استعمال کیا گیا ہے وہ گرمیوں میں پھیلتا اور سردیوں میں سکڑتا ہے۔ لیکن عمارت کو نقصان نہیں پہنچتا۔ دن کو اس کا رنگ دودیا سفید نظر آتا ہے اور سرسبز درختوں کے پس منظر میں بہت ہی دل کش دکھائی دیتا ہے۔

پرانا ڈھنگ

اگرچہ کیپٹل پرانے ڈھنگ کی عمارت ہے لیکن آج بھی ملک کی ضروریات کو پورا کرتی ہے اب تو سینیٹ اور ہاؤس کے دفاتر کانگریس لائبریری اور عدالت عالیا کے دفاتر اب نئی خوب صورت عمارتوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ عظیم روٹنڈا میں تاریخی مصوری کے شاہکار شوبیروں کے مجسمے موجود ہیں۔

اس عمارت میں ان تمام امریکی صدروں مدبروں اور شہید ہیروؤں کے ہنارے رکھے جاتے رہے ہیں جو صدارت کے دوران میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ نامعلوم سپاہی کا جنازا بھی یہاں کچھ دیر کے لیے رکھا گیا تھا۔

سپاہی نے پکارا

سہام مرزا

پیارے دوستو! تم نے کبھی اس غریب کی خیریت پوچھی ہے۔ تم کیوں پوچھنے لگے بلاوجہ بھی زحمت اور مصیبت اپنے سر کیوں مول لوگے تمہارا ایک ساتھی وطن سے دور پڑا ہے مگر تم لوگ عیش مناتے ہو محبت کے میٹھے گیت گاتے ہو۔ تالاب کے کنارے چاندنی راتوں میں بیٹھ کر کنول کے ہرے ہرے پتے اور اس کی بل کھائی ہوئی سبز سبز ڈالیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو اب میری زندگی پر ہنستے ہو۔ وہ محبت کہاں گئی جب تم اپنی محبت کو کنول کے قطرے سے زیادا صاف اور موتی سے زیادا بیش قیمت بتایا کرتے تھے لیکن! تمہاری محبت کنول کے سبز سبز پتوں پر کھیلتے ہوئے موتیوں کی طرح چمکدار ضرور تھی۔ مگر اس کے قطروں سے حقیر ہوا کا خفیف سا جھونکا چلا۔ پانی اور محبت کے خامش قطرے پتوں پر رقص کرنے لگے لیکن دوسرے جھونکے پر وہی صاف اور شفاف موتی پانی میں کود کر غایب ہو گئے۔ وہی قطرا جو کنول کے کھلے ہوئے برتن میں آکر یہ بتا رہا تھا کہ میں پانی سے علیحدا موتی کی طرح رہ سکتا ہوں اپنی چمک دکھا سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے پرکھنا چاہتے ہو تو اسی تھال میں پرکھو۔ میری یہی کسوٹی ہے لیکن نادان یہ نہیں جانتا محض۔

دوستو! تمہاری محبت سیماب کی طرح ہے۔ جو ذری سے حرکت پر ادھر ادھر منتشر ہو جاتا ہے۔

راگ مالا مصوری کے نادر نمونے

ہندستانی حکومت کی وزارت تعلیم نے نیشنل میوزیم کے لیے راگ مالا کی قلمی تصاویر کا ایک نادر مجموعہ حاصل کیا ہے۔

فن موسیقی کا یہ خاصا ہے کہ اس کے سننے والے کے ذہن میں اگر تصویریں اور خاکے اور نقوش بھرنے لگتے ہیں اور فن مصوری کا یہ خاصا ہے کہ اسے دیکھنے والے پر گیت اور نغمے کا وجد طاری ہونے لگتا ہے چنانچہ ان دونوں فنون کے رشتے سے دنیا بھر میں آرٹ کی کئی اقسام ظہور میں آئی ہیں۔ مثلاً یورپ کی پیش نامی موسیقی درحقیقت مناظر بندی اور راگ کے ذریعے قصا کہانیوں کی ایک نئے انسان سرائی ہے چنانچہ یورپ کے مشہور موسیقار بیتھوون نے اپنی "پیسٹرل سمفنی" کی تخلیقی تحریک کے لیے دیہات کا رخ کیا اور دیہاتی مناظر سے اثر لیتے ہوئے انہوں نے بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کو تال اور سر میں پیش کیا۔

راگ راگنیوں کی ذہنی تصاویر

بھارتی جمالیات میں حسن اور آرٹ کی ابتدا کو دیوی دیوتاؤں سے وابستہ کیا گیا ہے۔

اور یہ اس رجحان کا نتیجہ تھا کہ ہندستانی سنگیت کے ارتقا کے ابتدائی دور میں بھی سنگیت کے مختلف اندازوں کو دیوی دیوتاؤں کے روپ تصور کیا گیا۔ چنانچہ "نجم سار سمہتا" میں جس کے مصنف نارد منی بتائے جاتے ہیں بیان کیا گیا ہے کہ چھ راگ اور ۳۶ راگنیاں اپنی سندر کاؤں کے ساتھ برہما کے استھان سے نمودار ہوئیں۔ اور انہوں نے برہما جی کی شان میں نغمہ سرائی کی۔ اس فن میں کمال صرف انہیں لوگوں کو حاصل ہوا جو اپنے دھیان میں ان کے درشن کر سکے سنگیت کے گرنتھوں اور کوہلا چاریا جیسے قدیم مصنفوں نے ہر راگ اور راگنی کو عالم خیال میں دیکھنے کے لیے ان کے لیے الگ الگ مخفی گر بتلائے ہیں۔ چنانچہ اس عالم خیال میں کامیاب تصور کی بدولت دوروپ نمودار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "دیو یا یا" اور دوسرے کا "نادیا یا" ہے۔ پہلی صورت میں تصویروں کا جو بیان ہوتا ہے اس کی نوعیت دینی معلوم ہوتی ہے۔ یہ صورت تصویری تصور پر بھی اثر انداز ہوتی ہے راگ بھیروں کے لیے عموماً شیو جی کے روپ کو دھیان میں لایا جاتا ہے لیکن تصویر کے لیے تخلیقی تحریک پیدا کرنے میں "نادیا یا" کو بہت زیادہ دخل رہا ہے کیونکہ یہ تشکیل، آہنگ کے جذباتی اور حواسی اوصاف کا زیادہ سیدا روپ معلوم ہوتی ہے اور یہی صورت سنسکرت ہندستانی اور فارسی میں علم موسیقی کی کتابوں کی اصل بنیاد ہے۔ سنگیت کے مختلف سروں کے لیے بھی مخصوص رنگ تصور کیے جاتے ہیں اور راگوں کی تصاویر کے علاوہ مختلف تالوں کے لیے بھی مصوری تصویریں پائی جاتی ہیں۔

مختلف موسموں اور نائیکا کی تصویریں

ہندستان میں موسیقی کے طرزوں کے تصور کبھی بھی قصر ہوائی کی طرف نہیں بڑھے اس کا ثبوت راگ مالا کی تصویروں میں ملتا ہے۔ راگ مالا کی تصویروں پر جو دوستوانزی روایتیں اثر انداز ہوئیں وہ بارہ ماس یعنی مختلف موسموں کی مصوری اور نائیکا چتر یعنی طرح طرح کے نسائی حسن کی مثالی تصویریں ہیں۔ راجپوتوں کے زمانے کی موسمی تصاویر بھی موسمی گیتوں اور نغموں کے جذبات کے اظہار ہیں۔ یہ گیت اور نغمے گیارویں

یا بارویں صدی سے شروع ہوئے یہ دیسی زبانوں میں تھے اور سنسکرت شاعری میں اس موضوع کے پر تکلف اشعار کے برعکس ان گیتوں کے الفاظ کی ترتیب میں موسیقی کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ موسمی تہواروں پر ٹولیوں پر ٹولیاں انہیں گایا کرتی تھیں۔ سنگیت کے ہندستانی ماہروں نے ابتدا سے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ سنگیت کے موسم اور وقت سے خاص تعلق ہے۔ چنانچہ راگ مالا کی تصاویر کے رجحان کا زور موسموں کی مصوری کی طرف ہی ہے۔ تارا دتے اپنی تصنیف "سنگیت گوند" میں ہر موسم اور دن کے ہر پہر کے لیے الگ الگ سر بنائے ہیں۔ اسی طرح وسنت راگ موسم بہار کے تصورات سے وابستہ ہو گیا۔

نائیکا کی کہانیوں اور گیتوں میں رومانی لمحوں میں معشوق کی جدائی اور وصل سے متعلق امید اور یاس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ نائیکا سنگیت لکھنے والے ہندی شاعر پریت کی اس کیفیت کو بیان کرنے میں بڑے ممتاز رہے ہیں۔ جو چھ موسموں سے متعلق ہیں۔ چنانچہ نائیکا اور مصوری موسموں کی صورت گری سے منسلک ہو گئی۔ یہ راگ مالا کی روایت سے بھی ہم آہنگ ہو گئے کیونکہ سنگیت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ چھ بڑے راگوں کی پانچ سنگھیوں میں سے ایک برہن نائیکا ہے۔

وزارت تعلیم نے راگ مالا کا جو مجموعہ حاصل کیا ہے اس میں اسی چھوٹی تصویریں ہیں۔ جن میں راجپوتانہ کے زمانے کی مصوری بہت نمایاں ہے۔ ان میں موسم بہار کے آغاز کے وقت تاج ورنگ طلوع آفتاب کا خیر مقدم، موسم برسات کی کالی کالی گھٹاؤں وغیرہ کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ اسی میں حسین دوشیزاؤں کے بناؤ سنگار میں مصروفیت کی تصویریں ہیں۔ ان مرحلوں کی تصویریں ہیں جب ایک سورما جنگ پر روانگی کے وقت اپنی بیوی کو الوداع کہہ رہا ہے۔ پنگھٹ پر شوخ لڑکیوں کو پانی بھرتے دیکھ کر راہ چلتے خوبرو نوجوان کے ٹھٹک جانے کی تصویریں ہیں۔ ان سب تصویروں میں خشمناک چہروں لانبے کالے گیسو اور مغرز اشخاص کی داڑھیوں میں مصور کے اسلوب عملی کی عمدگی قابل دید ہے۔

ثمر (گلیر گوی)

خیالی محبوبا!

عزیز اقربا، دوست، احباب اور ملنے جلنے والے مجھکو مجبور کیا کرتے ہیں کہ میں شادی کر لوں۔ کوئی کہتا ہے چچا کی لڑکی بیاہ لاؤ کسی کا کہنا ہے کہ ماموں زاد بہن سے شادی کروں اور کسی کا مشورہ ہے کہ پھوپی کی لڑکی سے۔ غرض یہ کہ جتنے موجد اتنی باتیں لیکن اے "خیالی محبوبا" بھلا تو ہی بتا چکے میرے دل کی دنیا میں تیری بے پایاں محبت نے ایک حسین اور مستحکم گھر بنا لیا ہو اور تیرا ہی تصور وسیلہ زندگی بن کر رہ گیا ہو۔ تیرا خیال میری اجڑی ہوئی اور خزاں رسیدہ دل کی دنیا کے لیے بہار کا مژدہ اور مسرت کا پیام بنا ہوا ہو تو پھر میں کیوں کر کسی اور سے شادی کر سکتا ہوں۔

برسات کا شوخ موسم ہے کالے کالے بادل آسمان پر ہر طرف منڈلا رہے ہیں۔ ترشح بھی ہو رہا ہے اس پر طرفہ یہ کہ شام کا وقت یہ وہ موسم ہے جس میں ہر نامراد بامراد ہوتا ہے اور ہر ایک کی آرزوئیں پوری ہوتی ہیں ہر شخص مسرور اور اور انتہا سے زیادہ خوش ہے لیکن میں ایک ہوں کہ رات دن تیرے ہی تصور میں رہتا ہوں۔ اور اب بھی تیرے ہی تصور میں ہوں لیکن اکیلا تن تنہا کوئی ساتھ نہیں کوئی یار و مددگار نہیں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی نہیں۔ یہ سائنس جج۔ بر آتہائی گراں ہیں مجھے اس کا بھی علم نہیں کہ تو کہاں کس جگہ اور کس مکان میں رہتی ہے۔ خیر تو جہاں بھی رہے خدا تجھے خوش و خرم رکھے تو پہلے بھولے اور اس محبوب محض کو بھی یاد کر لیا کرے مجھے اس خدائے بزرگ تر سے قوی توقع ہے کہ یہ جدائی کی گھڑیاں بہت جلد ختم کر دے گا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی

(برطانیا کا سب سے پرانا تعلیمی ادارا)

ہیلن۔ ڈینٹ

اگر آپ کسفورڈ یونیورسٹی کو دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ کیمبرج یونیورسٹی کی طرح اس کی بھی ایک خاص بات یہاں کا ماحول ہے برطانیا کی دوسری متدد چیزوں کی طرح جو ایک طاؤی زندگی کا ایک لازمی حصا بن چکی ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے کئی صدیوں کی بتدریج نشو و نما کے بعد اپنا موجودا پوزیشن حاصل کی ہے اور یہ نشو و نما کسی ڈھنگ یا طریقے کے مطابق نہیں ہوئی۔

عالمی شہرت رکھنے والی یہ یونیورسٹی ایسے الگ الگ کالجوں کے مجموعے کا نام ہے جن کی عمارتیں نہ ایک نمونے کی ہیں اور نہ وہ سب ایک جگہ پر واقع ہیں۔ لیکن آکسفورڈ یونیورسٹی کے کالجوں کی ایک مشترکا بات دریائے آئی سیس ہے جس کے برخم کناروں پر سب عمارتیں واقع ہیں برطانیا کی یہ سب سے پرانی یونیورسٹی ہے اور اس نے اب تک اپنی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ یہاں تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ طلبا یہاں تعلیم حاصل کرنے کے علاوا زندگی کے فن کے متعلق بھی کچھ سیکھتے ہیں۔

آکسفورڈ میں تعلیم و تربیت کا سلسلا آٹھویں صدی میں سینٹ فریزی والڈ کی خانقاہ سے شروع ہوا تھا۔ اس خانقاہ میں تھوڑی بہت تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں گئی اور چھوٹے چھوٹے اسکول بھی بغرض وجود میں آگئے مگر لیکن آکسفورڈ یونیورسٹی کی ابتدا حقیقی طور پر شاہ ہنری دوم کے دور میں ہوئی۔ بارہویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک پہلی بار اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ آج سے پچاس سال پہلے اس یونیورسٹی میں ایک نمایاں تاریخی تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ اس نے لڑکیوں کو بھی آنرز ڈگری کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ اس وقت طلبا کی کل تعداد کا تقریباً چھٹا حصا خواتین پر مشتمل ہے اور وہ یونیورسٹی کی زندگی میں پوری طرح حصالے رہی ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی کی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی کے کالجوں میں بھی ہر طالب علم کو ایک ٹیوٹر کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ یہ ٹیوٹر یونیورسٹی کے امتحانوں کی پڑائی کے متعلق اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے مشورا دیتا ہے کہ اسے کون سے یونیورسٹی لیکچر سننے چاہئیں۔ اگرچہ ایسے لیکچروں میں طلبا کا حاضر ہونا ضروری نہیں۔ کالج میں ڈسپلن قایم کرنے کی ذمے داری ڈین پر ہوتی ہے اور کالج سے باہر ڈسپلن کا ذمے دار یونیورسٹی پروکٹر ہوتا ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں طلبا کو ڈگریاں عطا کرنے کا سسٹم تیرہویں صدی میں شروع ہوا تھا اور ڈگری دینے کی رسم اب تک لاطینی زبان میں ادا کی جاتی ہے۔ علوم و فنون کے احیا کے زمانے کے مضامین مثلاً موسیقی۔ دینیات اور قانون کے علاوا متعدد دوسرے مضامین کی جن میں گریجوایٹ فزیکس حیاتیات وغیرا بھی شامل ہیں تعلیم دی جاتی ہے۔

موجودا صدی کے دوران جو تجربا گاہیں بنائی گئی ہیں انہوں نے تقریباً ۱۷ ایکڑ جگہ گھیر رکھی ہے۔ اس صدی کے دوران لڑکیوں کے پانچ کالج اور یونیورسٹی کی کئی نئی عمارتیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی اپنی روایات پر چلتی ہے۔

اور سورج ... ڈوب رہا تھا!

اجمل رشید (عادل آبادی)

اکسپریس فراٹے بھرتا اڑا جا رہا تھا۔ دکن کی چھاتی پر پھیلے ہوئے نشیب و فراز نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے مسکراتا ہوا سورج افق مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ نرم نرم شعاعیں لہراتی ناچتی زمین پر پھیلتی جا رہی تھیں۔ پرگ وگیا، اونچی نیچی چٹانیں جامد و ساکت کھڑی ہوئی مشرق سے ابھرتی ہوئی کرنوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ تھرڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں کچھ لوگ جاگ چکے تھے کچھ جاگ رہے تھے۔ کچھ نیند اور بیداری کے درمیان جھول رہے تھے۔ ایک ابھری توند والے سیٹھ نے ایک زوردار جمائی لی۔ پائیوریا زدہ بتیسی باہر نکال کر کچھ دیر تک مظاہرہ کرتے رہے۔ اور پھر توند پر ہاتھ پھیر کر اٹھ بیٹھے۔ ایک دیہاتن کے تین چار بچے اپنی ماں کی ٹانگوں میں ابھی تک اپنا منہ پھنسائے ریل کے ہر دھچکے پر جھول رہے تھے اور ماں اپنے بچوں پر ہاتھ رکھے نیند کی مائی لال آنکھوں سے ریل ٹھہرانے کی زنجیر دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں زنجیر پر تھیں اور ہاتھ آہستہ آہستہ بتدریج ہر بچے کے جسم پر گھوم رہا تھا۔ ایک ماں کا ہاتھ جو بظاہر ایک سنگتراشی ہاتھ ہے جس پر موٹی موٹی رگیں ابھری ہوئی ہیں، ایک سوکھا ہاتھ جس کا رنگ پیلا سا تو لاپن چھوڑ کر سیاہی اختیار کر چکا ہے ایک عجیب سی کراہ جسے دیکھنے سے پیدا ہوتی تھی ــــ بصورتیں اس قسم کا ہاتھ کسی برطانوی یا امریکی پراسرار ہاتھ سے کم نہیں ہوتا۔ جو زنجیروں میں جکڑے جانے پر بھی معصوم انسانوں کے گلے بڑی پراسراری سے گھونٹ دیتا ہے۔ مگر یہ ہاتھ ــــ ایک ماں کا خون اور گوشت سے معرا ہاتھ جو کسی اسرار سے کوسوں دور ہے جو آج تک کسی برائی کے لیے نہیں اٹھا۔ جس میں مرتے دم تک یہی تمنا رہتی ہے کہ یوں ہی اپنے بچوں کے جسم پر گھومتا رہے۔ ماں تا ماں ہی ننھے ننھے معصوموں میں دوڑتی رہے اور پر عظمت ماں اپنی ماں تا ماں ہی اپنے بچوں پر نچھاور کرتی رہے ــــ نثار کبھی کا جاگا ہوا بغور دیہاتن کا چہرا دیکھ رہا تھا۔ ایک پر عظمت ماں کا چہرا ــــ جس کے چمڑے سے گوشت اور خون کی لالی کے بجائے ممتا جھلک رہی تھی مقدس ممتا ــــ جس میں انتہا پیار ہے خلوص ہے جس کے کلیجے میں محبتوں کا انبار سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے جس کی مسکراہٹوں میں شہد کی سی حیات آفریں حلاوت ہے۔ جس کی چھاتیوں کا پاک خون پی کر کوئی انسانیت کی معراج کو پہنچ جاتا ہے۔ اور کوئی پستیوں میں ڈوب کر شیطان کو بھی مات کر دیتا ہے

ایکا ایک اکسپریس نے ویزل دی اور ایک چھوٹے سے واٹرنگ اسٹیشن (WATERING STATION) پر ٹھہر گیا۔ دیہاتن جلدی جلدی بچوں کو جھنجھوڑتی ہوئی اٹھی چھتریوں کی سی ایک گٹھڑی سر پر رکھے اتر گئی۔ پلاٹ فارم پر کچھ دیر تک شور رہا۔ چائے پان چار مینار سگریٹ کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ اور پھر ٹرین اسٹیشن چھوڑ کر کھیتوں میں داخل ہو گئی ــــ صبح کا سورج اب افق سے اچھی طرح جھانکنے لگا تھا۔ نرم نرم کرنیں اب بھی دھالوں کے کھیتوں پر رقص کر رہی تھیں۔ ایک کسان اور اس کی بیوی بھاگتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہے تھے۔ کسان اپنے ہاتھوں میں پھاوڑا لیے مسکرا رہا تھا اور نئی نویلی بیوی بچوں کی سی مسکراہٹ لیے کبھی بھاگتی ہوئی ٹرین کو دیکھتی اور پھر ایک لمحے میں اس کی پیار بھری نظریں اپنے تانبے ایسے جسم والے شوہر پر مرکوز ہو جاتیں ــــ کتنا پیار تھا ان آنکھوں میں! نثار جیسے محسوس کر رہا تھا اس کی اپنی فاطمہ جھینپی جھینپی نظروں میں محبت کا عمیق تھاہیں

مارتا ہوا آسمان پر لیے پوچھ رہی ہو ——

"آخر دیر تک کیا کرتے رہے آپ ——؟"

کتنا پیار تھا ان لفظوں میں —— اس کا رواں رواں جیسے مسرت سے ناچنے لگتا۔ ان لفظوں سے اس کے جسم میں لہر سی دوڑ جاتی اور پھر جب فاطما پوچھتی ——

"کچھ بندوبست ہوا یا۔۔۔۔۔" وہ پرامید سی پوچھتی بقیہ الفاظ اس کے حلق میں اٹک جاتے۔ نثار کا چہرہ الجھ جاتا اداسی اور گہری ہو جاتی جیسے قدرت نے دلاسا دینے کے لیے بھیجا ہو —— ایک ہوک سی اس کے دل میں اٹھتی اس کا جی چاہتا کہ کائنات کی ساری مسرتوں کو سمیٹ کر فاطما کے آنچل میں بھر دے اور پھر جب اس کی نظریں فاطما کے وجود سے ہٹ کر اپنے ماحول پر پڑتیں تو اسے ایک جھرجھری سی آتی۔ ایک زوردار جنبش جسم کے روئیں روئیں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی۔ ایک کراہیت ایل ایل کر حلق کے حساس پردوں میں چلن پیدا کر دیتی۔ اس کا اپنا ماحول جیسے چیچک کے داغ معلوم ہوتا ایک متعفن پلیٹا ہوا پھوڑا جو پھوٹ کر اپنا سرانڈ سوا دآہستہ آہستہ انجان طرح سے اس کے وجود میں گھستا چلا جا رہا ہے جس کے تعفن کو ماحول کا ہر شخص پینے پر مجبور ہو رہا ہے اس کی ماں چار چھوٹے چھوٹے بھائی فاطما اور وہ خود۔ اس نچلے متوسط طبقے سے چپکا ہوا بیدم کی حالت میں افق پر نظریں جمائے کھڑا ہے۔ ایک انجان سی بے چارگی رہ رہ کر آنکھوں سے مترشح ہو رہی ہے سینے کی گہرائیوں سے ایک گولا سا ابھر کر حلق میں پھنس جاتا ہے اور افق کی مسکراتی ہوئی لالی جیسے کہتی ہے۔

"آؤ! ہمیں چھین لو ——!! ہماری مسکراہٹوں کو اپنے دامن میں بھر لو ——"!!

مگر ایکا ایک کہیں سے ایک جگمگاتا ہوا شعلا سا ابھر کر آجاتا ہے آنکھیں اپنی جنبانی لکھو بیٹھتی ہیں۔ افق کی مسکراتی ہوئی لالی ان جگمگاہٹوں میں ڈوب جاتی ہے۔ کتنی بے چارگی ہوتی ہے ان آنکھوں میں جن کی چمک شعور کی ساری توانائیوں کو چھین لیتی ہے نثار محسوس کرتا جیسے نامعلوم قسم کے تار تیز تیز بڑی بے رحمی سے اس کے وجود پر لپٹے جا رہے ہیں۔ ان تاروں میں کسمسا کر وہ اور اس کی ماں چار چار چھوٹے چھوٹے بھائی اور فاطما گھٹی گھٹی سانسیں لینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

فاطما روز خواب دیکھتی۔ حسین خواب جس میں اس کا اپنا دولہا ہوتا۔ اور اپنی محبت کے پھول بڑی عقیدت سے اس کے قدموں پر چڑھاتی —— دن بھر کی تھکن کے بعد نثار جب چارپائی پر تان کر لیٹتا تو ہلکے پھلکے سہانے خواب دیکھنے لگتا وہ ایک اچھے سے ایوان میں ایک نفیس چوبی کرسی پر بیٹھا فائیلوں پر دستخط کر رہا ہے اور باہر ایک چھوٹا سا خوب صورت بورڈ آویزاں ہے جس پر خوب صورت نفاستوں میں "نثار یوسف زئی۔۔۔۔ ۔ عثمانیا" لکھا ہے۔ وہ بڑا آفیسر ہے اور فاطما ایک بڑے آفیسر کی خوب صورت بیوی ہونٹوں پر تبسم کی مسکراتی ہوئی لالی لیے اس کا استقبال کر رہی ہے اور نثار —— نثار ساری دنیا سے بے گانا دکھوں کی بستی سے کوسوں دور فاطما کے گود میں منہ چھپائے خدا کے وجود کو تک بھولا ہوا ہے۔ اسے کتنی محبت تھی فاطما سے —— اسے یقین ہی نہیں بلکہ ایمان تھا کہ فاطما اس کے بغیر نہیں رہ سکتی مگر پھر بھی نہ جانے اس دن اسے کیا ہو گیا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ معطل سا ہو گیا۔ ایک ہفتے پہلے کی مسلسل بیروزگاری سے تنگ آکر آخر فاطما نے کہہ دیا ——

"کاش مجھے موت آجاتی ——!"

اور نثار کے سر پر جیسے آتشیں ہتوڑا پڑ گیا جس کی گرما گرم ضرب سے اس کی روح تلملا اٹھی! وہ بلبلا گیا فاطما جیسے دعوت مقابلہ دے رہی تھی مگر پھر بھی وہ تنہا ہوا تو "مر گیوں ——"!

"اس لیے کہ گھر والوں کے تیر و نشتر کے طعنے سننے نہیں جاتے اور نہ جینے جی آپ کا خیال ہی دل سے نکل سکتا ہے۔"

—— وہ روز کتنی امیدوں سے اپنی شہلائی آنکھوں میں محبت لیے پوچھتی ——

"کچھ بندوبست ہوا ملازمت کا ——"!

اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ دل کی گہرائیوں میں ایک ہلکی سی گدگدی ہوئی۔ مگر نثار کا چہرا دیکھتے ہی اس پر اوس پڑ جاتی۔ اور چہرا چپکے سے نفی میں جواب دیدیتا۔ بظاہر وہ ہر طرح خوش رہنے کی کوشش کرتی اور نثار کو تسلی و تشفی دے کر اسے ہمت بندھاتی۔ مگر کب تک ـــــ وہ اس دن دیر تک دوپٹے کی اوٹ میں سسک سسک کر روتی رہی۔ اس کی ہچکیاں جیسے برقی چابکوں کی طرح برستی رہیں۔ نثار ان چابکوں سے جلتا رہا جلتا رہا۔ وہ اسے چپ کرانے کی ممکن کوشش کرتا رہا اور جب متعدد قسموں کے بعد بھی فاطمہ روتی رہی تو اس کے احساس کو ایک دھچکا سا لگا ـــــ ہچکیاں ابھرتی اور ڈوبتی رہیں۔ نثار فاطمہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ جب وہ وہاں سے دنیا بھر کا پہاڑ لیے اٹھا اس کا چہرا دہکتا ہوا انگارا بن چکا تھا مگر فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو بدستور بہہ رہے تھے۔

ـــــ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد ایک سیاہ رات کی تاریکی میں نثار کہیں غایب ہوگیا۔!

ایک سال کا طویل عرصا گذر گیا ـــــ!

چلچلاتی دھوپ کڑکڑاتے ـــــ جاڑے اور موسلا دھار بارش کی مسلسل ضربوں نے نثار کا بال بال سیدا کر دیا تھا۔ ایک سال میں گھر سے بھاگ کر اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا جہاں اسے مزدوری کرنے شرم آرہی تھی آج لیبر ایچارج بنے جب وہ تنخواہ لیتا تو وہ سو پچاس روپے کے چرمراتے ہوئے نوٹ اس کی آنکھوں میں رس گھول دیتے۔ بوڑھی ماں چھوٹے چھوٹے بھائی اور فاطمہ کا پیارا چہرا ان نقوشوں سے ابھرنے لگتا۔ ایک دفعہ جب اس نے سو روپے کا منی آرڈر فاطمہ کے باپ کے نام بھجوایا تو وہ واپس آگیا تھا۔ اور اس دن سے مزدوروں کے محبوب نثار کو کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا ـــــ ایک دن نثار نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایک انگڑائی لی۔ سگریٹ سلگا کر فائلوں اور مزدوروں کی عرضیوں پر جھک گیا چند ایک فائلوں پر اس نے دستخط کیے۔ چند ایک نئے مزدوروں کا مناسب مزدوری پر اپائنٹمنٹ (APPOINTMENT) کیا دو ایک کی رخصت منظور کر دی۔ پھر یکے لکھا اور پھر پاس کی لوہے کی ٹرے میں ڈال دیا ـــــ شام کی ڈاگ میں سے اس نے اپنے ذاتی خطوط چن لیے ایک خط پر کونے میں لکھا تھا "ذاتی" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ فاطمہ کا خط پہچانتا تھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے لفافا کھولا اور پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھ رہا تھا۔ دم بدم اس کا چہرا اداس ہو رہا تھا۔

"پیارے نثار"

غالبًا تم مجھے بھول چکے ہوں گے یا ممکن ہے میری یاد دھندلے دل کے کسی گوشے میں پڑی دم توڑ رہی ہوگی۔ فایدا بھی کیا اس دم توڑتی ہوئی یاد سے ـــــ اچھا کیا جو تم نے مجھے بھلا دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہیں یہ خط لکھنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا کہ ایک فعا میرے کچھ کہنے پر تم گھر سے چلا گئے تھے۔ تمہارے نازک جذبات کو میں نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ مجھے اس کا احساس ہے مگر کیا کرتی ایک ہندستانی لڑکی جس طرح گھونٹ کر رکھی جاتی ہے اس کے نازک جذبات جس طرح گھٹن میں مرتے رہتے ہیں انہیں کوئی کس طرح سمجھ سکتا ہے! ہر لڑکی کی طرح میں نے بھی اپنے من مندر میں ایک دیوتا کی تصویر بنائی تھی اور روز آنکھوں میں دل ہی دل میں اس کی پوجا کیا کرتی تھی وہ دیوتا نہ جانے کتنی راتیں میں نے تمہارے تصور میں کاٹ دیں ـــــ آج بھی جب کبھی ان دنوں کی یاد آجاتی ہے سینے میں ایک چبھن سی ہونے لگتی ہے۔ جب بھی تم ملازمت کے لیے شہر جاتے میرا سر خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتا۔ میں ڈوپٹے کا آنچل اٹھا اٹھا کر تمہارے لیے خدا سے بھیک مانگتی ـــــ مجھے ایک امید سی بندھ جاتی۔ تمہارے شہر جانے پر ـــــ تم نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور میں سوچا کرتی۔ جب تم اتنا بہت پڑھ لکھ چکے ہیں تمہیں ایک اچھی سی ملازمت ضرور مل جائے گی ـــــ ایک خوب صورت مکان ہوگا۔ ضروریات زندگی کا جس میں پورا پورا

سامان ہوگا۔ خوب صورت سوٹ پہن کر جب تم کمرے میں داخل ہوگے تو میری مسکراہٹ تمہارا خیر مقدم کرے گی۔ میں نے اپنے ہمسایوں کو دیکھا ہے جو شادی کے بعد زرق برق کپڑوں میں ملبوس بڑے سج دھج اور شان سے اپنے گھر واپس آتی ہیں ــــ میں نے بھی ایسے خواب دیکھے ہیں۔ ایسے شیش محل بنائے ہیں مگر جب بھی تصورات کا تانا بانا ٹوٹ جاتا ہے اور میں حقیقت کی دنیا میں آجاتی تو جیسے یہ ماحول میرا مونہہ چڑانے لگتا۔ اور میں چپکے چپکے گھر والوں سے مونہہ چھپائے بلکنے لگتی۔ لیکن اتنا سب کچھ پڑھ کر بھی تم کوئی ملازمت حاصل نہ کر سکے۔ تم روز ہی ایک نومید لیے بستر سے اٹھتے اور رات کی روکھی سوکھی بچوں کے ساتھ زہر مار کر کے ہیں سکول پہنچاتے اور حد گئی رات دفتروں اور سرکاری دفاتر کے چکر کاٹ کر جب تم گھر آتے تمہارا چہرا لٹک جاتا۔ اداسی تمہارے بند بند پر چھائی ہوئی دیکھ کر میرا دل بیٹھ جاتا ــــ تم اپنی تعلیم اور طبقے کے لحاظ سے ملازمت کی کھوج میں رہتے۔ تمہیں مزدوری کرتے ہوئے شرم آتی۔ اس لیے کہ اتنا سب کچھ پڑھ کر مزدوری کرنا تمہیں کیا ہر نچلے متوسط طبقے کے لڑکے کو اچھا نہیں لگتا۔ تم بے کار رہے۔ بوڑھی ماں اور چھوٹے چھوٹے بھائی فاقے کرتے مگر مجھے ان ننھے ننھے معصوموں کا بلبلانا نہ دیکھا نہ جاتا۔ میں گھر والوں کی چوری چھپے بچوں کو ناشتے کے بعد اسکول بھیج دیتی اور رات گئے ماں کے لیے اناج پہنچا دیتی تاکہ تمہاری مصیبت ہلکی ہو سکے مگر کب تک ــــ

تمہیں سونچو نثار! ــــ صبر و ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے تمہاری طرح میرے ماں باپ بھی غریب ہیں۔ تم اپنی ماں کے جوان بیٹے ہو ــــ آج نہ سہی کل تم روزگار پیدا کر کے اپنے کفیل ہو سکتے ہو ــــ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ میں لڑکی ہوں۔ پردے میں بیٹھنے والی لڑکی ــــ انہ باپ کب تک تمہارے سہارے بیٹھے رہتے۔ آج مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں بھی تم سے رکھ اکتا سی گئی تھی۔ اور نہ جانے کیوں مجھے اس اکتاہٹ سے مجھے ایک الجھن سی ہونے لگتی۔ انہیں دنوں عزیز نے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جیسے امید کی ایک کرن چھوٹی مگر اس نے بھی دم توڑ دیا۔ عزیز نے جہیز کا مطالبہ کر کے والدین کو ہمیشہ ہمیشا کے لیے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ ایک اندھیری رات میں مسلسل بخار سے بوڑھی ماں نے تمہاری یاد میں دم توڑ دیا اور معصوم بھائی بے سہارا ہو گئے۔ تمہارا چھوٹا سا گھر رہن کر کے تمہاری ماں کا جنازہ اٹھایا گیا اور بے سہارا روتے بلکتے بچوں کو والد صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا۔ جو آج بھی اسکول جاتے ہیں جن کے پیوند لگے کپڑے دیکھ کر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ کاش! تم مزدوری ہی کرتے!!

اچھے نثار ــــ! یہ داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی ــــ یہ میری ہی کہانی نہیں بلکہ ان ہزاروں کنواری لڑکیوں کی کہانی ہے جن کی کومل کامنائیں سسک سسک کر دم توڑ رہی ہیں جو اپنے ماحول سے گھٹ گھٹ کر پس پس کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ جو دق کے سے منحوس مرض میں مبتلا ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر قبرستان آباد کرتی ہیں۔ جہاں رات کی تاریکیوں میں ان کی مردا آرزوئیں چیخنے لگتی ہیں روحیں فریاد کرتی ہیں کہ شاید اس طرح یہ ڈراونی رات جو کسی اژدھے کی طرح مونہہ کھولے ہوئے ہے ہمیشا ہمیشا کے لیے بند ہو سکے اور کمال شفق سے ابھرتے ہوئے سورج کی پہلی کرن صبح کا پیغام دے ــــ

قصور میرا ہے میں تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن تم ہی سوچو میں کس حد تک قصوروار ہوں۔ اس لیے کہ میں تمہاری ہو کر بھی میں تمہاری نہ ہو سکی۔ ہر ماں اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ ہر باپ اپنی اولاد کی مسرتوں کو دیکھتا ہے۔ میرے ماں باپ بھی تو اس قسم کا احساس رکھتے ہیں بھلا وہ کس طرح ایک روزگار کے پلے باندھ کر اپنی بیٹی کو اجڑتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں ــــ

تمہیں گئے ہوئے آج پورا ایک سال ہوتا ہے ان اگلے چھ مہینوں میں مجھ پر دق ہو گئی ہے بالآخر تمہارا کھرنچ کر مجھے یہاں پہنچا دیا گیا۔ ارم نما میں۔ تمہارا بھیجا ہوا منی آرڈر والد صاحب کے نام آیا تھا۔ وہ وہاں موجود نہ تھے بلکہ مجھے ارم نما

چھوڑ نے گئے تھے ـــــ بہر حال انسان کو دولت نہیں زندگی چاہیے۔ محبت چاہیے۔ پیار بھری مسکراہٹ چاہیے سکون چاہیے ایک اچھا سا گھر ایک شریف شوہر اور پر مسرت زندگی ہی ایک عورت کا تاج محل ہے۔ میں ان تلخیوں کو دہراؤں گی نہیں جو ایک سال سے مجھے برابر ملتی جا رہی ہیں۔ ان کڑوا ہٹوں سے میں نے بچ کیسے ہے پڑ کر سبق لیا ہے۔

مجھے معاف کر دو نثار ـــــ میں نہیں اس دق زدہ ماحول میں دیکھنا نہیں چاہتی۔ جہاں کی فضاؤں میں دق کے جراثومے اڑتے رہتے ہیں ـــــ میں نے سنا ہے کہ میرے نثار کو اچھی سی ملازمت مل گئی ہے ـــــ میں بستر پر بیٹھی ہوں نیا چاند نکلا ہے اور میں اپنا آنچل پھیلائے ہوئے ہوں۔ خدا تمہیں اور ترقی دے پھولو پھلو۔ اور ایک حسین سی دلہن اپنے اچھے سے گھر میں بیاہ لے آؤ تا کہ زندگی میں بہار اس کے لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ رقص کر سکے۔ پیارے نثار اپنی اس منحوس فاطما کو بھول جاؤ اسے معاف کر دو ـــــ

کاش! ایک بار ـــــ صرف ایک بار۔ تمہاری موہنی صورت کو دیکھ سکتی جس کی میں کبھی پجارن تھی، کاش! میں تمہیں چھو سکتی ـــــ تمہیں پیار کر سکتی۔!!! مگر یہ اٹکتی ہوئی سانس۔ جو موت سے قریب تر کیے دے رہی ہے ـــــ

جو تمہاری ـــــ فاطما

نثار ایک عجیب بے بسی سے خط پڑھتا رہا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دبی ہوئی آگ شعلہ جوالا بن کر بھڑک اٹھی ایک بھولی ہوئی یاد نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک مبہم سی تصویر جو دماغ کے گوشوں میں پڑی تھی ایک دم ابھر کر آگئی تھی۔ دھندلے نقوش گہرے ہو رہے تھے ـــــ

فاطما جو کبھی اس کی کائنات تھی اس کی روح تھی زندگی تھی جو پھولوں کی مسکراہٹ ستاروں کی چمک تھی۔ محبت کے مترنم ساز پر ایک مرتعش نغمہ بن کر اس کے وجود میں حل ہو گئی تھی جس نے ہمیشہ ہمیشہ اس کی رہنے کی قسم کھائی تھی۔ آج اس سے چھوٹ رہی تھی موت کے بے رحم ہاتھ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیا چاہتے تھے۔ اس نے انہیں آنسوؤں سے لبریز نگاہیں اٹھائیں۔ نہ جانے منیجر کب کا بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ "کیا بات ہے نثار صاحب۔ آپ رو رہے ہیں؟"

"جی ہاں بات ہی کچھ ایسی ہی ہے۔ مجھے رخصت دیدیجے اور اسی وقت میری تنخواہ اور بونس ابھی دلا دیجے" وہ روتی آواز میں بولا ـــــ

"منیجر صاحب! میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوں مجھے معاف کر دیجے"

اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ خط ہاتھ میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ منیجر کے آتے ہی وہ جیسے نوٹوں پر جھپٹ پڑا۔ اور پھر رات کی اکسپرس سے فاطما کے لیے چل پڑا۔

اکسپرس فراٹے بھرتا اڑا چلا جا رہا تھا۔ دکن کے شاداب وسیع و عریض کھیت تیز تیز بھاگ رہے۔ ریل کے پہیوں کی دھک دھک اس کے دل کی دھک دھک کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہی تھی جیسے جیسے وہ ارم نما کے قریب ہو رہا تھا اس کی بے چینی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی ایک مقناطیسی کشش کے زیر اثر اس کا دل کھنچا جا رہا تھا۔ ٹرین کے سکندر آباد جنکشن پر رکتے ہی وہ کیریجمنٹ سے ـــــ ایک اینگلو انڈین لڑکی سے ٹکرا گیا "ایڈیٹ" کا لفظ ابھرا اسٹیشن کے شور میں دب کر رہ گیا۔ ہاتھوں میں جھولتا ہوا اٹیچی کیس دو ایک قلیوں سے ٹکرا گیا ایک ابھری ہوئی توند سے دب کر وہ اسٹیشن سے باہر آگیا۔ قطار میں لگی ہوئی ٹیکسی کاروں تک وہ دوڑتا ہوا پہنچا۔ اور دروازہ کھول کر جیسے کٹی ہوئی شاخ کی طرح دھڑام سے سیٹ پر گر گیا ـــــ ٹیکسی کا ڈرائیور جیسے اسی کا منتظر تھا۔

"کہاں چلیں گے صاحب؟"

"ارم نما"!

اور پھر کار سکندر آباد کے سیکڑوں موڑ مڑتی ہوئی شہر سے باہر آگئی۔

"اور تیز ڈرائیور ــــ جلدی کرو ــــ!" وہ پسینا پونچھتے ہوئے بولا ــــ

اور پھر پانچ میل کا فاصلا لمحوں میں کھینچ کر آگیا۔ ارم منا کا بڑا گیٹ عمارت کی شان کو دوبالا کر رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کے ہات میں پانچ روپے کا نوٹ تھما دیا۔ اور قریب قریب ٹوٹے ٹوٹے لگ گیا ــــ ارم منا کی حسین عمارت اسی طرح کھڑی تھی لوگ اسی طرح آجا رہے تھے۔ دوسری منزل کے زنانا وارڈ میں کچھ لڑکیاں جنگلے سے لگی دور خلاؤں میں گھور رہی تھیں ــــ نثار کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے اوپر اٹھیں مگر ان میں فاطمہ نہ تھی۔ وہ کانپتا دار ڈانچارج کے پاس پہنچ گیا جو ایک مریض کو نسخا لکھ رہا تھا ــــ

"ڈاکٹر! ڈاکٹر!! فاطما کا بیڈ (BED) کہاں ہے؟"

"کون فاطما؟" بوڑھا ڈاکٹر عینک کے شیشوں میں سے جھانکتا ہوا بولا ــــ "کس فاطما کو پوچھ رہے ہو تم ــــ"؟

"وہی جو ایک سال پہلے ..... سے آئی تھی"! نثار مجسم سوالیا علامت بن گیا تھا۔ ڈاکٹر کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے اٹھیں اور چہرا اداس ہوگیا۔

"بڑی دیر کی تم آنے میں ــــ تمہارا نام نثار ہے نا؟"

"جی" سے ایک دھچکا سا لگا۔

"آخر دم تک تمہیں یاد کرتی رہی۔ ابھی ابھی تین بجے ... آؤ۔ میرے ساتھ"

ڈاکٹر نے اسٹیتھاسکوپ (STETHOSCOPE) کندھے سے نکال کر میز پر ڈال دیا۔ اور نثار کی نظروں میں دنیا جھک سے اڑ گئی تھی ــــ پھر بھی وہ لڑکھڑاتا وسیع وارڈوں کو طے کرتا ہوا اس جگہ آگیا جہاں فاطما کی لاش پر ایک سفید کپڑا اڑا دیا گیا تھا۔

اس کا چہرا تمتما اٹھا۔ ہلکوں پر آنسو لرزنے لگے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے کپڑا اٹھایا۔ اس کا دل جیسے بیٹھ کر رہ گیا معلوم ہو رہا تھا جیسے فاطما اب بھی "نثار"! نثار!! کی رٹ لگائے ہوئے

شام کے سورج کی زرد زرد کرنیں ایک عجیب سا ماحول میں امتزاج پیدا کر رہی تھیں اور نثار جیسے محسوس کر رہا تھا۔ فاطما مری نہیں بلکہ اب بھی اپنی آنکھوں میں دنیا بھر کا پیار لیے ہوئے پوچھ رہی ہو ــــ

"کیا کرتے رہے آپ اتنی دیر تک ــــ"؟

"ہاں" جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے نکل رہی تھی "میں نے دیر کی ہے فاطما ــــ"!

آنکھیں جھلملاتی رہیں۔ آنسو ٹپ ٹپ فاطما کے چہرے پر گرتے رہے جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔ دو کپکپاتے ہوئے ہونٹ بے جان فاطما کی پیشانی سے لگ گئے۔ کمرے میں کچھ دیر تک سکوت رہا۔ بوڑھے ڈاکٹر نے چپکے سے آنکھیں پونچھ لیں اور نثار رقت آمیز آواز میں بڑبڑانے لگا۔

"تم شہید ہو فاطما ..... ! تم نے ایک ..... نصب العین کے لیے جد و جہد کی ..... ایسا نصب العین جس کے پردے میں بھوک ہے ..... کڑکڑاتے ہوئے فاقے ہیں ..... انمٹ جہالت ہے ..... اونچ نیچ کا فرق ہے ... تم میری نہیں ..... عورت کی عظمت کا کلیجا نوچ ڈالا گیا ... محبت کا راگ ٹوٹ گیا ... تم نہیں مریں ..... ایک دنیا مر گئی ..... ایک کائنات جل گئی ہے ....."

نثار کو معلوم ہو رہا تھا جیسے ارم منا کی یہ حسین عمارت جل رہی ہے۔ اس کے وسیع و عریض جہنم کے اژدھوں کی طرح نگلنے کے لیے کھڑے ہیں۔ اس کے چاروں طرف ایک دہکتا ہوا لاوا پھیلتا جا رہا ہے۔ بادلوں کی گرج جیسے چنگھاڑیں مار رہی تھی۔ گھٹا ٹوپ سیاہی بڑھتی جا رہی تھی۔ کائنات کی ہر چیز اپنا آخری رقص کر رہی تھی۔ ایک بھیانک رقص ــــ بے جان رقص ــــ اس کی نگاہوں میں کائنات کی ہر چیز دھندلی ہوتے ہوتے مٹ گئی اور پھر نثار کو کچھ یاد نہ رہا۔

شام ہو رہی تھی۔ شفق کی لالی لہو رنگ بن رہی تھی اور سورج اپنی آخر میں فاطما کی لاش پر سے سمٹتا ہوا ایک خونین سمندر

صنعتی کاموں میں نائیٹروجن کا استعمال

یونیس

نائیٹروجن گیس ہوا سے حاصل کی جاتی ہے امریکا کی صنعتوں میں اس سے کئی مفید کام لیے جا رہے ہیں وہاں کے کارخانے دار اب دوا ربِ مکعب فٹ سے بھی زیادہ نائیٹروجن استعمال کر رہے ہیں۔ بعض کمپنیاں تو نائیٹروجن تیار کرنے والی کمپنیوں سے اسے خریدتے ہیں اور بعض کارخانوں نے نائیٹروجن تیار کرنے کے لیے اپنے کارخانے کھول رکھے ہیں۔

چونکہ نائیٹروجن ایک جامد گیس ہے جس کا دوسری اشیا سے مس ہونے پر کوئی فوری ردِ عمل نہیں ہوتا۔ اس لیے گرم دھاتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ کرہ ہوائی ہی تحفظی عمل پیدا کرتی ہے۔

اسی وجہ سے خوراک اور دوائیوں کو ڈبوں یا بوتلوں میں بند کرتے وقت بھی نائیٹروجن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مصنوعی وٹامن اے کی تیاری کے وقت نائیٹروجن کی ایک تہہ جما دی جاتی ہے تاکہ یہ وٹامن محفوظ رہے۔

اسی طرح سبزیوں سے تیار کیے ہوئے تیل پر بھی نائیٹروجن کی چادر چڑھائی جاتی ہے تاکہ وہ بدبودار یا خراب نہ ہونے پائیں۔ کافی کی ایک قسم پر بھی اس کی تہہ جمائی جاتی ہے کہ اس کی خشبو زایل نہ ہو۔

دوسری اشیا جن پر نائیٹروجن پیکنگ لگائی جاتی ہے اس میں سبزیاں۔ آئس کریم۔ لیمو کا رس۔ سلاد کا تیل۔ اخروٹ اور کئی قسم کی دوائیاں شامل ہیں۔ نائیٹروجن کے کرہ ہوائی میں ایسی دوائیاں صاف بوتلوں میں بھری جا سکتی ہیں جن پر آکسیجن کے فوری اثر کا اندیشہ ہوتا ہے۔

کیمیاوی طور پر جامد ہونے کی وجہ سے نائیٹروجن کو ٹیلی فون کے تاروں کے تحفظ سے لے کر متشنوں کو چلانے والے پنکھوں کے پھلوں تک کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

ٹیلفون کے تاروں پر نائیٹروجن گیس دبا و ڈالا جاتا ہے تاکہ ان میں نمی اثر نہ کرے اور تار کے اوپر جو قول چڑھایا جاتا ہے اس میں کوئی ٹوٹی ہوئی جگہ ہو تو اس کا پتا لگ سکے۔

اندر کے کھوکھلے فولادی پنکھے کے پھلوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر کوئی نمی نہ رہے ——

دھات کا کام کرنے والے دھات کے سانچوں میں اسے کام میں لاتے ہیں تاکہ ان میں کوئی چھید وغیرہ نہ رہیں۔

ایک کیمیائی کا مال محض ان چھیدوں کی وجہ سے نامنظور کیا جاتا تھا لیکن نائیٹروجن کے استعمال سے اس کی مشکل حل ہو گئی۔

اب اسے جست، تانبے، سیسے اور فولاد وغیرہ کے لیے بھی کام میں لایا جا رہا ہے۔

لندن یونیورسٹی میں ریسرچ کا وظیفہ

لندن یونیورسٹی نے ایک ریسرچ فیلوشپ (تحقیقاتی وظیفے) کے لیے درخواستیں طلب کی ہیں۔ یہ وظیفہ ٹرنر اینڈ نیوول کی طرف سے ابتدا میں ۳ سال کے لیے پیش کیا گیا ہے اور پہلی اکتوبر ۱۹۵۴ء سے وظیفے کی مدت کا آغاز ہوگا۔ وظیفے کی رقم ۵۰۰ پونڈ سالانہ ہے۔ تحقیقات کے مضامین میں انجینیرنگ ان آرگینک کیمسٹری۔ علم طبیعات اور ان سے متعلقہ مضامین شامل ہیں۔

امیدوار کا تعلیمی میعار عموماً پی۔ ایچ ڈی (PHD) کا ہونا چاہیے۔

ننی

ابراہیم شفیق

جب کبھی میں ننی کو سڑک کی طرف جاتے دیکھتا ہوں اسے گود میں اٹھا کر لے آتا ہوں اور اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر ٹھوڑی کو ہات لگا کر کہتا ہوں "اندر جاؤ" باہر گاڑیاں چلتی ہیں ٹکر ہو جائے گی"

وہ مجھے عجیب انداز سے دیکھنے لگتی اور ٹھمکتے ٹھمکتے چلنے لگتی۔ اس کے ایک پیر میں بندے ہوئے گھنگرو چھن چھن کرنے لگتے اس کے پیر میں گھنگرو کیوں باندے گئے ہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتا مگر میں نے یہی سمجھا ہے کہ یہ گھنگرو ننی کو ہنساتے ہیں جب کبھی وہ رونے لگتی ہے ..... یہ گھنگرو ننی کے ساتھ ساتھ گنگناتے چلے ہیں۔ جہاں کہیں وہ جاتی ہے اور کبھی وہ ان گھنگروں کو پیر سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ نہیں نکلتے۔ ننی اس پر جھنجلا اٹھتی اور ضد میں آکر پاؤں ہلانے لگتی گھنگرو ہنس پڑے چھن چھن چھن!!!

اکثر میں نے اس کو گلی سے نکل کر سڑک کی طرف جاتے دیکھا ہے اور ہر دفعا میں نے رک کر ان کو گھر چھوڑ دیا کیونکہ ننی مجھے بہت پسند ہے ہر بچا مجھے پیارا ہے میں ایک چھوٹے بچے سے باتیں کر کے اتنی خوشی محسوس کرتا ہوں جو مجھے شاید کوئی چیز نہیں دے سکتی۔ اگرچہ میری باتوں کا کوئی جواب نہیں ملتا مگر ننی کے چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھیں ہی میری باتوں کا جواب ہیں جن میں معصومیت جھلکتی ہے جن میں مستقبل چمکتا ہے

میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا نام کیا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ لوگ اس کو ننی کہتے ہیں اور حقیقت میں ہے بھی تو وہ ننی ہی ——

ننی میرے بازو کے مکان میں رہتی ہے ننی اپنے ماں اور باپ کے پاس رہتی ہے۔ اور میں اس کو چاہتا ہوں۔ گلی میں جب میں اس کو روتے ہوئے سنتا ہوں تو میرے ہات میں تھما ہوا قلم چھوٹ جاتا ہے اور میں کتاب بند کر کے اس کو سمجھانے جلا جاتا ہوں جب وہ ہنستی ہے تو میرے دل میں گدگدی سی ہوتی ہے جب میں اس کے ہات میں "آئس فروٹ" یا تل کا لڈو دیکھتا ہوں تو مجھے خشی سی محسوس ہوتی ہے۔ مگر جب وہ خالی ہات ہوتی ہے تو مجھے برا معلوم ہوتا ہے۔

ننی مجھے ایک گلی میں ہی نہیں دکھائی دیتی۔ بلکہ میں نے اس کو کئی گلیوں میں دیکھا ہے۔ ہر بار میں نے وہی تبسم کو دیکھا ہے جو ایک ننی کے ہونٹوں پر ہوتا ہے۔ میں نے کبھی ننی کو باپ کی گود میں بیٹھے ہوئے اس کے غصہ کی گندگیوں سے کھیلتے دیکھا ہے تو کبھی اس کو فقیر کی گود میں بھی پایا ہے میں نے اس کو ریلوں، بسوں، سڑکوں، سینماؤں اور ہوٹلوں میں اپنے ماؤں کے ساتھ اپنا ننا منا ہات پھیلاتے بھی دیکھا ہے۔ اور کبھی گلی سے نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے مگر مجھے ہر ننی کی آنکھوں میں یکساں جھلک ملی اور ہر ننی کے ہونٹوں پر ایک ہی تبسم نظر آیا۔

سوچتا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہر ننی ..... ایک الگ الگ باپ کی بیٹی ہے الگ الگ گوداموں میں پلی ہوئی الگ الگ ماحول میں جنم لیا۔ مگر سب یکساں کیوں ہر ماں جدا جدا فطرت رکھتی ہے مگر ہر ایک کے پاس وہی ننی ہے۔ جو دوسری ماں کے پاس ہے۔

ننی اسی ملک میں نہیں پائی جاتی بلکہ وہ دھرتی کے ہر خطے پر آباد ہے جہاں انسان بستے ہوں وہ ایشیا اور یورپ میں ہے۔ امریکا اور افریقا میں بھی ہے۔ آسٹریلیا میں ہے غرضکہ وہ ہر جگہ ہے ہر ملک میں اس کے روپ مختلف

ہیں مگر وہ بھولی ہے معصوم ہے ایک بکری کے بچے کی طرح جو اپنے قاتل کے ہاتھ میں چھرا دیکھ کر بھی اس کے اطراف پیار سے اچھلنے کودنے لگتا ہے وہ نہیں جانتا کہ قاتل کے اس چھرے کی چمک میں اس کی موت رقصاں ہے۔

نیتیوں کے باپ آپس میں لڑتے مرتے ہیں ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ اپنے فائدے کے لیے ہر چیز کو مٹا ڈالتے ہیں۔ نیتیوں کے باپوں نے ابراہیم لنکن کو، سادی کارنو، زار نکولس دوم، لیون ٹراٹسکی، احمد شہ ابدالی، یوآگ سان مہاتما گاندھی، کاؤنٹ برناڈوٹ، علی رزم آرا اور لیاقت علی خاں کو قتل کیا۔ مگر یہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کے گال نوچتے بھی ہیں تو پیار اور محبت سے انہیں معلوم کہ دشمنی کیا ہے وہ بس مل جل کر گڑیوں اور پھولوں سے کھیلنا جانتے ہیں یہ بھی تو پھول ہیں ان پھولوں کی طرح جو جھیلوں کے کنارے پہاڑوں کے دامنوں پر کھیلتے ہیں وہ زعفران کے پھول گلاب کے پھول اور کنول کے پھول ہیں تو یہ انسانی پھول۔ . . . . . .

کسی بھی ظالم کا دل پھول کو مسل ڈالنا نہیں چاہے گا مگر پھول کو مسلا جاتا ہے نئی کو کچلا جاتا ہے پیروں سے دیا بوں سے۔

پھول توڑ دیے جاتے ہیں، گلدستوں کی زینت کے لیے گلوں اور ہاروں کی سجاوٹ کے لیے خوش بودار عطر کے لیے مگر نیتیاں برباد کی جاتی ہیں۔ ماؤں کی گودیں خالی کرنے کے لیے ملکوں کو فتح کرنے کے لیے۔ مگر پھول کبھی ختم نہیں ہوتے۔ درختوں کو کاٹ دیا جائے تو وہ دھرتی کے کسی نہ کسی حصے سے نکل پڑتے ہیں۔ اور پھول پیدا کرتے ہیں نئی کبھی نہیں مرتی وہ ہر ملک میں اور ہر دور میں جنم لیتی ہے اور لیتی رہے گی۔ . . . اسی ظالم کے ہاں جو پھول کو مسل ڈالتا ہے اور نئی کو ختم کرتا ہے وہ اب نئی کو نہیں مارے گا۔ وہ بھی اس سے پیار کرے گا وہ نہیں چاہے گا کہ کوئی اس کی نئی کو اس سے چھین لے۔ . . . .

پھر بھی . . . نئی ڈرتی ہے۔ اس کی ماں ڈرتی ہے۔ . . . اس کی آنکھیں ڈرتی ہیں۔ مکانوں کو جلتے دیکھ کر انسانوں کے خون کو دیکھ کر اور اس خون کے سیلاب میں ننھی ڈوب جاتی ہے پھر پیدا ہوتی ہے مگر وہ بدلتی کبھی نہیں۔ وہ اسی نئی کی مانند رہتی ہے جو فقیر کی گود میں رہتی ہے جو اپنی ماں کے ساتھ ہاتھ پھیلائے بھیک مانگتی ہے جو شاندار محلوں کے باغیچوں میں ہری گھاس پر کھیلتی ہے۔ یہ ننھی کلی نیتیوں کو ختم کر دیتی ہے اور وہ بھی اپنے پیروں باندھے ہوئے گھنگروؤں سے کھیلنے لگتی ہیں اپنی ماں کے مقدس سینے پر رینگتی ہیں اور اس سے لپٹ کر سو جاتی ہیں۔

سب رس

کا خاص نمبر مارچ ۵۴ء کے پہلے ہفتے میں شایع ہو جائے گا۔

یہ خاص نمبر

کیسا ہوگا اس کا اندازہ اس میں لکھنے والے چند ادیبوں کے ناموں سے ہو سکتا ہے نامہ نگار۔ ڈاکٹر زور۔ محمد مہدی۔ ڈاکٹر سلامت اللہ۔ خط انصاری۔ بلراج ساہنی ہنس راج رہبر۔ عالم خوندمیری۔ زینت ساجدہ وغیرہ۔ شاعر۔ جوش ملیح آبادی۔ علی اختر۔ اثر لکھنوی۔ علی منظور۔ پرویز شاہدی نیاز حیدر۔ شاہد صدیقی۔ نظیر کاشمیری۔ فیض شفائی۔ سلیمان ادیب غلام ربانی تاباں۔ نظر حیدرآبادی۔ جگناتھ آزاد۔ خلیل الرحمن اعظمی لطیف ساجد، کمال احمد صدیقی، حمایت علی شاعر وغیرہ

افسانہ نگار۔ ل۔ احمد۔ ابوالفضل صدیقی۔ سہیل عظیم آبادی۔ اختر محیی الدین شوکت صدیقی۔ جیندر ناتھ۔ اقبال متین۔ سردار سلیم۔ یوسف ناظم آمنہ ابوالحسن وغیرہ۔

ضخامت۔ ۲۵۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ سکہ ہند

آج ہی ایک کاپی بک کرا لیجیے۔ ۱۵ مارچ تک خریدار بننے والوں سے خاص نمبر کی قیمت الگ نہیں لی جائے گی۔

دفتر ماہنامہ "سب رس" خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کرے گا۔
(۲) اس کی ضخامت زمانہ کے ساتھ ساتھ گھٹتی بڑھتی رہے گی۔
(۳) ادبی گفتگو کے سوا ہر موضوع پر مضامین قبول کیے جائیں گے۔
(۴) ہر شمارے کی مقید اور بقیے کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے رہیں گے۔
(۵) مستقل خریداروں کو وقت پر رسالہ نہ پہنچے تو ۱۵ تاریخ تک اطلاع دینے پر دوبارہ بھیجا جائے گا۔
(۶) جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ اور مضامین کی واپسی کے لیے بھی مناسب ٹکٹ لگا ہوا لفافہ لازمی طور پر بھیجا جائے۔
(۷) اغلاط مضامین ہوں یا دفتر کسی قسم کی غلطی کا ذمے دار نہ ہوگا۔
(۸) ہر شمارے کی اجرت پہلے وصول نہ ہوا شمارہ پھیلے نہ جائیں گے۔
(۹) مضامین بجز اضافات ایک ہی رخ پر خوش خط لکھے جائیں۔
(۱۰) اگر رسالے کی خریداری منظور ہو تو ایک سال کا چندہ پہلے ہی بھیجا جائے۔

منیجر "ہندستانی ادب"

۵۵۔ لے۔ اعظم پورہ شرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے۔اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے قیمت ایک چار آنے

جلد (۱۴) نمبر (۱۱)

مہر ۱۳۶۳ف اگست ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات — ایڈیٹر ۲

حقایق و معارف — افقر موہانی ۳

راز محبت — سلام سندیلوی ام۔اے ال ال بی ۴

دو غزلیں — جلال الدین اکبر بی۔اے (لاہور) ۵

صدائے درد — فضا (جالندھری) — عبرت (بریلوی) ۶

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل — ڈاکٹر کے ایس کرشنن ۷

یادِ رفتگان — اثر۔تاثیر ۹

کشمیر کا سفر — ا۔ا ۱۲

اندھیرا — ایاز عصمی ۱۳

جذبات جوش — جوش مندوزئی ۱۵

چین میں تعلیمی ترقی — چ۔ا ۱۶

ہندستان کی تعمیر نو میں یلورا کے غاروں سے سبق — ا۔ا ۱۷

ادب اور جمود — شاہد اختر ۱۹

انتون چیخوف — پروفیسر ولادیمیر پریملوف ۲۳

غزل — سید حسین محشر موہانی ۲۸

ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہندستانی طلبا — جی ڈارلو ٹیلر ۲۹

ترجمات — حمید صنوی (بلیح آبادی) ۳۰

کیا دوسرے سیاروں پر بھی زندگی ہو سکتی ہے — ف۔یوگنیف ۳۱

ہمارے خیالات

اعلیحضرت حضور نظام کا پانچ کروڑ کا ٹرسٹ

(دوسری قسط)

جیسا کہ ہم نے پچھلے نمبر میں اپنے خیال کا اظہار کیا ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کا لحاظ کرتے ہوئے پانچ کروڑ کا ٹرسٹ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جتنا کی حالت کو سدھارنا مقصود ہو تو کئی کروڑ کے بھاری سرمائے سے ملک میں جدید ترین صنعتوں کا جال پھیلا دیا جائے اس کے بھاری منافع سے طرح طرح کے ٹرسٹ قایم کیے جا سکتے ہیں صنعتوں اور کارخانوں کا قیام ہی پانچ کم ٹرسٹ نہیں ہے ان سے ہزاروں ہی بے روزگار کام دھندے سے لگ جائیں گے۔ اس طرح پر لاکھوں ہی آدمیوں کی بھوک پیاس کا حل نکل آئے گا۔ ہم حضور نظام کے اس بیان سے مطمئن نہیں ہیں کہ

"زمانہ ماضی اور حال میں بھی اس کے بڑے چرچے تھے (اندرون و بیرون ملک) اور جس کے جی میں جو آتا تھا وہ بے پر کی اڑاتا تھا اور ایسے سنگھ رت قصے بیان ہوتے تھے جو خفق و فہم سے بالا ہوتے تھے یا یہ سمجھا جاتا تھا کہ قارون کا خزانہ حدود "نذری باغ" (کنگ کوٹھی جس میں حضور نظام رہتے ہیں) میں پوشیدہ ہے۔ مگر جب وقت آگیا تو یہ راز سربستہ منظر عام پر آیا اور دنیا کو معلوم ہوگیا کہ ان افسانوں کی دراصل کیا اصلیت تھی۔ اگر کچھ دولت تھی بھی تو (یعنی تھوڑی بہت) اس کی تقسیم کن ابواب میں ہوئی یا کس مصرف میں آئی۔" اس سے بڑھکر تعجب خیز جملہ یہ ہے "خلاصہ ایں کہ اب کچھ باقی نہیں رہا جو معرض بحث میں آئے۔ ایسی حالت میں پبلک کو چاہیے کہ ان امور کو ختم کرے۔ ورنہ ایسے سود بیکار باتوں پر جو کہ اپنی جگہ کوئی وزن نہ رکھیں عقلا کان نہیں دھرتے اور اس کو الف لیلیٰ کی داستان سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ہیں۔ بلکہ دل بہلانی کے قصے سمجھتے ہیں۔"

حضور نظام کا اوپر کا تردیدی بیان بلکل ہی غیر ضروری تھا۔ اس لیے کہ اپنی حالت اور حیثیت سے وہ خود جس طرح پر واقف ہیں جاننے والے بھی انہیں کچھ کم نہیں جانتے۔ جس طرح سے حضور والا کی ہستی غیر معروف نہیں۔ اسی طرح سے ان کی دولت بھی جاننے والوں کے علم سے باہر نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ اندازے میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہو جاتا ہے مگر اتنا بھی نہیں جیسا کہ خود حضور نے اپنی طبعی انکساری کو کام میں لاتے ہوئے ارشاد فرمایا یعنی "اگر کچھ دولت تھی بھی تو (یعنی تھوڑی بہت) اس کی تقسیم کن ابواب میں ہوئی یا کس مصرف میں آئی۔" اس سے بڑھکر تعجب خیز جملہ یہ ہے "خلاصہ ایں کہ اب کچھ باقی نہیں رہا جو معرض بحث میں آئے۔" (باقی آنے والے نمبر میں ملاحظہ ہو)

معذرت
[illegible] پیس [illegible] تقریباً دو [illegible]
[illegible] - [illegible] [illegible]
[illegible] ہر [illegible] [illegible] [illegible]
ج - ا - م - شمائی

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

نظروں میں مری جلوہ جانانا وہی ہے
دنیا کے لیے طور کا افسانا وہی ہے

دنیائے تصور میں بھی کاشانا وہی ہے
اب جیسے نظر میں درجانانا وہی ہے

اب لیلیٰ و محمل ہے نہ دیوانا وہی ہے
دنیا کی زباں پر مگر افسانا وہی ہے

آنکھوں میں بھی تک ہے خمار مئے دوشیں
رفتار میں بھی لغزش مستانا وہی ہے

وہ جام جو صدقے ہے سر پیر مغاں کا
میخانے میں بس حاصل میخانا وہی ہے

آبادی کعبہ کا خیال آتا ہے جس دم
واللہ سمجھتا ہوں صنم خانا وہی ہے

مدت ہوئی دیکھے ہوئے بزم مئے و ساقی
نظروں میں مری آج بھی میخانا وہی ہے

الحمد ری محویت حسن رخ جاناں
ہر شکل میں حسن رخ جانانا وہی ہے

کچھ دل ہی پہ موقوف نہیں اہ طلب میں
سمجھے تھے لگانا جسے بیگانا وہی ہے

تصویر زمانے کی بدلتی رہی لیکن
بدلا ہوا رنگ رخ جانانا وہی ہے

وہ کہتے ہیں کیا سنکے کریں قصۂ ماضی
ہیں آپ وہی آپ کا افسانا وہی ہے

یہ حسن کا نیرنگ ہے وہ عشق کی فطرت
شمعیں تو جداگانا ہیں پروانا وہی ہے

پینے کو خدا جانے مگر حضرت واعظ
مخمور نظر۔ لغزش رندانا وہی ہے

ہر جلوہ جداگانا ہے انداز و ادا میں
دراصل مگر جلوہ جانانا وہی ہے

حالات بدلتے ہیں بدلتی نہیں فطرت
افقر ہے گدا فطرت شاہانا وہی ہے

رازِ محبت

سلام سندیلوی
ام۔ اے ال ال۔ بی، وائس پرنسپل لکھنؤ

غمِ فراق میں بلبل ہے نوحا گر لیکن
ہزاروں ایسے پرندے ہیں اس گلستاں میں
جو اپنا رازِ محبت عیاں نہیں کرتے
دلوں میں آتشِ الفت چھپائے بیٹھے ہیں
جگر پہ چوٹ ہے لیکن فغاں نہیں کرتے
سمیٹے بیٹھے ہیں ٹوٹے دلوں کے پیمانے
ہے کس کو کس سے محبت، یہ کوئی کیا جانے

عیاں ہے سوزشِ پروانا خلق پر لیکن
ہزاروں ایسے پتنگے ہیں بزمِ الفت میں
کہ جن کے عشق سے آگاہ بھی نہیں کوئی
سلگ رہے ہیں جگر شعلۂ محبت سے
لبِ حزیں پہ مگر آہ بھی نہیں کوئی
یہ بات اور ہے وہ بن سکے نہ پروانے
ہے کس کو کس سے محبت، یہ کوئی کیا جانے

جنونِ قیس سے واقف ہے ہر بشر لیکن
ہزاروں اہلِ جنوں ایسے ہیں زمانے میں
کہ جن کے عشق کا پوتیدا ہے کنول اب بھی
سسک سسک کے شبِ ہجر کاٹ دیتے ہیں
ہزاروں وامق و فرہاد و قیس و لیلیٰ اب بھی
نہ جانے کتنے چھپے ہوں گے ایسے افسانے
ہے کس کو کس سے محبت، یہ کوئی کیا جانے

جلال الدین اکبر بی۔ اے (لاہور)

دو غزلیں

اللہ اللہ تیرا جلوہ ناز
خد بخد جھک گئی جبین نیاز
تو ہے اور جلوہ ہائے رنگا رنگ
"میں اور اندیشہ ہائے دور دراز"
حسن بے تاب عرض جلوہ ہے
اللہ اللہ عشق کا اعجاز
اضطراب وفا کا حال نہ پوچھ
دل دھڑکنے کی سن ذرا آواز
طاعتوں پر غرور واعظ کو
اور مجھے تیری رحمتوں پر ناز
آفت روزگار ہیں دونوں
حسن کے ناز عشق کے انداز
دل میں اک حشر آرزو ہے بپا
ہائے اس کی نگاہ فتنہ طراز
ہے ازل اور ابد سے وابستہ
مرا انجام اور مرا آغاز
کوئی دیکھے کلام اکبر کا
کس قدر دل نشیں ہے یہ انداز

فضا (جالندھری)

دل حیراں ہے جانے کیا یہ راز
ہو چلا ہر ستم بھی روح نواز
ہو چکیں پردہ داریاں اے دل
اشک پیہم ہیں شرح سوز و گداز
دل کو دل کہیے تیرے جلووں سے
ایک آئینا ایک آئینا ساز
فطرت حسن گو حجاب سہی
نگہ شوق اٹھا دے پردہ راز
عشق میں پاس خامشی کب تک
چھڑ رہے آگے بڑھ کے پردہ ساز
مجھکو محسوس یہ ہوا اکثر
گونجتی جیسے ہو تری آواز
جب ستارا فلک پہ ٹوٹتا ہے
مجھ پہ کھلتا ہے زندگی کا راز
سب کی نظریں مآل کار پہ ہیں
کیجیے کچھ تو پاس اہل نیاز
گریہ عندلیب، خندہ گل
حسن اور عشق کے ہیں راز و نیاز
تم نظر میں رہو کہ دل میں رہو
دونوں غماز دونوں محرم راز
نظر لطف ہو فضا پر بھی
وہ تیرا بندہ تو ہے بندہ نواز

صدائے درد

صدائے درد ہے نغمہ کہاں مری آواز
کسی کی دھن میں تڑپتا ہوا ہے دل کا ساز

جبین شوق نے طے کر لیے مقام نیاز
بڑھا لے اب کوئی آگے حدود کعبہ و ناز

ہر ایک سانس محبت میں ہے تری آواز
کہ ڈھل چکا ہے حقیقت میں اب کہاں ہے مجاز

جنون عشق ہے وابستہ نگاہ ناز
یہ سوچ کر مری وحشت پہ ہنسیے بندہ نواز

ہے کش مکش میں مری آرزوئے سوز و گداز
ابھی تو دل بیتاب میں نگاہ ناز

نہ راہبر کی تمنا نہ حسرت منزل
کہاں نکل گیا دنیا ہوا انہیں آواز

پھر اس فسانے کی ہو انتہا بھی کیا آخر
تری نگاہ سے وابستہ جس کا ہو آغاز

ہر انقلاب سے ٹکرا رہا ہوں البتہ
مری نظر میں نہ مانے کے ہیں نشیب و فراز

جہاں تھا درد وہاں ہے تمام کیف و سرور
وہ دل میں آ گئے جیسے اٹھا کے پردہ راز

بھٹک کے راہ سے منزل پہ اس طرح پہنچا
کہ ہم سفر مجھے دینے ہی رہ گئے آواز

نظر ہے محو نظارا اٹھا ہوا ہے حجاب
وہ سامنے ہیں ادا ہو رہی ہے میری نماز

دل حزیں نے کی محسوس ایک آہٹ سی
پھر اس کے بعد نظر بن گئی حریم ناز

یہاں سے غم کے فسانے کا رخ بدل جائے
مری نظر پہ مسلط ہوا تبسم ناز

کسی طرح دل انا صبح نہ ہو سکا ہموار
تری نظر نے بھی سمجھائے کو نشیب و فراز

تری نظر نے مٹا کر بنا دیا دل کو
نفس نفس میں ہیں حسن جمیل کے انداز

نفس نفس ہے محبت میں اک جہان جمال
عجیب حسن سے قصہ مرا ہوا ہے دراز

کہ جیسے بیٹھا ہو فردوس بزم خاص میں لی
سمجھ رہا ہوں ترے غم کو حاصل پرواز

نگاہ لطف نوازش کا شکریہ لیکن
ستم نصیب ہوں فطرت ہے میری سوز و گداز

ترے جمال سے عالم کو روشناس کیا
عجب حقیقت روشن ہے ہر نگاہ مجاز

عبرت بریلوی

دل شگفتہ مے دنیائے رنگ و بو عبرت
چمن چمن ہے نظارا چمن چمن پرواز

سلسلہ نمبر (۹)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

—— ڈاکٹر کے۔ ایس۔ کرشنن

ڈاکٹر کے۔ ایس کرشنن ڈائریکٹر نیشنل فزیکل لیبارٹری نئی نے قومی پروگراموں کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو سے ہندستان میں تعلیم کے مستقبل پر ایک تقریر براڈ کاسٹ کی ہے جس کا خلاصا نیچے دیا جاتا ہے۔

اگر ہندستان میں پرائمری اور سکنڈری تعلیم کے موضوع پر تقریر کرنے کو کہا جاتا تو مجھے جھجک محسوس ہوتی کیونکہ اس کے لیے ایک خاص علم اور تجربا درکار ہوتا۔ جو مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس لیے میں اپنی تقریر صرف یونیورسٹی کی تعلیم تک محدود رکھوں گا کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصا فزکس اور اس سے متعلقا مضامین پڑھانے اور ریسرچ کرنے میں صرف کیا ہے۔ سنسکرت کا ایک قدیم مقولا ہے کہ سچی تعلیم صرف وہی ہے جو دل کو آزاد بنانے والی ہو۔ باقی تمام تو محض ہنرمندی کی تربیت دینے کے مترادف ہے" ہر زمانے میں آزاد تعلیم اور حقیقی تہذیب کو بہت زیادا اہمیت دیجاتی رہی ہے — یونیورسٹیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی ہی آزاد تعلیم دینے کا انتظام کریں تاکہ ان میں سے جو گریجویٹ بن کر نکلیں وہ زیادا مکمل اور مسرور زندگی بسر کریں۔

اس قسم کی آزاد تعلیم کئی طرح کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے ذریعے دیجاسکتی ہے۔ محض کسی ایک قسم کی تادیب و تربیت پر یہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسی تعلیم کو پورے طور پر دینے کا باعث ہوگی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مختلف قسم کی ذہنی اور اخلاقی تربیتیں ایک دوسری کی معاون ہوتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کی غلطیاں درست کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ اور ذہنی نظریوں میں کسی طرح کی تنگ خیالی پیدا ہونے کے امکان کے خلاف تحفظ کا کام دیتی ہیں۔

سائنس اور انسانیت

چند روز پہلے ہمارے دیس کے نامور سیاست داں فلاسفر پروفیسر رادھا کرشنن نے ٹیلی کمیونیکیشن انجینیروں کے انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ سائنس کو سچائی کی جستجو تسلیم کیا جائے تو یہ ویسا ہی لیکن بخش تجربا ہوگا جیسا کہ دھرم کی بہترین طور پر پیروی کرنا ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی جی نے کہا تھا کہ سچائی ہی پرماتما ہے۔ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے سے کتنی موافقت رکھتے ہیں۔ سائنس کی تمدنی اور تہذیبی پہلو سے جو قدر و قیمت ہے وہ کسی طرح بھی دوسرے انسانی اقدار یا فنون لطیفا سے کمتر نہیں۔ اس لیے سائنس کو بھی ایک ایسی ذہنی تربیت خیال کیا جانا چاہیے۔ جو آزاد تعلیم دینے کا ذریعا بن سکتی ہے۔ ذہنی اخلاص و ایمانداری کی نشو ونما کے لیے سائنس کی تعلیم اور جستجو کے جذبے کی پرورش کرنے سے بہتر اور کوئی موثر ذریعا مجھے نظر نہیں آتا ہے۔ ذہنی اخلاص سے میری مراد ہے حقایق کا روبرو سامنا کرنے پر رضامند رہنا حقایق سے منطقی نتایج نکالنا ان نتایج کو بلا پس و پیش قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا۔ سائنس کا جو طالب علم اس رستے سے منحرف ہونا ہے اسے قدرت خدہی ایسا دھچکا دیتی ہے کہ وہ راہ راست پر آجاتا ہے چونکہ قدرت خدہی معلم کا کردارا دا کرتی ہے اور وہ قومی یا علاقائی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لیے سائنس باوجود ان چند ایک جبری پابندیوں کے جو اس کے عملی شکل میں استعمال

کیے جانے پر جبر عاید ہیں حقیقی معنی میں بین قومی ہی رہتی ہے۔ یہ چیز اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ سائنس کی تربیت اگر تعلیم کا ایک لازمی جزو بن جائے تو وہ تعلیم سچے معنی میں آزاد ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اکے دکے کالج جو صرف ایک ہی قسم کی تادیب و تربیت سے وابستہ رکھتے ہیں آزاد تعلیم کے لیے موافق ماحول مہیا نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اس زمرے میں آنے والی کوئی یونیورسٹی یہ فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

ہمارا تعلیمی مسلا بہت بڑا ہے انتہائی بڑا اجتناک ملک کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کا مسلا ہے۔ قوانین میں بنیادی یا نصاب تعلیم پھر سے ترتیب دینے یا زیادہ بہتر ڈسپلن نافذ کرنے کے لیے مزید چند پروکٹروں کی تعیناتی سے اس مسلے کا حل اس وقت تک نہ ہوگا جب تک کالجوں کو بے شمار طلبا کو بہت ہی کم سہولتوں سے تعلیم دینا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بیش بہا دولت کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے وسایل آج ہمیں میسر نہیں کر سکتے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درس گاہیں آہستہ آہستہ تکمیل کے معیار پر پہنچی ہیں۔ بنیادی اور انتہا پسندانہ تعلیمی اصلاحات عمل میں لانا خالی از خطر نہیں ہے۔ خاص کر اس لیے کہ اصلاح کے اکثر خواہش مندوں میں جوش زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کو وہ خاص تعلیمی تجربہ حاصل نہیں ہوتا جس سے وہ ان بے شمار مسایل کو حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ جو ان کو درپیش ہیں۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کے متعلق انگریزی میں کتابیں

لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کا مشرق قریب وسطا کا شعبہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صاحب کی زندگی کے بارے میں چھ کتابیں انگریزی میں شایع کر رہا ہے اس بات کی اطلاع اس شعبے کے انچارج ڈاکٹر اے گل لام نے اسلامک کارٹرلی کے پہلے اشو میں ایک مضمون کے دوران دی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف عربی زبان کے ایک مشہور محقق ہیں۔

ثانوی تعلیم کی تجدید

(ہیڈ ماسٹروں کی تحقیقی مجلس کی سفارشات)

مرکزی وزارت تعلیم نے "ثانوی تعلیم پر ہیڈ ماسٹروں کے خیالات" نام کا ایک کتابچا شائع کیا ہے۔ اس میں "آل انڈیا ہیڈ ماسٹرز سیمینار" (تحقیقی مجلس) کی وہ تمام سفارشات درج ہیں جو شملا کے قریب تارا دیوی کے مقام پر ۲۷ سے ۲۵ جون ۱۹۵۳ء تک منعقد ہوا تھا۔

سیمینار مرکزی وزارت تعلیم نے منعقد کرایا تھا اور اس میں ہندستان کے تمام اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور ملکی اور غیر ملکی ماہرین تعلیم نے حصا لیا تھا۔ اس وقت تجویز کیا گیا تھا کہ ۱۹۵۴ء کے دوران ریاست وار اور حلقے وار ایسے سیمینار منعقد کیے جائیں گے۔ سیمینار کی سفارشات میں جونیر ثانوی درجے کے لیے چھ لازمی اور دو یا غیر لازمی مضامین مقرر کیے گئے ہیں۔ اور نصاب کی کتابوں کا انتخاب ہیڈ ماسٹروں اور استادوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کی بھی سفارش کی گئی ہے کہ تعلیم دینے کے پیشے میں بعض افراد کے لیے زیادہ کشش پیدا کرنے کی غرض سے مفت طبی امداد اور بچوں کی مفت تعلیم جیسی رعایتیں دی جائیں سیمینار نے "پیرنٹ ٹیچر ایسوسی ایشنوں" یعنی والدین اور استادوں کی ایسوسی ایشن) کے قیام کی بھی سفارش کی تھی چونکہ ان کا خیال تھا وہ طلبا کے لیے لازمی اور مفت ٹیفن فراہم کرنے فلموں کی نمایش کے لیے پروجیکٹروں کی خرید وغیرہ کے مسایل حل کرنے میں مفید ثابت ہوں گی۔

یادرفتگان ——— اثر تاثیر

۱۹۴۲ میں حضرت اثر لکھنوی نے ایک نظم کا ہندستانی میں ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر م۔ اے مرحوم کو اثر صاحب نے مذکورہ ترجمہ سنایا یا تاثیر نے کچھ سوچ کر کہا کہ اس کا ڈراما بنا کر اسٹیج پر یا سینما میں دکھایا جائے تو عجیب و غریب ہو۔ حضرت اثر لکھنوی نے اپنی طرف سے معذرت پیش کی۔ پھر ڈاکٹر تاثیر نے اثر صاحب سے نظم لے لی۔ اور ہفتے عشرے میں میں (بیگم تاثیر کے مشورے سے) ڈرامے کا پلاٹ اور اسٹیج کے ہدایات مکمل ہو گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر تاثیر کشمیر سے چلے آئے۔ اور اثر صاحب لکھنؤ تشریف لے آئے۔ وقت گذرتا گیا۔ ڈرامے کی یاد اثر صاحب کے حافظے سے محو ہو چکی تھی۔ حسن اتفاق سے اثر صاحب کو پرانے مسودات میں سے وہ خاکا انگریزی زبان میں مل گیا جس کا ہندستانی میں ترجمہ مرزا جعفر علی خاں بی۔ اے۔ اثر لکھنوی نے نہایت قابلیت سے کیا ہے جسے ہم ناظرین رسالا کی دلچسپی کے لیے پیش کرتے ہیں۔

ہدایات برائے اسٹیج

ایک مندر کا دروازا۔ اندر دھیمی روشنی۔ مدھم آوازیں مترنم گھنٹیاں (جیسے کہیں دور بج رہی ہوں۔) بخور اٹ روشن ہیں ایک پروہت داخل ہوتا ہے ادھر ادھر دیکھتا ہے گاتا ہے

موسم بہار کا۔۔۔۔۔ حلقا سکون و قرار کا

(دور سے) آواز رقص آتی ہے۔ پاؤں کی آہٹ قریب ہوتی جاتی ہے۔ پروہت خاموش ہو جاتا ہے۔ رقاصا کی سمت دیکھتا ہے۔

رقص آئینا۔ مایا داخل ہوتی ہے شراب حسن سے مست رقص کرتی ہے۔ (ہاتھوں اور پاؤں کے سب انگلیوں میں آئینا دار انگوٹھیاں (بہتر ہو کہ آرسیاں) پہنے ہے۔

لباس میں رنگ رنگ کے شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ ناچتی ہے اور باری باری ہر ناخن کو دیکھتی جاتی ہے بال بکھرا دیتی ہے۔ اور سرشار حسن آنکھوں سے اپنے جسم پر نظر ڈالتی ہے۔

رقص آئینا و رقص طاؤس (سر پر طاؤس کے پروں کا تاج) یکایک لہک لہک کے گانے لگتی ہے

عارض کی شمع کس لیے۔۔ حکومت کے واسطے۔

گانے گاتے شدت لذت سے غش کھا کر گر پڑتی ہے۔

گرج اور چمک (اسٹیج پر اندھیرا) پر روشنی دولت کی دیوی لکشمی اپنے بیوان میں داخل ہوتی ہے سہیلیاں ہمراہ ہیں وہ غش میں پڑی مایا کے گرد ناچتی ہیں۔

(ساحرانا رقص) اس کی آنکھوں کو چھوتی ہیں قدموں کو چھوتی ہیں۔ از فرق تا قدم چھوتی ہیں۔ گویا عمل سحر پڑھ رہی ہیں اس کے ساتھ گاتی جاتی ہیں۔ اپنی ملکا کی تعریف میں لکشمی دیوی کی تعریف میں۔ پھر اس کی ثنا خوانی کرتی ہیں کہ تخت سے اتر فانی مایا کو ننگا، ترنم سے دیکھ لے۔ دیوی اپنے ہوادار سے اترتی ہے جب دیوی کے قدم زمین پر ٹکتے ہیں تو روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔ منظر بدل جاتا ہے۔

ڈراپ سین

اب ایک دوسری دنیا پیش نظر ہے۔ دیوی مایا کے گال کو کلے کی انگلی سے آہستہ سے چھوتی ہے اور کہتی ہے۔

دو شنیزا جاگ۔۔۔ شادماں۔

مایا جاگتی ہے۔ انگڑائی لیتی اور بل کھاتی ہوئی آنکھیں جھپکا جھپکا کے کھولتی ہے۔ اپنے کو ایک باغ میں پاتی ہے۔

حیرت انگیز باغ طلسمی منظر مایا کو اچنبا ہوتا ہے۔ اور کہتی ہے

منظر یہ سہانے ۔ ۔ ۔ ۔ بھری بھری"

لکشمی مایا کا ہات پکڑ کر اسٹیج کے ایک کونے میں لے جاتی ہے "یہ کہہ کر ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ لیں"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک وسیع مسلسل مرقع پیش نظر ہے۔ (تماشا دیکھنے والوں سے مخفی)

دیوی منظر کو الفاظ میں بیان کرتی ہے "وہ دیکھ سامنے ۔ ۔ ۔ ۔ سڑک پر پڑے ہوئے"

مایا۔ دیوی کے قدموں میں گر پڑتی ہے گویا اب تک بیہوش تھی۔ سہیلیاں دیوی کو حلقے میں لے کر رقص کرتی ہیں۔ دیوی ایک پھر کے مجسمے کی طرح تنی ہوئی کھڑی ہے۔ مایا گویا اب تک معروف پرستش ہے۔ رقص تالیش "جے جے"

ڈراپ سین

دوسرا منظر، دیوی کا تجمل مایا رقصاں ہے دیو داسی کا ناچ! جب وہ ناچ ختم کرتی ہے تو دیوی کہتی ہے (سہیلیاں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اور توجہ سے سن رہی ہیں)

"مخزن ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ نفرت تو خوب ہے" سنہری زنجیر کھینچی جاتی ہے۔

پہلا خامش نظارا

پہلا خامش نظارا۔ ایک عیاش طبع جوان (مصنوعی چہرا لگائے ہوئے) شیو کا تانڈو ناچ ناچتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دیوی کے قریب آتا ہے دامن کے قریب پہنچ کر التجا کرتا ہے (ملکا دیوی کی ۔ ۔ ۔ ۔ شرمائے پیار کی)

ایک نیم برہنا عورت مقنع میں منہ چھپائے داخل ہوتی ہے۔ مرد اور عورت مل کر ناچتے ہیں۔ (عاشقانہ ناچ، جاز یا جا) اور سینما ہال کا گانا گاتے ہیں۔ (سوقیانہ مگر فحش نہیں) باہمی معاشقہ جب دونوں ہم آغوش ہوتے ہیں تو مصنوعی چہرے دور ہو جاتے ہیں طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور خبیث و پلید مردا چہرے نمودار ہوتے ہیں۔ لوٹرے پاپی چہرے! خشک پتیاں ان پر برستی ہیں۔ ارد گرد کنٹیلی جھاڑیاں اور کانٹے!

یہ سب اسٹیج کے ایک گوشے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ململ کے پردوں کی آڑ میں مایا غمگین ہوتی ہے متنفر ہوتی ہے۔ خائف ہوتی ہے رونے لگتی ہے۔ دیوی اس سے کہتی ہے "اس سے سبق لے ۔ ۔ ۔ ۔ دور دور تک"

دوسرا خامش نظارا

زنجیر پھر کھینچی جاتی ہے ایک جنگجو جوان داخل ہوتا ہے (ناچ تلواروں اور بھالوں کا ناچ طبلہائے جنگ فوجی دھنیں) اس کا لباس سانپ کی کینچلی کا ہے (یا اسلحہ پر اژدھا بنا ہوا ہے) وہ کہتا ہے "یوں ہو شکست شاہوں کو ۔ ۔ ۔ راج چاہیے"

ڈراپ سین

میدان جنگ اختتام جنگ پر وہ سپاہی شیو کا ناچ ناچتا ہے (بچھو پریوں کا رقص مرگ مشہور رقص)

بعد ازاں اپنے خیمے میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کا قتل خاشی (MIME) میں واقع ہوتا ہے۔

تیسرا خامش نظارا

سنہری زنجیر پھر کھینچی جاتی ہے ایک حریص پیر فتوت داخل ہوتا ہے رنگیلا ہوا اور کانپتے ہوئے ہات دعا کو اٹھا کر اشرفیوں کا تھیلا مانگتا ہے۔ ایک گھناؤنی کھڑکھڑاتی ہوت کی طرح بھیانک گت ناچتا ہے۔ قریب قریب چوتڑ لٹکا دیتا ہے کیسے نکالتا ہے دانت کھڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ تھیلے کو بھینچتا ہے جو نہیں چھوتا ہے تھیلے سے شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔ (فاسفورس کی روشنی) ایک نوجوان ادھر لپکتا ہے اس کے باریک لباس میں آگ لگ جاتی ہے۔ خاک اور راکھ، خاک اور راکھ کی بارش۔

چوتھا خامش منظر

سنہری گھنٹی بجتی ہے ایک شئی اپنے گیروے لباس میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے

"اے لکشمی اے دیوی قناعت ملی مجھے ۔ ۔ ۔ جو چاہے سو کرے" یہ کہتے ہی سانس اکھڑ جاتی ہے اور سنہری کہرے میں

لپٹی ہوئی پرواز کر جاتی ہے۔

پدمنی ہنگامہ، کدر کی بھرتی، غنڈوں کا ناچ، سیاہ چہروں کا ناچ مختلف معنوی چہرے (پس منظر میں) اس کے مناسب باجا۔ پل پل دھینگا مشتی شور و غل، لکشمی کہتی ہے "ابھی نہ سے ..... دخان ہو"

مایا کو لالچ آتا ہے۔ ایک انگوٹھی پسند آتی ہے اس کی طرف بڑھتی ہے پھر پلٹتی ہے۔ پھر بڑھتی ہے پھر پلٹتی ہے۔ دیدا ہے کھٹکتی ہے آخر کار حرص کا شکار ہو جاتی ہے۔ سانپ کا ناچ۔ تریبھنی ناچ۔ جیسے ہی انگوٹھی اٹھاتی ہے ایک شعلا بلند ہوتا ہے۔ منظر پر دھواں اور تاریکی چھا جاتی ہے۔

ڈراپ سین

وہی افتتاحیا منظر ——— مندر

مایا مدہوش پڑی ہوئی ہے چونکتی اور بل کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔ تھرتھر کانپ رہی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہے۔ پھر کانپتی ہے گویا شدید کرب میں مبتلا ہے چاہتی ہے کہ ہاتھ کے اشارے سے بھیانک منظر کو دنیائے خیال سے نکال دے۔

پروہت داخل ہوتا ہے اور ایک شلوک گاتا ہے مایا کے ہوش ٹھکانے ہوتے ہیں۔ خوف دور ہوتا ہے آنسو پونچھتی ہے پروہت کے سامنے جھکتی ہے وہ آشیرباد دیتا ہے دونوں مندر میں داخل ہوتے ہیں وہ یہ گیت گاتا ہے۔

"یہ خوبیاں ..... ڈھکنا تو چاہیے"

جس وقت وہ گا رہی ہے اس کی ضعیف (لیکن قبول صورت) ماں چندن اور سیندور تھال میں لیے داخل ہوتی ہے وہ اپنی لڑکی کی تلاش میں آتی ہے۔ مایا اپنی ماں کی طرف دوڑتی ہے۔ دونوں طویل مفارقت کے بعد مل جاتے ہیں۔ مایا ایک گیت گاتی ہے۔ قناعت کا گیت۔ ایسی فرماں بردار لڑکی کا گیت جو والدین کے قدموں میں جنت ہونے کی قایل ہے۔

اولاد کی عصمت و پاکی کا رقص۔

چینی مسلمانوں کی عید

ہر عید کی صبح کو پیکنگ کی ساٹھ سے زاید مسجدوں میں عید کا مذہبی تہوار منانے کے لیے ہزاروں ہی چینی مسلمان جمع ہوتے ہیں اور اپنے مذہبی عقیدے کے تحت نماز عید ادا کرتے ہیں۔

۹ تو۔ قوموں کے مسلمان جن میں ہوئی، اوئی غر، قزاق، تاتک اور تاتار نژاد ہیں شامل ہیں۔ ۲۵۰۰ مسلمانوں نے راجدھانی کی بڑی مسجد میں نماز ادا کی۔ مسجد کے آخون۔ ان بشپ وے نے جو اس وقت نماز پڑھانے کے فرائض ادا کر رہے تھے اپنے خطبے میں کہا کہ نجات امن چینی مسلمانوں کے لیے مسرت کا پیغام لائے ہیں آپ نے مسلمانوں سے اس بات کا تقاضا کیا کہ وہ امن کی حفاظت میں سرگرمی کے ساتھ حصا لیں۔

مذہبی عبادت میں بہت سے اسلامی رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ ان میں اخون تاپو۔ شینگ چینی اسلامی ادارے کے نایب چیرمین اور نانتینگ اے اور مانسنگ۔ تنگ ہوئی تہذیبی ادارے کے نایب ڈایرکٹر شامل تھے۔

اس تقریب کے بعد مسلمان اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے گھر گھر ہر عید کو اسکولوں، سرکاری دفتروں فیکٹریوں اور دوسرے اداروں میں چھٹی رہتی ہے۔ اس موقع پر گائے اور بکری کا گوشت پکانے کے لیے تیل اور دوسری غذائی اشیا بھاری مقدار میں خریدی جاتی ہیں۔

عید کا مذہبی تہوار بہت سی قومیتوں والے صوبے نکیانگ کے مسلمان بھی مناتے ہیں۔

اس صوبے کی راجدھانی ارچی میں ڈھول تاشوں اور شہنائیوں کی آواز صبح ہی سنائی دینے لگی۔ جب مسلمان میلے کے دن کا بہترین لباس پہنے ہوئے نماز ادا کرنے کے لیے شہر کی ۶ مسجدوں کی طرف بڑھے۔

کشمیر کا سفر ——— ۱-۸

(پہلے تین مہینے اور اب ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہوتا ہے)

ہندستان کے میدانوں میں جب موسم گرما شروع ہوتا ہے اور گرمی کی شدت بڑھ جاتی ہے تو قدیم وقتوں سے ہی ہندستان کے باشندوں کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ برف پوش پہاڑوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کے دلوں میں پہاڑوں کے سینوں سے ابلتے ہوئے چشموں اور جنگلات سے بہہ بہہ کر آنے والے دریاؤں کے مناظر دیکھنے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندستان کے میدانوں کی سخت گرمی اور تپش ہی نے پہاڑوں کے مقدس اور ان کی چوٹیوں پر دیوتاؤں کی آرام گاہوں کا تصور پیدا کیا ہے۔

ہندستان کا موسم گرمانہ صرف دیوتاؤں بلکہ بادشاہوں اور عوام کے دلوں میں آغوش کشمیر کی تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ جس کے برف پوش پہاڑ، سرسبز و شاداب وادیاں جھیلیں اور دریا میدانوں کے باشندوں کو سیاحت کی دعوت دیتے رہتے ہیں لیکن سفر کے خطرات، سڑکوں کی دشواریاں اور بھاری اخراجات ہمیشہ سیاحت کشمیر میں حایل ہوتے ہیں۔ اور انہیں اسباب کی بنا پر کشمیر عام آدمی کے لیے محض ایک واہمہ بن کر رہ گیا ہے۔

شاہان مغل کو بھی دلی سے سری نگر جانے میں دو تین مہینے لگ جاتے تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کو ایک مرتبہ کشمیر پہنچنے میں تین مہینے لگ گئے تھے۔ اور گذشتہ چند سالوں تک بھی سفر کشمیر کے اخراجات صرف راجا یا دولت مند لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن آج سفر کشمیر ہوائی جہاز کے ذریعے دلی سے ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ تاہم اخراجات عام آدمی کے لیے قابل برداشت نہیں ہیں۔ بہرکیف آج کل ریلوں اور سڑکوں کے مربوط انتظامات کی بدولت سفر کشمیر پر سیاح کے چالیس گھنٹے صرف ہوتے ہیں اور ہوائی جہاز کے سفر کے مقابلے میں اخراجات بھی ایک تہائی رہ گئے ہیں۔

آج کل مسافر کو دلی سے "کشمیر میل" کے ذریعے روانا ہونا پڑتا ہے۔ اور پٹھان کوٹ تک کا سفر رات کے بارہ گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ پٹھان کوٹ میں حکومت جموں اور کشمیر کے محکمے نقل و حمل کی بس یا اسٹیشن ویگن کے ذریعے سری نگر تک دو سو ستائیس میل لمبی سڑک کا سفر طے ہو جاتا ہے۔ پٹھان کوٹ سے جموں ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور یہیں پر لنچ کھانے کے لیے پہلا پڑاؤ ہوتا ہے۔ جموں سے سڑک میدانی علاقے میں سے گذرتی ہے۔ اور چالیس میل پر ادھم پور کا قصبا ہے۔ یہاں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے جو سطح سمندر سے نو سو فٹ بلند ہے۔ یہاں سے تین میل چل کر گڈ کا پہاڑی اسٹیشن ہے جو اپنے چشموں کے لیے بہت مشہور ہے اور سطح سمندر سے ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں پر مسافر دوروپے ادا کرنے پر ڈاک بنگلے میں رات بسر کر سکتا ہے۔ اس سڑک کے ہر پڑاؤ پر ڈاک بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ اور مسافر ان میں آرام کر سکتے ہیں۔ گڈ کے بعد مسافر بانونے کے مقام پر پہنچتا ہے۔ اور بانہال گاؤں میں پہنچنے کے بعد درہ بانہال سے گذرنا پڑتا ہے۔ بانہال کی سرنگ کو عبور کر کے مسافر کشمیر کی دل فریب وادی میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے سڑک وادی میں اترنی شروع ہو جاتی ہے اور لور منڈا میں مسافر وادی میں پہنچ جاتا ہے۔ سڑک سے دو میل کے فاصلے پر ویرناگ کا چشمہ ہے جہاں سے دریائے

اندھیرا

آیا عصمی

(بنیادی خیال شو کانت بھٹاچارجی کی نظم "محبوبا کے نام"... سے لیا گیا ہے)

وہ شام بڑی سرد تھی۔ خدغرضی اور سرد مہری سے بھی زیادہ! دھنا نے اپنی اندھیری جھونپڑی پر نظر دوڑائی اور دانت کٹکٹاتے ہوئے سیڑی کندے پر اٹھا کر باہر نکل پڑا۔ باہر جا کر اسے یاد پڑا کہ وہ ماچس جو اس کی نہیں سوسائٹی کی ملکیت تھی وہ جھونپڑی میں ہی بھول آیا تھا۔ وہ اس اندھیرے میں پھر دھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے ذہن میں کئی سال پیچھے کی باتیں پھرکی کی طرح گھوم گئیں۔ جب وہ فوج کا سپاہی تھا اس خیال پر بموں کے دھماکوں سے اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں.... اندھیرا بڑھتے جا رہا تھا اور نوکری بچانے کے لیے اسے کام پہلے کرنا تھا اور سوچ بچار بعد کو۔ وہ سیڑی باہر ہی رکھ کر بڑبڑاتا ہوا اندھیرے میں گھس پڑا۔ اور ماچس کی جگہ ٹٹولنے لگا۔

"ہات تیرے نصیب کی.... میں تو سڑکوں، گلیوں اور کوچوں میں بتیاں جلاتا چلوں اور خود میرے گھر میں ایک دیا تک نہیں۔ ہات تیرے نصیب کی....."

اس نے اپنے نصیب کو کئی فحش گالیاں دے ڈالیں بارے ماچس مل گئی۔ اس نے سوچا باہر جانے کو راہ ڈھونڈنے کے لیے ایک تیلی جلالے۔

"ہات تیرے نصیب کی...." ماچس کی ڈبیا خالی تھی وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکل پڑا۔

دھندلے اندھیرے میں سڑک ایسی دکھائی پڑ رہی تھی جیسے کوئی نئی نویلی دلہن اپنے شوہر کی راہ تکتے تکتے ابھی ابھی سوئی رہو۔

"سروپ بھیا ایک پیسے کی بیڑی اور ایک ماچس تو دیدینا۔" اور سروپ نے ماچس اور بیڑی اسے تھما دی اور دھنا کو دوسرے گاہکوں سے الجھتا دیکھ کر دھنا نے بغیر کچھ کہے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔

"ابے پیسے تو دیتا جا"

دھنا سیڑی کندے پر رکھے تقریباً دوڑتے ہوئے چیخا۔

"کل لے لینا، بھاگا ـــــ تھوڑے ہی جاتا ہوں"

وہ سڑکوں اور گلیوں کی بتیاں جلا رہا تھا۔ مگر اس کے ذہن میں اپنے گھر کا اندھیرا تلاطم بازیاں کھا رہا تھا اور فوج کی زندگی پھر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔ فوجی ملازمت کے سلسلے میں اس نے دنیا کے کئی ملک دیکھے تھے کتنے ہی لوگوں سے ملا تھا۔ کتنی ہی سڑکوں کی جگمگاہٹ دیکھی تھی۔ اس نے کسی کے گھر میں جھانک کر تو نہیں دیکھا تھا۔ پر نہ جانے کیوں اس کا جی کہہ اٹھا کہ ان ملکوں میں بھی جہاں سڑکوں کی جگمگاہٹ راہ چلتوں کے پیروں سے لپٹی جاتی ہے۔ وہاں بھی کتنے ہی گھروں میں ضرور ہی اندھیرا گھور اندھیرا بسیرا کیے ہوگا جنگ کی باتیں سوچتے ہی اسے شوبھا کا خیال آگیا۔ اور شوبھا کے خیال پر اس کی آنکھیں بھر آئیں ـــــ کم بخت جنگ نے ہی تو اس کی شوبھا اس سے چھین لی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے جاتے ہی اتنا زبردست کال آئے گا۔

اس کے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے۔ اور خیال پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جنگ کی طرف ـــ جنگ کے زمانے کی طرف جس کے ہر طرف دھماکوں، گولیوں کی تڑاتڑ اور ہوائی جہازوں کی گھنگھناہٹ کا راج تھا۔ اور شوبھا کے سینکڑوں کاغذ پر لکھے ہوئے بیتے خط کو سامنے رکھے تخیل کی دنیا میں کھویا رہتا۔ سوچتا رہتا جانے کس سے شوبھا نے یہ خط لکھوایا ہوگا۔ جانے کتنی ہی

باتیں اس کے دل سے امنڈ کر اس کے ہونٹوں پر آ آ کر ٹھٹک گئی ہوں گی۔ جانے کتنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "دھڑام دھڑام دھم" کوئی بم لیٹ کر اس کے خیال کے پرخچے اڑا دیتا۔ اور ایک دن اس نے ایک سیدے سادے خیال کو تیڑے میڑے حروف کی شکل دیدی ۔ ۔ ۔ رانی!

طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ کئی بار جی میں آیا ہے وردی بندوق پھینک کر بھاگ آؤں۔ مگر چھٹی سے آنے والے سپاہیوں نے بتایا ہے کہ دیش میں بھیانک کال آگیا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ تم کو تو۔

رانی یہ کال بڑی تکلیف دہ چیز ہے ۔ ۔ ۔ مگر ہمارے دیش میں کال آتا ہی کیوں ہے۔ اتنے بڑے دیش میں جہاں اتنے سارے لوگ ہیں۔ جہاں اتنی ساری زمین ہے اور زمین کا چپا چپا سونا اگلنے کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ سچ سچ رانی! اٹلی میں ایک مزدور مجھ سے کہنے لگا "تم جنگ میں کیوں آئے، تمہارے دیش کی زمین تو سونا اگلتی ہے"۔ میں لاجواب ہوگیا رانی! بالکل لاجواب مگر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ کم پڑھا لکھا ہوں تو کیا ہوا۔ دنیا دیکھی ہے میں نے اپنے دل سے ایک بات گڑھی "بات یہ ہے بھائی کہ ہمارے ملک میں بہت بڑے بڑے دریا ہیں۔ ان میں ہر سال بڑے بھیانک سیلاب آتے ہیں۔ کھیت تہہ آب ہو جاتے ہیں۔ اور سونا اگلنے والی زمین کال اگل دیتی ہے۔ کال بھوک بیماری اور بیکاری لاتا ہے اور ہمارے دیش کے لوگ معمولی تنخواہوں پر جنگ کا ایندھن بننے کو فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں اسے مطمئن کر چکا تھا کہ میرا ایک ساتھی سپاہی بگڑ اٹھا "ابے ڈینگ کاہے کو لیتا ہے یہ کیوں نہیں کہتا کہ ہمارے دیش میں سونا بھوک بیماری، کال اور بیکاری ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں سونا کچھ دوسرے لوگ لے جاتے ہیں۔ اور بقیہ "پیداوار" ہمارے ہمارے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر سب چیز ہمارے لیے ہی چھوڑ دیں تو وہ غریب جو اتنی محنت کر کے ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ خدا کیا کریں"۔ اتنا کہہ میرا ساتھی سپاہی بڑے زور سے ہنسا اور اس کی بات سچ کر ٹالی کا مزدور بھی مسکرا دیا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں ہم سے نفرت کی جھلک نہ تھی بلکہ ایک گہرا ترحم تھا۔ ایک محبت تھی۔ میں بھی اپنے دیش کی درد شا پر کئی بار گھنٹوں رویا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ تم خط لکھتی رہا کرو۔

تمہارا اپنا دھنا

اتنی دیر میں وہ کئی بتیاں جلا چکا تھا۔ اس نے تخیل اور جسم کو گرمی پہنچانے کے لیے ایک بیڑی جلائی اور خیال کا تار جوڑا۔ اس بار تخیل نے اس کے سامنے ایک اور خط رکھ دیا جو اس نے اپنی محبوبا کو لکھا تھا۔

شوبھا!

کئی خطوط لکھے مگر جواب نہیں ملا۔ شاید تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ ورنہ یہ ناممکن تھا کہ تم جواب نہ دیتیں۔ میرے دوست میں خاک کیسی باتیں سوچنے لگا۔ موت سے جونکے اس قدر نزدیک ہوں کہ نظر کے سامنے موت کے فرشتے کا بازار ہے۔ اس لیے جو بات بھی ذہن میں آتی ہے ایسی ہی اوٹ پٹانگ ہوتی ہے یقین مانو شوبھا! میرا ایمان ہے کہ تم جس صورت میں ہو جہاں ہو میری ہو۔ اور سنو اب میں آرہا ہوں۔ اپنی شوبھا سے ملنے۔ کتنا سندر اور سہانا ہوگا وہ سمے جب فوج کی سیٹی ہوئی ٹیالی وردی پہنے تم سے ملوں گا۔ میرے ساتھی رشک و حسد کرنے والوں کی ایک بھیڑ ہوگی۔ مگر میری نگاہیں تمہیں ڈھونڈ لینگی۔ اور تم ایک کونے میں لجائی ہوئی سر جھکائے ہوئے کھڑی ہوئی ملوگی۔ کتنی حسین ہوگی وہ گھڑی، میری وردی تو اس خیال سے ابھی سے ہی جسم سے پھسلی جا رہی ہے۔ اب میں جنگ سے اکتا گیا ہوں کیوں وہ آخر کیوں؟ یہ دوسروں کے لیے خون بہایا جائے۔ یہی خون اپنے دیش کی ترقی اس کی آزادی کے لیے کیوں نہ بہایا جائے۔ جنگ ہمیں دیتی کیا ہے کال، بھوک، بیکاری، بیماری موت، بھیانک موت، موت

اور صرف موت اٹلی، جرمنی یا جاپان نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کچھ بھی تو نہیں! اگر میں نے جانے کتنوں کو ہی گولی مار دی تو کیا بھونک دیں اور کیسے نہ بھونکتا۔ اسی بات کے تو مجھے پیسے ملتے ہیں اسی مقصد کے لیے تو مجھے اس کال سے نکال لایا گیا تھا۔ جو میرے بھائیوں کو نگلے جا رہا تھا۔ مگر اب میرا ہاتھ ان پر نہیں اٹھتا جو میرے دشمن نہیں ہیں۔ میں لوٹ آ رہا ہوں۔ میں نے اپنے دشمنوں کو پہچان لیا ہے۔ اپنے دشمنوں کو۔ تمہارے دشمنوں کو۔ دیش کے دشمنوں کو ——

تمہارا دھنا

پھر ایک اور خط کے الفاظ اس کے ذہن پر ابھر آئے جسے وہ پوسٹ کر سکا تھا آخر کیسے بھیجتا جبکہ شوبھا کو سچ مچ کال کھا گیا تھا۔

میں آ گیا۔ مگر تم نہیں ملیں۔ تمہیں کال کھا گیا۔ جانتی ہو جنگ سے واپس آنے پر پھر مجھے میری پرانی نوکری مل گئی ہے۔ وہی سڑکوں کی بتیاں جلانے والی۔ میں روز شام کو سڑکوں گلیوں اور کوچوں کی بتیاں جلاتا رہتا ہوں۔ مگر میرا دل اندھیرا رہتا ہے۔ دل کا دیا بجھا رہتا ہے۔ گھر اندھیرا ہے۔ میرے پاس ایک دیا تک نہیں کہ اپنے گھر کا اندھیرا دور کر سکوں۔ اندھیر گھور اندھیرا۔ اندھیرا۔ اتنا گمبھیر اندھیرا جس میں تم میں سب کے سب کھوئے جا رہے ہیں۔ راہ بھولے جا رہے ہیں لٹ رہے ہیں۔

کام ختم ہو چکا تھا۔ تخیل کا دھاگا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ "بات تیری کی . . . . ." اس نے بجھی ہوئی بیڑی کا ٹوٹا زور سے زمین پر ٹپک دیا۔

واپسی پر سروپ سے کترا کر ہی نکل آیا کہ کہیں وہ شام کے پیسوں کا تقاضا نہ شروع کر دے۔ اور اپنے جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا ہو چتا رہا کہ اپنے گھر کے گمبھیر اندھیرے میں دھنس جائے یا تمام رات باہر ہی کھڑے کھڑے گذار دے۔

گرد و رات بڑی سرد تھی۔ خدغرضی اور سرد مہری سے بھی زیادہ سرد۔ وہ دانت کٹکٹاتے ہوئے اپنے اندھیرے گھر میں گھس پڑا اور اندھیرا دور کرنے ایک پتلی جلانی چاہی "بات تیری کی . . . . یہ سالی بھی ختم ہو گئی!" اس نے ماچس کی خالی ڈبیا ہوا میں اچھال دی۔ اور اپنی جھلنگا چارپائی پر اپنی میلی چیکٹ پھٹی ہوئی گدڑی اوڑھ کر پڑ رہا۔

جوش مندوزئی
(پاکستان)

جذبات جوش

(تحفہ عید)

چاند کے ساتھ عید آتی ہے
اک ادا سی سبھی دل پہ چھاتی ہے
دل بہلتا ہے دیکھ کر تصویر
آپ کی یاد جب رلاتی ہے
جب مچلتا ہے بات کرنے دل
خط کی تحریر کام آتی ہے
کسی گلشن کو دیکھ لیتا ہوں
جب کہ یاد وطن ستاتی ہے
سعی کرتا ہوں بھول جانے کی
اور تقدیر مسکراتی ہے
ہائے کیا انقلاب آیا ہے
زندگی موت کو ڈراتی ہے
روک کر راستا مرے گھر کا
مرا تقدیر منہ چڑاتی ہے
جوش کیا فائدہ شکایت سے
جس طرح ہو گذر ہی جاتی ہے

چین میں تعلیمی ترقی

پ۔ ا

عالا درس گاہوں اور ان سے وابستہ کسانوں اور مزدوروں کے لیے مڈل اسکولوں کی عمارتوں میں ایک اور نئی عمارت کی تعمیر کے لیے ۱۹۵۳ء میں ۱۶ کھرب ۶۰ ارب یوآن کی رقم (۲ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کے لگ بھگ) وقف کی گئی۔

مرکزی عوامی سرکار کی طرف سے دی گئی اس عظیم رقم سے نئی عمارت کے ۱۲ لاکھ مربع میٹر کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور یہ کالج اور یونیورسٹی اسی کل رقم کے برابر ہے جسے کومنتانگ کی حکومت نے ۱۵ سالوں میں تعمیر کیا تھا۔ درسی ہال، تجربہ گاہیں، تجرباتی ورکشاپیں، طالب علموں اور شعبہ تعلیم کے ممبروں کے لیے رہائش گاہیں، لکچروں کے لیے ہال کھانے کے کمرے اور ورزش گاہیں ان عمارتوں میں سے ہیں جنہیں تعمیر کر لیا گیا ہے۔

اس عمارت کے تعمیری پروگرام میں ۸۰۰ ریل کے ڈبوں میں سمانے والی فولادی سلاخیں سمنٹ اور کڑیاں استعمال کی گئیں۔

جنوب میں کینٹون سے شمالی اندرونی منگولیا تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے میں اور مشرقی ساحلی علاقوں سے شمال مغرب کے صوبے سنکیانگ تک کے علاقوں میں یہ تعمیری منصوبے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ۳۰ شہروں میں عالا تعلیم کے ادارے اور مزدوروں اور کسانوں کے مڈل اسکول ہیں جن میں ۲۰ ادارے بالکل نئے ہیں اور باقی ۱۸۳ اداروں کو توسیع دی گئی ہے اور ۲۰ نئے اداروں میں جنہیں اس سال تعمیر کیا گیا۔ پیکن کے فولاد اور لوہے، ہوابازی، ارضیات، کان کنی، پٹرول اور مشینی کھیتی باڑی کے تعلیمی ادارے شامل ہیں اور شمال مشرق میں ہربن کا میڈیکل کالج اور وسط جنوب میں وہاں کا انجینرنگ کالج بھی پیکن کے لوہے اور فولاد، ہوابازی، ارضیات، کان کنی اور پٹرول کے تعلیمی ادارے اپنی عارضی عمارتوں سے شہر کے مغربی مضافات کی نئی اور عظیم الشان عمارتوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ شہر کے اس مشہور تعلیمی مرکز کا حصا بن چلے ہیں جہاں ایک سال پہلے کھیت ہی کھیت تھے۔

ٹکنیکل تعلیم کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ دینے کے لیے ۱۹۵۳ء میں تعمیر کیے گئے نئے کالج کی عمارت کا ۶۰ فی صدی حصا ٹکنیکل تعلیم کے لیے وقف ہے اس کے بعد ان کالجوں کا نام لیا جا سکتا ہے جو فطری سائنس، زراعت، جنگل بانی ادویات اور دوا سازی سے متعلق ہیں۔ ان کے بعد مزدوروں اور کسانوں کے مڈل اسکولوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مرکزی عوامی سرکار شعبہ تعلیم کے ممبروں اور طالب علموں کی رہائش اور مطالعے کے لیے آسانیاں بہم پہنچانے کی طرف بڑی توجہ دے رہی ہے۔ قومی آزادی کے بعد سے جس قدر فرشی رقبا تعمیر کیا گیا ہے وہ ۱۸ لاکھ مربع میٹر تک ہے۔ یہ رقبا قومی آزادی سے پہلے کے ۵۰ سالوں میں تعلیمی اداروں کی عمارتوں کے لیے تعمیر کیے گئے۔ فرشی رقبے کا لگ بھگ نصف حصا درس و تدریس کی دوسری آسانیوں میں اضافے کے تھا ساتھ مختلف اداروں میں استعمال کی جانے والی مشینوں اور تجربا گاہوں کے ساز و سامان میں بھی اضافا کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں اس مقصد کے لیے سرکار نے ۷ کھرب ۳۰ ارب یوآن (ایک کروڑ ۷ لاکھ پونڈ) کی رقم وقف کی تھی اس رقم کے ۱/۵ حصے سے سوویت یونین، جمہوری جرمنی، چیکوسلواکیا اور دوسرے ملکوں سے آلات اور مشنری خریدی گئی۔ ان آلات اور مشینوں میں لیبارٹریوں کا ساز و سامان چھوٹی فیکٹریوں کی مشینری مثال کے طور پر خرادا و ریرمے اور ایکس۔ رے کا ساز و سامان شامل ہے۔

جواب کے لیے ہیٹا جوابی خط لکھیے ورنا جواب نہ دیا جائے گا

ہندستان کی تعمیر نو میں ایلورا کے غاروں سے سبق ۱-۱

بمبئی۔ سوراشٹر۔ مدھیہ۔ بھارت۔ بھوپال اور کچھ کی ریاستوں کی اجتماعی ترقی کے منصوبوں کے افسروں کی چوتھی علاقائی کانفرنس حال ہی میں اورنگ آباد (حیدرآباد) کے مقام پر منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والے افسر اورنگ آباد سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ایلورا کے غاروں کو دیکھنے کیلیے بھی گئے تھے۔ ان غاروں کا مشاہدہ کرنے کے لیے ایک مبصر بھی ان افسروں کے ہمراہ تھا۔ اور درج ذیل مضمون میں اس مبصر کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔

اٹھارا سو برس پیشتر کسی گمنام صاحب تخیل انسان نے پہاڑی کگھاٹیوں کے دامن میں بیٹھ کر ہندستان کے باشندوں کے دھرم، دیومالا اور تہذیب کو لافانی بنانے کی تجویز پر غور و خوض کیا۔ مہاتما بدھ نے دنیا کو سچائی و عدم تشدد کا جو پیغام دیا تھا اسے حفاظت سے آیندہ نسلوں تک پہنچانے کی ضرورت تھی۔ اس کام کی تکمیل کے لیے ہندستانی کے بلند خیال اور جذبہ عقیدت سے سرشار کئی پشوت ایک کے بعد ایک پوری نو صدیوں تک ایک مسلسل مہم کی صورت میں مصروف عمل رہے، اور ان کے کام کا نتیجہ ایلورا کے ۳۴ غاروں کی شکل میں ایک دائمی عظمت کی حیثیت سے آج تک ہمارے سامنے موجود ہے۔

حال ہی میں اورنگ آباد میں مختلف ریاستوں کے اجتماعی ترقی کے منصوبوں کے کارکنوں کا اجتماع ہوا اگرچہ اس کانفرنس کا بنیادی مدعا اجتماعی ترقی کے پروگرام کی تکمیل کے مختلف مسایل کو زیر غور لانا تھا۔ تاہم کانفرنس میں شریک ہونے والے افسروں نے ایلورا کے غاروں کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھی وقت نکال لیا ان میں سے کئی افسروں کے لیے ان غاروں کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ بل کھاتی ہوئی پہاڑی سڑک پر سے گذر کر جب وہ ان غاروں تک پہنچا تو سب سے پہلے انہوں نے مہاتما بدھ کے زمانے سے متعلق پہلی یا دوسری غاروں کو دیکھا۔ یہ غار گپتا حکمرانوں کے عہد میں تیسری اور ساتویں صدی کے درمیانی عرصے میں تیار کیے گئے تھے۔ ان سے پہلے اٹھارا غار آٹھویں اور گیارویں صدی کے درمیانی عرصے میں تیار کیے گئے تھے۔ اور ان میں ہندو دھرم و دیومالا سے متعلق تصاویر نقش کی گئی ہیں۔ اس سلسلے کے آخری چار غار نویں اور گیارویں صدی کے درمیانی عرصے میں تیار کیے گئے اور ان میں جینیوں کے دھرم اور تہذیب کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

غار نمبر (۱۶) میں کیلاش مندر کی تعمیر تو ایک معجزے سے کم نہیں۔ یہ مندر آج سے ایک ہزار برس پہلے تعمیر کیا گیا تھا۔ جبکہ آج کل کی سائینس ترقی کی مدد حاصل نہ تھی۔ اس

غار میں ایک پوری پہاڑی کو کاٹ کر چٹانوں میں سے یہ شاندار مندر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے زمین پر کھڑا نہیں کیا گیا بلکہ پتھروں کو کاٹ کر ہی ہاتی، شیر اور دوسرے جانوروں کی شکلیں تیار کی گئی ہیں اور ان کے اوپر یہ عظیم الشان مندر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مندر کے ایک طرف سو فٹ سے زیادہ لمبی ایک ڈھلوان چٹان ہے یہ چٹان کسی قسم کے ستون یا بیرونی امداد کے بغیر کھڑی ہے اور انجینیر اس امر پر حیران ہیں کہ یہ چٹان صدیوں سے کس طرح اس حالت میں لٹکی چلی آ رہی ہے۔ اس غار کو دیکھنے کے لیے آنے والے عام لوگ ستوجی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد اس بات پر اپنا بیان ظاہر کرتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں کہ گذشتہ زمانے میں ہندستان میں فنی کمال کا یہ مظاہرہ کرنے والے اشخاص کون تھے۔ اسی طرح اسے دیکھنے والے پروجکٹ انگیز کیٹیو افسر بھی حیران اور ششدر رہ گئے کیا ہمارے آباؤ اجداد نے بھی کوئی ایسا پلاننگ کمیشن مقرر کیا تھا جس کی ہدایات کے مطابق وہ کسی پانچسالا یا پچیس سالا اسکیم کی صورت میں نہیں بلکہ صدیوں تک اپنے لاثانی فن تعمیر کا مظاہرہ کرتے رہے وہ کونسی چیز تھی جس نے ہمارے ملک کے ان باشندوں کو اس مسلسل جدوجہد میں سہارا دیے رکھا تھا۔

اس زمانے میں چھینی اور ہتوڑا ہی ان کے ہتیار تھے لیکن وہ عقیدت کی دولت سے مالا مال تھے اور کون نہیں جانتا کہ عقیدے کی قوت کے سامنے پہاڑ بھی نہیں ٹھہر سکتے انہوں نے اپنی یقین کی قوت کے سہارے مضبوط چٹانوں کو چھینی سے تراشا اور ان سے ایسی ایسی شکلیں وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو آج بھی دنیائے آرٹ میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دیوی۔ دیوتاؤں کی مورتیاں۔ جانتا بدھا ورجاویر کے محلوں کے نقوش اور فن ورقص کے دلکش نمونے وہ ان چٹانوں کو کاٹ کر پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے ان غاروں کا مشاہدہ کرنے والے اجتماعی ترقی کے

بعض کارکنوں کو یہ احساس ہوا کہ کس کار عظیم کی تکمیل کے لیے مضبوط بنیاد اور سرکاری مشینری کے علاوہ دیگر لوازمات بھی درکار ہیں اور وہ ہے یقین اور اعتقاد۔ اگر ہندستان تعمیر نو میں حصہ لینے والے موجودہ کارکن اس یقین کا تھوڑا سا حصہ بھی اپنے میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ ملک بھر میں سے مایوسی۔ کاہلی اور سستی کو بھگا سکتے ہیں۔ البتہ اس زمانے کے کارکنوں اور آج کل کے کارکنوں کے کام میں ایک فرق ضرور ہے۔ اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کرنے والے ان کارکنوں کو اس بات کی فکر واسن گیر ہونی چاہیے کہ انہیں اپنے کام کو جلد سے جلد انجام دینا چاہیے۔ کوئی کارکن اگر چاہے تو اپنی ساری عمر کسی پتھر کے ٹکڑے کو کاٹ کاٹ کر ایک ہی مورتی بنانے پر صرف کر سکتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں ترقی کی رفتار کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے وقت تیزی سے گذر رہا ہے اور اپنے ملک کی تعمیر نو کے سلسلے میں جہاں اپنا قدم مضبوطی سے اٹھانا ہے وہاں اس امر کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ تعمیر اور ترقی کی مختلف منزلوں کو ہم بروقت طے کرتے جائیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ایلورا کے غاروں میں چٹانوں پر نقوش تیار کرنے والے کارکنوں کا دائرہ عمل جہاں ان غاروں تک محدود تھا وہاں اجتماعی ترقی کے منصوبوں کے موجودہ کارکنوں کو تعمیر اور ترقی کی تحریک کو دوسرے ملک میں فروغ دینے کا فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ انہیں صرف اسکولوں، ہسپتالوں اور سڑکوں کی تعمیر کی طرف ہی نہیں بلکہ ایسے انسان تیار کرنے کے پروگرام کی طرف بھی توجہ دینا پڑتی ہے جن کی نشوونما جسمانی، ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے متوازن ہو۔

اجتماعی ترقی کے منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں کام کرنے والے کارکن ایلورا کے غاروں میں فنی کمال کا مظاہرہ کرنے والے قدیم کارکنوں کے جذبہ اعتقاد اور ان کی ہمت سے یہ سبق سیکھ کر منزل ترقی کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں کہ ہمیں راستے کی مشکلات سے گھبرا کر

ادب اور جمود

شاہد اختر

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)

انجمن ترقی پسند مصنفین ہماری زندگی کی صحی ترجمان ہے۔ یہ عام انسانوں کی ادبی ثقافتی، اقتصادی، معاشی اور سماجی حالات کا جایزا ارتقا کی سنہری اور نیلگوں سطح پر کرکے ان تمام برائیوں اور بدکاریوں کو دور کرنے کی ایک ناقابل فراموش کوشش کرتی ہے جو ہمارے ادب اور ہماری زندگی میں پروان چڑھتے ہیں۔

ادب کا رشتہ انسانی زندگی سے منسلک ہے۔ اسے ہم محض تخیل کی فریب کاری یا ذہنی عیاشی کا نام نہیں دے سکتے۔ ادیب کبھی خلا میں پرواز نہیں کرتا بلکہ وہ عام انسانوں کی زندگی سے سوا اکٹھا کرتا ہے۔ جو ادیب ادب کو زندگی سے الگ سمجھتے ہیں وہ اپنے گھناونے ہتیار سے انسانی شعور کو ناپاک کرتے ہیں۔ اور خود فریبی کے خطرناک جال میں پھنس کر اپنی تخلیقی صلاحیتیں تج دیتے ہیں۔ انجمن کی ضرورت کیوں پڑی۔ اور اس کا اثر خاص و عام پر کیا پڑا۔ یہ ایک اہم سوال میرے اس مضمون سے متعلق ہے۔ غدر کے بعد ہندستان کے معاشی، سماجی اور سیاسی حالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں تھیں اسی کے ردعمل پر سرسید، حالی، نذیر احمد، اکبر اور ذکاءاللہ جیسے باکمالوں نے جنم لیا اور کسی نہ کسی روپ میں اپنے عہد کی عکاسی کی۔ جب بھی کوئی نئی تبدیلی ماحول میں اچانک پیدا ہوتی ہے تو انسان تمام مشکلوں اور دشواریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اس کی ترقی میں حایل ہوتی ہیں۔ انجمن کی تخلیق اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ انجمن نے ایک ایسے دور میں جنم لیا جبکہ دنیا کے عوام اپنی آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے۔ ہمارا سیاسی شعور بڑی سرعت کے ساتھ ارتقا کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ افرنگیوں کے خلاف نفرت کا شدید اظہار کیا جا رہا تھا۔ برلا اور ڈالمیا کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ مل مالکوں کی پونجیوں میں گھن لگ رہا تھا اور فاشسزم اپنا گھناونا سر اٹھا رہا تھا۔ اسی لیے ہمیں ضرورت تھی کہ ایک ایسا پلیٹ فارم بنایا جہاں سے جلد سے جلد ملک کو زہریلی ہواؤں سے نجات ملے۔ ان ہی حالات کے بطن سے انجمن ترقی پسند مصنفین نے جنم لیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انجمن نے اپنے ابتدائی دور ہی سے ادب میں کافی ترقی کی۔ ہمارے ادب میں بیش بہا اضافے کیے گئے بہترین نظمیں اور کہانیاں لکھی گئیں۔ لیکن کچھ عرصے سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ادب میں جمود ہے کوئی کہتا ہے کہ ادب شخصیت پرستی کا شکار ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے ادب میں انحطاط ہے۔

ادب میں جمود ہے یا نہیں اس کا جواب گذشتہ برسوں کی تخلیقات کا جایزا لینے کے بعد دیا گیا ہے یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں جو چیزیں ہم نے پیش کی ہیں اور جس رفتار سے ہم آگے کی طرف بڑھتے رہے وہ حالت اب باقی نہیں رہی کیا ہمارے ادیبوں کو گھن لگ گیا ہے؟ وہ اب نہیں لکھ سکتے؟ جہاں تک میرا خیال ہے کچھ ادیب ایسے ہیں جنہوں نے اس قدر لکھنا شروع کر دیا ہے کہ ان کا فن زوال پذیر ہونے لگا۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کو لیجیے۔ وہی کرشن چندر جنہوں نے کالو بھنگی، ان داتا، گرجن کی ایک شام، زندگی کے موڑ پر اور برہمتما جیسی لافانی اور بے مثال کہانیاں ادب کو دیں، آج جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو عورتوں کا عطر، ایرانی پلاؤ

ہیں انتظار کرتا رہوں گا۔ اور امن کی انگلیاں جیسی تیسرے درجے کی کہانیاں ہو جاتی ہیں۔ اگر کبھی بھی انہوں نے سوچا ہوتا یا اس کا احساس ہوتا کہ نئے لکھنے والوں پر اس کا کیا اثر پڑ رہا ہے تو مندرجہ بالا کہانیاں چھپ نہیں لیتیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے ادیبوں کی معاشی حالت ناگفتہ بہ ہے اور وہ پیسے کے لیے ایسی کہانیاں لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن جب ہم نے لکھنا شروع کیا تھا تو کیا ہماری معاشی حالت اچھی تھی؟ کیا ہم حسین گہواروں میں زندگی بسر کرتے تھے یا آسمان سے فرشتے ہمارے لیے ساری چیزیں مہیا کر دیتے تھے۔ اور نہیں تو شاید علاؤالدین کا چراغ ہاتھ لگ گیا تھا! آج جبکہ بہت سارے ادیب و شاعر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے اور روپیہ کمانے لگے پھر بھی ان کے لیے معاشی رونا ناقابل قبول ہے اس کے برعکس ہمیں کچھ ادیب ایسے بھی ملیں گے جن کے ادب میں کبھی زوال نہیں آیا۔ اور وہ بدستور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر رہے ہیں جعفری کی مثال ہم دے سکتے ہیں جعفری کی شاعری نے کبھی تنزل کی راہ اختیار نہیں کی آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جو ترقی پسند فن کار فلمی دنیا سے منسلک ہو گئے تھے اور ہیں ان سے ہماری بہت ساری امیدیں وابستا تھیں ہمیں یقین تھا کہ وہ فلمی دنیا میں ایک انقلاب لائیں گے لیکن وہ خدشکار ہو کر رہ گئے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو تو فلمی دنیا سے فوراً کنارا کشی اختیار کر لینی چاہیے اس وقت متحدہ اور پاکستان کی تمام شاخوں میں اس پر بڑی گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں لیکن اب تک کوئی ایسا واضح اور سلجھا نظریہ نہیں پیش کیا گیا ہے جسے ہم قدر کی نگاہوں سے دیکھتے یہ کہہ دینا جتنا آسان ہے کہ ادب میں جمود ہے یا ادب شخصیت پرستی کا شکار ہے اس کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنا اتنا ہی مشکل ہے ہمیں صرف زبانی خرچ سے کام نہیں کرنا ہے بلکہ عملی طور پر ان تمام گندے عناصر کو اکھاڑ پھینکنا ہے جن سے ہماری ادبی روایات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور ہماری ترقی کی منزلیں محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ طبقہ فائدہ اٹھا رہا ہے جو اپنی ذاتی کمزوریوں کی بنا پر اب تک انجمن سے منسلک نہیں کر سکا۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جو بظاہر ترقی پسندوں کا نقاب اوڑھ کر رجعت پرست عناصر کو شہ دیتے ہیں اور ترقی پسندوں کے خیالات کو گمراہ کن طریقوں سے پیش کرتے ہیں ایسے حضرات کو جو اکی طرح الگ کر دینا چاہیے لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے باشعور اہل قلم اس طرف توجہ نہیں دیتے اور نہ ہی کوئی ایسا اقدام اٹھاتے ہیں جن سے ہماری پوزیشن صاف ہو جائے اور ہم واضح طور پر کام کر سکیں۔

نئے لکھنے والے جس تیزی سے ابھر رہے ہیں یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن ان نئے لکھنے والوں میں بھی دو قسم کے رجحانات ملتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ ادیب و فن کار جو مستقل مزاجی کے ساتھ ادب میں اپنی راہ آپ بنا رہے ہیں۔ قابل تحسین ہیں وہ لوگ جو کھرے اور کھوٹے کی تمیز کر کے ادب کو غلط رجحانات سے پاک رکھتے ہیں۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں سے ہمارا مستقبل بیگانا نہیں۔ کیونکہ وہ غلط بیانی اور سستی شہرت کے طلبگار نہیں ہیں۔ دوسری قسم اس گروہ کا ہے جو یک لخت کرشن چندر سردار جعفری اور اختشام حسین بن جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان کی صلاحیتیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ کالو بھنگی اور نئی دنیا کو سلام جیسی کہانیاں اور نظمیں لکھ پائیں تو ادب میں شخصیت پرستی کے کہہ کر مہنگا مایہ پاکرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ادیب گمراہ کن رستے پر جا رہے ہیں۔ انہیں اگر نہیں روکا گیا تو آگے ہمیں افسوس کرنا ہوگا۔ لیکن یہ غلط رجحانات پر ورش کرنے والے ابھی خال خال ہیں اس میں ان کی غلطیاں تو ضرور ہیں لیکن ان ادبی اور معیاری رسالوں کے سرپرستوں کی بھی جو ایک جانب بڑے ادیبوں کی غیر معیاری چیزوں کو بھی شائع کر دیتے ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ

اپنی طرف سے دو چار جملے اضافہ کر دیتے ہیں یہ ایڈیٹر صاحبان کی دوست نوازی یا خوش اخلاقی نہیں ہے، بلکہ ایک فریب ہے جو اس لیے دیا جا رہا ہے کہ مندرجہ بالا حضرات ادب میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں۔ جب ان کی چیزیں اسی لاپروائی کے ساتھ شایع ہوتی رہتی ہیں تو انہیں اپنی تصنیفوں کا صحیح اندازا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کی افسانہ نگاری ترقی سے تنزل کی طرف گامزن ہے، راہی معصوم رضا نے سہیل کے کسی شمارے میں ایک دل چسپ بات لکھی تھی کہ بمبئی کی ایک بیٹنگ میں عصمت چغتائی نے کرشن چندر کے افسانوں کے متعلق کہا تھا "جب کرشن چندر اپنا افسانہ ہماری انجمن میں پڑھتے ہیں تو ہم ان کی زبان کے طلسم میں پھنس جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی چیزوں پر تنقید نہیں ہوتی۔" عصمت چغتائی کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص یہ کہتا تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتی ہیں۔ آج تنقید کا دور ہے ہمیں وقتی تاثر سے کسی کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے بہ ظاہر تو وہ خلوص سے کہتے ہیں لیکن یہی خلوص جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو ان کے لیے بہتر نہیں ہوتا دوسری بات یہ ہے کہ اگر نئے ادیب نے کوئی چیز اشاعت کی غرض سے بھیجی تو ارشاد ہوتا ہے "بہت ہی ہلکا پھلکا ہے کوئی دوسری چیز روانہ کریں" یہ رویہ نئے ادیبوں کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں اس طرح وہ مایوس ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتیں کھو دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں جب مخمور صاحب بھی کچھ کہتے ہیں تو عجیب لے تکی سی ہانک دیتے ہیں ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ "معیاری رسالوں کی شناخت یہی ہے کہ اس میں اچھے اور بلند پایا لکھنے والے شامل ہوں چاہے ان کے مضامین غیر معیاری کیوں نہ ہوں اور کتنے ہی اچھے اور جاندار مضامین سے بھرپور رسالے اگر ان میں کہنہ مشق ادیب لے رشتہ نہیں ہیں تو وہ معیاری نہیں کہلا سکتے" اب اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے ایسے ہی خیالوں سے ادب کو نقصان پہنچنے کا خدشہ رہتا ہے مجنوں حسین کا مقالہ "جوانی کا" میں شایع ہوا تھا باوجود غیر جانبداری کے جب ندیم کے متعلق کہنا شروع کیا تو ایک اچھا خاصا تاثراتی انداز نمایاں ہو گیا — ہمیں ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے، ان ہی چیزوں نے ہمارے ادب میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔

ہماری اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ہم ادب کو اچھی چیزیں نہیں دے سکتے۔ یہ حقیقت ہے لیکن سب کے لیے نہیں مجھے یقین ہے کہ ادیب غیر حساس نہیں ہوتا ہے، اور جب وہ غیر حساس نہیں ہے تو معمولی چیزوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ غم والم کے دباؤ سے اس کی کمر خم تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن جو چراغ اس کے ذہن میں روشنی ہے اس کی تابناکی میں کمی نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کو محض ایک دیوالے کا خواب نہیں سمجھتا۔ بلکہ ایک طویل اور پر مسرت گھڑی تصور کرتا ہے جس کی آغوش میں وہ حسن و محبت کا گیت گاتا دکھائی دیتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ڈھاکا کی گرچہ تنظیمی حالت اچھی نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کے ممبران بڑے حسن و خوبی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ ایاز، عصمی، فخر الدین قمر خواجہ محمد علی مسعود، کلیم یوسف حسن اور صلاح الدین محمد جو انجمن کے اہم اور سرگرم رکن ہیں انہوں نے بہت سی اچھی کہانیاں نظمیں اور تنقیدی مضمون ادب کو دیے ہیں ایاز، عصمی کا افسانہ کافور کی لو، رد عمل، قمر الدین قمر کی کہانی، خواب سیمر، فٹ پاتھ ادب میں بیش بہا اضافے ہیں۔ خواجہ کا افسانہ ہر شے مسافر ہر چیز راہی ادب میں ایک (SCIENTIFIC) تجربہ پیش کرتا ہے۔ یوسف حسن کا مقالہ شیکسپیر اور جنگ ایک اور اور تنقیدی ادب میں بہترین اضافہ ہے۔ صلاح الدین محمد نے گیتوں کی طرف خاص توجہ دی ہے اور بڑے پیارے گیت لکھے ہیں۔ مسعود کلیم ایک اچھے اور کامیاب غزل گو ہیں۔ لیکن ان کی غزلیں بھی اپنے اندر وہ تیور کی سی ایسا ہم پسندی

لیے ہوئے ہیں ویسے انہوں نے ایک اچھا اور عمدہ ذہن پایا ہے ان سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں ان حالات کے پیش نظر میں یہ کہنے کی جرات کروں گا کہ ادیبوں کی لڑائی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ہمیں جلد سے جلد کوئی فیصلا کر لینا چاہیے کیونکہ آج ہمارا ملک جس سیاسی بحران سے گذر رہا ہے وہ تو ہمارے پیش نظر ہے جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ دنیا کے ہر حصے کو ناگاساکی بنا دیا جائے ایسی صورتوں میں ہم بحث و مباحثے میں الجھ کر ضروری چیزوں کو فراموش کر رہے ہیں اور صرف اُوب میں جمود ہے کا نعرا لگایا جا رہا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہزاروں مہلک ہتیاروں کا تجربا کیا جا رہا ہے اور جب یہ تجربا ہوتا ہے تو صدہا ملاح اپنی زندگی کھو دیتے ہیں۔ ہزاروں عورتوں کا سہاگ لٹ جاتا ہے اور ہم صرف بحث میں الجھے رہتے ہیں۔ آج ہمارا ادب ہمارا کلچر ہماری تہذیب خطرے میں ہے اس کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ جنگ اور امن کے بیچ جو سنگرام ہے وہ تاریکی کا جال پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں!

آخر میں میں تمام ترقی پسند فنکاروں سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس کے حق میں جلد کوئی فیصلا صادر کریں اور اپنے ملک اپنی تہذیب اپنے کلچر کو جنگ کے خوفناک مینگل سے بچا لیں!

ہر با اصول چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اس لیے آپ اپنی زبان کو با اصول بنانے کی کوشش کیجیے۔ جب تک آپ کی زبان بے اصول ہے ڈھنگی رہے گی اس وقت اس کی ترقی ناممکن اور اس کا عام ہونا ایک بے کار سی بات ہے ایک با اصول زبان ہی سائنٹیفک زبان کہلاتی ہے۔

جسم انسانی کا استخوانی ڈھانچا

دوران ارتقا جب مختلف حیوانوں کے جسم نے ایک ہی خلیے کی ساخت سے بڑھتے بڑھتے پیچیدا شکل اختیار کی۔ تو جسم کے گوشت پوست کا سہارا دینے کیلئے کسی ڈھانچے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ ضرورت استخوانی ڈھانچے نے پوری صدف نما جانوروں سیپ وغیرا کی صورت میں یہ ڈھانچا بیرونی ہوتا ہے اور انسان اور دوسرے قدآور حیوانوں کی صورتیں اندرونی

جسم انسانی کے استخوانی ڈھانچے کے اہم اجزا کھوپڑی۔ ریڑھ کی ہڈی اور اس سے ملحقا ہڈیاں ہوتی ہیں۔ کھوپڑی ایک ایسے خول کی مانند ہوتی ہے جو دماغ اور قوت احساس کے بعض اہم اعضا کی حفاظت کرتا ہے انسان کی آنکھیں ہڈیوں کے کٹہروں میں واقع ہوتی ہیں۔ تاکہ انھیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ کم رہے اور ہوئیں ان کے مزید تحفظ کی ضامن ہوتی ہیں۔ اسی طرح کان کے اندرونی حصے بھی کھوپڑی کی ہڈیوں سے متعلق ہونے کے باعث محفوظ ہوتے ہیں۔

ریڑھ کی ہڈی ۳۳ الگ الگ ہڈیوں کی ایک زنجیر کی مانند ہوتی ہے یہ حرام مغز کی حفاظت کرتی ہے۔ کندھوں اور کولھوں کی ہڈیاں اس سے وابستا ہوتی ہیں۔ بازو اور ٹانگیں ترتیب وار ان ہڈیوں سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ سینے کے حصے میں ریڑھ کی ہڈی پسلیاں اور چھاتی کی پلیٹ پھیپھڑوں اور دل کیلئے خول مہیا کرتی ہیں۔ کولھے کی ہڈی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ وہ اوپر کے دھڑ کے بوجھ کو سہارا دے سکتی ہے۔

جسم کے بازوؤں اور ٹانگوں کی ساخت بھی اسی طرح کی ہوتی ہے انکے اوپر کے حصے کی ہڈی ترتیب وار کندھے اور کولھے کی ہڈی سے جڑی ہوئی ہوتی ہے اور دو دو ہڈیاں اس کے نیچے ہوتی ہیں۔ اس کے علاوا کلائی اور ٹخنے کے جوڑوں سے پرے چھوٹی چھوٹی مختلف ہڈیوں کے جڑنے کے سات اور پاؤں بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

انتون چیخوف ——— پروفیسر ولادیمیر پریسیلوف

۱۵ جولائی ۱۹۵۴ء کو عظیم روسی ادیب اور دنیائے ادب کی مشہور اور ممتاز ہستی، انتون پاولووچ چیخوف کے انتقال کو پچاس برس ہو ہے۔

عالمی امن کونسل کے برابر چیخوف کی برسی دنیا کے تمام ملکوں میں بڑے پیمانے پر منائی گئی۔ چیخوف کا نام سویت عوام کو اور کل ترقی پسند انسانیت کو عزیز ہے۔ ان کی تصانیف بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اور دنیا کے تمام حصوں میں مل سکتی ہیں۔

پچھلی صدی کی آٹھویں دہائیوں میں رجعت پسندی کا دور دورا تھا اسی زمانے میں چیخوف نے لکھنا شروع کیا تھا اور اسی زمانے میں اخبارات اور رسایل پر اتنی سختی ہوئی تھی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ زار شاہی حکومت "اخبارات اور رسایل پر" تشدد سماجی فکر پر مکمل "امتناع" عاید کرنا عملی طور پر اپنا سب سے بڑا کام تصور کرنے لگی تھی۔ صرف گھٹیا قسم کے مزاحیہ رسالے کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل پڑے تھے۔ اور وہی پھل پھول بھی رہے تھے۔ لیکن تاریخ کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ روسی پریس کے انہیں عامیانہ پرچوں میں فرسودہ جاگیردارانہ بے لگام اور "پیٹی بورژوا" ردس کے دشمن نے جنم لیا ——— ایک ایسے دشمن نے جس نے اس پوری طرز زندگی کو بے نقاب کر دیا۔ جو نئی نوع انسان کی تذلیل کرتی تھی۔ یہ دشمن ایک نیا اور جادو بیان روسی ادیب تھا جس نے اپنی اصل شخصیت ابھی "انتوشا چیخونتے" کے فرضی نام سے چھپا رکھی تھی اور جسے شاید خود بھی اپنی جدت کی اہمیت کا پوری طرح احساس نہ تھا۔ انہوں نے نچلے درمیانی طبقے کے دانشوروں کو جن کا خصوصی مراعات یافتہ طبقوں سے تعلق نہ تھا۔ دفتروں کے معمولی کلرکوں کو کسانوں کو ——— مختصر یہ کہ "چھوٹے" آدمی کو اپنے افسانوں کا ہیرو منتخب کیا۔

چیخوف کے ابتدائی دور کی تحریر کا جمہوریت پسند رجحان ان کے طنزیہ افسانوں میں خاص طور پر نمایاں ہے جن میں سب سے اہم مقام "سارجنٹ پریشی بے ٹیف" کو حاصل ہے یہ افسانہ سب سے پہلے ایک اخبار میں "روز روز زندگی کا ایک منظر" کے ضمنی عنوان کے تحت شایع ہوا تھا۔ "جاہل لوگوں" پر حکم صادر کرنے کا خبط رکھنے والے ریٹائرڈ فوجی کا مزاحیہ انداز میں قلمی چربا پیش کرنے والے مروجہ افسانوں سے یہ افسانہ اصل میں بہت ملتا جلتا تھا۔ لیکن اسی "روز روز کی زندگی کے منظر" سے ایک مضحک کردار ابھرا جو گوگول کے "انسپکٹر جنرل" اور "مردہ روحیں" کے کرداروں مثلاً نیاکووچ، سوباکووچ، نوزدریف، اور سکوزنک دموخانوسکی اور سالٹی کوف شچیدرین کی تصانیف کے کرداروں مثلاً اوگرین بوچیٹیف اور جودا س گولوولیف کی صفوں میں شامل ہو گیا۔ "پریشی بے ٹیوویت" بے شرمی اور حماقت کے اطمینان ذاتی کی جاہلانہ خدستائی اور خداعتمادی کی وحشیانہ گستاخی کی۔ عوام سے اجنبیت کی نفرت کی۔ دوسروں کے معاملات میں بھونڈی اور بیہودہ دخل اندازی کی۔ زندگی کے ہر شان کو کچلنے کی کوشش کرنے کی علامت بن گئی ہے۔ جس دور میں یہ افسانہ لکھا گیا تھا اس دور میں پریشی بے ٹیف رجعت پسند قوتوں اور خود ملک کی زندگی کو

ختم کر دینے کے لیے ان کی کوششوں کی ایک علامت بن گیا تھا صرف چند صفحوں کے ایک فسانے میں طنز نگاری کا اس قدر شاندار مرقع پیش کرنے میں نوجوان ادیب فن کاری کی کتنی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا! وہ فن کاری جس کی محرک قوت آزادی سے محبت اور بے لگامی سے نفرت تھی۔

شدید رجعت پسندی کے تاریک دور میں چیخوف نے روسی حریت پسند طنز نگاری کی شاندار روایات دوبارہ زندہ کیں۔ گھٹیا قسم کے مزاحیہ رسالوں کے صفحات پر انہوں نے سماجی رواجوں کے بھونڈے پن پر بھرپور وار کرنے کی تدبیر نکال لی۔ "سارجنٹ پرشیبے یئف" کی اہمیت کسی قدر موزوں شبدوں میں بیان کرتے ہوئے زار شاہی محققین نے اس کو "سماجی رواجوں کا بھونڈا پن" کہا تھا۔

چیخوف روس میں تیز رفتار سرمایہ دارانہ ارتقا کے ساتھ ساتھ پنپتا ہونے والے نچلے درمیانی طبقے اور جمہوریت پسند روسی عقلمندوں کے بڑے ادیب بن گئے۔ ان کی تخلیقات میں اس عقلمند طبقے کے روشن پہلوؤں اور بعض تاریک پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے یعنی اس طبقے کی جمہوریت پسندی اور طفیلیت سے بیزاری زمین دارانہ سماج امرا اور بورژوازی (سرمایہ دار طبقے) کی خدمت کرنے میں اس کی بے دلی اور ناخشی امرا اور سرمایہ دار طبقے کی اعتدال پسندی سے بے اعتمادی اور اس کے ساتھ ساتھ انقلابی رستے سے اس کا گریز اور اس لیے نظریت پسندانہ اور رومانیت پرستانہ طرز نگارش اور "پیٹی بورژوا" عقلمند طبقے کی کرداری خصوصیت یعنی اعتدال پسندانہ تعصب کا ناقابل گریز اثر۔

ان کی ادبی پیداوار کی فنی پختگی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے محبوب ہیرو، عام انسان محنت کش کی تصویر کتنی اور بھی زیادہ بہتر اور مکمل ہوتی گئی جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی اور اپنا کام وقف کر دیا تھا اور جس کی جانب انہیں آدم حیات پر خلوص ہمدردی کا بڑا احساس رہا۔

ضبط اور بے حسی کے اوپری قول کی سطح کے نیچے چیخوف کی تحریر کی ہر سطر اور ہر شبد میں محنت کش لوگوں سے پرجوش محبت اور ان کے دشمنوں سے نفرت عامیانہ پن معمولی حرکتوں ناشائستگی اور تنگ دلی سے نفرت دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

معمولی سی چیز میں حسن تلاش کر لینے کی صلاحیت اور معمولی لوگوں کا سادا اور روز روز کا حسن معلوم کر لینے کی اہلیت چیخوف کی جمالیات کی سب سے بڑی خوبیوں میں سے ہے۔

یہ جمالیاتی اصول کہ معمولی چیز میں سادگی میں روز روز کی زندگی میں حسن چھپا رہتا ہے عام لوگوں کی یعنی اصلی روس کی روحانی آسودگی شوق اور خداداد صلاحیتوں میں چیخوف کے یقین کامل سے قریبی طور پر وابستہ تھا۔

"ٹڈی" نام کے افسانے میں (۱۸۹۲ء) ڈاکٹر دیموف کو یاد رکھیے۔ دیموف روحانی اعتبار سے آسودہ اور طاقتور آدمی ہے جس کی رحمدلی بزدلانہ شرمیلے پن موقع شناسی اور سادگی سے اصل میں اس کی قوت ارادی اور جفاکشی اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کام کرنے میں اس کی مستقل مزاجی سائنس سے اس کی عقیدت اور بھی زیادہ واضح طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر دیموف کی بیوی اولگا ایوانوونا کے گرد منڈلانے والی ممتاز شخصیتوں سے اگر خدا اس کا مقابلہ کیا جائے تو وہ معمولی اور حقیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔ دیموف ڈفتھیریا کے مرض میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے یہ مرض اس کو ایک بچے کے علاج کرتے ہوئے لگ جاتا ہے لیکن دیموف کی وقت سے پہلے موت کی دفتھیریا نہیں ہے یہ تو محض اولگا ایوانوونا کا مدعا ہے۔ اولگا کو تو پتا ہی نہیں چلا کہ جس عظیم شخصیت کی اسے تلاش تھی وہ تا حیات اس کے پہلو بہ پہلو رہی۔ جو بات خاص تھی اسی کے سمجھنے سے وہ مجبور رہی۔ وہ نہ تو دیموف کے حسن کو سمجھ سکی اور نہ اس کی قوت کو۔ وہ معمولی چیز میں غیر معمولی چیز دیکھنے کی نا اہل تھی۔

چیخوف کی تمام ادبی کاوشیں پر شوق، پر عزم اور مصیبت بھری جستجو پر مشتمل ہیں۔ دنیا کے متعلق ایک ایسے واضح اور جامع نقطہ نظر کی جستجو جو خارجی حقیقت کی سچی اور صحیح معلومات پر مبنی ہو۔ اور تاریخ کے نئے دور میں کلاسکی سوال ——— کیا کیا جائے ———؟ کا جواب فراہم کر سکے ———! ایک ایسے ہیرو کی جستجو جو گفتار کے بعد عمل کا ذہنی بننے اور ملک کو انقلابی رہنمائی میں پرستش بیلیویت کی خوفناک حقیقت بدل ڈالنے کے رستے پر لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسی نے انہیں ۱۸۹۰ء میں سکھالین کا دورہ کرنے کی ترغیب دی۔ یہی وہ خوفناک جزیرہ تھا، قید یا مشقت اور جلاوطنی کا یہی وہ مقام تھا جہاں زار شاہی حکومت نے انسان کی تذلیل اور ایذا رسانی کا ہر ممکن وسیلہ فراہم کر دیا تھا۔ سکھالین کے دورے کے بعد چیخوف نے سیاسی زندگی میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اس زمانے کے روس کی زندگی میں ناقابل برداشت پابندیوں اور قید خانے جیسی گھٹی ہوئی فضا کا انہیں جو احساس تھا اس کی شدت اس دورے کے بعد اور بھی بڑھ گئی۔ ان کی نظر کے سامنے وہ چار دیواری کے اندر کی اس زندگی کے روپ میں آئی جس میں پہرے دار اور وارڈر ہوتے ہیں۔ جس میں سلاخوں والی کھڑکیاں اور زنجیریں ہوتی ہیں۔

مشہور افسانہ "وارڈ نمبر ۶" نے اسی طرح جنم لیا تھا۔ ایک چھوٹے سے دور افتادہ قصبے میں ایک ہسپتال ہے جو پچھلے بیس برس سے آندری راگین نامی ایک ڈاکٹر کی نگرانی میں ہے۔ یہ ہسپتال انتہائی خراب اور بری حالت میں ہے جہاں گندگی ہے مریضوں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اور چوری دھڑلے سے ہوتی ہے۔ مدتیں گذریں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ڈاکٹر راگین بڑی محنت سے کام کیا کرتا تھا اور حالات سدا رہنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا لیکن جلدی ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ یہ کوشش بے کار ہے ہر کس و ناکس کی بے اعتنائی سے دوچار ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں ——— بہرحال پتھر کی دیوار کو ٹکریں مار مار کے توڑا نہیں جا سکتا اور اس لیے اسے اپنے فرائض کی جانب محض رسمی رویہ اختیار کر لینے کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ایک طرف تو راگین اسی سوچ بچار میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور زندگی کی حقیقتوں سے دن پر دن زیادہ دور ہوتا چلا جاتا ہے دوسری طرف نکیتا نام کا ایک ظالم اور وحشی پہرے دار جو پاگلوں کے لیے مخصوص وارڈ نمبر ۶ کے مریضوں کو مار پیٹا کرتا ہے ہسپتال پر پوری طرح اپنا اقتدار جما لیتا ہے۔

ایک مرتبہ راگین اتفاق سے وارڈ نمبر ۶ میں جا نکلتا ہے اور اسے ایک مریض شکل و صورت سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے اس سے باتیں کرنے کے بعد اسے یہ معلوم کر کے مسرت ہوتی ہے کہ وہ بڑا تیز فہم اور ذہین ہے وہ اس آدمی کی شخصیت میں بڑی کشش محسوس کرتا ہے جو نہایت ہوش مند اور صاحب فکر ہے اور جسے ناقابل برداشت یہ تین جھیلنا پڑ رہی ہیں۔ گروموف کے نظریے اور خیالات راگین کے نظریوں کے بالکل برعکس ہیں۔ گروموف عمل کی ضرورت، آزادی کے لیے جد و جہد کرنے کی ضرورت کے متعلق بحث کرتا ہے خدا اس کی ہستی استبداد، غلامی اور بے لگامی سے نفرت کرتی ہے۔

مریض سے ڈاکٹر کی بار بار ملاقات اور گفتگو اور اس کے منکی پن سے جو اس کی تنہائی اور زندگی سے مکمل طور پر الگ تھلگ ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ہسپتال کے دوسرے لوگوں کو شبہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ وہ خدا بگل ہو گیا ہے۔ مددگار ڈاکٹر ایک خدغرض شخص ہے اور راگین کے عہدے پر پہنچنا چاہتا ہے وہ نہایت چالاکی اور ہشیاری سے اپنے فائدے کی صورت نکال لیتا ہے راگین کو پاگل قرار دے کر وارڈ نمبر ۶ میں بند کر دیا جاتا ہے۔

وارڈ میں پہنچکر حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد راگین کو برائی کا مقابلہ نہ کرنے کے متعلق اپنا نظریہ یا دنگ نہیں آتا۔ وہ اور گروموف تشدد اور زمانی کارروائیوں کے خلاف باقاعدہ اعلان بغاوت بلند کرتے ہیں۔ یکجہتی دونوں کو پیلتا ہے۔ اور راگین اس کی تاب نہ لاکر دم توڑ دیتا ہے۔

اس افسانے میں پورے روس نے رجعت پسندی کی اندھی قوت کا ایک علامتی نقشہ دیکھا۔ اپنے آپ کو "وارڈ نمبر ۶" میں قید دیکھنا یہ اف ناجد وجہد کی پکار تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس افسانے نے راگین جیسے بہت سے لوگوں کو اپنے ضمیر کی صاف آواز ہتھوڑے کی شدید ضرب کی طرح سنائی دی۔ ضمیر نے چیخوف کی شخصیت میں روس کے ضمیر نے ان سے کہا "زار شاہی حکومت کے تمام جرموں کی ذمہ داری راگین صاحبان آپ پر آپ حضرات پر عاید ہوتی ہے جو خود کو بہت شریف موقع شناس، بہت نرم دل بہت ایماندار بہت اعتدال پسند سمجھتے ہیں کیونکہ آپ اس سے ٹکر نہیں لیتے بلکہ مروت اور اخلاق کے ایک فلسفے سے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے لیتے ہیں۔"

چیخوف کے ہتھوڑے کی ضربیں صرف امرا کے طبقے پر ہی نہیں پڑیں عقلمند طبقے میں خدا پنی دنیا میں مگن، جینے کا رویا اختیار کرنے والے ہر وضع اور ہر طرز کے لوگوں پر جد وجہد میں حصا لینے سے انکار کرنے والوں پر "وارڈ نمبر ۶" میں اس ہتھوڑے کی کاری ضربیں لگائی گئی ہیں۔ اور کسی فلسفیانہ بہانے خصوصاً "برائی کا تشدد سے مقابلہ نہ کرنے" کے متعلق طالسطائی کی رجعت پسندانہ تعلیم کے بہانے کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

چیخوف کو وہ راستے نہ تو معلوم تھے اور نہ انہوں نے دیکھے تھے جن پر چل کر ان کا دیس آزادی کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن ان کی قوت تنقید نے انہیں اس سماجی ہلچل کو محسوس کرنے اور اپنے افسانوں میں اس کی روز بروز وضاحت اور گہرائی کے ساتھ عکاسی کرنے میں مدد دی۔ جو پچھلی صدی کے آخری برسوں میں ملک میں شروع ہو چکی تھی اور جس کے اثر سے ۱۹۱۷ء میں پہلا روسی انقلاب ہوا۔

چیخوف کی تحریر میں ایک نئی خصوصیت اور گہرائی پیدا ہو گئی۔ اس میں آنے والی مسرت اور اپنے ملک کی زندگی میں زبردست تبدیلی آنے کی آگہی کا احساس جھلکنے لگا۔ اگر آپ کسی ساحلی شہر میں رہتے ہوں تو سمندر کے قرب کا احساس ہر وقت موجود ہوتا ہے چاہے وہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو اور اسی طرح چیخوف کے وہ افسانے پڑھنے کے بعد جو پچھلی صدی کے آخری برسوں میں اور موجودہ صدی کے شروع میں لکھے گئے تھے افسردگی کے پس پردہ زندگی کے لیے پناہ تنفس کا ہلکا سا احساس ہوتا ہے گہرائی میں لب و لہجے میں خدا چیخوف کی شاعری کے نغمے میں "ہمیں حسن اور جوانی اور بھلی بھولی تو لوں کی جبت" کا کہیں نہ کہیں احساس ہوتا ہے۔ ہمیں "شاندار سخت جان وطن" کی ایک تصویر نظر آتی ہے (گھاس کے میدان)

ان کے افسانے "تین سال" (۱۸۹۵ء) کا ایک کردار نوجوان دوا فروش یاریتسیف میلان طبیعت کے اعتبار سے شاعر اور آرٹسٹ ہے۔ مصنف کے دلی جذبات کا اظہار کرتا ہے جو ہمیں ان کی بعد کی تحریروں میں دن پر دن زیادہ موثر انداز میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

"روسی زندگی کتنی شاندار اور رنگ رنگ کی ہے۔ ہاں کس قدر بھرپور! جانتے ہو مجھے دن پر دن زیادہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ہمیں عظیم ترین فتح ہونے والی ہے اور میں اسے دیکھنے کے لیے خدا سے میں حصا لینے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

پچھلی صدی کے آخری چند برسوں میں چیخوف نے فن ڈراما نگاری میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔

۱۸۹۵ء میں انتون چیخوف نے "سمندری بگلا" نام کا ڈراما لکھنا شروع کیا۔ ۱۸۹۶ء میں یہ ڈراما سینٹ پیٹرس برگ کے الیگزاندرنسکی تھیٹر نے اسٹیج کیا۔ اور دو سال بعد ماسکو

آرٹ تھیٹر نے اس نے چیخوف کی تصانیف کا انوکھا پن اور زیادہ واضح طور پر ظاہر کر دیا۔ اور روس کے ممتاز ڈراما نگار کی حیثیت سے ان کی دھاک بٹھا دی۔

ڈراما "سمندری بگلا" میں فن کار کے مشن کے متعلق چیخوف نے کئی برس کے غور و فکر کا نچوڑ پیش کیا ہے اس کا موضوع ہے آرٹ اور بہادری کے کارنامے۔ فن کار انا جیت صرف انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جن میں بہادری کے کارہائے نمایاں انجام دینے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔

چیخوف کے ایک اور کلاسیکی ڈرامے "چچا وانیا" کا موضوع چھوٹے لوگ اور ان کی خاموش مصیبتیں اور ایثار ہے۔

ڈراما "تین بہنیں" میں ہمیں وہی موضوع ملتا ہے۔ جو کھیت کے میدان" اور "چچا وانیا" کا ہے یعنی حسن کی پامالی اور ویرانی کا موضوع۔ ان حیرت انگیز عورتوں میں ان تین بہنوں میں کس قدر روحانی حسن ہے لوث محنت کے لیے کتنی ستودی زندگی اور عوام کے تمام تر روشن پہلوؤں سے کتنی اثر پذیری کتنی ہمدردی، مہربانی اور ذہانت موجود ہے پاک اور خوب صورت زندگی کے لیے وہ کس قدر کوشاں اور کتنی مسرور ہیں! لیکن ان خوبیوں کا کہیں استعمال نہیں ہوتا۔ تینوں بہنیں عامیانہ بھونڈی اور بدصورت حقیقت کے گھیرے میں "بیانشاعری کی محنت لے عقلی محنت"، انگلس، ایرینا اور اولگا! حصول مسرت کی ان کی تمنائیں کملا کر رہ جاتی ہیں۔ زندگی خدوخال چھوس کی طرح ان کا حسن کملایا سا کر دیتی ہے۔

لیکن اس ڈرامے کا ایک کردار پیشین گوئی کرتے ہوئے کہتا ہے "وقت آ گیا ہے۔ ایک زبردست اور تباہ کرنے والا طوفان آنے کے آثار ہیں۔ وہ ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے قریب پہنچ بھی چکا ہے اور جلد ہی ہمارے سماج کی کاہلی بے پروائی محنت سے تعصب بدترین اکتاہٹ اڑا کر لے جائے گا۔"

"چیری کا باغ" میں (۱۹۰۳ء) پرانے روس کو جو نئے کے عالم میں ہے جس کا جلد ہی خاتمہ ہونے والا ہے۔ نئے روس سے مستقبل کے روس سے رخصت ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی سال لکھے گئے "اف نامنگیئر" کی طرح "چیری کا باغ" میں بھی ہمیں چیخوف کا مانوس موضوع یعنی مسرت کی آمد کا احساس غالب نظر آتا ہے۔

"منگیئر اور" چیری کا باغ" دونوں کے کرداروں کو اس زمانے کی قربت کا احساس ہے جبکہ دھوئیں میں گھٹے ہوئے "صوبائی" قصبوں کا ملک میں وجود نہ ہوگا۔" جبکہ ہر چیز... اس طرح بدل جائے گی جیسے کہ کسی نے جادو کر دیا ہو۔ تب پھر یہاں بڑے بڑے عالیشان مکانات، حیرت انگیز باغات عجیب و غریب فوارے شاندار لوگ ہوں گے۔"

اف نے کے آخری حصے میں بادبہاری کی کیسی تازگی ہے، طویل غیر حاضری کے بعد اف لے کی ہیروئن نادیا چند روز کے لیے اپنے قصبے میں دوبارا آتی ہے۔ وہ باغ میں ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ سڑکوں پر گھومتی پھری۔ مکانوں اور ان کے بھورے احاطوں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ قصبے کی ہر شے "عرصا ہوا پرانی اور فرسودا ہو چکی تھی۔ اور کسی چیز کی منتظر تھی۔ کسی پرشباب شے کسی تازا شے کے اختتام یا آغاز کی منتظر۔ کاش وہ جلد آ جائے۔ وہ نئی اور تازا زندگی جو اپنی منزل کی موہ موڑے بغیر جرات کے ساتھ دیکھا جا سکے۔ جب علوم ہو سکے کہ ہم بھی ہیں۔ جب ہم شاد و آزاد ہو سکیں۔

اپنے ہیروؤں کے ساتھ چیخوف کو بھی احساس تھا کہ "ہر شے عرصا ہوا پرانی اور فرسودا ہو چکی تھی۔۔۔ کسی پرشباب شے کی کسی تازا شے کی" اور وہ پرشباب مسرت کے ساتھ ماضی کو رخصت کرتے ہیں" الوداع پرانی زندگی" آنیا کی پرشباب آواز "چیری کا باغ" کے آخری منظر میں گونجتی ہے۔ آنیا اور نادیا کے کردار ملک کے نوجوانوں کے مسحور کرنے والے کردار ہیں مگل مل جاتے ہیں خوش آمدید نئی زندگی "چیری کا باغ" میں یہ مکالمہ چیخوف کے آخری شیدتھے اپنے دیس کے

کے نئے دن کو۔ اس کی آزادی، فتح اور مسرت کے دن کو۔ پر مسرت پیغام مبارک باد۔

گندگی اور غلاظت دور کرنے والا طوفان آ پہنچا۔ چیخوف کا وطن ایک شاندار باغ بن گیا۔ سچائی اور حسن کے قوانین اس کی زندگی کے قوانین بن گئے۔

"عوام کا احترام کر کے کتنی مسرت ہوتی ہے!" چیخوف نے اپنی نوٹ بک میں لکھا ہے۔

"یہ مسرت ہمیں مل گئی ہے سوویت عوام نے جو کچھ تعمیر کیا اور جو کچھ تعمیر کر رہے ہیں اس کا جوش و خروش انہیں انسان کے لیے پناہ و احترام کرنے سے محبت اور ان پر اعتماد کی سادا اور عقل مندی سچائی میں آزاد تخلیقی کام کی سچائی میں مدغم ہو گیا ہے۔"

"سوویت حقیقت، کروڑوں ایماندار محنت کش عوام کی کروڑوں عظیم چھوٹے لوگوں کی مسرت کی خدمت انجام دیتی ہے۔ اس نے معمولی آدمی کو بے نظیر بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ اسے ایک عظیم نظریے کا جوش و خروش بخشا ہے۔ اس کی زندگی قابناک مقاصد سے بھر پور کر دی ہے اور اسے بہادری کے کارہائے نمایاں انجام دینے کی راہ دکھائی ہے اور اب بھی دکھا رہی ہے۔ کام اور فرصت کے ہر لمحے کو عالا اور نیک معنویت عطا کی ہے۔ معمولی آدمی پوری سوویت زندگی کی بنیاد ہے۔ وہی شاندار شہر تعمیر کرتا ہے۔ محل کھڑا کرتا ہے۔ حیرت آمیز اور بہادرانہ تخلیقی کام انجام دیتا ہے۔ اور تمام نیک نیت لوگوں کے ساتھ مل کر عالمی امن کی علمبرداری کر رہا ہے اور اسے انسانیت کے دشمنوں کے حملے سے مسرت اور رشادمانی اور حسن کے دشمنوں کے حملے بچا رہا ہے۔"

چیخوف اس دھرتی پر مسرت حسن اور انصاف کا بول بالا ہونے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان کے چاروں طرف کتنے خوب صورت درخت کتنی حسین زندگی ہونی چاہیے!

ان شبدوں میں انہوں نے "تین بہنوں" کے ایک کردار کی زبانی اپنی اس آرزو کا اپنے خواب کا اظہار کیا ہے وہ تباہی، تشدد اور بے لگامی کی بدروح سے نفرت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ چیخوف آج فطری طور پر "اپنی فطری سادگی کے ساتھ" ہمارے دور کی زبردست ناقابل تسخیر تحریک میں ساری دنیا میں امن اور مسرت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں۔

غزل

سید حسین محشر بدایونی

جذبہ شوق کہاں کھینچ کے لایا مجھکو
کہ نہیں دل میں اب احساس تمنا مجھکو

غمزۂ حسن بھی خاموش کہیں رہتا ہے
تم نے آخر نہ بھری بزم میں چھیڑا مجھکو

کیا خبر کس کی نظر نے کیا بیخود مجھکو
ان کو دھوکا دم دیدار ہوا یا مجھکو

جان دیکر یہیں ملتی ہے حیات جاوید
ہے در یار پہ مرنے کی تمنا مجھکو

آتش گل نے جلایا تو خزاں نے لوٹا
آشیاں اپنا کبھی راس نہ آیا مجھکو

اے مری ہستی امید مٹانے والے
ذرے ذرے میں نظر آتی ہے دنیا مجھکو

گھر تھا صحرا میں کبھی وحشت دل سے محشر
اب تو گھر ہی میں نظر آتا ہے صحرا مجھکو

ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہندستانی طلبا

جی۔ ڈار لوٹیلر

جنگ سے پہلے ایڈنبرا یونیورسٹی ہندستانی اور سیلونی طلبا کے لیے بہت زیادہ کشش رکھتی تھی۔ ۱۹۳۵-۳۶ء کے درسی سال میں ہندستان اور سیلون کے تقریباً ۲۵ طلبا اس یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۴۵-۴۶ء میں یہ تعداد گر کر سات رہ گئی۔ اب پھر اس یونیورسٹی کی مقبولیت کو بڑی تیزی سے بحال کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۲-۵۳ء کے درسی سال میں ہندستانی اور سیلونی طلبا کی تعداد ۱۷۹ ہو گئی تھی۔ اس سال کے اعداد و شمار ابھی تک مکمل نہیں ہوئے مگر آثار سے ہے کہ یہ تعداد ۲۰۰ تک پہنچ جائے گی۔

ایڈنبرا یونیورسٹی کے طب کے شعبے کی شہرت بہت ہی زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ ہر سال تقریباً چھ ہزار طلبا یہاں طب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ باقی پانچ شعبوں مثلاً آرٹس، سائنس، قانون، ادبیات اور موسیقی میں سے کم سے کم تین شعبوں میں بھی طلبا کی تعداد کافی ہے جو طلبا ہندستان، پاکستان اور سیلون سے آتے ہیں ان میں زیادہ تعداد طب کے طلبا کی ہوتی ہے اور چونکہ آج کل ان ممالک میں صنعتوں کی ترقی پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ اس لیے سائنس کے طلبا کی بھی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

۱۹۵۲-۵۳ء کے درسی سال میں ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہندستانی طلبا کی تعداد ۱۱۸ تھی جس میں ۷۹ طب، ۲۵ سائنس اور باقی آرٹس اور قانون کے طلبا تھے۔ ۲۸ پاکستانی طلبا میں سے ۱۰ طب، ۸ سائنس اور باقی آرٹس کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سیلونی طلبا کی تعداد ۲۳ تھی اور ان سب نے طلبا کا مضمون لے رکھا تھا۔ اس سال سائنس کے طلبا کی تعداد بڑھ رہی ہے ایشیائی ممالک کی بہت سی لڑکیاں بھی اب اس یونیورسٹی میں داخل ہو رہی ہیں۔ اس سال ہندستان سے ۳۰ اور سیلون سے پانچ لڑکیاں آئی ہیں پاکستان کی کوئی لڑکی ابھی تک اس یونیورسٹی میں داخل نہیں ہوئی۔

مانگ بڑھ جانے سے یونیورسٹی میں جگہ ملنی مشکل ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی حکام نے راشننگ اسکیم جاری کر دی ہے۔ سب سے پہلے تو اسکاٹ لینڈ کے طلبا داخل کیے جاتے ہیں اور ان کے بعد سمندر پار کے طلبا کا نمبر آتا ہے۔ سمندر پار کے طلبا میں سے ان طلبا کو ترجیح دی جاتی ہے جو پسماندہ ممالک سے آتے ہیں۔ اس اسکیم کی وضاحت کرتے ہوئے یونیورسٹی کے اسسٹنٹ رجسٹرار نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی ایسے غیر ملکی طلبا کو داخل نہیں کرنا چاہتی جن کے اپنے ممالک میں ایڈنبرا یونیورسٹی کے برابر تعلیمی سہولتیں موجود ہیں۔ یونیورسٹی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ ان تمام طلبا کو جو یہاں پڑھنا چاہتے ہیں داخل کرلے۔ اگر وہ ایسا کرے تو طلبا کی کل تعداد تین گنا ہو سکتی ہے۔ صرف ان طلبا کو سب سے پہلے داخل کیا جاتا ہے جنہیں اپنے ملک میں عالا تعلیم کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بعض جگہیں خالی رہ جاتی ہیں تو انہیں ایک ویٹنگ لسٹ میں سے پر کر لیا جاتا ہے۔

سمندر پار کے طلبا کا ذکر کرتے ہوئے اسسٹنٹ رجسٹرار نے یہ بھی بتایا کہ میں ہندستانی، پاکستانی اور سیلونی طلبا کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ان میں دوسرے کے مقابلے میں دوستی کا جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے اندر اور باہر مجھے ان کے ساتھ کافی میل جول رکھنا پڑتا ہے۔ ایڈنبرا یونیورسٹی کوئی سکونتی یونیورسٹی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

بیشتر طلبا کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ دو دو تین تین اور بعض اوقات زیادہ طلبا مل کر ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ ہندستانی طلبا کا اپنا ایک کلب ہے۔ جہاں وہ کلاسوں کے درمیان یا شام کو اپنا خالی وقت گذارتے ہیں۔ ایڈنبرا میں ایک رستوران کا مالک پاکستانی باشندا ہے جو یہاں کئی سالوں سے ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ پاکستانی طلبا کی رضاکارانا طور پر دیکھ بھال کرتا ہے۔ سیلونی طلبا ہندستانی و پاکستانی طلبا کے ساتھ مل کر اپنا فالتو وقت گذارتے ہیں۔

ایڈنبرا یونیورسٹی کے طلبا بہت خوش قسمت ہیں کہ انہیں سر ایڈورڈ ڈاپلٹن جیسا پرنسپل و وائس چانسلر ملا ہے۔ سر ایڈورڈ ایک ممتاز سائنس داں ہیں۔ وہ طلبا سے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ تم یہاں پرانا اور استعمال کیا ہوا علم حاصل کرنے نہیں آئے ہو۔ خدکام کرنا چاہیے اور نئی نئی باتیں معلوم کرنی چاہئیں۔

ترنمات

چلو یوں ہی سہی تم سے رہے ہم سرگراں اکثر
مگر تم جو رہے بدظن نصیب دشمناں اکثر
محبت کیں ہوا کرتی ہیں یہ تبدیلیاں اکثر
ہوے وہ مہرباں اکثر رہے ہم بدگماں اکثر
قیامت ہے کہ بعد فصل گل دیکھے خزاں اکثر
وہ دل جو حسن والوں کا رہا ہو مہماں اکثر
دم رحلت سرہانے پہ چرچا ہے حسینوں میں
یہ کس کا نام لیتا ہے مریض ناتواں اکثر
تو کیا میں تھا نہیں سنتے تم جو زینت بزم دشمن کی
رہا جھگڑا عدو سے کس کا شب کے درمیاں اکثر
بڑا ظالم ہے تو لیکن زمیں پر ایسے ایسے ہیں
سکھائیں جو تجھے طرز ستم اے آسماں اکثر
یہ فیض حضرت اقبال حمید اب تو خدا رکھے
سمجھتے ہیں مجھے اہل سخن اہل زباں اکثر

حمید رضوی
(ملیح آبادی)

انسانی روح کے انجنیر

سویت ادیبوں کی یونین میں تین ہزار سے زیادا ادیب شامل ہیں جو سویت یونین کی تمام قوموں میں سے آئے ہوے ہیں۔

یہ یونین ایک با اثر عوامی تنظیم ہے۔ سویت ادیبوں کو جے۔ وی استالن نے "انسانی روح کے انجنیر" کہا تھا اور سویت باشندے اپنے ادیبوں کی بات بڑے شوق سے سنتے ہیں سویت ادیب ان کی زندگی اور سویت سماج کی زندگی کی حقیقت افروز عکاسی کرتے ہیں۔

سویت ادیب اپنی تصنیفات میں سویت عوام کی عالا اخلاقی خصوصیات مزید خوش حالی کے لیے ان کی کوششوں اور اپنی مادر وطن کی قوت کے لیے ان کے کارناموں، قوموں میں امن اور دوستی کے لیے اور ساری دنیا کے عوام کی مسرت کے لیے ان کی جد وجہد کی تصویر پیش کرتے ہیں اس طرح سے سویت ادیب اپنے تخلیقی فن کے ذریعے عوام کو جدید دور کے سب سے زیادا ترقی پسند نظریات کی اسپرٹ میں۔ کمیونزم کی اسپرٹ میں تعلیم دینے میں مدد دیتے ہیں سویت ادیب ملک کی امن کی تحریک میں عملی حصا لیتے ہیں۔ اور سویت یونین کے مشہور شاعر نکولائی تھیخونوف سویت امن کمیٹی کے صدر ہیں اشتراکی انقلاب نے بہت سی قوموں کے قومی ادب کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ ادیگی ایک چھوٹی سی قوم ہے جو نوے ہزار سے زیادا افراد پر مشتمل نہیں ہے۔

کیا دوسرے سیاروں پر بھی زندگی موجود ہے

ف۔ یوگنیف

کیا دوسرے سیاروں پر بھی زندگی موجود ہے؟ یہ سوال عرصہ دراز سے سائنس دانوں کو پریشان کر رہا ہے۔ آج سے تقریباً چار سو سال پہلے گیوردانو برونو نے بتایا تھا کہ لامحدود کائنات میں لاتعداد آباد دنیائیں موجود ہیں۔ لیکن یہ ایک دانش مندانہ قیاس آرائی تھی اور رومی کلیسا کی مذہبی عدالت کے حکم سے ان جرات آزما نظریوں کی پاداش میں برونو کو کھمبے سے باندھ کر زندا جلا دیا گیا تھا۔ اس زمانے کا قادر مطلق کلیسا مذہب کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا پورے انسان اور جانور صرف زمین پر ہی پیدا کیے ہیں جو کائنات کے مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے سیاروں پر زندگی کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے نظریاتی دلایل سب سے پہلے انیگلز نے پیش کیے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ زندگی مادے کی حرکت کی ایک شکل ہے اس لیے جہاں کہیں بھی حالات موافق ہوں وہاں تامیاتی قدرت سے اس کو وجود میں آنا چاہیے لیکن اس زمانے میں زمین سے قریب ترین سیاروں پر بھی زندا اجسام کا وجود ثابت کرنے کے لیے تجربوں کے ذریعے حاصل کیے اعداد شمار اور معلومات موجود نہ تھیں۔

سوویت سائنس دانوں نے اور ان میں سب سے پہلے گ۔ اتنجوف نے اس کا ثبوت فراہم کیا۔ وہ سوویت یونین کی سائنس اکادمی کی تبادلی ممبر اور ایک نئی سائنس کے بانی ہیں۔ جو علم نجومی حیاتیات کہلاتی ہے۔ اس سائنس کی نشوونما اور ترقی میں اکادمیشین وگ فیبنسکوف پروفیسر و۔ و۔ شاروناف مان۔ ن سنتکایا، ن پ۔ یارایا شیف اور دوسرے ممتاز سائنسدانوں کا بھی بڑا اہم حصہ ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریخ پر جو نباتات پائی جاتی ہیں ان کی خصوصیات کا مکمل مطالعہ کرنا ممکن ہو گیا اور سوال پیدا ہوا کہ کیا نظام شمسی کے بعض دوسرے سیاروں پر بھی زندگی کے آثار ہیں۔

موجودا صدی کے شروع ہی میں سائنس دانوں نے تصدیق کر لی تھی کہ ہر مریخی سال کے دوران (جو دو زمینی سالوں کے قریب قریب برابر ہوتا ہے۔) مریخ اپنا رنگ ایک مقرر تسلسل سے تبدیل کرتا رہتا ہے۔ موسم بہار میں جب قطبی ٹوپی (برف) پگھلنی شروع ہو جاتی ہے تو قطب کے نزدیک بلے پگھلی برف کے گرد گہرے چاکلیٹی رنگ کا ایک حلقا نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سمندروں جھیلوں اور "نہروں" کا خاکا دن بدن زیادا صاف نظر آنے لگتا ہے اور ان کا رنگ رفتا رفتا سبزی مایل یا نیلگوں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد گرمیوں اور خزاں میں رنگ تبدیل ہو کر زرد یا بھورا ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار سردیوں میں برف کے رنگ میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ شیخوف اس نتیجے پر پہنچے کہ مریخ پر نباتات ہے اور وہ موسمی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔

علم نجوم حیاتیات کے مخالفوں نے مریخ پر نباتات کے وجود کے تصور کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ وہاں کی آب و ہوا بہت ہی خشک ہے۔ وہاں پانی اور آکسیجن کی مقدار نہایت قلیل ہے اور وہاں کے کرہ ہوا میں "اوزون" گیس نہیں ہوتی۔ جو زندگی کے لیے نہایت مہلک ہے اور

چھوٹی لہروں والی (بالائے بنفشی) شعاعوں کو جذب کرتی ہے۔ تیخوف نے اس کی نہایت قوی اور معقول دلیل یہ دی کہ ممکن ہے مریخی پودوں میں تحفظ کی ایسی صلاحیتیں موجود ہوں، جو انہیں ٹھنڈ سے بچاتی ہوں۔ اول تو وہ عکس شعاعی کے لمبی لہروں والے حصے کو جس میں زیریں سرخ شعاعیں بھی شامل ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ سورج کی شعاعوں کی لائی ہوئی قوت حرارت کا بڑا حصہ استعمال کر لیتی ہیں اس کے علاوہ بہت سے زمینی پودوں کی طرح مریخی نباتات میں بھی بظاہر خد شعاعی (سلف ریڈی ایشن) خصوصیت بڑی حد تک موجود ہے جس کی مدد سے پودے خدا سے آپ کو حرارت پہنچا سکتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ زمین کی نباتات کی طرح مریخی پودوں نے کم حرارت میں زندہ رہنے کی اور بھی بہت سی صلاحیتیں حاصل کر لی ہوں گی۔ مثلاً سوویت یونین میں ورخوبانسک کے قرب وجوار میں آج کل پودوں کی تقریباً دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ وہاں کی آب وہوا مریخ کی آب وہوا سے کچھ کم شدید (سرد) نہیں ہے۔

جہاں تک پانی کی قلت کا سوال ہے تو بظاہر مریخی پودے بھاپ کی صورت میں رطوبت بہت کم خارج کرتے ہیں۔ زمین پر خشک آب وہوا کے لیے پودوں کے موزوں ہونے میں سب سے بڑی یہی تبدیلی ہوتی ہے۔ کرہ ہوا میں آکسیجن کی مقدار کی کمی اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ پودا اپنی جڑوں اور اعضا میں آکسیجن محفوظ کر لے۔ فوٹو سنتھیس کے عمل میں خارج ہوتی ہے (قوت روشنی) کی کافی مقدار میں فراہمی پر پودوں کے سبز خلیوں میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی سے کاربوہائیڈریٹ بننے کے عمل کو فوٹو سنتھیس کہتے ہیں۔ اس عمل کے دوران آکسیجن بھی خارج ہوتی ہے۔

تیخوف نے اس کی تردید کی ہے کہ طاقتور بالائے بنفشی شعاع زنی نے عمل کے سخت زندگی کا ختم ہو جانا لازمی ہے زمین پر زندگی کا آغاز انتہائی چھوٹے چھوٹے اجسام (مائیکرو آرگن ازم) سے ہوا تھا۔ پودے جن کی زندگی کی سرگرمیوں سے کرہ ہوا میں آکسیجن بھر گئی۔ بہت بعد میں نمودار ہوئے۔ آکسیجن سے "اوزون" گیس کی تہہ بنی جو ہماری موجودہ زمین پر سیکیٹر یا اور دوسرے اجسام کے لیے مہلک شعاعیں یعنی بالائے بنفشی شعاعیں جذب کر لیتی ہیں۔ اس لیے ہمارے سیارے پر زندگی کی ابتدائی منزلوں میں انتہائی چھوٹے چھوٹے اجسام (مائیکرو آرگن ازم) اور پودوں کو چھوٹی لہروں والی شعاعوں سے نقصان نہیں پہنچا۔ اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ مریخی نباتات نے کروڑوں برس کے دوران میں بالائے بنفشی شعاع زنی برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہوگی۔

علم نجوم حیاتیات کے ارتقا کی محض نظریاتی اہمیت نہیں ہے۔ علم نجوم حیاتیات کے مسئلوں کے حل سے ممکن ہے کہ زراعتی پیداوار کو ترقی دینے میں بھی مدد ملے۔ مثلاً روشنی کے عمل کی مدد سے شدید قسم کی آب وہوا برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے مفصل مطالعے سے ایسے پودے تیار کرنے میں مدد ملے گی۔ جو پانی کی قلت اور پالا برداشت کر سکتے ہوں۔ اس طرح کھیتی باڑی کا علاقہ دور شمال اور خشک بیابانوں تک پھیلایا جا سکے گا۔ اس لیے علم نجوم حیاتیات کے میدان عمل میں مزید تحقیقات سے اہم عملی نتائج حاصل ہونا عین ممکن ہے۔

ہندستانی زبان اور آزادی
کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آزادی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے۔اعظم پورہ شرقی۔پی۔او۔جوبلی۔حیدرآباد دکن ۳۴

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

قیمت ایک چار آنے

جلد (۱۴) نمبر (۱۲)

آبان ۱۳۶۳ف ستمبر ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	"راسی آئیں ہیں کسی کو بھی نادار لیا کہیں"	محضر (سندیلوی)	۱۰
حقایق و معارف	افقر موہانی	۳	بھکارن	صبا نقوی	۱۱
غزل	(نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی)	۴	کتھا کلی	ام۔مکندراج	۱۶
غزل	فضا (جالندھری)	۵	"ہم امن چاہتے ہیں"	ایاز عصمی	۱۸
غزل	شفیق بنیائی (شاہجہاں پوری)	۶	تاج محل	ڈاکٹر محمد عبدالمجید چغتائی	۱۹
غزل	مشیر (جھنجھانوی)	۷	جیبا یوسف	یعقوب نوشیروان	۲۲
گلہائے رنگا رنگ	اختر انصاری اکبرآبادی۔بی۔اے	۸	برطانیا کے صنعتی میلے کی کہانی	جے۔ال ریڈنگ	۲۵
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	سنجیوا راؤ نایب صدر فاؤنڈیشن فار نیوا ایجوکیشن	۹	تنکھی کو پنل امریکی زندگی کے متعلق گوناگون تحریریں	قمرالدین قمر ام۔جے رام	۲۶ ۲۹

ہمارے خیالات

(تیسری اور آخری قسط)

اعلیحضرت حضور نظام کا پانچ کروڑ کا ٹرسٹ

جیسا کہ پچھلے نمبر میں ظاہر کیا گیا کہ ایک طرف تو اعلیحضرت حضور نظام اپنی کم استطاعتی کو نہایت ہی انکساری کے انداز میں ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف دنیا والوں کا خیال ان کے بارے میں کچھ اور ہی ہے امریکا کی مشہور نیوز ایجنسی یونائیٹڈ پریس آف امریکا نے حال ہی میں دنیا کے دولت مندوں کے جو اعداد شمار جمع کیے ہیں اس کے لحاظ سے اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ مالدار ایک امریکی ہیرلڈسن لیفیٹ ہنٹ نامی شخص ہے جس کی روزانا آمدنی ایک لاکھ ۸۰ ہزار ڈالر ہے۔ آگے چل کر اسی ایجنسی نے لکھا ہے کہ "نظام حیدرآباد سے اگرچہ ایک امریکی نے دنیا کے امیر ترین آدمی کا لقب چھین لیا ہے مگر اس کے باوجود نظام کا شمار دولت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ضرور ہے۔" نیوز ایجنسی کا یہ بھی کہنا ہے کہ "۱۹۴۸ء کے بعد سے حضور نظام کی آمدنی گھٹ کر صرف ۳۰ لاکھ ڈالر (ایکٹ الرمساوی ہے تقریباً ۵ روپے) یا دیڑھ کروڑ روپے رہ گئی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے ان کی سالانا آمدنی ایک کروڑ ڈالر یا پانچ کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ ہیرے جواہرات چاندی سونے کے زیورات، چاندی اور سونا، اشرفیاں روپے اور نوٹ یہ سب ملا کر نظام کے قبضے میں اس وقت ایک ارب ڈالر یا پانچ ارب روپے سے کم نہیں۔ ان کی غیر منقولا جائیداد جیسے ایوانات شاہی، باغات مکانات اور لگیاں بازارات وغیرا اس دولت کے علاوا ہیں۔"

ہمیں حضور نظام کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ "یار لوگوں نے ان کی دولت کو افسانوی رنگ دیدیا" یہ سچ ہے کہ لوگ جب بولنے پر اتر آتے ہیں تو پھر سچ کا خیال ہی نہیں رکھتے۔ ہو سکتا ہے کہ نظام کی دولت کے بارے میں ۵۰ فی صد لینے کے کام لیا گیا ہو بلکہ ہم تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۷۵ فی صد جھوٹ ہوگی ۔۔۔ اب اس کے بعد تو اور کوئی گنجائش نہیں! غالب حضور والا ۲۵ فی صد یعنی اقل ترین سچ کو تو تسلیم کرلینگے نا! گویا ۱۵ ارب روپے نقد میانا آمیز دولت کا ۲۵ فیصد سچ حصا ہے ۱ ارب ہوا یعنی ۲۵ کروڑ روپے۔ اس دولت میں سے حضور نظام نے اب تک اپنی اولاد کے لیے ۴ کروڑ کا ٹرسٹ قایم کیا ہے۔ سنا گیا ہے کہ ۱۶ کروڑ روپیا مرکزی حکومت کو اور ۱۰ کروڑ روپیا حیدرآباد حکومت کو لیطور قرض دیا گیا ہے اور پانچ کروڑ کا زیر بحث ٹرسٹ غریبوں کے لیے قایم کیا گیا ہے۔ یعنی حملا، ۷ کروڑ روپیا خرچ کیا گیا ہے اور ۴۸ کروڑ روپیا کسی نہ کسی شکل میں اب بھی محفوظ ہے۔ ہمیں اس وقت جو بحث ہے صرف اسی پیسے سے۔ اعداد شمار میں تھوڑی بہت غلطی کا امکان ضرور ہے لیکن اس کے باوجود رقم کی گنتی کروڑوں ہی میں رہے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ انہیں کروڑوں روپے سے حضور نظام ملک میں چند بڑے بڑے کارخانے کھول کر ہزاروں بلکہ لاکھوں ہی بے روزگاروں کی زندگی کا سہارا پیدا کر دیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک میں عام اور مفت تعلیم کی غرض سے بڑا بھاری ٹرسٹ قایم کر دیں جس کی تمام تر آمدنی تعلیم صنعت وحرفت اور سائنس کی ترقی میں خرچ ہو حضور نظام کا یہ ایک ایسا لافانی کارنامہ ہوگا جو رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔ اور "نظام حیدرآباد" کے نام نامی کو زندا جاوید کر دے گا۔

حضور نظام کی غیر منقولا جائیداد سے متعلق ہمارا یہ مشورا ہے کہ عثمان گڑھ، محبوب مینشن، پرانی حویلی، چوتھا محلا، جوبلی، منجلی بیگم خلوت اور کئی ایک ایسی بڑی بڑی عمارتوں میں "نظام تعلیمی ٹرسٹ" کے

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

اتنا مجبور نہ کر اے غم دنیا مجکو
کہ خدا میرا کہے غیر کا بندا مجکو

حاجت قبر کفن کی نہ تمنا مجکو
لے لے آغوش میں اے جوشش دریا مجکو

فکر امروز نہ اندیشہ فردا مجکو
تیرے ہوتے ہوئے کیوں غم ہو کسی کا مجکو

ایسا منظر بھی غم دل نے دکھایا مجکو
زیست پر اپنی ہوا موت کا دھوکا مجکو

اب کہاں جائے نکل کر یہ نگاہ حیرت
ہر طرف گھیرے ہوئے ہے ترا جلوا مجکو

تلخی موت گذرتے ہوئے ڈرتی ہے ادھر
جانتی ہے خلش درد کا پتلا مجکو

وسعت جوش جنوں دیکھ لے ذرا ذرا
نہ کرے منع جو ویرانی دنیا مجکو

موت تو راہ محبت کی ہے پہلی منزل
نظر آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مجکو

اے مری قبر سے منھ پھیر کے جانیوالے
کیا کہے گی مری اب خاک تمنا مجکو

جانتے یہ ملا اور کبھی سوے حرم
دھوکے دیتا ہے ترا نقش کف پا مجکو

ایک ہی گھر سے اٹھے تا بہ فلک دو شعلے
برق نے ساتھ نشیمن کے جو پھونکا مجکو

ہو گئی کش مکش نزع کی مشکل آسان
مل گیا نام کا تیرے جو سہارا مجکو

ڈوبتی کشتی دل صاف نظر آتی ہے
گریہ چشم ہے منجملہ دریا مجکو

آج تک نام قیامت کا ہے زندا جس سے
یاد ہے آپ کا وہ وعدہ فردا مجکو

بیکسی دیکھ کے اپنی سر تربت افقر
یاد آتا ہے فریب رخ دنیا مجکو

غزل

(نواب) جعفر علی خاں اثر (لکھنوی)

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ رنگ آسماں بدلا
نہ جانے کیوں نظر آتا ہے پھر سارا جہاں بدلا

گلوں کو سرگراں دیکھا، تو انداز فغاں بدلا
مگر اس پر بھی، یا قسمت! مزاج باغباں بدلا

نہ سوچا کوئی کیا کیا گل کھلیں گے اس کے پرد میں
چمن سے جب چمن اور آشیاں سے آشیاں بدلا

محبت کی پذیرائی تواضع سے، تبسم سے!
قیامت آئی کافر نے طریق امتحاں بدلا

ابھی تک شوق میں ساحل کے موجیں پٹکتی ہیں
نہ یہ بدلیں نہ انداز محیط بیکراں بدلا

بپر دطاق نسیاں کیجئے اب یاد ماضی کی
زمانے کی ہوا کا رخ جہاں بدلا وہاں بدلا

ارے عرض تمنا کا کوئی پہلو نکلتا تھا!
جب ہی تو مسکرا کر شوخ نے طرز بیاں بدلا

نظر آتی نہیں اب منزل مقصود کو سو تک
یہ کس نے کارواں شوق کا سنگ نشاں بدلا

فقط اپنی سمجھ کا پھیر ہے ورنہ یہی دیکھا
زیاں بھی سود تھا جب مرکز سود و زیاں بدلا

صبا جو حال دیکھا ہے چمن والوں سے کہہ دینا
بہار آئی مگر ہم نے نہ ملبوس خزاں بدلا

توقع دلنوازی کی اثر اور ایسے پرفن سے،
جو ہو کر بحث میں عاجز ڈھٹائی سے زباں بدلا

غزل

فضا (جالندھری)

ان کا سنور سنور کے بگڑنا عتاب میں
نشتر لیے ہوئے ہیں نگاہیں عتاب میں

رہنے نہ دیگا حسن کسی کو حجاب میں
کھل کھیلتا ہے اور یہ ظالم شباب میں

انداز دلفریب تمہارا ہے بے خطا
ڈالا مری نگاہ نے مجھکو عذاب میں

اب جلوہ بھی ہے حجاب الٰہی رے شوخیاں
یا ایک دن تھی جلوہ نمائی حجاب میں

پوشیدہ درد عشق میں ہے زندگی کا راز
یارب کمی نہ ہو خلش اضطراب میں

ہاں ہاں سپہر عشق کے تارے یہی تو ہیں
آنسو جھلک رہے ہیں جو چشم پرآب میں

ان بے شمار پردوں میں بھی جلوہ گر رہا
جلوے ترے عیاں ہیں مگر تو حجاب میں

قسمت میں جو لکھا ہے پڑھیں گے تمام عمر
راحت کا لفظ درج نہیں اس کتاب میں

کس کو سناؤں حال کہ ہے زندگی تباہ
میری طرح سے کون لٹا ہے شباب میں

تعبیر یہ ہے غیر سے دیکھے گا میرے گھر
"دیکھا ہے میں نے غیر کے گھر اس کو خواب میں"

کیف دو آتشہ سے ہیں سرشار چشم و دل
ساقی کا عکس رخ بھی ہے جام شراب میں

دیکھوں کہیں مری نگہ گرم تو نہیں
اک برق سی جو کوند رہی ہے نقاب میں

وہ درد دل نواز ہے جس میں ہو سوز عشق
وہ زخم دل نشیں ہے جو ابھرے شباب میں

سوز و خلش سے پاک ہیں عشق ہو کہ حسن
لالے کے دل میں داغ ہے کانٹا گلاب میں

نقشا بدل رہی ہیں زمانے کی گردشیں
ہے جملا کائنات فضا انقلاب میں

غزل

اس خاکداں میں آج جدھر دیکھتا ہوں میں
انسانیت کو خاک بسر دیکھتا ہوں میں

آئینے میں خدا اپنی نظر دیکھتا ہوں میں
جلوے ترے بطرز دگر دیکھتا ہوں میں

کس سے کروں شکایت ناکامی نگاہ
ایک ایک کو خراب نظر دیکھتا ہوں میں

ہر لطف پر ہے اب تو گمان فریب لطف
پیہم نوازشوں کا اثر دیکھتا ہوں میں

ہر چیز پر نظر ہے مری ماسوائے دل
تو کس جگہ ہے اور کدھر دیکھتا ہوں میں

رنگ مجاز میں بھی حقیقت کی شان ہے
یعنی تمہیں کو بار دگر دیکھتا ہوں میں

حسن تمام تیری تجلی کی حد نہیں
پھر بھی بقدر ذوق نظر دیکھتا ہوں میں

ہمدم سحر ہو میری شب غم محال ہے
بیدار ہوں کہ خواب سحر دیکھتا ہوں میں

کیا خاکِ آشیاں سے بھی ہے آسماں کو لاگ
اب تک ہجوم برق و شرر دیکھتا ہوں میں

میرے نیاز عشق کی قدوسیت نہ پوچھ
اکثر فراز عرش پہ سر دیکھتا ہوں میں

کوئی سمجھ سکا نہ مرا مرجع نگاہ
کیا دیکھتا ہوں اور کدھر دیکھتا ہوں میں

یہ نظم گلستاں میں تغیر خدا پناہ
اک انقلاب حشر اثر دیکھتا ہوں میں

عبرت مآل یاس نصیبوں کی شام ہے
ڈوبی ہوئی لہو میں سحر دیکھتا ہوں میں

کانٹے ہی پایمال نہیں اے شفیق زار
پھولوں کو بھی تو خاک بسر دیکھتا ہوں میں

شفیق بنبائی
(شاہجہاں پوری)

غزل

تری برق پاش نگاہ سے ترے حشر خیز خرام سے
بہ سکون قلب گزر گیا میں ہر ایک ایسے مقام سے

مری زندگی کے یہ مرحلے ہمہ اتفاقیہ بندگی
مجھے کیف ان کی نظر سے ہے کوئی واسطہ نہیں جام سے

یہ سمجھ لے زاہد سادہ دل مرے ہر عمل میں خلوص ہے
مری معصیت بھی بلند تر، تری بندگی دوام سے

وہ لجا گئے وہ جھجک گئے، وہ ٹھہر گئے کسی سوچ میں
سر راہ کسی نے جو دفعتاً انہیں دی صدا مرے نام سے

یہ حیات و مرگ کی منزلیں بھی مری نگاہ میں کچھ نہیں
نہ سحر سے کوئی خوشی مجھے نہ ملال ہے کوئی شام سے

نہ سمجھ سکا تری دشمنی، نہ پرکھ سکا تری دوستی
مرا فیصلا ہی بدل گیا تری ہر نظر کے پیام سے

وہ نگاہ لطف و کرم نہیں جو سکون روح و نظر نہ ہو
مرا قلب اب لرز اٹھا ترے التفات مدام سے

مجھے بندگی سے غرض ہی کیا، مری زندگی ہی سجود ہے
مجھے واسطہ نہ رکوع سے، نہ قیام سے، نہ سلام سے

وہ لحاظ پیر مغاں نہیں، وہ مذاق بادا کشی کہاں
ہمیں پھر عطا ہو مئے کہن نئے دور میں نئے جام سے

ترا ذکر سن کے تڑپ اٹھا، ترا نام لے کے میں رو دیا
مجھے ایک نسبت خاص ہے ترے ذکر سے ترے نام سے

میں ہوں شمع محفل جاوداں مری زندگی نہیں مختصر
میں جو داغ راہ گزر نہیں جو بجھا بجھا سا ہو شام سے

نہ رہا مشیر ہی تشنہ لب سر بزم ساقیٔ دل نشیں
کوئی بادا کش نہیں مطمئن ترے میکدے کے نظام سے

مشیر جھنجھانوی

گلہائے رنگا رنگ

اختر انصاری اکبرآبادی۔ بی اے

۱ خون دل جھلکتا ہے رنگ چشم تر دیکھا!
اپنے ظلم پیہم کا آپ نے اثر دیکھا!
آو جگمگا دو اب وادیاں محبت کی
وہ یہاں بھی دیکھے گا جس نے طور پر دیکھا
زندگی کا ہنگامہ موت کی سی خاموشی
شام دیکھنے والو! عالم سحر دیکھا

۲ مرے لبوں پہ نہ آجائیں راز ہائے نہاں
دعائیں مانگ کے ہو جائے بند میری زباں
نہ جانے شام تاریکیوں میں کیا ہوگا
سحر سے آج چمن میں ہے شاخ گل لرزاں
افق سے اور ادھر ہی سہی مری منزل
میں بڑھ رہا ہوں برابر بہ فیض عزم جواں

۳ خدا معلوم اب رقص جواں کون دیکھے گا
ہمارے بعد پھولوں کو عزائم کون دیکھے گا
بہاروں میں بھرا ہے رنگ دل کے خون سے ہم نے
نئی کلیاں گلستاں در گلستاں کون دیکھے گا

۴ یوں برق تبسم لہرائی پلکوں سے ستارے ٹوٹ پڑے
دامن کا سہارا پاتے ہی آلام کے مارے ٹوٹ پڑے
اک ٹھنڈی سانس پہ دنیا نے تنقید ہزاروں لگتی کی
تھی میرے لبوں پر اک جنبش اور لاکھ اشارے ٹوٹ پڑے

۵ راز ان کے مرے اشعار تک آپہنچے ہیں!
پھول کچھ دامن افکار تک آپہنچے ہیں!
جو فسانے لب گفتار تک آ سکے بھی نہیں
رنگ بن کر ترے رخسار تک آپہنچے ہیں
مسکراتا ہوا خدا سامنے آجائے دوست
ورنہ ہم پردہ اسرار تک آپہنچے ہیں

۶ یہ روے تابناک یہ زلف سیاہ فام
آئینہ لے کے دیکھ لے ملتے ہیں صبح و شام
آواز دے رہا ہے مرا فرض پھر مجھے!
بزم سکون قلب تجھے دور سے سلام
سائے طویل ہو گئے مہتاب ڈھل گیا
کافر ترے خیال میں شب ہو گئی تمام

۷ بھڑک کے ہو گئی گل شمع، انجمن ہے اداس
نسیم صبح نے کیا کہہ دیا خدا جانے!
اگر سنبھال نہ لیتا مجھے جنوں اختر
ہزار طرح سے دھوکے دیے تھے دنیا نے

۸ خلوت کے ہنگاموں کو محفل والے کیا جانیں
ان کی نظر کے افسانے ہم دل والے کیا جانیں
مشکل مشکل روتے ہیں رونے دو بدبختوں کو
سعی حصول آسانی مشکل والے کیا جانیں
اونچی نیچی پگڈنڈی دور افق تک جاتی ہے
راہوں کی دشواری کو منزل والے کیا جانیں

۹ طلب ہے صادق تو ہر قدم پر ہر ایک منزل تجھی ملے گی
جو دل جواں ہے نظر جواں ہے تو موت سے زندگی ملے گی
یہ زندگی یہ عروج و پستی ہر اک نفس ہے فریب ہستی!
جو یہ دھند لگے عبور کر لے تو دور تک روشنی ملے گی

۱۰ جوانیوں کے زمانے ابھی نہیں بدلے
محبتوں کے فسانے ابھی نہیں بدلے
ہزار ربط و جنگ و ریا ہے لوٹ گئے
اس انجمن کے ترانے ابھی نہیں بدلے
تری نگاہ کے عنوان بدل گئے لیکن
مرے جنوں کے فسانے ابھی نہیں بدلے

سلسلہ نمبر (۱۰)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

سنجیوا راؤ
نایب صدر فاؤنڈیشن فار نیوا یجوکیشن

(تعلیم کا حقیقی مدعا اپنے آپ کو سمجھنا ہے)

افراد میں بحیثیت فرد اور بحیثیت مجموعی سماج میں ذہنی انتشار کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کا علاج تلاش کرنا تعلیم کا مدعا ہونا چاہیے بے مقصد اور مایوس زندگی ہمارے اندر ذہنی انتشار کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اس انتشار کو دور کرنے کے لیے انسان کو اس قسم کی تعلیم دی جانی چاہیے جس سے اسے یہ معلوم ہو سکے کہ زندگی میں اس کا نصب العین کیا ہے۔ تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہیے جو ہمیں زندگی کی کسی نئی راہ سے روشناس کرائے اور ہمارے اندر زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو۔

گذشتہ دو عالمگیر جنگوں اور نئے سائنسی خیالات نے ان روایاتی قدروں کو ختم کر دیا۔ جن کی موجودگی ہمارے اندر پائے جانے والے حیوانی اور غیر سماجی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے لازمی ہے۔ "اپنے آپ کو سمجھنا" تعلیم کا حقیقی مدعا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ اس کی انفرادی زندگی کا کیا مطلب ہے اور سماجی زندگی میں اسے کیا پارٹ ادا کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو سمجھنے سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اسی آئینے میں دیکھیں جس میں ہمیں اپنا صحیح عکس دکھائی دے اور اپنے آپ کا جایزہ لینے کے بعد ہم اپنی حقیقت کو پہچانیں۔ انسان بے چین اور ناخوش ہے کیونکہ وہ اپنی حقیقت سے برعکس بچنے اور بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے آپ کے علم کے ذریعے ہمیں مکمل طور پر خوش رہنے کا راز سمجھ میں آتا ہے۔ اس وسیع کاینات میں چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک کا باہمی رشتے کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ اور ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس وسیع دایرے میں ہمارا کونسا مقام ہے یہی اپنے آپ کو پہچاننا ہے اس حقیقت سے روشناس ہونے کے بعد ہمیں سماجی زندگی میں اپنے فرایض کو انجام دیتے ہوئے خدبخدا اپنی اندرونی گہرائیوں میں سے مسرت کی ایک لہر کا احساس ہوتا ہے اس منزل پر پہنچکر انسان کی بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننے سے ایک اور بڑا فایدہ ہوتا ہے کہ ہم میں دوسرے انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر سکنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا یہ جذبا باہمی پیار اور محبت کے رشتے کو استوار کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے ان تمام باتوں کی تعلیم محض کتابوں کے ذریعے ہی نہیں دی جا سکتی۔ ہم بائبل تو پڑھ سکتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ سے پیار کا جذبا پیدا کرنے کے لیے محض الفاظ کا دہرانا کافی نہیں۔ یہ چیزیں ایک اندرونی احساس کے ذریعے ہی ہماری شخصیت کا جزین سکتی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ تعلیمی نظام میں پیشہ ورانہ نقطہ نگاہ سے کام کرنے والے استاد تعلیم کے اوپر گنائے ہوئے اغراض اور مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ چھوٹی تنخواہوں اور دوسری باتوں سے متعلق ان استادوں کی مشکلات کا ہمیں احساس ہے لیکن ان میں سب سے بڑی مشکل ان کا اپنا ذہنی انتشار

ہے۔ انہیں خدا یہ معلوم نہیں کہ زندگی میں ان کا مقصد کیا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان استادوں کو صحیح تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کو تعلیم دینا خدا اپنے آپ کو تعلیم دینے کے عمل کا ہی ایک جز ہے۔ ہماری نجات سچائی پریم اور پیار کی راہ پر چلنے ہی میں ہے۔ محبت کی قوت سے ہی ہم اپنے آپ کو اور دوسروں کی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ ورنا دوسری صورت میں انسان کی تباہی یقینی ہے۔ یہ گویا ہمارے لیے بدترین رستا ثابت ہوگا۔

آیا لوگوں کے لیے اس قسم کی تعلیم کا مہیا کرنا ممکن ہے؟ اس کا جواب ان بڑی ہستیوں کو دینا چاہیے جو خدمت ہو کر ہمیں تاریکی سے باہر نکلنے کا رستا دکھائیں گی۔ یہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہم لازمی طور پر اس منزل پر پہنچیں گے۔ دنیا کو ایسے استادوں کی ضرورت ہے جو ان کو اندرونی اور بیرونی انتشار سے نجات دلا سکیں۔ ہمارے مستقبل کا انحصار اس قسم کے استادوں ہی پر ہے۔ اور آشا ہے کہ حقیقی آزادی کے متلاشی انسانی زندگی کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔ ہندستان میں قدیم زمانے میں "تمنا" کو سمجھنے کی جس تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اب پھر اس کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ سچائی کبھی بھی پرانی نہیں ہوتی۔ مختصر لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ نہایت جامع شکل میں مذہب کا دوسرا نام تعلیم ہی ہے۔

دنیا کے ماہرین شرقیات کا کیمبرج میں اجتماع

حال ہی میں بمقام کیمبرج ماہرین مشرقی علوم کی ۲۳ ویں بین قومی کانگرس منعقد ہوگئی جس میں دنیا کے تقریباً ۹۰ ماہرین نے جن میں ہندستانی بھی شامل ہیں شرکت کی۔ اس کانگرس کا انتظام رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے کیا تھا اور اسے ملکا کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کانگریس میں تقریباً ۳۵۰ مقالے پڑھے گئے۔

"آس آئیں ہیں کسی کو بھی ناداریاں کہیں"

(مخمور سندیلوی)

نہریں کہیں ہیں جاری تو دریا رواں کہیں
برسا دیے ہیں آنکھوں نے آنسو جہاں کہیں
پہنچے گا سوز غم کا کہیں سے دھواں کہیں
نکلا زمین دل سے اگر آسماں کہیں
مل جاتا ہے خدا بھی مگر شرط ہے تلاش
آسانیوں سے مٹتی ہیں دشواریاں کہیں
فکر و نظر سے اس لیے رہتا ہوں دور دور
مجھکو ڈبو نہ دیں مرے وہم و گماں کہیں
اے طالب جمال کدھر ہے ترا خیال
شب میں دکھائی دیتی ہیں پرچھائیاں کہیں
دل میرا کانپتا ہے دم سجدا خوف سے
ٹھکرا نہ دے جبیں کو ترا آستاں کہیں
قاصد کے بس کا روگ نہیں عرض مدعا
ڈر ہے بدل نہ جائے ہمارا بیاں کہیں
محو جمال دید ہے وقف جمال دید
اڑنے لگیں نہ آنکھوں سے چنگاریاں کہیں

مخمور مٹا نہ دے ہمیں یہ دور انقلاب
راس آئی ہیں کسی کو بھی ناداریاں کہیں

بھکارن

صبا نقوی

"بابو جی!۔۔۔" میں ٹھٹک گیا۔ ایک جوان لڑکی مجھے بلا رہی تھی۔ میرے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔

"آج صبح سے بھوکی ہوں بابو جی!۔۔۔" اوہ! تو یہ بھکارن تھی۔ لیکن اتفاق دیکھئے اس پر کہ بھرپور جوانی کو گداگری کی بھینٹ چڑھانے سڑک کے کنارے آگئی تھی یہ۔ بات یہ ہے کہ آج کل نرنی کا زمانہ ہے اور ہر فن میں تکنیک پیدا کی جا رہی ہے۔ اور یہ جوان بھکارنیں۔ خدا محفوظ رکھے ان ظالم شکاریوں سے۔

"لیکن یہ تو ایسی نہیں۔۔۔ یہ تو شکاری نہیں" میرے دل نے پکارا۔ اس کے چہرے سے معصومیت ٹپکتی ہے شیطنیت نہیں۔ اس کے سراپا سے اپنی بے چارگی اور مظلومیت ٹپک رہی۔ اور میں اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ دھول میں اٹا ہوا زرد چہرا۔ جیسے چاند کو گرد و غبار کے بادلوں نے ڈھانپ لیا ہو۔ پتلا سا قد۔ تناسب اعضا۔ پوسیدہ کپڑے۔ تیکھے نقوش موٹی موٹی آنکھیں۔ جن میں نہ جانے کتنے صحراؤں کی وسعتیں اور کتنے ہی غیر آباد کنوؤں کی گہرائیاں سمٹ کر آگئی تھیں۔ اس کے لمبے گھنے اور ریت سے اٹے ہوئے سنہری بالوں کی لٹیں دونوں شانوں پر ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ جیسے کسی بہت بڑے سانپ کا خاندان اپنے جدی خزانے پر پہرا دے رہا ہو۔

"بابو جی!" وہ مجھے اپنی طرف یوں گھورتا دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں آج شام کی سیر کے لیے خلاف معمول اکیلا ہی چلا گیا تھا اور غالباً اسی لیے معمول سے زیادہ دیر بھی ہو گئی تھی۔ تاریکی نے تمام کائنات کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا تھا۔ ہنگامے خاموش ہو گئے تھے۔ سڑکیں سنسان ہو چلی تھیں۔ اور بجلی کے کھمبے قطار اندر قطار کھڑے یوں معلوم ہوتے تھے جیسے فوجی سپاہی دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی اپنی جگہ اٹینشن پر کھڑے وزیر اعظم کی سواری کے گذرنے کے منتظر ہیں۔

"کون ہو تم" میں نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے صرف بات کرنا چاہی۔

"ایک غریب بھکارن" اس نے نہایت شستہ لہجے میں کہا۔

"تم شائستہ ہو فی معلوم ہوتی ہو" میں نے بات بڑھائی۔

"آپ نے کیوں کر جان لیا بابو جی!۔" جیسے میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔

"کس نے ظلم کیا ہے تم پر" میں نے اسی لہجے میں پوچھا

"بے رحم زمانے۔۔۔ نے ظالم سماج نے۔۔۔ صفاک دنیا نے اور۔۔۔ اور بابو جی۔۔۔"

مدت کے بعد ہمدردی کے چند کلمات سن کر وہ پھوٹ پڑی لیکن شدت جذبات نے اس کی زبان پکڑ لی۔

"تم مجھے اپنی بپتا سناؤ تو تکلیف تو نہ ہو گی"

"لیکن آپ کو خدا تکلیف ہو گی اسے سن کر"

"تمہارے دل کا بوجھ تو کچھ ہلکا ہو جائے گا نا۔ ایک ہمدرد کو پا کر اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک پیدا ہوئی اور میرے ساتھ بلا چون و چرا میرے گھر چلی آئی۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔ گھر کا بچا کچھا کھانا اس نے اس شوق سے کھایا جیسے من و سلویٰ مل گیا ہو۔ اور پھر اپنی رام کہانی سنانے میری کرسی کے قریب ہی اصرار کر کے زمین پر بیٹھ گئی۔

میں کلکتہ کے ایک علاقائی خاندان کی چشم و چراغ ہوں میرے تایا جی کا نام سیٹھ مول چند تھا۔ وہ ایک بہت وسیع تجارتی فرم کے پروپرائیٹر تھے۔ ان کی فرم کی شاخیں ہندستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کے علاوہ سنگاپور۔ رنگون اور لندن میں

بھی تھیں۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ لیکن ایک کمی ایسی تھی جسے پتاجی پوری طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ کئی شادیاں کیں۔ منتیں مانیں۔ فقیروں اور سادھوؤں سے التجائیں کیں۔ حکیم ڈاکٹر کوئی چھوڑا۔ کوئی جتن نہ چھوڑا لیکن امید کی شاخ میں کوئی کونپل نہ پھوٹی۔ آخر عمر کے ساتھ ساتھ ان کی مایوسی بھی پختگی کا رنگ اختیار کرتی گئی۔ اس کا اثر کاروبار پر بھی پڑا۔ ہندستان سے باہر کی شاخوں کو ختم کرنا پڑا۔ اور اندرون ملک بھی کمپنی کی ساکھ بگڑنے لگی۔ پتاجی کے دوست ان کی توجہ اس طرف دلاتے تو وہ صرف یہ لفظ کہتے ــــ

"میں کس کے لیے کروں؟"

اس غم نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ اور بڑھاپے نے آتے ہی انہیں چارپائی کا مہمان بنا ڈالا۔ مگر۔ صاحب اختیار ذات قدرت کی نیرنگیاں۔ کہ آتشیں امید کے بالکل سرد پڑ جانے کے بعد راکھ کے نیچے سے ایک دہکتا ہوا انگارا نکل آیا جس نے ان کی دنیا کے ذرے ذرے کو سنہرا کر دیا ان کی امیدوں کے تمام مرجھائے ہوئے غنچے امید سحری کے ایک ہی جھونکے سے کھل گئے۔ ان کے خزاں رسیدہ چمن میں بہاریں اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔ ان کی تمام آرزوئیں برآئیں وہ ایک بچے کے باپ بن گئے۔ انہیں گویا دوبارہ زندگی مل گئی۔ اور کمپنی کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بھی طوفان کے تھپیڑوں سے واپس لے کر نئی زندگی بخشی گئی۔ اور پھر خوشیاں شادمانی۔ مسرت۔ سعادت۔ وغیرا وغیرا ــــ

میں اپنے بھائی سے صرف دو سال چھوٹی ہوں ہماری ماں بچپن ہی میں ہمیں ہمیشا ہمیشا کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ لیکن پتاجی کو ہم سے اس قدر محبت تھی کہ ہمیں کسی مرحلے پر اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ہم بلا ماں کے بچے ہیں۔ ہم نے لاڈ پیار کی گود میں آنکھ کھولی۔ ناز و نعم کے جھولے میں پرورش پائی سونے چاندی کے انباروں پر کھیلا۔ ہمارا خیال تھا کہ دنیا خوشیوں اور قہقہوں کا نام ہے۔ ہم ناکامیوں اور آفتوں کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ ہمارے سدا بہار چمن کی طرف خزاں جھانک کر بھی نہ گئی تھی۔ اور ہم بڑھے جا رہے تھے بغیر ارادے کے۔ بلا کوشش کیے۔ جد و جہد کے بغیر سوچنے سمجھنے سے پہلے۔ جاننے بوجھنے کو ضروری نہ سمجھتے ہوئے۔ ہم بڑھتے رہے۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف۔ بہار سے خزاں کی طرف۔ گلستاں سے نظارزار کی طرف۔ بغیر کسی احساس کے ہم بڑھتے رہے۔ اور کتنی جلد ہم اچھے دنوں سے بہت آگے نکل آئے۔

بی۔ اے میں پڑھتی تھی۔ کالج کی لڑکیوں میں حسین ترین تسلیم کی جاتی تھی۔ سالانا مقابلے میں خوب صورتی کا پہلا انعام بھی میں نے حاصل کیا۔ میری نظروں میں کسی کی شخصیت نہ جچتی تھی۔ میں کسی کو خاطر میں لاکر بہت خوش تھی۔ بہت مسرور تھی اپنی خوب صورتی پر۔ اپنی پڑھائی پر۔ اپنی قسمت پر ــــ اچانک بجلی اٹھی۔ آسمان کو سیاہ گھٹاؤں نے محیط کر لیا۔ دنیا پر اندھیرا چھا گیا۔ اور ایک بے پناہ طوفان نے مجھے آلیا طوفان جس نے میری زندگی میں انقلاب بپا کر دیا۔ بہت بڑا انقلاب۔ جس نے میری زندگی یکسر بدل کر رکھ دی ساری بساط الٹ دی۔ سب کچھ لوٹ لیا۔ بہار آخری چمن صحرا میں تبدیل ہو گیا۔ سفید صحرا خوفناک گیدڑوں کی رقص گاہ بن گیا۔ میرے تمام خوابوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ سارے قلعے یکسر مسمار ہو گئے۔ ہر مسرت اور سعادت نے منہ موڑ لیا اور تمام بھیانک مصائب منہ کھولے میری طرف لپکے۔ اور مجھے اس جگہ پہنچا دیا جہاں آج آپ دیکھ رہے ہیں ــــ

میں اس کی باتوں میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں کون ہوں اور کہاں بیٹھا ہوں۔ وہ جب ــــ ذرا رکی تو میں نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نام کو چمک باقی نہیں رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام دنیا کی ویرانیاں اکٹھی ہو کر ان حسین آنکھوں میں آ

لیسی ہیں۔

"لیکن اس بربادی کی وجہ؟" میں نے اسے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی طرف توجہ دلائی۔

"ہاں!۔ تو میں بی۔ اے کی طالب علم تھی ۔۔۔۔ دور خلا میں گھومتے ہوئے سلسلا جوڑا جیسے گذرے ہوئے زمانے کو کرید رہی ہو۔ کالج کے لڑکے لڑکی عشق فرمانا لازمی خیال کیا کرتے ہیں۔ جج پر بھی ہر ایک کی نظر تھی۔ بہت بڑے بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لڑکے میرے ہم جماعت تھے اور سب کے سب میری ایک نظر التفات کے عوض اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتے۔ بعض منچلوں نے تو مجھے متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کر ڈالیں۔ اور کچھ ایسے بھی جن کے التجاؤں آرزوؤں اور تمناؤں سے پُر محبت ناموں تک مجھے ملے لیکن میں اپنی حد تک ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میری نظروں میں کوئی نہ جچ سکا۔ میرے دل کو کسی کی ادا نہیں بھائی۔ اور دن یوں ہی گذرتے رہے بی۔ اے کا فائنل ایئر تھا۔ موسم گرما کی چھٹیوں کے بعد کالج کھلا تھا۔ جیسے خزاں گذر گئی تھی۔ اور بہار پھر آ گئی تھی۔ خامشیاں لد گئی تھیں۔ اور رونقوں نے ان کی جگہ لے لی تھی کالج میں بہت چہل پہل تھی۔ اور سارے طالب علم نئی امنگوں کے ساتھ نئی نئی دلچسپیوں میں محو تھے۔ کلاس شروع ہوئے ابھی ایک ہفتا بھی نہیں گذرا تھا کہ ایک لڑکا کیلاش کسی دوسرے شہر کے کالج سے ٹرانسفر لیٹ کر کے ہمارے کالج میں آیا۔ وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ پہلے دن کلاس میں آیا تو قدرتی طور پر سب اسی اجنبی کو دیکھنے لگے۔ میں بھی اسے دیکھنے لگی۔ بالائد ۔۔۔ موزوں گٹھیلا بدن۔ بہت متناسب اعضا۔ سنجیدہ اور متین چہرا۔ خمار آگیں آنکھیں۔ جچ جانے والے نقوش۔ میں اسے دیکھتی رہی۔ دیکھتی گئی۔ اس کی نظر بھی کمرے کا طواف کرتے ہوئے مجھ پر آ ٹھہری۔ نگاہیں ٹکرائیں اور مجھے زندگی میں پہلی بار ایک عجیب حالت سے واسطا پڑا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے شراب پی لی ہے۔ میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ میرا بند بند درد کر رہا ہے، اور اس درد سے مجھے بے پناہ لذت حاصل ہو رہی ہے۔ اور پھر۔ جیسے میں اڑی جا رہی ہوں۔ اونچے۔ بہت اونچے۔ آسمان کی نیلگوں پنہائیوں سے بھی پرے۔ ایک نئی پرکیف دنیا کی مخلوق بن گئی ہوں۔ اس مادی دنیا سے دور چلی گئی ہوں۔ اب میں آزاد ہوں۔ ہر قید و بند سے فکر سے سوچ سے۔ ہر بھاری چیز سے۔ اور اب میں اسی دنیا میں ہوں جہاں کیف۔ مستی۔ مسرت۔ سعادت اور سرور کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہاں رہنے والوں کا اوڑنا بچھونا تک یہی چیزیں ہیں۔

پتاجی مجھے بہت پیار دلارا چاہنے کے ساتھ ساتھ آزاد خیال بھی تھے۔ اس لیے مجھے کیلاش سے ملنے میں کسی روک ٹوک اور پابندی نے میرا رستا نہیں روکا۔ رفتہ رفتہ وہ میرے کلاس فیلو کی حیثیت سے ہمارے گھر بھی آنے جانے لگا۔ وہ ایک معتبار اور سمجھدار طالب علم تھا اس لیے پتاجی کے دل میں بھی اس نے گھر کر لیا تھا۔ ہم بلا کسی روک ٹوک کے سارا سارا دن ایک دوسرے کے ساتھ گذارنے لگے۔ ہر پروگرام مشترکا بننے لگا۔ محبت کے مدارج طے ہونے رہے۔ ہم پر لگاتار بھی اٹھنے لگیں۔ ہم جماعتوں نے آوازوں کی زد میں بھی لے لیا۔ کالج کا ماحول ہم دونوں کی باتوں سے گونج گیا لیکن ہم مگن تھے۔ اپنی اندھی دھن میں۔ میرا خیال تھا کہ کیلاش مجھے اس سے بھی زیادہ چاہتا ہے جتنا میں اسے۔ وہ میرے بغیر زندا نہیں رہ سکتا وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ دنیا ہمیں کبھی جدا نہیں کر سکتی۔ محبت کے اسی یقین میرے ارادوں کو پختگی اور عزم کو رفعت بخش دی میں نے ہر قیمت پر کیلاش کا ساتھ دینے کا تہیا کر لیا۔

پینگیں بڑھتیں ۔۔۔ اور بڑھتی ہی گئیں۔ مراحل طے ہوتے رہے ہم ایک خیالی دنیا میں بہت دور نکل گئے۔ بہت آگے۔ جہاں صرف رنگینیاں ہیں۔ پاکیزگی ہے۔ بلندی ہے۔ محبت ہے ۔ مٹھاس ہے۔ حسن ہے۔ نفاست ہے۔ اور دنیا کی برائیوں میں سے کوئی برائی وہاں جھانک بھی نہیں سکتی۔ رنج و غم اپنا پرتو بھی اس دنیا پر نہیں ڈال سکتے اسی دنیا میں میں نے ایک

محل بنایا تھا۔ بہت اونچا۔ بہت بلند و بالا۔ بڑی مضبوط نیادوں والا۔ نہایت مستحکم۔ لیکن۔ لیکن۔ وہ محل۔ میں اس کے دروازے تک بھی نہ پہنچ سکی۔ وہ فضا مجھ سے بہت جلد چھن گئی۔ اس دنیا سے مجھے نکال کر پھینک دیا گیا۔ اور مجھے ہمیشا ہمیشا کے لیے ایسی دنیا سے واسطا پڑ گیا جہاں گندگی ہی گندگی ہے۔ مکروہ گندا متعفن گندگی ——

سردی آگئی تھی۔ شروع سردی کی بارشوں نے موسم کو بڑی تازگی بخشی تھی خشگوار ہوا بدن میں امرت گھول رہی تھی۔ اتوار کا دن آیا۔ ہم نے ہر چھٹی کے دن کی طرح کوئی دل چسپ پروگرام بنانے کی ٹھانی اور طے پایا کہ تمام دن ریاض آباد کے میلے سے لطف اندوز ہو کر شام کو ساحل سمندر کی سیر کرتے ہوئے واپس ہو جائیں۔ کالج کے دوسرے لڑکے لڑکیوں نے بھی میلاد دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا اس لیے خوب لطف رہا لیکن واپسی پر کیلاش نے سب کا ساتھ چھوڑ کر کار کو ایک انجانے سے ویران رستے پر ڈال دیا۔ سورج غروب ہونے کا منظر ایک ویران جگہ ساحل پر بیٹھ کر دیکھا۔ سورج غروب ہو گیا۔ تاریکی نے اپنی زلفیں کھول دیں۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ میرے اصرار کے باوجود کیلاش نے واپسی کا نام نہ لیا۔ اس پر تو اس دن شیطان سوار تھا۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا گیا۔ اس کے محبت بھرے انداز میں کرختگی آتی گئی۔ اس کی لطیف آغوش جبر سے تنگ ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شیطنت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا متنفس شعلے برسانے لگا۔ اور میں۔ ایک غریب عورت۔ بے چاری اور مجبور عورت —— ہزار انکار اور مزاحمت کے باوجود ہماری پاک محبت کا واسطا دیکر بھی میں اس کے شیطانی جذبے سے محفوظ نہ رکھ سکی ——

سردی کا موسم تھا اور میں اب تک برآمدے میں بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے جبر پر کپکپی طاری کر دی۔ اور وہ تو بالکل ٹھٹھر کر رہ گئی۔ میں نے کہا "چلو اندر میرے کمرے میں —— یہاں تو سردی ہے۔"

"پاپوجی!" وہ ڈری ہوئی التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ڈرو نہیں۔ اسے اپنا گھر سمجھو" میں نے اس کی ڈگمگاہوں کی بات سمجھ کر کہا۔

ہم کمرے میں پہنچ کر ہم انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ پھر زمین پر بیٹھنے پر مصر تھی۔ لیکن میں نے اپنی بات منوا لی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر یوں دیکھنے لگی جیسے سے بہت دنوں بعد کوئی گم شدا چیز مل گئی ہو۔

"آپ کتنے اچھے ہیں پاپوجی!" اس کی آنکھیں تشکر کے جذبے سے پرنم ہو گئیں۔

"ابھی سے رائے قایم کر لی تم نے؟" میں مسکرایا تو اس کے لب بھی پھیل گئے۔

"ہاں پھر کیا ہوا۔؟" اس کے پھیلے ہوئے لب سکیڑ گئے۔ چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔ اور بولنے کی کوشش میں یوں معلوم ہونے لگا جیسے اس کا زخم چھیلا جا رہا ہو۔

"جب سے کیلاش نے گویا دنیا کی ہر چیز چھین کر اور مجھے اندھی کھائی کے کسی اندھیرے غار میں پھینکنے کے لیے چھوڑ دیا تھا یہ غم میری جان کھائے جا رہا تھا۔ صحت پر بھی اثر پڑا۔ اور تعلیم پر بھی۔ اگرچہ امتحانات تک کیلاش اپنی سہانی اور لبھا دینے والی باتوں وعدوں اور عہد و پیمان بہت موجود تھا وہ ہر طرح میرا دل بڑھانے اور ہمت بندھانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جس ذہنی دھچکے نے میرا سب کچھ تباہ کر دیا تھا اس کی تلافی وہ نہ کر سکا۔ امتحان کے بعد کیلاش مجھے تمام عمر اپنے اوپر آنسو بہانے کے لیے چند حسین وعدوں کے سہارے چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔

کیلاش ایسا گیا کہ اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے تمام وعدے رکھے رہ گئے۔ اس کے عہد و پیمان دھجیاں بن کر میری آنکھوں میں قوس قزح کی صورت پھیل گئے۔ اس کی قسمیں انجان ماضی کی نادان باتیں بن گئیں۔ نتیجا آیا۔ اس نے سکنڈ کلاس حاصل کیا تھا۔ اور میں۔ میری بھیانک تباہی کا دور شروع ہو چکا تھا میں پاس کیوں کر ہوتی؟ اس نے دنیا کے سامنے سرخرو ہو کر جنت

حال کی اور مجھے ہمیشہ کے لیے دوزخ کے سپرد کر گیا۔ اس نے مڑکر ایک نظر بھی مجھ پر نہیں ڈالی۔ کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ کبھی پوچھنے تک نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ میری خوش بختی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ اور بدبختی میں انسان کا ساتھی کون بنتا ہے اسے معلوم تھا کہ وہ گناہگار ہونے کے باوجود دنیا کو اپنی بے گناہی کا دھوکا دے سکتا ہے۔ لیکن بے چاری غریب عورت۔ جو بے گناہ ہونے پر بھی بے گناہ نہیں ہوتی جس کا کلنک اشتہار بن جاتا ہے۔ جس کی بدنامی کو اس کی پاکدامنی بھی کم نہیں کر سکتی۔ جو۔ جو۔۔۔"

اس کی آواز رندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے پانی کا گلاس منگوایا۔ دو گھونٹ پانی پی کر وہ سنبھلی۔

"بابوجی! جب مجھے یقین ہو گیا کہ کیلاش اب کبھی مجھے پوچھنے نہیں آئے گا۔ اگر کہیں اچانک سامنا ہو بھی گیا تو وہ پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔ اب میرا راز کسی طرح بھی چھپائے نہیں چھپتا تھا۔ اور مجھے ہر حالت میں کچھ کرنا تھا۔ ایک رات میں نے اپنی اچھی کپڑوں میں ضروری چیزیں۔ کچھ کپڑے۔ روپے پیسے۔ زیور رکھے اور اپنے گھر کو ایک حسرت بھری الوداعی نظر سے خیرباد کہہ کر اسٹیشن کی راہ لی۔ اور جو گاڑی پہلے جانے والی تھی اسی کا ٹکٹ خرید لیا۔

میرے پاس زیور اور نقدی کافی تھی۔ لیکن مصیبت اکیلی کب آتی ہے۔ اس کے جلو میں تو طوفان اور زلزلے ہوتے ہیں۔ میں بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ایک نرسنگ ہوم میں تھی کہ میرا اچھی کیس چوری ہو گیا۔ اور میں ایسی رہ گئی جیسی آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔ اس کے بعد میری قسمت میں سوائے ٹھوکریں کھانے کے اور تھا ہی کیا۔ شاید میں مرجانا پسند کرتی اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی لیکن ایک ننھی سی جان کے خیال نے مجھے اس حد تک گرنے پر بھی مجبور کر دیا جس سے زیادہ نیچا ہونا شاید ممکن نہیں۔ ملازمت کی بہت کوشش کی۔ لیکن بابوجی! ایک بے سہارا عورت کے لیے اس کی سب سے بڑی مصیبت جو ہے۔۔۔ جوان عورت تمام دنیا کا چیا چیا گھوم جائے۔ اسے بھیڑیوں کی فوجیں قدم قدم پر مل جائیں گی۔ لیکن انسان کوئی نہیں ملتا۔ ملازمت کے لیے میری قابلیت اور اہلیت کو کسی نے نہیں جانچا صرف جوانی اور حسن کو معیار بنایا۔ اور جب میں نے اس ترازو میں تلنے سے انکار کر دیا تو مجھے دھتکار دیا گیا۔ مجھے ہر جگہ سے دھتکار مل بابوجی! اور جب میری چھاتیوں میں دودھ کی بوند بھی نہ رہی اور میرے پھول سے بچے کی جان کا سوال پیدا ہوا تو میں نے خدا آسمان کی سطح سے زمین پر گرا دیا۔ میرا ہات رہگیروں کے آگے پھیل گیا۔ میں بھیک مانگنے لگی۔ لیکن یہ دنیا ہے نا بابوجی یہاں ایک جوان عورت کو مظلومیت اور غربت میں بھی ہمدردی میسر نہیں آتی۔ اگر وہ اپنی جوانی کا معاوضہ پیش نہ کرے جوانی کے خون کو ہوس کے ہونٹوں کی سرخی بنانے والی عورت ہفت اقلیم کو پاؤں کے نیچے روند سکتی ہے۔ لیکن ایسا نہ کرنے والی عورت سے ہمدردی کے ایک لفظ کی بھی حقدار نہیں سمجھی جاتی۔ چاہے نزع کی حالت میں ہو۔ اسے ایک چلو پانی بھی نہیں مل سکتا۔ اس کی "عورت" بازاروں میں رسوا ہوتی پھرے اسے ایک روٹی کا ٹکڑا میسر نہیں آ سکتا۔ چاہے اس کا پھول سا بچا بلک بلک کر دم توڑ دے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا بابوجی مجھے بھیک کسی نے نہیں دی۔ اور سودا ہر ایک نے کرنا چاہا۔ اور کل رات کو میرا بچا۔ پھول سی جان۔ بھوک کے مارے میری چھاتیوں کو چھوڑتا ہوا سردی سے ٹھٹھر کر رہ گیا۔ اور میں۔۔۔۔۔"

اور اس کی سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے دھارا بہ بند گئی۔ میں نے اس کو سہارا دیا۔ اور اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اب میرے ہی گھر میں رہے گی۔ مگر ایک بہن کی طرح ــــ یہ سنتے ہی اس نے چلا کر "بھائی" کہا اور خشی سے اس کے آنسو ٹپک پڑے۔ وہ حسرت بھری نظروں سے میری طرف گھورنے لگی۔ میں نے کہا "ہاں بہن تم اب اپنے بھائی کے ساتھ رہو گی!

کتھاکلی

ام۔ مکندراج

کتھاکلی ایک اداکاری اور سوانگ کا فن ہے اس میں اشاراتی زبان کا ایک ذخیرا ہے اس کے اداکاروں کی تین اقسام ہیں سانوک راجسک تامسک کتھاکلی کی نمایش کے لیے ان تینوں اقسام کے بھیس بہروپ ضروری ہیں دوسرے ناچوں کے مقابلے میں کتھاکلی میں ایک نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ اس میں بہت زیادا بھیس بہروپ بھرنا پڑتا ہے اس کے لیے جن کہانیوں کا ناٹک کیا جاتا ہے ان میں سے بیشتر رامائن اور مہابھارت سے لی گئی ہیں۔

کتھاکلی تین فنون لطیفا کا امتزاج ہے۔ ابھینیہ (اداکاری) نرتیہ (رقص) اور گیت (موسیقی) یہ ایک چپ سوانگ ہے۔ جس میں اداکار نہ گاتے ہیں اور نہ ہی بکے گاتے ہیں۔ بلکے ہاتوں اور چہروں کے مناسب اور دل کش اشاروں سے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ جنہیں اس فن سے نا آشنا اشخاص بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اس فن کا وطن کیرالا ہے لیکن اس کی ابتدا کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ اتری کیرالا میں ایک روایت ہے کہ یہ کوزی کوڈ اور کوٹا کار کے دو قدیم حکمرانوں کی سیاسی عداوت سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے کہ کوزی کوڈ کے راجا زمورن نے ایک مذہبی ناٹک بہ عنوان "کرشن نایم" کا تمام کیا۔ جو مقبول عام ہوا اور کوٹا کار کے راجا نے زمورن راجا سے یہ درخاست کی وہ اپنے اداکاروں کی پارٹی اس کے دربار میں بھیجے۔ زمورن راجا نے یہ درخاست منظور نہ کی جس سے کوٹا کار کے راجا نے ایک دوسری قسم کے ناٹک "رام نایم" کا اہتمام کیا۔ بعد میں یہی ناٹک کتھاکلی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ دکنی کیرالا میں کتھاکلی کی ابتدا کے متعلق جو روایت ہے وہ اس سے بلکل الٹی ہے۔ اس کے برابر پہلے "رام نایم" ہوا اور اس کے بعد "کرشن نایم" ہوا ان دونوں کی تاریخوں کے بارے میں جو تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق "رام نایم" ۱۶۸۳ء اور ۱۷۹۱ء کے درمیان اور کرشن نایم ۱۶۵۳ء میں لکھا گیا۔ بہرحال یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ کتھاکلی ایک بہت قدیم رقص ہے۔

کیرالا میں اس کا رواج اس قدر عام رہا کہ قریب ہر اونچے خاندان میں کتھاکلی اور اداکاروں اور گائیکوں کی اپنی پارٹی ہوتی تھی۔ لیکن مغربی تعلیم کے رواج اور اثر کے بعد تعلیم یافتا اور نوجوان طبقا اس پر ناک بھوں چڑھانے لگا اور ماضی قریب میں اس کا رواج بھیکا پڑگیا۔ اب حالات نے پھر کروٹ لی ہے۔ اور روشن خیال طبقے میں اس کی تجدید کرنے اور اپنے فنون کی قدیم شان و شوکت کو پھر سے تازا کرنے کا رجحان ترقی پا رہا ہے اس میں کیرالا کے مہاکوی

ولاٹھول کی مساعی کو بہت دخل ہے۔ انہوں نے چند دوستوں کی مدد اور تعاون سے نومبر ۱۹۳۰ء میں کیرالا کلامنڈلم کتھا کلی انسٹی ٹیوٹ قایم کیا۔ جو آج اس فن کا ایک مشہور اور با اثر ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس فن کی تعلیم اور تربیت کے لیے ماضی قریب تک کیرالا کے رؤسا کے زیر اہتمام کئی اسکول بھی چلتے تھے۔ اب ان میں سے صرف دو ہی موجود نہیں۔ ایک کیرالا کا منڈلم اور دوسرا کوٹا کلی کا اسکول جیسے سورکیہ ولیدرتنم پی۔ ایس ویر نے قایم کیا تھا۔

کتھا کلی پر سب سے پہلے شاید کوی کوٹا رکے راجا نے کتابیں لکھیں۔ ان کی کہانی راماین سے متعلق ہے اور اس کا پورا ناٹک آٹھ راتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس ناچ کے متعلق اب تک ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابوں کا علم ہوا ہے جن میں سے دو درجن بے حد مقبول ہیں۔ ان کی زبان ہر طرح سے جدید ملیالم کے اصل سے میل کھاتی ہے اور ادبی لحاظ سے بہت عالا ہے۔

بھیس بہروپ کتھا کلی کی کہانیاں راماین، مہابھارت اور دوسرے ہندو پوران سے لی گئی ہیں اس لیے ان کے کردار روایتی دیوتاؤں کی نیابت کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا بھیس بہروپ متعلقہ ضرورتوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس میں ڈرامائی آرٹ کے جدید نظریے اصلیت نگاری کے اصولوں کو دخل نہیں۔ ان کرداروں کی کئی اقسام اور لتعداد بلے شمار ہے ان کی نمایندگی کے لیے بھیس بہروپ کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ بہر حال یہ طریقہ پیچیدہ اور بناوٹی ہونے کے باوجود بڑا پر اثر ثابت ہوتا ہے۔

کتھا کلی کے فن میں ناٹک اور ناچ دونوں کو دخل ہے لیکن بنیادی طور پر اس کا تعلق ناٹک سے ہے۔ ابھینیہ (اداکاری) اس پر غالب ہے لیکن اس کی نوعیت عامیانہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق تخیل اور تصور کے ان نظریوں سے ہے جن کا ذکر بھارت مین نے کیا ہے۔ ہر جذبے کو ایک کامل صورت تک پہنچایا جاتا ہے اور ــــ چہرے پر اس وضاحت سے دکھایا جاتا ہے کہ گفتار کی عدم موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ چہرے کے ہر رخ کو ناچ کے تناسب اور موسیقی کی لے سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔

کتھا کلی میں اداکاری صرف داخلی جذبات کا اظہار نہیں ہوتی۔ بلکہ گرد و پیش کے افراد، مناظر، مخلوق اور اشیا کا معروض حاصل ہوتی ہے۔ کتھا کلی کا ایک اداکار کسی چیز کو پیش کرتے وقت ظاہر و باطن میں ہی چیز رچا بسا کی کوشش کرتا ہے۔

اس فن میں سب سے عجیب چیز وہ اشارے "یا مدرا" ہیں جو اس میں اختیار کیے جاتے ہیں۔ ان اشاروں سے زبان کا کام لیا جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ رقص اور ڈراما کے بہت موافق ہے۔ پس پشت موسیقار مکالمے کو گا کر ادا کرتے ہیں اور ان کی تشریح اداکاروں کے اشاروں سے کی جاتی ہے۔ اس سارے مظاہرے میں ایک لیا تال میل رہتا ہے کہ ہر حصا کل کا ایک لازمی جزو بن جاتا ہے۔

اشاروں کی زبان کے متعلق ہست لکشن دیپک نامی کتاب کو کتھا کلی کی "مدراؤں" کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے اس کتاب میں چوبیس بنیادی مدراؤں کا ذکر ہے ان سے سالہا سال میں سات سو "مدراؤں" کو ترقی دی جا چکی ہے اور آج کل ان سب کا رواج ہے۔ عصر حاضر میں ناٹیہ اچاریا پی کے کنجو کروپ کو مدرا اور ابھینیہ کے فن کا سب سے بڑا استاد سمجھا جاتا ہے ان کے چیلوں میں گوپی ناتھ۔ مادھون آنند، شورام اور کرشنن نایر ایسے مشہور رقاصوں کے نام شامل ہیں۔

کتھا کلی کے ساز منگلیت میں دو کا تک بھی ہوتے ہیں ایک چنگ آلا (ساز) کے ساتھ سر تال کو برقرار رکھتا ہے اور دوسرا ایلا تھلم (ساز) کے ساتھ پہلا ایک طرح کا ڈھولک ہے اور دوسرا دکنی بھارت کے مردنگم کی طرح ہوتا ہے۔ کہانی کے تمام مکالموں کو [illegible] سے بلند آواز سے گایا جاتا ہے اور ان کی ادائیگی کے لیے خاص طور پر تربیت یافتہ گلوکار ہوتے ہیں۔ کتھا کلی کا تعلق کیرالا کی مارشل قسم سے ہے جس کی ابتدا ایک [illegible] سے ہوتی ہے۔

ہم امن چاہتے ہیں

(روسی گیت (الگزنڈر زاروف)

ترجمہ ایاز عصمی

لوگو! بگل بج اٹھا!
امن کی جنگ شروع ہوگئی
آؤ اس جنگ میں شریک ہوجاؤ
آؤ ہم ایک ہوکر، متحد ہوکر
دنیا سے جھگڑے تکرار اور جنگ کا خاتمہ کردیں
یہی ہماری خواہش ہے، دلی تمنا
اور اسے ایک دن پوری ہونا ہے
یہ پوری ہوکر رہے گی۔

کورس ..... ہم امن چاہتے ہیں!
ہماری یہ تمنا پوری ہوگی
دنیا میں امن کا راج ہوگا
تمام لوگ خوشی سے ناچ اٹھیں گے۔
کوئی بھی پیچھا نہ بیٹھے گا۔
کوئی بھی ہونٹ خاموش نہ رہے گا۔
ہر طرف گیتوں کے زمزمے اور خوشیوں کی ہریالی ہوگی
مگر آج بھی تو ہمارے ہونٹوں پر ایک گیت ہے۔
وقت کا سب سے اہم گیت۔
کہ لوگو! متحد ہوجاؤ
امن کی جنگ میں شریک ہوجاؤ

ہم دنیا کو ان دشمنوں سے نجات دلائیں گے
ہم جنگی کتوں کا مقابلہ بے جگری سے کریں گے
ہمارے حوصلے بلند ہیں اور عزائم پختا
"جیت یقیناً ہماری ہوگی۔

سنو! وہ بگل بجا!
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر
دوستی اور محبت کے بندھنوں میں خود کو جکڑ لو
انسانیت کے ناپاک دشمن پر ٹوٹ پڑو
اسے مار گراؤ
ایسا کہ وہ کبھی بھی اٹھ نہ سکے۔

کورس ..... مضبوط اتحاد کے تحت!
ہم غلط لوگوں اور غلطیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے
حق کی جنگ لڑنے والوں کو اندھیری راتوں کا خوف کیسا!
اور پھر دور بہت دور سیاہ آسمان کے اندھیرے سینے سے
وہ چمکدار اور سرخ ستارہ ہماری رہنمائی بھی تو کر رہا ہے۔
راہ بھٹکنے کا خطرہ کیوں! ہم امن کی منزل پر پہنچ کر رہیں گے۔
ہم امن چاہتے ہیں۔ ـــــ امن! امن!! امن!!!

تاج محل

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

حال ہی میں ہندستان گورنمنٹ نے پبلک کی اطلاع کے لیے یہ نشر کیا ہے کہ کئی سالوں کی لگاتار کوشش کے بعد تاج محل آگرا کی مرمت مکمل ہوگئی ہے۔ اور اب اس میں کسی قسم کا نقص و عیب نہیں رہا۔ اور عنقریب گورنمنٹ اس کی تین سو سالا برسی منائے گی۔ یہ خبر بہت مسرت کا باعث ہے۔ پاکستان بننے سے پیشتر میرے پونا میں قیام کے زمانے میں ہندستان گورنمنٹ کی سنٹرل پی ڈبلیو ڈی کے محکمے کے انجینیر عالا جناب خان بہادر محمد سلیمان صاحب نے راقم کی مطبوعہ انگریزی زبان کی کتاب "تاج" کو طلب کیا تھا اور چند امور استفسار کیے میں نے آپ کے جواب میں فوراً جو میری ذاتی معلومات تھیں بہم پہنچائیں۔ اور کتاب مطلوبا بھی ارسال کر دی تھی۔ اسی طرح پونا کے انجینرنگ کالج کے اسٹاف میں سے ماہرین مسٹر گپ چپ۔ مسٹر گوشن وغیرہ جب خان بہادر محمد دین انجینر کے ایما پر آگرا جانے لگے تب بھی انہوں نے مجھ سے مشورا کیا تھا۔ واضح رہے کہ تاج کے گنبد میں جو نقص بیان کیا جاتا تھا اس کا حوالا اورنگ زیب کے خط کتابت میں بھی ملتا ہے جو اس نے اپنے والد شاہ جہاں کو اس کی زیارت کرنے کے بعد لکھا ہے جب کہ تاج اس سے تھوڑا عرصا پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔

میں نے تاج محل آگرا کو ثقافت اسلامی کا بہت بڑا شاہکار تصور کرتے ہوئے اس پر جو تحقیقی مقالا لکھا وہ خوب صورت مبسوط مصور کتاب ہرسل (بلجیم) فرنچ زبان میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہو چکا ہے۔ جس میں قریب دو سو صفحات اور قریب ایک سو ضروری تصاویر بھی ہیں۔ چونکہ آج یہاں طباعت کی بے شمار دقتیں ہیں۔ اس لیے اب تک اسے ہندستانی یا انگریزی زبان میں پیش نہیں کر سکا۔ حالانکہ ہر دو بالکل تیار ہیں۔ احباب کا شکر گذار ہوں کہ ان کا تقاضا برابر جاری ہے توقع ہے کہ عنقریب شایع ہو جائیں گی۔ بہر حال میں ذیل میں چند سطور بطور تمہید تاج کی تین سو سالا برسی کے موقع پر اپنی تحقیقات کا لب لباب پیش کرتا ہوں۔ تاج ۱۶۳۰ء سے شروع ہو کر ۱۶۵۳ء میں اختتام کو پہنچا۔ یعنی پورے سال اوپر تین سو سال آج تعمیر تاج کو گذر چکے ہیں۔ اس لیے میں بھی ہندستان کے جشن تین سو سالا میں اس مختصر مقالا ذیل عنوان "تاج محل" ہدیہ ناظرین کرنا فرض سمجھتا ہوں۔

یہ ایک مسلما امر ہے کہ تاج محل آگرا اپنی بے مثال تعمیری خوبیوں کی وجہ سے عجایبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔ اور انہیں خوبیوں کی بنا پر بہت سی غلط فہمیاں بھی اس کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں۔ افسوس اس امر کا ہے کہ صحی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ اور اصل ماخذ سے روگردانی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے لفظ "تاج" کے متعلق عرض ہے کہ یہ دراصل لفظ ممتاز کی بگڑی شکل ہے۔ جس کا آغاز زیادہ تر گذشتا صدی سے ہوتا ہے۔ ورنا اسے روضہ ممتاز محل کہنا بجا ہوگا ارجمند بانو بیگم جس کا خطاب ممتاز محل تھا شاہجہاں بادشا کی چہیتی بیوی تھی۔ جو نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی بیٹی تھی۔ اس کا انتقال ۱۰۴۰ھ میں بمقام برہان پور ہوا اور اس کی نعش کو آگرا میں لایا گیا۔ جہاں اس کے روضے کی تعمیر جمنا ندی کے کنارے ۱۰۴۰ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰۵۳ھ میں مکمل ہوئی۔

ہندستان میں فن تعمیر خاص کر شاہجہاں کے زمانے میں ہر اعتبار سے اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اس کی

خاص وجہ یہ بھی کہ خدا بادشاہ مذکور کو بچپنے سے تعمیر کا بڑا شوق تھا۔ فن تعمیر اس کے لیے طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ جہانگیر نے خدا اپنی اکثر عمارات شہزادہ خرم (بعد میں شاہ جہاں) کے زیر اہتمام تعمیر کرائیں۔ جیسا کہ باغ شالامار کشمیر وغیرہ۔ مورخین نے جہاں شاہجہاں کے اوقات کاروبار روز روز کی تقسیم کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے عمارات کے نقشے تیار کرانے اور ان میں اس کی گہری دلچسپی کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے ان میں ترمیم اور اصلاح کرتا تھا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بعض عمارات کو اپنی مرضی یا نقشے کے خلاف تعمیر ہوتا دیکھ کر گرا دیا اور از سر نو نقشہ اور ہدایت کے مطابق تعمیر کرایا جس سے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ ضرور ماہر عمارات تھا قدسی شاعر دربار شاہ جہاں لکھتا ہے ؎

عمارات را جملہ بر داشتند منازل در آنجا بر افراشتند
ہمہ طرح جہانزادۂ بلند مشاہ پرندہ بآں ہوش راہ
چیکہ ہندس شہنشاہ دہر دقیقہ رس دور رس بہر

"بادشاہ نامہ" میں شاہجہانی عمارات کی تعمیر کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے مگر تاج محل کے تعلق میں یہ بیان کہیں نہیں ملتا کہ اس کا معمار کون تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ۱۰۳۵ھ کے بیان میں مورخین نے اس روضے کی مستقل تفصیل دی ہے جو آج بھی درست بیٹھتی ہے۔ اس بیان میں دو نام میر عبدالکریم اور مکرمت خاں ملتے ہیں۔ جن کے زیر اہتمام یہ روضا تعمیر ہوا۔ ادھر تاج کے گنبد کے اندر امانت خاں شیرازی کا نام ملتا ہے جس نے خط نسخ میں کتبات جو آیات قرآنی پر مشتمل ہیں، اسی نے لکھے ہیں جیسا کہ الفاظ عبارت سے بھی واضح ہے۔

"بادشاہ نامہ" میں مذکور ہے کہ جب ۱۰۴۶ھ میں دلی میں شاہ جہاں نے لال قلعہ اور نئے شہر شاہجہاں آباد کی بنا رکھی ان کی تعمیر کا کام احمد اور حامد دو معماروں کے حوالے عزت خاں کی نگرانی کیا جو اس زمانے میں اپنے فن میں یکتا تھے۔ اور ان عمارات کا بھی میر عمارت مکرمت خاں شیرازی تھا۔ اس لیے ہمیں اس موقع پر واضح کر دینا چاہیے کہ اگر ان دو معماروں احمد و حامد کا تعلق تاج کی تعمیر سے بھی تھا تو "بادشاہ نامہ" میں بالضرور تاج کے بیان میں ان کا بھی ذکر ملتا ہر دو "بادشاہ نامہ" اور عمل صالح شاہجہاں کے عہد کی مستند تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر چہ احمد معمار کے فرزند لطف اللہ مہندس نے اپنے اشعار میں یہ دعوا کیا ہے کہ روضہ ممتاز محل میرے باپ نے تعمیر کیا تھا۔ مگر اس کی تصدیق کسی اور شہادت سے نہیں ہوتی۔

ایک مغربی سیاح پادری منیرق ہندستان میں تاج کی تعمیر کے وقت سیاحت کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ حج سے پادری ڈی کاسٹرو نے فیام لاہور کے زمانے میں بیان کیا کہ روضہ ممتاز محل کا ایک معمار ایک اطالوی وینس کا باشندہ جیرونیو ویرونیو تھا۔ مگر اس کی تصدیق کسی دوسری تاریخی شہادت وغیرہ سے نہیں ہوتی۔ یہ ضرور ملتا ہے کہ یہی جیرونیو ویرونیو ہگلی کا لکتا کی لڑائی میں شاہجہاں کے خلاف پرتگالیوں کا مددگار تھا بعض اسے جوہری بھی کہتے ہیں۔ مگر اس کے معمار ہونے کے متعلق کہیں کوئی روایت نہیں ملتی بے شک اس کی تصاویر آگرا میں موجود ہے اسی طرح ایک اور فرانسیسی موسیو آسٹن ڈی بورڈو کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تاج تعمیر کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص ہندستان میں جہانگیر کے زمانے میں شاہی ملازمت میں تھا اور توزک جہانگیری میں موجود ہے کہ اس کو اپنی کارکردگی کی وجہ سے ہنرمند کا لقب بھی دیا گیا تھا جب شاہ جہاں کا زمانہ آیا تو دربار سے اس کے تعلقات بدستور قایم رہے بلکے بادشاہ نے ایک مرتبا سفارت پرتگالیوں کے پاس بھی بھیجا تھا۔ مگر انہوں نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اور یہ واقعا ممتاز محل کی وفات سے پہلے وقوع میں آتا ہے اس لیے محال ہے کہ تاج کی تعمیر سے اس کا تعلق رہا ہو۔ جب تاج زیر تعمیر تھا اتفاق سے بہت سے یورپین سیاح ہندستان میں موجود تھے جن میں دو سیاح برنیر اور ٹیورنیر فرانسیسی قابل ذکر ہیں

ان کے سفرنامے بھی طبع ہو چکے ہیں۔ اور دونوں اس کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں۔ اور تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کامل طور پر مشرقی عمارت ہے جس کی نظیر یورپ میں کبھی نہیں اگر کوئی یورپین ماہر تاج کی تعمیر پر مقرر ہوتا تو یہ لوگ ضرور ذکر کرتے۔

گذشتہ صدی سے ہمارے سامنے ایک استاد عیسیٰ کا نام پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے تاج تعمیر کیا اور نقشہ بنایا اس کا نام دراصل ایک گائیڈ میں ملتا ہے جو آگرہ کالج کے طلبا نے ۱۸۲۵ء میں تیار کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ ایک شخص مانک چند نامی اس کا مصنف ہے جو آگرہ کالج کا ایک طالب علم تھا۔ اور اس کے یہ شمار قلمی نسخے قریب قریب ہر لائبریری میں موجود ہیں۔ راقم کے پاس بھی چھ سات ہیں، برٹش میوزیم کے نسخے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ آگرہ کے مجسٹریٹ مسٹر لشنگٹن کے ایک استفسار کے جواب میں تالیف ہوا تھا جس کے فی الطلب طلبا آگرہ کالج تھے مگر اس کو عہد شاہجہانی سے کوئی تعلق نہیں اس میں کاریگروں کی فہرست میں ایک استاد عیسیٰ کا نام بھی ملتا ہے۔ نہ معلوم اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ نسخہ جس قدر مشہور ہے۔ اسی قدر ناقابل اعتبار ہے۔ یورپین مصنفین نے اس استاد عیسیٰ نام کا اس رسالے کا تڑجما کرتے وقت ایک کر سچین لکھا ہے۔ مجھے ایک نسخہ متعلقہ تاج پیرس کے کتب خانہ ملی میں ملا جس میں روضے کی پیمایش اور مصارف درج ہیں۔ یہ نسخہ قدیم اور صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے میں نے اسے الگ شائع کر دیا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت آخر میں ماہ ربیع الاول ۱۱۲۸ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ دراصل تمام روضہ ممتاز محل کی تفصیلی یادداشت ہے جو بعد تیاری روضہ کے تیار کی گئی ہے اور یہی اس سے واضح بھی ہے۔

ان تمام حالات کے بیان کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تاج محل کس نے تعمیر کیا۔ اور اس کا نقشہ کس نے بنایا میں اپنی تحقیقات کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کا معمار شاہ جہاں بذات خود ہے جو اپنی بیوی کا روضہ اپنی مرضی کے مطابق تیار کرا سکتا تھا جبکہ وہ خود بہت بڑا ماہر تعمیر تھا جیسا کہ تاریخ عہد میں ملتا ہے۔

تاج کے نقش کے نقش و نگار کی طرز پر چین کاری پر بھی حملا کیا جاتا ہے کہ یہ طالوی اصل ہے جو سراسر غلط ہے واضح رہے کہ مسلمانوں نے اپنی عمارات کو ابتدا سے ہی نقش و نگار سے مزین کیا ہے خصوص اس قسم کے نقش و نگار جو پتھر کی سطح پر کھود کر رنگین پتھر کاٹ کر بھر دیے جائیں۔ ہندستان میں سب سے اولی اس قسم کے نقش و نگار احمد آباد کی جامع مسجد مانک چوک کے محراب میں ملتے ہیں۔ جو ۸۱۴ھ میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے بعد یہیں سلطان ہوشنگ غوری کا روضہ ۸۳۷ھ ماندو ہے جسے سر جان مارشل نے بھی تاج کی پرچین کاری کو خالص مسلمانوں کا فن ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ غرض کہ یورپین یہ طرز فن بنام پیترا ڈورا سولہویں صدی عیسوی یعنی بہت بعد میں رائج ہوا ہے

تاج محل میں جو چیز زیادہ دلکش ہے وہ اس کی ہمہ گیر موزونیت اور منظم ہے جو زیادہ تر اس کے امرودی گنبد نے پیدا کی ہے جس کی مثال دنیا بھر کے عمارات میں نہیں ہے پھر اندرون تعمیر میں یہ گنبد دہرا ہے یعنی اس بیرونی گنبد کے اندر ایک اور گنبد ہے اسی عمارت تاج میں زیر زمین سرداب ہے جو قبر ممتاز الزمانی کا صحیح مقام ہے اگر ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ہر دو امور دہرا بلب نما گنبد اور زیر زمین سرداب برائے قبر جو مغلوں نے اپنی شہزادیوں کی قبور کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ سمرقند سے روضہ تیمور جسے گور امیر کہتے ہیں آئے ہیں، کے نقش قدم پر ہی یہ گور امیر در اصل تیمور نے قدانی زوجہ بی بی خانم کے لیے اول تعمیر کیا تھا جس میں وہ بعد میں خود دفن ہوا۔

غرض کہ تاج محل اپنی تمام تعمیری اور فنی خوبیوں کی وجہ سے دنیا بھر میں عجائبات روزگار میں شمار ہوتا ہے اور دنیا کی عمارات میں بلکل ایک الگ درجہ رکھتا ہے اور میرے نزدیک ثقافت سلامی کا مظہر بھی ہے۔ اور جس طرح اسے دنیا بھر میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح اس کے متعلق ان کی وجہ سے اس کے گرد کئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا ازالہ ضرور ایک مشکل امر ہے تاہم راقم نے اپنی کتاب تاج محل میں جو عنقریب شائع ہوگی ہے تمام امور کو صراحت سے بیان کرنے اور وضاحت کی کوشش کی

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

جیبا یوسف

یعقوب نوشیروان

ان معمر خاتون کو جن کے سینے پر لینن تمغا جگمگا رہا تھا میں نے پہلی بار پرانے شہر میں دیکھا تھا۔ تاش قند کا ایک محلا اب بھی پرانے شہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انقلاب کے بعد اس کا نقشہ اتنا بدل گیا ہے کہ اب تو یہی نام بھی نہیں جانتا۔

یہ خاتون پختا شاہراہ پر آہستہ آہستہ ٹہلتی جا رہی تھیں بہت سے رستا چلتے والے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان کو بڑے ادب سے سلام کرتے جاتے تھے۔ مقامی باشندے جس احترام کے ساتھ ان کو دیکھا کرتے تھے اس سے بخوبی اندازا ہوتا تھا کہ اس خاتون کی بڑی قدر و منزلت ہے۔

ہم ایک بوڑھے ازبکستانی کے پاس گئے جو اپنے نئے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا اور سوال کیا "وہ خاتون کون ہیں؟"

اس نے متعجب نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر محسوس کرتے ہوئے کہ ہم کہیں باہر سے آئے ہوئے ہیں بہت آہستہ آہستہ اور پر وقار و پر فخر لہجے میں جواب دیا۔

"وہ جیبا یوسف ہیں، ہمارے بچوں کی استانی اور ہمارے حلقے کی ممبر۔۔۔۔۔"

وہ بوڑھا شخص یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور اس کی نگاہیں نیلے رنگ کی ایک دو منزلا عمارت کی طرف اٹھ گئیں جس میں لڑکیوں کا ثانوی اسکول واقع ہے۔ اس کی نگاہیں گویا زبان حال سے کہہ رہی تھیں۔

"جاؤ، اس عمارت میں جاؤ و سنو! جہاں جیبا یوسف پچھلے بتیس برسوں سے پڑھا رہی ہیں۔ وہیں لوگ تمہیں ان کے نیک کاموں کے متعلق بتائیں گے جن کی بدولت لوگوں میں ان کی اس قدر اور عزت ہوتی ہے۔"

اس اسکول میں جہاں سات سے سترا برس تک کی عمر کی ایک ہزار ایک سو ازبکستانی لڑکیاں ثانوی تعلیم حاصل کر رہی ہیں مقصود عاصم نے ہمارا پرجوش خیر مقدم کیا۔ وہ اس اسکول کے ڈائرکٹر ہیں۔ جب مقصود کو معلوم ہوا کہ ہمیں جیبا یوسف کی زندگی اور کارناموں سے دلچسپی ہے تو انہوں نے بتانا شروع کیا۔

"جیبا یوسف کے متعلق بتانے کو بہت کچھ ہے اور سب اچھا ہی اچھا ہے انہوں نے ازبکستانی بچوں کو ۱۹۱۴ء گرامر پڑھانی شروع کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر سترا برس کی تھی۔ انہوں نے ایک اسکول ماسٹر سے شادی کر لی جو ایک دیسی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ پرانے تاشقند میں ازبکستانی بچوں کے لیے جو تباہ حال اسکول تھے ان کو دیسی اسکول کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اپنے شوہر کے ساتھ مل کر انہوں نے بھی بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ رستم بیگ یہ ان کے شوہر کا نام تھا۔ اور جیبا دونوں متضاد مزاج اور دھن کے پکے نوجوان تھے انہوں نے اپنے لیے جو رستا منتخب کیا تھا اس سے کوئی رکاوٹ اور کوئی مشکل بھی انہیں ہٹا نہ سکی۔ اکتوبر اشتراکی انقلاب عظیم اور تاشقند میں سوویت حکومت کے قیام کے بعد انہیں اپنے مرغوب کام کو جاری رکھنے کے وسیع امکانات مہیا ہو گئے سوویت حکومت نے بہترین عمارتیں اسکولوں کے حوالے کر دیں اور انہیں ضرورت کی ہر شے مہیا کر دی۔۔۔۔۔"

مقصود عاصم نے ایک لمحا توقف کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کوئی پرانی بھولی بسری بات یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ہمارے محلے کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی گرامر جیبا یوسف ہی سے پڑھی تھی۔ یہیں آج سے اکتیس ۳۱

برس پہلے اسی پختہ شاہراہ پر جو اس زمانے میں تنگ و برکی تھی اور موجودہ حالت سے بالکل مختلف تھی میں پہلی بار ایک ازبکستانی مکان کی دہلیز پر گیا۔ جہاں رستم بیگ اور جیبا یوسف رہتے تھے ان کے مکان کے صحن ہی میں ایک ابتدائی اسکول تھا۔

سوویت نظام نے مجھے عالا التعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا۔ میں تاشقند کے دار العلوم سے فارغ التحصیل ہو کر ایک نوی اسکول کا ڈائریکٹر ہو گیا۔ ایک میری عمر چالیس سے زیادا ہے۔ لیکن میں یہ بات کبھی نہ بھولوں گا کہ جیبا یوسف اور ان کے شوہر رستم بیگ ہی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے مجھے علم اور سائنس کی راہ دکھائی۔ میں ہی نہیں بلکہ میرے دوسرے ایکڑوں ساتھی بھی جو اب مدرس، انجنیر، ایکٹر، تاشقند کی فیکٹریوں میں صف اول کے مزدور ریلوے مزدور، سوویت فوج میں افسر ہیں۔ جیبا یوسف کے عقیدت مند اور احسان مند ہیں۔ جیبا یوسف کے نام ان کے سابق شاگردوں کے محبت بھرے خطوط سوویت یونین کے مختلف شہروں سے ہمارے اسکول کے پتے پر آتے رہتے ہیں۔

مقصود حاصم نے آخر میں کہا! "مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ مجھے جیبا یوسف کے ساتھ کام کرنے کی خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ ایک معلما کی حیثیت سے ان کا تجربا نہایت وسیع ہے جسے ہم سراہتے اور برتے کا رلاتے ہیں۔"

مقصود حاصم کے ساتھ ہم اسکول کے کشادا اور روشن پیش دالان میں داخل ہوئے۔ وہاں ہم نے ایک نہایت ہی دلچسپ منظر دیکھا۔ جیبا یوسف چھوٹی چھوٹی بچیوں کی ایک جماعت سے پہلی کلاس والیوں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ اپنی پڑائی کے بعد سات سالا ازبکستانی لڑکیوں نے جو بھڑکدار زردوزی کی ٹوپیاں اور اسکول کی گنجی وردی اور کالے ایپرن پہنے ہوئے تھیں۔ گھر جانے سے پہلے اپنی بوڑی استانی سے پیار و محبت کے وداعی جملے سنے۔

ڈائریکٹر نے جیبا یوسف سے ہمارا تعارف کرایا جنہیں ازبیک جمہوریا کی عزت آب معلما کا خطاب بھی مل چکا ہے انہوں نے اپنی ذہین آنکھوں سے دیکھا جن میں ابھی تک جوانی کی چمک موجود تھی۔ اور گویا چھوٹی بچیوں سے اپنی شفقت کی وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

"یہ عمر مجھے بڑی پیاری لگتی ہے سات برس کی عمر ہی میں بچے اسکول جانا شروع کرتے ہیں۔ نئے سوویت شہریوں کی زندگی کی یہ ایک اہم منزل ہوتی ہے۔ اپنے اسکول پہنچ کر انہیں کتنی مسرت ہوتی ہے پورے دس برس تک کے لیے اسکول ان کا دوسرا گھر بن جاتا ہے۔"

"اور یہ سوویت اسکول اس پرانے اسکول سے کتنا مختلف ہے جس میں بچپن میں میں نے پڑھا تھا۔ لاپروا اور رنگ دل لوگ ان دنوں ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔ اکثر ڈانٹ ڈپٹ کر چانٹے تھپڑ مار مار کر لڑکوں کو اور جو چند لڑکیاں اسکول جاتی تھیں ان کو اکثر مار پڑتی تھی۔"

جیبا یوسف ابتدائی جماعتوں کو پڑھاتی ہیں۔ والدین پورے بھروسے کے ساتھ اپنے بچوں کو بات ان کے مردانا ہات میں دیدیتے ہیں۔ صرف پہلے چند گھنٹے ہی بچا اپنے چاروں طرف کی عجیب ترتیب اور غیر مانوس شکلوں کو بڑے خوفزدا نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی دن بچے کو اس بوڑی خاتون سے لگاو پیدا ہو جاتا ہے۔ جن کی آواز میں بچوں کی آواز جیسی کھنک ہے۔ جو بچوں کے ساتھ مل کر اس طرح ہنستی ہیں کہ بچے اور بھی زیادا لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ جو بچوں سے پیار محبت کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ اور جب وہ بچوں کو ازبیکستانی کہانیاں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں سناتی ہیں تو سب کے سب مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور چپ چاپ بیٹھے سنا کرتے ہیں۔

ازبکستانی لڑکیوں کے لیے دس جماعتوں کا یہ خوبصورت اور کشادا اسکول "پرانے شہر" میں یعنی تاشقند اکتوبر تحفے میں ۱۹۳۴ء میں تعمیر ہوا تھا۔ تب ہی جیبا یہاں کام کرنے

آئی تھیں۔ گذشتہ بیس برسوں میں ہزارہا لڑکیاں نئے اسکول سے نکل چکی ہیں۔ اور وہ سب جیبا یوسف کو ساری عمر یاد رکھیں گی۔ تجربے کار ماہر تعلیم کی حیثیت سے جیبا یوسف کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ ابتدائی چار جماعتوں کی تمام استانیوں کو یکساں طریقۂ تعلیم کے متعلق ہدایات دیں، بچوں کی تعلیم و تربیت کا انہیں جو وسیع عملی تجربہ حاصل ہے اس سے وہ سب کو مستفید کرتی ہیں۔ ان کی تقریریں مدرسین کی ضلع کانفرنسوں میں بھی سنائی دیتی ہیں۔ جو سال میں دو بار ہوتی ہیں۔ جیبا کے تجربے اور ان کے طریق تعلیم سے تاشقند کے سیکڑوں مدرسین برصد شکر استفادہ کرتے ہیں۔

جیبا یوسف تین بچوں کی ماں ہیں اور وہ سب کے سب ذہین ہیں کچھ بچے ممتاز ماہرین بن چکے ہیں اور اپنے ملک کے لیے کارآمد کام انجام دے رہے ہیں۔ اور باقی ابھی زیر تعلیم ہیں۔ ان کی دو بڑی لڑکیاں حمیدا اور جاویدا تاشقند طبی کالج سے فارغ تحصیل ہوکر ازبکستان کی راجدھانی میں ڈاکٹری کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ایک اور لڑکی بادجہاں نے اقتصادیات میں عالا تعلیم حاصل کی ہے ان کے بیٹے یاقوت بیگ نے ہوابازی کے اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ اور اب وہ ہوابار بن گیا ہے۔ ایک اور لڑکا نصیر بیگ ریلوے انجینیر ہے دل بہادر اور حاجیا نے علم تعلیم کے مخصوص اسکول سے آخری امتحان پاس کرلیا اور ان کا لڑکا مرادنا شقند کی درس گاہ موسیقی میں داخل سیکھ رہا ہے ان کے کہنے کے سب سے چھوٹے افراد — لڑکی غیرت اور لڑکا نادری — ابھی ثانوی اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔

تاشقند کے انکتوبر محلے کے اسکول کے آس پاس رہنے والے لوگ جیبا یوسف کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ گذشتہ چوتھائی صدی سے وہ انہیں ایک غیر پارٹی استانی کو ضلع سوویت اور میونسپل کمیٹی کی ممبر منتخب کررہے ہیں۔ جمہوریا ازبکستان نے انہیں عزت مآب معلمہ کا خطاب دیا۔ تعلیم عام کے میدان عمل میں اس کی بے داغ خدمات کے صلے میں سوویت یونین کی مجلس عالا انہیں ملک کا سب سے بڑا اعزاز لینن تمغا انعام دیا۔

اسکول کی استانی جیبا یوسف کی نیک اور پرسکون زندگی کے متعلق صفحے کے صفحے لکھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے مفادات کو ہمیشا مقدم سمجھا لیکن معمار ازبکستانی ماہر تعلیم کی داستان جن کی سب عزت کرتے ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔ اور اس کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو خود جیبا نے اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے۔ جو انہیں لینن تمغا ملنے کی خوشی میں منعقد کیا گیا تھا۔

"ماضی کی طرح مستقبل میں بھی میں عظیم اور آزاد سوویت عوام کی خدمت کرتی رہوں گی۔ عوام کی فلاح و بہبود میں زندگی بسر کرنے اور عوام کی بھلائی کا کام کرنے سے بڑی اور کوئی خوشی نہیں ہوسکتی۔"

آکسفورڈ میں نوآبادیاتی مطالعے کا ایک نیا مرکز

آکسفورڈ میں نوآبادیاتی دفتر اور یونیورسٹی کی مشترکہ سرپرستی میں نوآبادیاتی مطالعے کا ایک نیا مرکز قایم کیا جائے گا۔ سمندر پار کے لوگ و طلبا اور برطانوی باشندے جن کا تعلق سمندر پار کے علاقوں کے مسایل سے ہے۔ اس مرکز میں نوآبادیاتی مسایل پر آزادانا طور پر تبادلا خیالات کرسکیں گے۔ ملکہ نے اس بات پر اپنی رضامندی کا اظہار کردیا ہے کہ اس مرکز کا نام کوین الزبتھ ہاؤس رکھا جائے۔

نوآبادیاتی مطالعے کے مرکز کا قیام ایک لاکھ پونڈ کے اس عطیے سے ممکن ہوگیا ہے جو جنوبی افریقا کے صنعتی کارخانے کے ایک سرارلنسٹ اوین ہرمز نے دیا ہے حکومت برطانیا نے بھی وعدا کیا ہے کہ وہ نوآبادیاتی ترقی و فلاح کے فنڈ سے پچاس ہزار پونڈ کی رقم اس مرکز کے لیے دے گی۔

برطانیا کے صنعتی میلے کی کہانی

جے۔ ال۔ ریڈنگ

برطانیا میں صنعتی میلے منعقد کرنے کا سلسلہ ۱۹۱۵ء میں شروع ہوا تھا۔ پہلا صنعتی میلا رایل اگریکلچرل ہال لندن میں منعقد کیا گیا تھا اور اس کا مقصد برطانیا میں بنائی ہوئی ان چیزوں کی نمایش کرنا تھا جو جنگ کی وجہ سے غیر ممالک سے درآمد نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اس میلے میں ۱۹۱۵ کارخانہ داروں نے اپنی چیزوں کی نمایش کی تھی اور تقریباً ۳۴۰۰۰۰ لوگوں نے اس صنعتی میلے کو دیکھا تھا۔

شروع میں اس میلے کو ہر سال منعقد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن پہلے میلے کی کامیابی سے اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ یہ میلا اب تقریباً ۳۰ سال سے ایک قومی ادارے کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ تقریباً ہر ملک سے ہزارہا خریدار ہر سال اسے دیکھنے کے لیے برطانیا آتے ہیں۔

دوسرا اور تیسرا میلا لندن کے وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم میں منعقد کیا گیا تھا۔ بعد کے دو سالوں میں یہ میوزیم فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اور صنعتی میلا لندن کی گودی کے ایک شیڈ میں منعقد کیا گیا۔ وہاں گودی کے چوہوں اور خراب موسم نے نمایش کرنے والوں اور خریداروں دونوں کو بہت تنگ کیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس میلے کو لندن کے کرسٹل پیلیس میں جگہ ملی۔ اس سال میلے کے شعبے پانچ سے دس کر دیے گئے۔ (آج کل صنعتی میلے میں ۳۱ شعبے پائے جاتے ہیں۔) بھاری صنعتوں کا ایک نیا شعبا کاسل یرو مویچ (برمنگھم) میں کھولا گیا اور اب تک بھاری صنعتوں کی نمایش اسی جگہ کی جاتی ہے۔

۱۹۲۱ء میں ایک نئے شعبہ یعنی ٹیکسٹائل شعبے کا اضافہ کر دیا گیا اور برطانیا کا یہ میلا ایک بہت بڑے نمایشی ہال یعنی وائٹ سٹی (مغربی لندن) میں منتقل کر دیا گیا اور اگلے آٹھ سال تک اسی ہال میں صنعتی میلا منعقد کیا گیا۔ دو سال بعد یہ میلا اولمپیا (لندن) میں منتقل ہو گیا اور آج کل بھی صنعتی میلے کا ایک بڑا حصا وہیں منعقد کیا جاتا ہے۔

اس زمانے میں برآمدات کی اہمیت بہت بڑھ رہی تھی۔ نو سال پہلے اس میلے میں دولت مشترکا کی چیزوں کا بھی ایک شعبا کھول دیا گیا تھا اور اب تک ہر صنعتی میلے میں یہ شعبا کھولا جاتا ہے۔

آج کل کاسل برومویچ (برمنگھم) اور دو لندن کے مرکزوں یعنی ارلز کورٹ اور اولمپیا میں نمایش منعقد کی جاتی ہیں۔ ان تینوں مرکزوں نے تقریباً ۰۰۰،۰۰۰ مربع فٹ جگہ گھیر رکھی ہے۔ ہر سال براہ راست پبلسٹی بعد مختلف ممالک میں برطانیا کے تجارتی افسروں کے ذریعے خریداروں کو میلے میں رکھی جانے والی چیزوں کے متعلق پوری تفصیلات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

۱۹۱۵ء میں صنعتی میلے کی ابتدا ایک معمولی سے پیمانے پر کی گئی تھی اور اس کا مقصد محض ان چیزوں کی نمایش کرنا تھا جو جنگ کی وجہ برطانیا درآمد نہیں کر سکتا تھا اور جن کے بدل برطانوی کارخانہ داروں نے مہیا کر لیے تھے۔ اب تو اس میلے کی شکل ہی تبدیل ہو گئی ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۵۳ء تک کے سالوں کے دوران (دوسری جنگ عظیم کے زمانے کو چھوڑ کر) اس میلے میں تقریباً ساڑھے ہزار مختلف چیزیں رکھی گئی ہیں اور انہیں دنیا کے تقریباً بیس لاکھ لوگوں نے دیکھا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریباً ۱۳۷۱۳ غیر ملکی خریداروں نے اس میلے کو دیکھا ہے ان میں سے ۵۱۰۰ خریدار ۱۲۹ علاقوں سے گذشتہ تین سال کے دوران برطانیا اس میلے کو دیکھنے کے لیے آ چکے ہیں۔

تیکھی کوپل

قمرالدین قمر

ہم سب شہر کے خطرناک پیچیدگی والے سانپوں جیسے رکشوں اور ٹینکوں کی طرح وزنی اور چنگھاڑتی بسوں سے بچ بچا کر آخر ایک ریستوراں میں داخل ہو گئے زندگی کے ہنگاموں سے پریشان اور عارضی جلوت کدے میں پہنچ کر ایک کونے والے ٹیبل پر سب ڈٹ گئے۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد نعیم نے بل کا چندا جمع کیا اور چائے آگئی۔

"بھئی معاملا کیا ہے۔ یہ چندا وندا کیوں؟ بل میں پے کر دیتا!" رشید نے کہا۔

"اماں نہیں یار۔ ہم تمہیں ٹیکس نہیں کرنا چاہتے گو تم اضافی ایڈ کو کے منیجر ہو۔" نعیم نے ٹالنا چاہا۔

"یہ ترقی پسندی ہے بھائی صاحب کہ۔۔۔۔۔۔" اصغر بولا

"خوب رہی، ایسی ترقی پسندی، چندہ آنے اور ترقی پسندی" رشید جھنجلایا۔

"ارے بھائی ہوٹل میں ہو، شریفوں جیسے بیٹھو۔ یہ کوئی اکھاڑا ہے جو آپ لوگ۔۔۔۔۔۔۔"

عابد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

حسن جو چپ چاپ تاک رہا تھا چیخ اٹھا "چائے اگر پی جائے گی تو چندے سے ورنہ واپس کر دی جائے گی۔ کہیے آپ حضرات کو منظور ہے ــــ"

"آپ یلا وجہ بھی گرم ہوتے ہیں، ادھر چائے ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے پی جیے۔" اصغر نے کہا۔ اور چائے کا دور شروع ہو گیا۔ سگریٹ جلے اور دھواں پھر اسی فضا میں پھیلنے لگا۔ گلابی جاڑے میں چا کلیٹی چائے مزا دے رہی تھی اور مقامی ریڈیو اسٹیشن سے کوئی معصوم سی نقرئی آواز فضا میں ترنم اور مدھم مدھم موسیقی گھولنے لگی کلام اقبال کا صرف ایک لفظ سنائی دے رہا تھا۔ "بجلی" اور گہری گمبھیر سی ارتعاش پیدا کر کے گم ہو جاتی۔ کوئی بولا "ارجنٹ گا رہی ہے" تھوڑی دیر کے لیے سب چپ ہو گئے لیکن رشید مسکراتا رہا۔

"اف! کتنی ترقی پسند ہے یہ سکراہٹ" عابد نے چوٹ چلی۔ سب ہنس پڑے۔

"وہ بھائی یہ غیر ترقی پسندانا باتیں چھوڑو بھی ــ" اصغر بولا۔

"ہر بات میں ترقی پسندی! آخر یہ ماجرا کیا ہے یار، تھوڑی دیر کے لیے تو پیچھا چھوڑیے ورنہ یہ ترقی پسندی بے معنی سی ہو کر رہ جائے گی۔" رؤف نے کہا۔

"تب تو ٹھیک ہے گا" عابد نے ملنسر یانہ انداز میں کہا۔

"وہ بھئی مجھے تو رحم آتا ہے۔ آپ لوگوں کے ذہنی توازن پر۔ یا تو آپ صاف کہہ دیجیے کہ آپ کامریڈ ہیں اور اسٹالن کے چیلے یا پھر ہماری طرح نیوٹرل رہیے اگر آپ واقعی ترقی پسند ہیں تو چھ فٹ کو کامریڈ کہیے بال بڑا کر۔ کپڑے پھاڑ کر مجنوں کی شکل بنا کر کامریڈ شپ سے جایئے۔ یہ کیا کہ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔" اصغر بولا۔

"جناب چھپنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ آپ جیسے موقع پرست ہم جیسے جھنجھلوں کو بگڑے دلوں کا علاج کرنے کا موقع نہیں دیتے اور اگر دیتے بھی ہیں تو فوراً حکومت کے سایے میں پناہ ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔ اور قبلا! سامنے اس لیے آنا پڑ رہا ہے کہ ہم وقت اور حقایق کے ہاتوں مجبور ہیں۔" حسن نے بڑی متانت سے تھیکایا۔ رشید کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور ہاتھ کہنی کے بل رکھ کر سمجھدار سنجیدہ انداز میں بولا "دیکھیے حسن صاحب! آپ لوگوں میں ہم بھی تو ہیں۔ جانتے ہیں کہ ہر طرف بدامنی پھیل رہی ہے

بغاوتیں، ہڑتالیں، حاتا حیتگیاں آج کہاں نہیں ہو رہی ہیں۔ بھائی یہ تو پہلے بھی ہوتی تھیں اور آج بھی ہوتی ہیں۔ پھر کونسی نئی بات ہے یہ۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انقلاب کا نقیب یا لیڈر صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ اور باقی لوگ بھیڑوں کی طرح اس کی پیروی کرتے ہیں۔ آج اگر آپ بھی اس کے مستحق ٹھہرتے تو۔۔۔ روف نے بات ادھوری چھوڑ دی ــــ "یہ آپ غلط کہہ رہے ہیں کہ لیڈر ایک ہوتا ہے اور باقی لوگ بھیڑوں کی طرح اس کے پیرو ہیں۔ رشید صاحب! انقلاب صرف ایک آدمی کے بس کا روگ نہیں اور سوائے لیڈر کے باقی ملک کے سب ہی لوگ نرے یدو نہیں ہوتے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ سوائے قائداعظم کے سارے لوگ نالائق ہیں۔ یہ آپ زیادتی کریں گے کہ ماؤزے تنگ کے علاوہ سب لوگ انقلاب اور اس کی قدروں کو سمجھتے تک نہیں۔ جی نہیں لیڈر کو جنم دینے والے عوام ہیں اور ہم اور آپ محض ایلیچوالنٹ" اور روف نے ہونٹ بھینچ لیے ــــ حسن نے بڑی گہری آواز سے سپورٹ کیا ــــ "جی ہاں فرانس، روس اور آج چین کی مثالیں اس کی شاہد ہیں غضب تو یہ ہے کہ ہر بورژوا قسم کے ممالک بھی چین اور روس کی طرف بڑی للچائی ہوئی اور آس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں کہ کم از کم یہ ہمارے اڑے وقت ہی کام آجائیں انہیں آپ ایلیچوالنٹ نہ کہیں تو اور کیا کہیں گے ــــ" عابد چپ نہیں بیٹھ سکا ــــ "خدا معلوم کیا بات ہے آپ لوگ پھر پھرا کر سیاسیات اور اخلاقیات، معاشیات اور نہ جانے کیا واہیات کو ہر دم بیچ میں لے آتے ہیں۔ اماں یار زندگی مختصر سی ہے۔ کھاؤ پیو عیش کرو یا عیش کرنے دو۔ کیوں دوسروں کے بیچ دخل در معقولات کرتے ہیں" اصغر نے شہ دی ــــ "اور دیکھئے ناترقی پسندی کا منتہائے عروج یہی ہے کہ ادب برائے پروپیگنڈا۔ کیا اشتراکیت کے لیے مارکسی مقالے اور اینگلز کی کتابیں کافی ہیں جو آپ اچھے خاصے ادب کا ستیاناس مارتے ہیں"

یہی تو فتور ہے جناب کہ آپ ادب اور سیاست کو الگ الگ جانچتے ہیں۔ اور ادب میں فراریت اختیار کرتے ہیں حقایق اور ماحول کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" روف نے الفاظ چبائے ــــ لیکن ادب عالیہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ آپ کے انقلابی یا اشتراکی میں مفقود ہے۔ اسے تو آپ مانیں گے ــــ" اصغر نے سمجھداری جتائی ــــ "مکرمی۔ ایمیل زولا۔ پشکن۔ گورکی۔ ماؤزے تنگ لوئی اراگاں۔ نذرل۔ کرشن جعفری۔ ان سب کے افکار کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ ان کو کہاں جگہ دیتے ہیں آپ" حسن بولا ــــ "لیکن اناطول فرانس۔ جیمس جائس، آسکر وائیلڈ۔ ٹیگور۔ ٹیگر۔ غالب۔ فانی ان سب کو آپ کیا غیر میعاری کہیں گے ــــ" اصغر بولا ــــ "یوں ہی اپنے ذہنی حصول اور فراریت کی کسوٹی پر ہر دور کے ادب کو جانچنے کا حق آپ کو ضرور پہنچتا ہے اگر آپ میر اور فانی کو اس وقت بھی سراہیں اور ان کی پیروی کریں تو یہ آپ کی فراریت ہوگی۔ اگر جائس۔ اور وائیلڈ کو یہی میعاری جان کر اس دور میں بھی اپنے تمام ذہنی انتشار کے باوجود پنک ہول لینا چاہیں تو یہ آپ کی مرضی ہے لیکن آپ کی ایسی مرضی جو کہ بہت سے افراد کے لیے مضرت رساں ہے اس پر تنقید کرنے کا حق ہر اس شخص کو حاصل ہے جو حقایق کا طالب ہو اور جھوٹی شرافت اور فراریت کے خول کو پھاڑ کر زندگی کو حقیقی شیشوں میں سے دیکھنا چاہتا ہو ــــ" اصغر نے دوسرا پہلو ڈھونڈ کر فوراً حملا کرنا چاہا ــــ "اچھا ایک بات بتایئے کہ ادب اور ادیب متوسط طبقے کی پیداوار ہے یعنی کیپیٹلسٹ (INTELLIGENTSIA) آپ ادب کی تخلیق کرتا ہے اور اس سے فیضیاب ہونے والا طبقا بھی قریب قریب وہی ہے تو ادب اور آپ کے مشن کے حصول کی تکمیل کی حدیں بند گئی اور آپ جو عوام کا رونا روتے ہیں کیا آپ کا ادب عالیہ ان تک پہنچتا ہے اور اگر نہیں پہنچتا تو آپ مانیں گے کہ آپ کے ہاں اندھی تنقید کے سوا کچھ نہیں ہاں یہ خیال لحوظ خاطر رہے کہ ہمارے نوے فیصدی عوام جاہل ہیں آپ ان عوام سے بالکل مختلف ــــ" روف سگریٹ کا

دھواں اگلتے ہوئے گرج پڑا ــــــ "میں آپ سے عرض کرتا ہوں ہمارے سارے ساتھی ادیب آپ جیسے سمجھدار موقع پرست لکھنے والوں کے لیے ہی لکھتے ہیں۔ چونکے آپ خدکو اہل ادب سے سمجھتے ہیں۔ اور آپ لوگوں کا ذہنی توازن خراب کر دیا گیا ہے اور آپ کسی معجزے کے قابل ہیں اور خدکو خاب آور حسین تصورات کے سپرد کیے رہتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کی رفتاریوں ہی چند روز اور رہے گی۔ اور پھر حالات استوار ہو جائیں گے۔ یا پھر یہ قول رشید کہ مجبوری۔ بحرانی انقلابی ادوار ہیشا آتے رہتے ہیں۔ اور ان کا مداوا یہی ہے کہ خدکو ان کے سپرد کر کے خدا تنے خدغرض بن جایے کہ اگر موقع ملا تو خش ہو جایے تاکے اپنے گرد سسکتی بلکتی مخلوق کو نہ دیکھ سکیں۔ دولت کی غلط تقسیم کی ایک بنیادی کمزوری اور انسانی استبداد کو بھلا کر خد تو عیش و آرام کی زندگی گذارا کریں۔ اور دوسرے فاقوں مریں بلا سے! بندہ پرور مداوا تلاشیے ورنا کہیں آپ بھی ہماری طرح مجنوں نہ بن جائیں۔ آپ نے کبھی ہمارے عوامی شاعروں کو تسکین آلود پیشانی اور دہکتی آنکھوں والے مفلوں کے بیچ انہیں پڑتے ہوئے سنا اور دیکھا ہے آپ نے کبھی اس جوش و خروش کے خلوص کا اندازا لگایا ہے جیکے شاعر گرج رہا ہوتا ہے ــــــ

گھر گھر ڈمبر پکین بجے چھے ۔ بجے چھے

ہر ہر ۔ ہر ہر ہڑتال ۔ ہڑتالی چکا گھر چھے

کیا آپ نے کبھی غلیظ ملبوس میں پڑے ہوئے ننگے بھوکے ان خاکی ان داتاؤں کا غم اور غصے سے بھرپور جلوس دیکھا ہے۔ شاید آپ کو بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس کے مل مزدوروں کی ہائی اور انقلابی روحوں کو للکارتے جنگھاڑتے بپھرے شیروں کی طرح سڑکوں اور میدانوں میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہوگا اپنے ساتھی رہنما کی قیادت میں انقلاب کے ان نقیبوں کے ساتھ چلنے کا آپ کو اتفاق نہیں ہوا ہوگا۔ انہیں گولی لاٹھی چارج اور اسٹین گنوں کے آگے ہنستے دلیری سے صداقت اور سچائی کے آدرش پر قربان ہوتے دیکھیے۔ اور انصاف کے نام اور آپ کو اپنے ایمان کی قسم بولیے کہ یہ سب ڈھونگ ہے بولیے کہ یہ سب کھیتے چور روسی ایجنٹ ہیں روپیا لے کر جان دیتے ہیں بولیے جواب نہ دیجے چپ کیوں ہو گئے آپ ــــــ" روف ٹیبل پیٹنے لگا۔ اور پیالیاں ٹکرا کر بجیں اور لڑکتی ہوئی الجھ گئیں جس پر عابد نے ٹوکا ــــــ "اماں یار بلاوجہ بھی جوش میں آ گئے ہو۔ کہیں کسی خفیہ پولیس نے سن لیا تو چلے جاؤ گے پھر بڑے گھر۔"

"بڑے گھر کی ایسی تیسی۔ کب تک اور کس کس کو بڑے گھر بھیجو گے۔ وہاں بھی اب جگہ نہیں رہی" روف بھنا گیا۔ اور اصغر لولا ــــــ "لیکن یہ بتایئے کہ آپ کے یہاں ایسے کتنے عوامی شاعر ہیں۔ کتنے چھے چار۔ چھ اور بس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ــــ جی ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ روز بروز ہماری تحریک بڑھ رہی ہے اور ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ایسے بہت سے شاعر اور ادیب ہمارے ساتھ آئیں گے۔ جو عوام سے جا ملیں گے۔" جس پر رشید اور اصغر خش ہو گئے عابد ریڈیو کلاک کے گرجدار آٹھ گھنٹوں کو سن کر بولا ــــ اب چلنا چاہیے ــــ ہا" اور ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے ــــ ہم سب باہر آ گئے مگر روف نہ جانے کدھر سے آگے نکل گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک چھریرے بدن کا چالاک آنکھوں والا آدمی باتیں کر رہا تھا قریب جب پہنچے تو وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں روف صاحب" اور عابد یہ کہہ کر پان منوانے لگا۔

یار میں کہتا نہ تھا ــــ سی۔ آئی۔ ڈی ہے۔ اب تو روف صاحب گئے ــــ" اور ہم سب ہنستے ہنستے کھسک گئے۔

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کر کے چندا منی آرڈر کر دیجے۔ وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا۔

امریکی زندگی کے متعلق گوناگوں تجربے

ام۔ جے رام

ہند سرکار کی وزارت تعلیم نے سال رواں کے آغاز میں ام۔ جے رام کو نیویارک ہیرلڈ ٹریبون کے مناظرے میں شرکت کے لیے منتخب کیا تھا۔ امریکا کے اس ممتاز روزانا اخبار کی طرف سے ہر برس ایک فورم منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں دنیا کے نوجوانوں کو اہم عالمی مسایل کے متعلق مشترکا پلیٹ فارم پر بحث کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس طرح عالمی مفاہمت اور امن کو تقویت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نیچے جو تفصیل درج ہے اس مضمون میں جے رام نے بڑی قابلیت اور صاف بیانی سے حالات قلم بند کیے ہیں جو یقینی طور پر مطالعے کے قابل ہیں۔

میں پچھلے دسمبر میں امریکا روانا ہوا تھا اور چند دن ہوے واپس ہندستان پہنچا ہوں ان چار مہینوں میں فورم میں شرکت کرنے والے ڈیلی گیٹوں کے ساتھ مجھے بھی بیش قیمت اور مختلف تجربے حاصل ہوے یہ تجربے اس لیے بھی سبق آموز ثابت ہوے کہ امریکی مناظر دیکھنے کے بدلے زیادا تر زور لوگوں سے ملنے ملانے پر دیا جاتا تھا۔

ایک اور دل چسپ بات یہ تھی کہ ہمیں امریکی کنبوں میں رکھا جاتا تھا ہر دو ہفتے کے بعد دوسرے کنبے میں چلے جاتے اور اس طرح میں ۱۵ ہفتوں میں ۷ مختلف کنبوں میں رہا۔ جس بیباک گرمجوشی اور بے تکلفی سے ان کنبوں نے میرا خیر مقدم کیا اس سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں اپنے گھر میں ہوں اور ہم مہمان کے بدلے گویا گھر کے افراد میں سے تھے اس سے ہمیں امریکی زندگی کا قریب سے مطالعا کرنے کا موقع ملا۔ ان کنبوں کے ساتھ میرے جو تعلقات قایم ہوے ہیں وہ بجاے خود بیش قیمت تھا ہیں۔

کمیونٹی جیون

امریکی کنبوں کے ساتھ دو دو ہفتے گذارنے کے علاوا ہم نے امریکی کمیونٹی میں بھی دو دو ہفتے بسر کیے امریکی کمیونٹی سے مراد ہے ایک گاؤں اسکول گرجا وغیرا پر مشتمل ایک بستی۔ چنانچہ میں نیویارک، ماساچیٹس، کنکٹی کٹ پینسلوینیا اور نیوجرسی کے کمیونٹی مرکزوں میں رہا۔

ہم ہر طرح کے لوگوں سے ملے جن کے سیاسی خیالات اور مشاغل اور دلچسپیاں مختلف قسم کے تھے چنانچہ فورم کے ایک ممبر سے جو حساب داں واقع ہوا ہے مجھے پتا چلا کہ میں نے اس دورے میں اسّی ہزار اشخاص سے باتیں کیں۔ مجھے یہ اعداد ناقابل یقین معلوم ہوے۔ یہ سب کچھ ان امریکی کمیونسٹوں کی وجہ سے عمل میں آیا جن کے ساتھ ساتھ ہمیں رہنے کا موقع ملا۔

ہائی اسکول

سرکاری طور پر ہم ہائی اسکولوں کے مہمان تھے (وہاں کے ہائی اسکول ہندستان کے انٹرمیڈیٹ کالجوں کا درجا رکھتے ہیں)

ان اسکولوں میں ہندستان کے متعلق مختلف موضوعات پر میں نے تقریریں کیں۔ اور ایشیا کے متعلق ان کی جو لاعلمی تھی اسے کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کی میں نے دیکھا کہ ایشیا کے متعلق وہاں بہت لاعلمی پائی جاتی ہے۔

ہائی اسکولوں کی سماجی زندگی میں ہم نے خوب حصا لیا ہر اسکول میں تقریباً ایک ہزار طلبا ہوتے ہیں اور صرف دو دو ہفتوں کے قیام کے باوجود سکیڑوں ہی دوست بنائے کیونکہ امریکا کے لوگ بہت ہی ملنسار، بے تکلف اور دوستی پیدا کرنے کے طبعاً خواہاں ہیں۔

ہماری سرگرمیاں ہائی اسکولوں تک ہی محدود نہیں تھیں میں نے ایسے سکیڑوں اسکولوں اور کالجوں میں بھی تقریریں کیں جہاں میں مہمان کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ الوداع کہنے والے اسکولوں میں بھی میں نے پرانے کا کام کیا اگرچہ میں بہت سی تقریریں کرتا رہا لیکن یہ کارروائی یکطرفہ نہیں تھی لیکن دفعاً ۳۰ طلبا پر مشتمل ہمارے گروپ نے ہزاروں طلبا کے اجلاس میں شمولیت کی اور ان کے نمایندہ طلبا سے موجودہ وقت کے کسی اہم مسایل پر بحث مباحثے کیے۔ امریکا کے لوگوں تک رسائی کا ایک اور ذریعہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو ہے میں ایک درجن سے بھی زیادہ ٹیلی ویژن پر نمودار ہوا اور مقامی اور ملکی ریڈیو اسٹیشنوں پر بیسیوں تقریریں کیں۔

آزادی خیال اور تقریر

میں نے امریکا میں ہر کہیں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں پوری آزادی تقریر پائی۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن والوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ میں کس موضوع پر تقریر کروں گا میں نے امریکی پالیسی کی بنیادی باتوں سے اختلاف ظاہر کیا۔ مثلاً میں نے کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ میں شامل کرنے کی حمایت اور پاکستان کو فوجی امداد دینے کی مخالفت کی اور اس پر نکتا چینی کی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ نکتا چینی کی حوصلا افزائی کرتے تھے امریکا کے لوگوں میں یہ بھاری وصف پایا کہ وہ اپنے آپ کا تمسخر اڑائے جانے کو لبیک کہتے ہیں۔ اور یہ کسی بھی ملک کے لیے بڑی صحت مند انا علامت ہے۔

صدر آئزن ہور سے ملاقات

امریکا میں ہمارے دورے کا بہترین حصا واشنگٹن میں صرف ہوا۔ یہاں وائٹ ہاؤس میں صدر آئزن ہور سے ہمیں شرف ملاقات حاصل ہوا۔ ان کی بے تکلفی، بیباک شفقت اور ان تک آسانی سے رسائی سے ہم بہت متاثر ہوے چند لمحوں میں ہی انہوں نے ہمیں یہ احساس دلایا جیسے ہم انہیں برسوں سے جانتے تھے۔ اس معاملے میں وہ قطعی مثالی امریکی ہیں۔ فورم نے صدر موصوف کو شکریے کا خط پیش کرنے کے لیے مجھے منتخب کیا تھا انہیں ہمارے خط سے بڑی مسرت ہوئی۔ اور ذاتی طور پر میرے نام اس کا جواب بھیجا۔ یہ خط میرے امریکا کے دورے کی ایک نہایت بیش قیمت یادگار ہے۔ صدر موصوف کا خط یہ ہے۔

> پیارے جے رام! مجھے آپ سے اور ان دوسرے طلبا سے مل کر بہت ہی مسرت ہوئی جو نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون فورم کے سلسلے میں امریکا آئے ہوے ہیں۔ میں آپ کا خاص طور پر اس خط کے لیے شکریا ادا کرتا ہوں۔ جو آپ نے اپنی پارٹی کی طرف سے مجھے دیا۔ اس خط میں یہ پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ امریکا میں بھی آپ کا دورا بہت پر لطف اور دل چسپ رہا ہے ہم بھی اس بات پر بہت مطمئن ہیں کہ آپ لوگ بھی یہاں آکے اور اپنے ملک کے مختلف طبقوں کے خیالات اور رسم و رواج سے ہمیں واقف کرایا۔
>
> دست بدعا ہوں کہ ہندستان کو آپ کا واپسی سفر بہت خشگوار ہو۔ آپکا مخلص۔ ڈوائیٹ ڈی آئزن ہاور

صدر موصوف کے علاوہ انہیں امریکا کے نائب صدر مسٹر نکسن اور دوسری اہم اور ممتاز امریکی ہستیوں سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ مسٹر نکسن کے بے تکلفانہ رویے کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔

ایوان نمایندگان کے اسپیکر نے انہیں لنچ کی دعوت دی اس موقع پر میں نے کانگریس کے ممبروں کی ایک پارٹی کے سامنے تقریر بھی کی۔ اس دعوت میں سابق اسپیکر مسٹر رے برن اور سینٹر فل برائیٹ فرینکلن روزویلٹ (جونیر) برکس ہائیز والٹر جڈ اور سینٹر وائیلی بھی شامل تھے۔ یہاں اس سے امریکا کی خارجہ پالیسی پر سوال پوچھنے کا موقع ملا۔

ہندستان کی خارجہ پالیسی پر بحث ہوئی ان سب نے وزیر اعظم نہرو کی خارجہ پالیسی کی شدید مخالفت کی لیکن مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ مجھے صاف دلی سے تقریر کرنے کا موقع دیا گیا۔ اگرچہ ان سے مجھے اختلاف رائے تھا۔

مجھے ان سب میں سینٹر فل برائیٹ سب سے زیادہ متوازن دماغ اور صاف گو معلوم ہوئے وہ سیاسیات سے بہت بالا تر ہیں۔ تب سے میری ان کے ساتھ خط کتابت ہوتی رہتی ہے اور میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ ایک ایسی ہستی سے میری ملاقات ہوئی۔ امریکا کی راجدھانی کے دورے کے بعد مجھے اس بات کا پکا یقین ہوگیا کہ امریکا میں پوری آزادی رائے پائی جاتی ہے۔

جب میں نے کانگریس کے ممبروں کو خطاب کیا تو مجھ پر کسی طرح کی پابندی نہیں لگائی گئی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی تقریر میں کیا کہنے والا ہوں۔

میں اس بات سے بھی متاثر ہوا کہ امریکا کی پالیسی مرتب کرنے والے صدق دلی سے امن چاہتے ہیں۔ میں ایوان نمایندگان کے ایک جلاس میں بھی شریک ہوا۔ اس دن "برکر ترمیم" پر بحث ہو رہی تھی۔

امریکا میں ہندستان کے سفیر مسٹر جی۔ ایل مہتا اور ہندستانی سفارت خانے کے دوسرے افسروں سے بھی ملا۔

پاکستان کے سفیر مسٹر محمد علی (جو اب پاکستان کے وزیر اعظم ہیں) نے مجھے کھانے پر بلایا اور بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔

واشنگٹن میں مجھے نئی دلی یاد آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شہروں کو ایک ماہر تعمیرات کے پلان کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے۔

میں امریکا کی جنوبی ریاست ورجینیا بھی گیا۔ میں نے دیکھا کہ جنوب میں شمالی امریکا کی نسبت نسلی امتیاز قدرے زیادہ پایا جاتا ہے لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں جتنا بعض اوقات بیان کیا جاتا ہے۔

ہمارا وقت زیادہ تر نیویارک میں بسر ہوا۔ پھر بھی موٹر کے ذریعے میں نے بہت کچھ سیاحت کی۔ اگرچہ میں بہت سی یونیورسٹیوں کو دیکھنا چاہتا تھا تاہم بعض بہترین یونیورسٹیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں ہارورڈ۔ ایلیز۔ کورنیل پرنسٹن کولمبیا۔ نیویارک کی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔

ہمیں اداء اقوام متحدہ کے صدر دفتر پر جانے کا اکثر موقع ملا۔ وہاں ہم کئی اہم ہستیوں سے ملے۔ اتحادی سبھا کے جنرل سکریٹری مسٹر ہیمر شیلڈ اور ڈاکٹر رالف بنچ نے مجھے برٹشی سنپ کونسل کا کام سمجھایا۔ ڈاکٹر فرینک گراہم ان بہترین امریکنوں میں سے ہیں جن سے ہمیں شرف ملاقات حاصل ہوا۔

ان سے مل کر میں بہت متاثر ہوا۔ اور میں حقیقی طور پر خوش ہوا کہ کشمیر کا مسئلہ ایسے قابل آدمی کو سونپا گیا ہے۔ انہوں نے ہند ایشیا کے متعلق مجھ سے تفصیلی باتیں کیں لیکن اپنی سرکاری پوزیشن کے پیش نظر کشمیر کے بارے میں کوئی بات کرنے سے انکار کیا۔ تاہم انہوں نے کہا کہ انہیں آشا ہے کہ تصفیہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر گراہم مجھے خود بہ نفس نفیس لیو۔ این۔ او کا سارا دفتر دکھانے کے لیے لے گئے۔

مناظرے کا موضوع

"جو دنیا ہم چاہتے ہیں" مناظرے کا خاص موضوع تھا۔ یہ مناظرہ لیو۔ این۔ او کی جنرل اسمبلی میں منعقد ہوا اس میں

امریکا کے پانچ ہزار طلبا نے شمولیت کی اور یو۔این۔او میں دوسرے ملکوں کے کئی نمایندوں نے بھی اس جلسے میں شرکت کی یہ مناظرہ ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا اور امریکا بھر میں نشر کیا گیا۔

مناظرے نے ہندستان کی غیر جانبداری کے موضوع کی زگت اختیار کی۔ ہندستان کی طرف سے میں اکیلا ہی بولنے والا تھا اور میں نے عالمی معاملات میں ہندستان کے طرز عمل کی حمایت کی۔ میں نے کیمونسٹ چین کو یو۔این۔او میں شامل کرنے پر زور دیا۔ اور امریکا کی طرف سے پاکستان کو فوجی امداد دیے جانے کی مخالفت کی لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں امریکی کی طرف سے دو سنی میں قطع فرق نہیں آیا۔

امریکا سے جو تاثر لے کر میں لوٹا ہوں وہ ان کا رونا تا برتا وہ ہے یہ ان سیکڑوں تحفوں اور ہزاروں خطوط سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ جو مجھے ملتے رہے ہیں۔ امریکا کے لوگ خط کتابت کرنے میں بڑے باقاعدہ ہیں اور ان کے خطوط کا جواب دینا میرے لیے کارے دارد والا معاملہ ہے۔

جب میں نیویارک سے ہندستان کے لیے رخصت ہونے لگا تو ہزاروں طالب علم مجھے الوداع کہنے کے لیے آئے۔ میں اس سے بے حد متاثر ہوا۔ ان میں سے اکثر کو میں جانتا بھی نہیں تھا مجھے آشا ہے کہ ہندستان سے بہت سے طلبا امریکا اور امریکا کے بہت سے طلبا ہندستان آنے کا موقع پائیں گے اور ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اس سے زیادہ ایدیعی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی اگر ہندستان اور امریکا میں غلط فہمیاں پیدا ہوں امریکا اور ہندستان کی دوستی عالمی امن کے لیے ضروری ہے۔

ہندستانی زبان

اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے۔

تعلیمی امداد

کلکتہ کے نزدیک بلگڑیا کی رفیوجی بستی کے پاس نندن نگر کے پرائمری اسکول کو کیلی فورنیا یونیورسٹی لاس انجلز کے طلبا کی طرف سے ۳۵۰ ڈالر (یعنی ۱۶۶۰ روپے) کا ایک چیک پیش کیا گیا۔

پچھلے برس اوپر کی یونیورسٹی کے طلبا کی ایک جماعت ہندستان آئی تھی۔ یہ چیک اس اسکول کے لیے ان طلبا کی خیر سگالی اور نیک خواہشات کا مظہر ہے نندن نگر میں اس اسکول کی عمارت کیلی فورنیا یونیورسٹی سے مس ایڈلین گونتھر کی قیادت میں آئے ہوئے چھ طلبا اور کلکتہ کے کچھ طالب علموں نے مل کر اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی۔

نندن نگر میں ایک پرتکلف تقریب کے موقع پر امریکی محکمہ اطلاعات کلکتہ کے کلچرل آفیسر ڈاکٹر رالف اے پرلسپنل نے کیلی فورنیا یونیورسٹی لاس انجلز کی طرف سے یہ چیک پیش کیا۔

مغربی بنگال کی سرکار کی وزارت نو آبادکاری کے ایگزیکٹو آفیسر مسٹر پی کے بنرجی نے بنگال سرکار کی طرف سے یہ چیک وصول کیا۔ کیونکہ یہ اسکول سرکار چلا رہی ہے اور چیک لیتے ہوئے آپ نے کیلی فورنیا یونیورسٹی لاس انجلز کے طلبا کی ایک خیر سگالی اور فیاضی کی بہت تعریف کی اور ان کا سچے دل سے شکریہ ادا کیا۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

ہندستانی ادب

۹۹ - اے اعظم پورا شرقی پی او - جوبلی حیدرآباد دکن ۳۷

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی - ام - خان - ام - اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

جلد (۱۴) نمبر (۸)

قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

تیر ۱۳۶۳ ف مئی ۱۹۵۴ ع

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	تھامس ایڈیسن
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳	خش طبعی
غزل	اعتبار الملک لال شاہجہانپوری	۴	ریاست اور فرد کا رشتا
غزل	فضا (جالندھری)	۵	موسیقی میں تحقیق کے قومی ادارے کا قیام
تجدید	صفی احمد (بہاری)	۶	جسم کا اندرونی معالج خون
رباعیات	اثر صہبائی بی۔ اے ال ال بی	۷	بچوں کا رسالا
ہندستان میں تعلیم کا تقبل	ڈاکٹر امرناتھ جھا	۸	امریکی عورتوں کی ترقی
"چاردن"	ڈاکٹر محمد باقر ام۔ اے (صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی)	۱۰	چینی ادیب لہسون
میری کشمیر یاترا	رادھارمن ام۔ پی	۱۲	تبصرے
چدائی			عزیز الحسن ضیا (عثمانیا) ۳۲

یوسیس		۱۵
فضلی شاہین بی۔ اے		۱۷
ایچ۔ ولسن ہیریس		۱۹
بنج۔ ط		۲۱
ا - ا		۲۳
ن - ا		۲۴
یوسیس		۲۷
چ - ا		۳۱
"ا"		۳۲

ہمارے خیالات

اردو کانفرنس میں "ہندستانی" کا ذکر خیر

حال ہی میں حیدرآباد دکن میں اردو کانفرنس کے اجلاس ہوئے پہلے اجلاس کی صدارت مشہور ادیب کشن پرشاد کول نے کی۔ آپ نے اپنے صدارتی خطبے میں بعض بڑی ہی اچھی باتیں کہی ہیں ہر سنجیدہ آدمی کو ان پر دھیان دینا چاہیے ہندستان کے ملے جلے کلچر کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ۔

"ہماری زبان اور ہمارا کلچر زمانے کے چلن ہی کے ڈھانچے میں ڈھلے گا اس سے مفر نہیں۔ عرض کہنے کی یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کا اٹھان اور اس کا چلن ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نباؤ اور بگاڑ دونوں ہی کی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لڑائی بھی رہتی ہے اور پھر میل ملاپ بھی ہو جاتا ہے صحیح راستہ یہی ہے کہ بگاڑ کی عارضی روش کو چھوڑ کر نباؤ اور سنوار کے چلن پر چلا یا جائے۔ جو شیلی طبیعتوں کو چھوڑ کر دل و دماغ والے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور اگر ہمیں ترقی کے راستے پر چلنا ہے تو ایسا ہی کرنا ہوگا۔ ہماری تاریخ و تمدن کی جلدوں میں اب صفحے اس طرح خالی نہیں پڑے ہیں کہ ہم جو مانے چوپٹ لکھ دیں۔"

آگے چل کر آپ نے ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور رشتے کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کا پرانا واسطہ اور رشتا پوربی دیسوں اور پچھمی دلایتوں کی بھیڑ ایسی تاریخی روایتیں ہیں کہ جو ہمارا مقدر ہو چکی ہیں۔ ان کو اب حرف غلط کی طرح مٹانا یا نہیں جا سکتا اور جو نقش ان تاریخی روایتوں نے چھوڑے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہندستانی تہذیب، تمدن ہمارا تمدن اور کلچر مشترکا ہوگا۔ ایک رنگی نہیں بلکہ دو رنگی، یعنی ایسا گنگا جمنی کہ جس کا سانا بانا تو پروہین آریائی ہوگا۔ پھول بوٹے اسلامی دور کے اور رنگ گہرا مغربی یا فرنگی۔"

ہندستان کی عام اور ملی جلی بھاشا کے بارے میں آپ نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ ــــــ

"ہماری زبان سنسکرت میں رچی ہوئی ہندی نہ فارسی اور عربی زدا اردو بلکہ سیدھی سادی "ہندستانی" ہوگی کہ جس کو جاہل گنوار بھی سمجھ سکیں اور بول چال سکیں۔"

حضرت کول سے کون واقف نہیں یہ بزرگ بڑے ہی عالم فاضل اور ماہر زبانیات ہیں۔ دیس کی بھلائی کی خاطر جہاں آپ نے ایک ملے جلے کلچر پر زور دیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ ترقی کی ایک اور بھی راہ دکھائی ہے۔ آپ ہی کے شبدوں میں "کلچر اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے" یہ سچ ہے کہ بنا کلچر زبان ترقی نہیں کر سکتی۔ اور بغیر ایک ملی جلی بھاشا کے "گنگا جمنی" کلچر نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسی لیے حضرت کول نے ان دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اور اسی بنا پر مشترکا کلچر کی ترقی کے لیے ایک عام فہم اور ملی جلی زبان کی ضرورت بتائی ہے۔ اور وہ زبان آپ کی گراں قدر رائے میں صرف "ہندستانی" ہو سکتی ہے۔ ہندی کے عقل کے اندھے پجاریوں اور اردو کے مجنوں پرستاروں کو حضرت کول کے اس سہنرے قول سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ یہ دونوں فریق اگر اب بھی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر عقل کی عینک سے زبان جیسے اہم مسئلے کو پھر سے دیکھیں تو انہیں ترقی کے نئے نئے رستے دکھائی دیں گے۔

حال ہی میں کانگریس کمیٹی کے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کانگریس کے صدر اور ہندستان کے بڑے وزیر جواہر لال نہرو نے ان لوگوں کی خوب خوب ہی لے دے کی جو سنسکرتیائی ہندی کو عام کرنے کے میٹھے سپنے دیکھ رہے ہیں نہرو نے صاف طور پر نہ صرف بلکہ دبی زبان اور چباتے چباتے شبدوں میں دیس بھاشا "ہندستانی" کا ذکر کیا اور ایک ایسی ہی ملی جلی بھاشا کو عام کرنے کا مشورا بھی دیا۔

اردو کے اندھا دھند شیدائیوں کو اس بات سے ہرگز ہرگز خوش نہ ہونا چاہیے کہ نہرو نے صرف ہندی کے پرستاروں کو ڈانٹا ڈپٹا ہے بلکہ ان کا اشارا ہر اس شخص اور جماعت کی طرف ہے جو زبان کو شکل اور سمجھ کے ناقابل بنا دے چاہے وہ ہندی ہو یا اردو چنانچہ خان عبدالغفار خاں نے بھی اسی پہلو پر زور دیا ہے اور دونوں ہی کو صحیح مشورا دیا ہے کہ اردو اور ہندی کے میل یا سنگم سے ایک عام اور ملی جلی بھاشا "ہندستانی" بنائیں۔ سب ہی

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

قطعہ

اگلی سی طبیعت میں روانی نہ سہی — اشعار میں وہ حسن معانی نہ سہی
کیا غم دو سہ روز کا بھروسا افقر — پیری ہی غنیمت ہے جوانی نہ سہی

غزل

سنی تو اس نے غیروں سے ہوا گو بدگماں پھر بھی — رہی بہتر غرض ہم سے ہماری داستاں پھر بھی
وہاں لے کیفیِ سجدہ یہاں ہے کیف جاں پھر بھی — کہیں بہتر ہے کعبہ سے درِ پیرِ مغاں پھر بھی
ترے جلووں میں گم ہو کر نہ ہونا بے نشاں پھر بھی — نہیں ہے اور سب کچھ ہے ہماری داستاں پھر بھی
کہی کب میں نے دار و رسن سے ہنی کب اس ستمگر نے — سر محشر رہی دل ہی میں اپنی داستاں پھر بھی
ہزاروں سجدے کعبہ میں اگر ہوں ہرج ہی کیا ہے — جو سجدے ہیں وہ رہ جائیں گے بہر آستاں پھر بھی
مٹائیں لاکھ مٹنے کو تری راہ تجسس میں — پھرا کی خاک تربت کارواں در کارواں پھر بھی
چمکتے ہیں ستارے بن کے خاک دل کے ابر رے — کمال بے نشانی ہے ہمیں اوج نشاں پھر بھی
قفس ہی اب نشیمن بن گیا مشق تصور سے — بہت کام آئی اے صیاد سعی رائیگاں پھر بھی
متاع دو جہاں بدلوں نہ خاک کوے جاناں سے — کہ ہے کم اور بہت کم ہے متاع دو جہاں پھر بھی
مدار زیست اک تار نفس پر گو رہا قایم — فریب زندگی دیتی رہی عمر رواں پھر بھی
جو رہ جاتے ہیں تھک کر ہم و فور ناتوانی سے — نظر کچھ دور رہتی ہے شریک کارواں پھر بھی
قسم ہے مجھکو کعبہ کی میں کعبہ میں رہا جب تک — ہزاروں بار یاد آیا کسی کا آستاں پھر بھی
جو سن لیتا ہے کوئی میرے درد دل کا افسانہ — ضرور اک بار سنتا ہے وہ میری داستاں پھر بھی
قفس ہی تک نہ تھی محدود بیداد فلک ہم پر — گری ہیں بجلیاں پھر بھی جلا ہے آشیاں پھر بھی
زمانا ہو گیا مجھکو مٹے راہ محبت میں — چمکتے جا بجا ہیں میرے سجدوں کے نشاں پھر بھی
مٹا کر مجھکو ظالم کی نظر ہے خاک مدفن پر — نہ بدلی حیف اقتاد مزاج آسماں پھر بھی
دہائی ہے دل لذت کش حرماں دہائی ہے — سر محشر ہمارے ضبط کا ہے امتحان پھر بھی
نہ پایا بت کدہ کعبہ میں جب تیرا نشاں ہم نے — کیا سجدا تجھے بے امتیاز آستاں پھر بھی
بنا ڈالیں ہزاروں داستانیں سننے والوں نے — رہی اتنی ہی جتنی تھی ہماری داستاں پھر بھی

جفا دیکھی ستم جھیلے مٹے راہ محبت میں
نہ سمجھے آج تک افقر مآل امتحاں پھر بھی

غزل

اعتبار الملک آل رضا جہانپوری

رنگ جہاں بطرز دگر دیکھتا ہوں میں
اک انقلاب شام و سحر دیکھتا ہوں میں

یعنی جو تھیں عروج و ترقی کے چرخ پر
ان ہستیوں کو خاک بسر دیکھتا ہوں میں

اٹھتی ہے جب نگاہ مآل شباب پر
گھبرا کے جانب گل تر دیکھتا ہوں میں

حل ہو رہا ہے ہستی عالم کا مسئلا
حیرت سے سمت برق و شرر دیکھتا ہوں میں

خواب و خیال زینت بزم نشاط ہے
افسردگی شمع سحر دیکھتا ہوں میں

آزادیوں کے دور میں مذہب ہے جہاد
الحاد کا دلوں پر اثر دیکھتا ہوں میں

ہر شخص بن گیا ہے فلاطوں بجائے خود
وارفتگی فکر و نظر دیکھتا ہوں میں

اسرار کائنات سے منکر ہے بے خبر
اک قدرت محیط مگر دیکھتا ہوں میں

اے دل یہی دلیل شباب بہار ہے!
زخموں کو غیرت گل تر دیکھتا ہوں میں

غزل

فضا جالندھری

قفس میں کاہے کو یاد چمن ستاتی ہے
کہ عمر یوں بھی آخر گذر ہی جاتی ہے

کسی نے جب سے اٹھائے ہیں پردۂ اسرار
حیات اپنے مقدر پہ مسکراتی ہے

نظر جو پڑتی ہے محرومی مسلسل پر
ہنسی فریب تمنا پہ آ ہی جاتی ہے

فلک کو میرے خیالوں سے دشمنی کیوں ہو
کچھ اس میں آپ کی مرضی بھی پائی جاتی ہے

وفائے عشق کا انجام ہم نے دیکھ لیا
اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے

یہ پچھلی رات، یہ موج سکوں، یہ نرم ہوا
تمہاری یاد مجھے بار بار آتی ہے

کسی کی برق نظر سوز دل کا عنواں ہے
یہ آگ خود نہیں لگتی لگائی جاتی ہے

میرا لیکن حالات کوئی بات نہیں!
ستم تو یہ ہے کہ دنیا بدلتی جاتی ہے

حدیث عشرت دوراں ندیم مجھ سے نہ سن
فسانا ہے جسے سنیے تو نیند آتی ہے

اگرچہ کرتا ہوں کوشش میں بھول جانے کی
وطن کی یاد مگر پھر بھی آ ہی جاتی ہے

شراب عشق میں کتنا ہے کیف آہ نہ پوچھ
یہ مجھ سے پوچھو میرا تجربہ یہ ذاتی ہے

مآل عشرت دوراں سے بے خبر ہوں فضا
مجھے گلوں کی جوانی لہو رلاتی ہے

تجدید

صفی احمد بہاری

سوئی ہوئی برسوں کی میری شاعری اے دوست!
پھر آج قلم ہات میں ہے بیٹھا ہوا ہوں

شاید یہ ترا فیض ہے پھر جاگ اٹھی ہے
اور قلب و نظر میں ہے فقط تیرا بسیرا!

وہ آرزو جس کو کبھی دفنا بھی چکا تھا
صدقا ہے خیالوں کا کہ تنہائی شب میں

پھر زندا ترے نام کے جادو سے ہوئی ہے!
تخئیل کی دنیا میں ہوا ہے یہ سویرا!

سرسبز ہے پھر آج مرا نخل تمنا!
اے دوست ترے نام کا جادو ہے یہ شاید!

پھر فصل بہار آئی بصد ناز ہے آئی
یک لخت غم و رنج و الم بھول گیا ہوں

پھر گلشن دل میں ہے اک ہنگامہ سا برپا
گو کاوش پیہم میں ہے دنیا میری الجھی

پھر بلبل خامہ نے زباں کھولی ہے اپنی!
پھر بھی میں زمانہ کے ستم بھول گیا ہوں

پھر آج تخئیل پہ ہیں رنگینیاں چھائیں
اس دہر میں جھیلے ہیں بہت میں نے مصایب

پھر جاگ اٹھی ساز دل زار کی آواز!
اور اب بھی کوئی فرق نہیں رنج کشی میں

پھر نوک قلم سے ہے مرے شعر کی بارش
لیکن یہ تری شوخ نگاہوں کا ہے صدقا

پھر آج ہیں بدلے ہوئے جذبات کے انداز!
تکلیف حوادث کو جو بدلا ہے خوشی میں

پھر نظم گل و لالا کی تجدید ہوئی ہے!
اب شاعر دلگیر کا اک آسرا تو ہے!

پھر شاخ چمن فیض بہاراں سے ہے سیراب
درد دل مضطر کا فقط تو ہے مداوا!

پھر نغمۂ بلبل سے فضا گونج رہی ہے!
ہو جائے مری شاعری بھی زندۂ جاوید

پھر کھیلتی ہے دل کے ہر اک تار سے مضراب
تیری نگہ ناز کا مل جائے سہارا!

رباعیات

اثر صہبائی۔ بی۔ اے، ال ال بی

(۱) اے حاصلِ ہر تجھکو حاصل کی تلاش — اے برلبِ ساحل تجھے ساحل کی تلاش
تو خضر بھی منزل بھی رہ منزل بھی — رہبر کی تلاش کر نہ منزل کی تلاش

(۲) جب ہمتِ اہل دل سنبھل جاتی ہے — تقدیر سے تدبیر کی چل جاتی ہے
گر صدق طلب ہو اور شمشیر عمل — تقدیر بھی اے دوست بدل جاتی ہے

(۳) ہے خونِ جگر سے لالہ رو جلوۂ عشق — ہے دار و رسن بدوش ہنگامۂ عشق
عصیاں سے بہت بلند نیکی ہے مگر — نیکی سے بہت بلند ہے رتبۂ عشق

(۴) ہے پیکرِ نور ابنِ آدم اب بھی — ہے بزمِ جہاں میں سب سے اعظم اب بھی
کونین ہوں اب بھی اس کے قدموں پہ نثار — ہو جائے اگر یہ حق کا محرم اب بھی

(۵) ہنگامِ فصلِ گل ہے ہنگامہ رنگ — ہے بربطِ رنگ سے رواں نغمہ رنگ
مے خانہ رنگ ہے گلستانِ جہاں — گل ساغرِ رنگ ہے صبا بادۂ رنگ

(۶) فطرت کا رباب ہو گیا ہے خاموش — نغموں سے مگر ابھی فضا ہے مدہوش
الہام کی کیفیت ہے طاری دل پر — خاموشی شام ہے کہ پیغامِ سروش

(۷) اک مستی و بیخودی ہے اک کیف و سرور — اک جلوۂ نغمہ زا ہے اک نغمۂ نور
کس عالمِ بے مثال میں ہوں یارب! — ہستی سے بھی پرے ہوں یا عدم سے بھی دور

(۲)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

ڈاکٹر امرناتھ جھا

(نصاب تعلیم کو ہندستانی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے)

وقتاً فوقتاً ملک کے طریقۂ تعلیم کا محاسبہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ اس میں ردوبدل ترمیم اور اصلاح عمل میں آسکے۔ تعلیم کے مسایل میں قوم کے ہر طبقے کو دلچسپی لینی چاہیے کیونکہ تعلیم قوم کے ہر فرد پر اثر انداز ہوتی ہے تعلیم کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے طلبا پر اس کے بعد اساتذہ اور پھر ملک کے حالات پر غور کرنا چاہیے۔ طالب علم کو محض مشین کا ایک پرزہ تصور نہ کیا جانا چاہیے بلکہ اسے ذات اور قوت کے ساتھ موجود سمجھنا چاہیے۔ طالب علم کے لیے غذا والی خوراک صحت اور صفائی، تکمیل کود اور سیر و تفریح کے مواقع فراہم کیے جائیں اس کے سوا انسانی حقوق کا عالم گیر محضر اور ہندستان کا "آئین" عام ابتدائی تعلیم کی حمایت کرتے ہیں۔ اس لیے اس تعلیم کے انتظامات میں کوئی دیر نہ ہونی چاہیے۔

بعض مضامین انسان کی شخصیت کی نشوونما کے لیے اشد ضروری ہیں اور ان سے بے بہرہ شخص کو تعلیم یافتہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان مضامین کے مطالعے میں سوسائٹی کے ڈھانچے اور پیشے کو کوئی دخل نہیں۔ اس لیے مادری زبان اور قومی زبان کی تعلیم سادا سا علم ریاضی اور تاریخ ہر طالب علم کے لیے لازمی ہونی چاہیے۔ میں اس بات سے بلکل اتفاق نہیں کرتا کہ طالب علم کو دستی محنت اور مشقت کے لیے مجبور کیا جاے اور میرے خیال میں یہ ایک حیثیانا فعل ہے۔ البتا طلبا کی صحت اور تندرستی کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ نصاب کئی قسم کے ہونے چاہئیں جو طلبا کی دماغی اور جسمانی صلاحیتوں کے لیے موزوں ہوں اساتذا چاہے کسی بھی مضمون کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہوں مگر ان کی تنخاہیں مساوی ہونی چاہئیں۔

ہندستان خود مختار جمہوری ملک ہے اور اس کے باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اس لیے اساتذا کو چاہیے کہ ہمارے آئین کے اس بنیادی اصول کو عملی اور مثالی طریقے سے طلبا کے ذہن نشین کرائیں۔ بنیادی تعلیم کے مختلف نصابات کو اس طرح سے ترتیب دیا جاے کہ اس کی تکمیل کے بعد طالب علم عملی زندگی میں داخل ہوسکے۔ اور اگر وہ چاہے تو عالا تعلیم بھی حاصل کرسکے۔ نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ہندستانی لفظ لگا کو پیش کرسکے تہذیب اور تمدن کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے متمدن بننے کی غرض اور غایت یہ ہونی چاہیے کہ ہم دنیا کے شہری بن سکیں۔ لیکن ہمارے اندر کوئی چیز ایسی بھی ہونی چاہیے جو ہمیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ممتاز بناتی ہو اور ہندستان کا یہ امتیاز بدستور جاری رہے گا تعلیم کے ہر ایک طریقے میں نسلی اور قومی تہذیب پر توجہ دینی چاہیے۔ اور طالب علم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا اقتور اور منہوم کیا ہے اور یہ صدیوں سے کیوں قایم ہے ہندستان کی تاریخ اور ادب عالمیعار کے چال چلن کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لیے اگر ہر فرد چال چلن کا عالا معیار برقرار رکھے تو مادی ترقی نقصان دہ ثابت نہ ہوگی۔

تعلیم کو موثر بنانے کے سلسلے میں یہ بات ضروری ہے کہ تعلیم دینے والے کے دل میں اپنے پیشے کی عظمت موجود

ہوا اور عالا عادات اور اطوار کا مالک ہو۔ آج کل اس پیشے کے لوگوں کی تنخواہیں قلیل ہیں۔ اور سماج میں ان کی کوئی وقعت حاصل نہیں لیکن ملک کا بھلائی چاہنے والا اس امر کی توقع کرتا ہے کہ اس کی حالت کو بہتر بنائے اور اس پیشے میں کشش پیدا کرنے کے لیے جلد سے جلد اقدامات کیے جائیں کیونکہ غیر تنظیم استاد ملک کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں تاہم استادوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی عادات اور اطوار جوش و ولولے اور اپنی کارکردگی کی بدولت عوام میں عالا مقام حاصل کریں

اگرچہ لمبے عرصے سے ہندستان کی یونیورسٹیوں کی ندمت کی جا رہی ہے لیکن جن مالی اور دوسری قسم کی دشواریوں سے ان کو سابقہ پڑتا ہے اس کے پیش نظر وہ جو کچھ کر رہی ہیں اچھا کر رہی ہیں بہر حال چند باتوں پر فوری توجہ کی ضرورت ہے مثلاً انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنا غیر قدرتی ہے اس لیے یونیورسٹی میں علاقائی اور قومی زبان کے علاوہ ایک غیر ملکی زبان کی بھی تعلیم دی جائے اس کے سوا یونیورسٹیوں اور استادوں کے اختیارات و آزادی میں دخل اندازی نہ کی جائے بلکہ تعلیم کا معیار برقرار رکھنے کی ذمے داری ان پر ہی چھوڑ دی جائے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یونیورسٹیاں عوام سے الگ تھلگ رہتی ہیں اس لیے اس نقص کو دور کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ہر طالب علم پر یہ پابندی لگائی جائے کہ ڈگری حاصل کرنے سے پہلے اسے محکمہ تعلیم کے زیر ہدایت چار مہینے استاد کی حیثیت سے خدمت انجام دینی پڑیگی۔

اگر آپ کی

مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کر کے چندا منی آرڈر کر دیجیے۔ وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا۔

عہد گذشتا کے ہندستانی آرٹ کی نمائش

عہد گذشتا کے ہندستانی آرٹ کی نمائش قریب ہی میں وسط مشرق، یورپ اور امریکا کے بعض ملکوں میں دکھائی جائے گی ہندستانی حکومت نے ان ممالک کے ساتھ ثقافتی تعلقات بڑھانے کے لیے اس نمائش کا اہتمام کیا ہے۔

اس نمائش میں نالندا کی سنگ تراشی کے شاہکار مغلیا اور راجستھانی مصوری کے نمونے ہمعصر آرٹسٹوں کی تصویریں، عوامی تصویریں اور کھلونے، سنسکرت فارسی اور عربی کے قلمی یا تصویر مسودے دکنی ہندستان کے کانسی کے مجسمے دھاتوں سے تیار کیا ہوا سامان، لکڑی پر نقش کاری، قدیمی جواہرات اور آرٹ کے دوسرے نمونے شامل ہوں گے۔

طلبا کے لیے تعلیمی سہولتیں

اس سال برٹش کونسل نے برٹش تعلیمات میں سمندر پار کے طلبا کے لیے انگلینڈ۔ اسکاٹ لینڈ۔ ویلز اور شمالی آئرلینڈ میں ۲۹ کورسوں کا انتظام کیا تھا جن میں سمندر پار کے ۶۸۵ طلبا نے شرکت کی تھی ان میں سے ۴۰۰ طلبا ایسے تھے جو دولت مشترکہ کے ممالک سے آئے ہوئے ہیں۔ ہندستان پاکستان اور سیلون کے طلبا بھی خاصی تعداد میں ان کورسوں میں شامل ہوئے ان کورسوں کا مقصد سمندر پار کے ممالک سے آئے ہوئے طلبا کو برطانوی طرز زندگی تاریخی مقامات وغیرہ سے روشناس کرانا ہوتا ہے۔ میں ہندستانی طلبا ان کورسوں میں شامل ہوئے تھے۔

"چار دن"

(افسانا اور تبصرا)

ڈاکٹر محمد باقر ام۔ اے (صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی)

چار دن کا بھی کوئی موضوع ہوتا ہے لیکن انہیں چار دنوں میں ہسپانیا کی خانا جنگی میں خاک و خون سے لتھڑی ہوئی سرزمین پر ایک نوجوان امریکی اور ایک ہسپانوی لڑکی عمر بھر کے رومان کا لطف حاصل کر لیتے ہیں۔ محبت و جرأت کا اتنا خوب صورت امتزاج حقیقت نما افسانوں میں شاذ ہی دیکھنے میں آیا ہے جتنا کہ ارنسٹ ہیمنگوے کے مشہور ناول میں پیش کیا گیا ہے اورنسٹ ہیمنگوے امریکا کا وہ مشہور ناول نویس ہے جس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد (A FAR E WELL TO ARMS) کا شاہکار لکھ کر شہرت حاصل کی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہسپانیا کی خانا جنگی سے متعلق یہ مشہور ناول لکھ کر یورپ اور امریکا سے خراج تحسین حاصل کیا۔

بات صرف "چار دن" کی ہے لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ اسے پانچ سو صفحات پر اس چابک دستی سے پھیلایا ہے کہ آغاز سے لے کر اختتام تک قاری کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا مصنف کی قوت بیان کا یہ عالم ہے کہ اس نے رزم و رزم کے جو قصے کرداروں کی زبان سے ادا کیے ہیں وہ متحرک مناظر کی طرح قارئین کے صفحۂ ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ عشق اور حسن کے لطیف و نازک حقایق مصنف نے نہایت کامیابی سے واضح طور پر پیش کیے ہیں ان میں عریانی اور فحاشی کو قطعاً دخل نہیں پانے کی ساری فضا محاذ جنگ کی ہے۔

ہسپانیا کے مشہور شہر لاگرنیجا میں فاشی ہسپانوی فوجیں جمع ہیں۔ دوسری جانب ری پبلک کی فوج نے بیڈرڈ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ سیڈرڈ ہی سے ایک اسکیم بنائی جاتی ہے کہ کسی جاسوس کو لاگرنیجا کے قریب اس وقت پل اڑانے کے لیے بھیجا جائے جب فاشی فوجیں اس پل پر سے گذر کر میدان میں آجائیں تاکہ ری پبلک کی فوجیں ان پر ہوائی حملا کر سکیں اور انہیں کے پیچھے سے کوئی مدد نہ مل سکے ایک امریکی پروفیسر جو امریکا میں ہسپانوی زبان کی تعلیم و تدریس پر مامور تھا ہسپانوی ری پبلک میں فاشیوں کے خلاف جنگ میں الٹیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہا ہے اور اسے اس کام پر متعین کیا جاتا ہے کیونکہ وہ سیاحت کی غرض سے چند سال پہلے اس پل پر سے گذر چکا ہے اور اس علاقے میں پیدل سفر کر چکا ہے اس پروفیسر کا نام رابرٹ جارڈن ہے۔ ہسپانوی گوریلے اسے انگلیس کے نام سے پکارتے ہیں اور ہسپانوی ری پبلک فوجوں کا افسر جنرل گولز مناسب ہدایات اور دانشمندانہ کی بار بار دہرا دے کر سفر پر روانہ کر دیتا ہے اور اسے بتا دیتا ہے کہ پل کے قریب ایسے گوریلے جو ری پبلک کے حامی ہیں اور ان گوریلوں سے ایسی مدد لینی چاہیے رابرٹ لاگرنیجا کے علاقے کے قریب پہنچ کر ان گوریلوں سے ملتا ہے جن کا سردار پابلو ہے۔ پابلو یوں تو ری پبلک کا حامی ہے لیکن وہ ہسپانوی خانا جنگی سے اکتا چکا ہے رابرٹ کی آمد اور اس کے مشن کو اپنے لیے نیک فال نہیں سمجھتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ جب پل اڑا دیا جائے گا۔ تو فاشی اس کے گروہ کو پہاڑیوں میں ڈھونڈ نکالیں گے اور ان کو قتل کر دیں گے لیکن پابلو کے گروہ کے دوسرے لوگوں اور اس کی بیوی پلار کا خیال ہے کہ ری پبلک کی حمایت میں ہر ایک کام سرانجام دینا چاہیے۔ پابلو اور دوسرے لوگوں میں اختلاف ایک شدید ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایک شخص پابلو کو پیٹتا بھی ہے۔ گوریلوں کے اس گروہ میں ایک

نوجوان دوشیزا ماریا بھی ہے، جو فاشیوں کے ہاتھوں اپنے بال کٹوا کر پسلو کے ساتھ شامل ہو گئی ہے۔ یہ لڑکی پہلے پہل تو پسلو سے شدت کے ساتھ رابرٹو کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ پسلو کی بیوی ایک بدصورت عورت ہے لیکن اس کا کردار مستحکم اور اس کے انداز میں تحکم ہے وہ زندگی کے فلسفے سے بھی کافی آشنا ہے اور اس فلسفے کی بنیادیں ذاتی تجربوں پر قایم کی گئی ہیں۔ یہ پہاڑیوں میں دیوار کے گھنے جنگلوں میں پلار رابرٹو اور ماریا بیٹھے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ موضوع سخن دیودار کے درخت ہیں ماریا کہتی ہے:۔

یہ درخت بہت پسند ہیں۔ . . . .

پلار پہلا کر کہتی ہے۔ تمہیں یہ کیوں پسند ہیں؟ مجھے ان کی خشبو اور ان کے سوکھے ہوئے سوئیوں جیسے پتے پسند ہیں ان درختوں میں جب تیز ہوا سرسراتی ہے اور یہ چوں چوں کرنے لگتے ہیں تو مجھے بہت لطف آتا ہے۔ . . . .

پلار یوں تمہیں ہر چیز پسند ہے اگر تم ذرا بہتر کھانا پکا سکتیں تو تم کسی مرد کے لیے تحفا ثابت ہو سکتیں۔ لیکن دیودار کے درخت اکتا دینے والا جنگل ہیں۔ تم نے اخروٹ برگد یا پیپل کا جنگل کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اصل جنگل تو وہی ہے جہاں ہر ایک درخت مختلف ہوتا ہے۔ ایک انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اور دل کش ہوتا ہے۔ دیودار کا جنگل تو صرف اکتاہٹ ہے۔ انگلیش تمہارا کیا خیال ہے؟ مجھے تو دیودار بھی پسند ہیں۔ مجھے دیودار پسند تو ہیں لیکن چونکے میں بہت دیر سے یہاں ہوں میں پہاڑیوں سے اکتا گئی ہوں۔ پہاڑیوں میں صرف دو موسمیں ہوتی ہیں۔ نشیبی اور بالائی اور نشیبی صرف فاشیوں کے گاؤں کو جاتی ہے۔ کیا تم کبھی سیگوریا گاؤں میں گئی ہو؟

پلار ماریا سے مخاطب ہو کر بولی واہ اس چہرے کے ساتھ؟ یہ تو ہر جگہ سجتا ہے خوب صورت لڑکی! تم بدصورت بننا پسند کرو گی؟

کہیں تم بدصورت تو نہیں ہو۔

ہوش کے ناخن لو۔ میں بدصورت نہیں ہوں۔ میں تو پیدا ہی بدصورت ہوئی تھی۔ میں ساری عمر بدصورت رہی ہوں۔ تم جانتی ہو۔ بدصورت عورت کیا محسوس کرتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ ساری عمر بدصورت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو خوب صورت سمجھتے رہنے کا کیا نتیجا ہوتا ہے؟ لیکن یوں بہت کم ہوتا ہے۔ پھر اس نے اپنی جیب سے چقماق نکالتے ہوئے کہا۔ انگلیس مجھے ایک سگریٹ دو۔ پھر سگریٹ سلگا کر اور اپنی ناک سے دھواں نکالتے ہوئے بولی "زندگی بڑی عجیب ہے۔ میں مرد بہت اچھا جانتی۔ لیکن میں پوری کی پوری عورت ہوں۔ اور پوری پوری بدصورت۔ اس کے باوجود مجھے بہت سے مردوں نے چاہا۔ اور میں نے بھی بہت سے مردوں کو چاہا ہے یہ عجیب بات ہے انگلیس! سنو یہ دل چسپ بات بھی ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میری بدصورتی کی طرف دیکھو۔ غور سے دیکھو انگلیس۔

تم بدصورت نہیں ہو۔

نہیں! جھوٹ مت بولو۔ کیا تم پر بھی اثر ہو گیا ہے؟ نہیں خبر! یہ تو مذاق تھا۔ میری بدصورتی کی طرف دیکھو۔ لیکن اس کے باوجود جب کوئی مرد اندھا ہو جاتا ہے تو میرے دل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ میں مرد کو بھی اندھا کر دیتی ہوں۔ اور خود بھی اندھی ہو جاتی ہوں۔ پھر کیا یک بیک بغیر کسی وجہ کے ایک دن وہ مرد میری بدصورتی دیکھ لیتا ہے اور مرد اور مرے دل کی کیفیت بچ سے چھن جاتی ہے۔ سمجھتی ہو لڑکی! اس نے لڑکی کا شانا ہلاتے ہوئے کہا۔

ماریا نے جواب دیا۔ نہیں! کیونکے تم بدصورت نہیں ہو

ماریا اور رابرٹو کے اصرار کے باوجود پلار اپنے جذبات و احساسات کا صحیح تجزیا کرتی رہتی ہے۔ وہ پر دل اور بے باک ہونے کے باوجود نہایت رحمدل عورت ہے اور خانہ جنگی کی تحریک کے آغاز سے تحریک میں شامل ہے وہ ماریا اور رابرٹو کی محبت کی قدر کرتی ہے اور دونوں کو شادی کرنے کی ترغیب بھی دلاتی ہے لیکن رابرٹ جارڈن اپنے فرض کو محبت پر ترجیح دیتا ہے اور "الوداع جارڈن" پل بارود سے اڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے

پلار ماریا اس کے کٹے ہوئے بال دیکھ کر کہتی ہے "ہم چھوٹے ہوئے بالوں کو پسند کرتے ہیں لیکن فاشی عورتوں کی طرح نہیں" اور ماریا اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے لیکن فاشی عورتوں کی طرح اپنے آپ کو محاذ جنگ سے

میری کشمیر یاترا

راوھارمن ام۔ پی

کشمیر کا نام لیتے ہی ہمارے سامنے ایک نہایت دلکش اور دلفریب تصویر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہم کتنا ہی اسے بھلانا چاہیں مگر وہ بھلائی نہیں جاسکتی۔ ۲۱ ستمبر کی شام کو دلی اسٹیشن سے کشمیر میل میں لگے نئے قسم کے ایک تیسرے درجے کے ڈبے میں ہم پارلیمنٹ کے ۱۲ ممبر سوار ہوئے اور اگلے دن صبح ٹھیک ساڑھے چھ بجے پٹھان کوٹ اسٹیشن پر پہنچے۔ یہ اسٹیشن ہندستان اور کشمیر کے درمیان آخری ہے اور دیکھنے میں ریلوے کے تمام اسٹیشنوں کی نسبت بہت صاف ستھرا معلوم دیتا ہے یہاں اسٹیشن ماسٹر نارون ریلوے کے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ جموں اور کشمیر ریاست کے آفیسر نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم فوراً روزانا کی ضروریات سے فارغ ہوئے ناشتا کیا اور مخصوص ریاستی بس میں ۲۷ روپے فی سواری کا واپسی ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے اور قریب پارا بجے جموں جا پہنچے۔ پٹھان کوٹ سے جموں اور جموں سے سری نگر کا کل فاصلا دو سو میل ہے کچا اوپر ہے۔ مگر سڑک نہایت اچھی ہے موٹر کار کے ذریعے کم سے کم پورا ایک دن اور بس کے ذریعے قریب دو دن سری نگر پہنچنے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ دو سو میل لمبا سفر نہایت آسانی سے کٹتا ہے کیوں کے اس کے درمیان زمین کو سرسبز کرنے والی نہروں تیز رفتار دریاؤں اونچے اونچے پہاڑوں ہرے بھرے کھیتوں دل خوش کرنے والے نظاروں کا زبردست سلسلا بندا ہے۔ جگہ جگہ ڈاک بنگلے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں جہاں آنے جانے والوں کو ہر قسم کا آرام کم خرچ پر ملتا ہے باورچی حسب منشا کھانا پکا کر دیتا ہے۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں وہ وقت تو ضرور بچاتے ہیں مگر قدرت کے ان پر لطف نظاروں سے جو انسان کو نئی جوانی بخشتے ہیں محروم رہتے ہیں۔ پٹھان کوٹ سے جموں جاتے وقت دو مقاموں پر ٹھہرنا لازمی ہے پہلے مقام پر ہندستان سے جموں کی طرف جانے والوں کو اپنا پرمٹ چیک کرانا پڑتا ہے اور دوسرے مقام لکھن پور پر جو ریاست کی کسٹم کی آمدنی کا سب سے بڑا مرکز ہے سامان کی چیکنگ کرانی ہوتی ہے اس طرح ہم جموں قریب دوپہر کے پہنچے اور وہاں رگھوناتھ جی کے مندر کے درشن کر کے ڈاک بنگلے میں کھانا کھا کر دو بجے سری نگر کے لیے روانا ہوئے۔ رستے میں ایک مقام ہے جسے کڈ کہتے ہیں۔ اور وہاں ڈاک بنگلا بھی ہے ہم سب وہاں ٹھہر گئے کھانا کھا یا۔ رات کو آرام کیا اور صبح بہت جلد ایک ایک پیالی چائے پی کر ہم پھر روانا ہوئے دوپہر کا کھانا بانہال کے ڈاک بنگلے میں کھایا۔ اور تقریباً تین بجے ہم بانہال پہاڑ کے پیٹے کو چیرتی ہوئی خوف ناک اور سب سے اونچی چوٹی پر کاٹی ہوئی سرنگ سے پار ہوئے۔ جموں اور کشمیر کے درمیان یہ سرنگ ہی آمد و رفت کا صرف ایک ذریعہ ہے سال میں قریب قریب چھ مہینے یہ پہاڑ اس سرنگ کے ساتھ برف سے ڈھکا رہتا ہے جس کی وجہ سے جموں اور کشمیر کی ریاست دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور ان میں باہمی آمد و رفت بالکل بند ہو جاتی ہے۔ صرف ہوائی جہاز جب موسم اچھا رہتا ہے آنے جانے والوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے اس سے ریاست کے لوگوں کو کافی تکلیف ہوتی ہے۔ تجارت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ ہندستانی سرکار نے اس وقت کے

پیش نظر یہ فیصلا کیا ہے کہ جلد سے جلد اس پہاڑ کے نچلے حصے کو چاک کر کے ایک دوسری سرنگ نکالے جو سال بھر برابر جموں اور کشمیر کے درمیان آمد و رفت جاری رکھنے کی ذمہ دے مگر یہ کام آج تک بھی جاری نہ ہو سکا۔ مگر اب بہت جلد یہ سرنگ تیار ہو جائے گی۔ تب ریاست کے عام لوگوں کو بیرونی اور دونوں شہروں کے درمیان اندرونی تجارت کو فروغ دینے کا موقع ملے گا۔ اور عام لوگوں کو آنے جانے میں بھی پورے سال کے لیے بہت بڑی سہولت ہوگی ریاست کے لوگوں کی نظر اس اہم کام کی طرف لگی ہے اور ہر شخص خواہش مند ہے کہ ہندستانی سرکار اس کام کو جتنی جلدی انجام دے اچھا ہے۔

جموں سے سری نگر جاتے وقت بانہال پہاڑ کے ایک طرف چڑھائی ہی چڑھائی ہے۔ اور دوسری طرف اترائی ہی اترائی ہے۔ ہماری بس جب پہاڑ کی چوٹی پر تھی تو ایک عجیب و غریب منظر تھا جس طرف نظر اٹھا کر دیکھا دائیں بائیں اوپر پیچھے پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتا تھا اور ٹیڑھی چکر دیتی ہوئی سڑکیں جن پر سے ہماری بس گذر رہی تھی بغیر معمول خوف پیدا کرتی تھیں۔ اور صرف لکیر کی شکل اختیار کیے تھیں۔ اس پہاڑ کے ایک طرف جموں کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف سری نگر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ جوں ہی ہم پہاڑ سے اترتے ہیں سڑک کے دائیں طرف تین میل کے فاصلے پر ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک نایاب چشمہ ہے جو ویری ناگ کے نام سے مشہور ہے کہتے ہیں یہ چشمہ حکم مغل بادشاہ شاہجہاں اس زمانے کے مشہور انجینیر حمید رنے تعمیر کیا تھا۔ اسے پہاڑوں کی جڑ میں اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ خدنخدر زمین سے بہت نیچے کے ساتھ لگا تار اس قدر پانی نکلتا رہے کہ دریا جہلم بن کر سری نگر اور اس کے پاس کے علاقوں کو سرسبز کیا کرے اس چشمے کے ساتھ مل جاتا ہے ان چشموں کے ساتھ ایک خوبصورت باغیچا بھی ہے جو رنگین پھولوں سے ہمیشا سجا رہتا ہے اور آنے جانے والوں کو فرحت بخشتا ہے اس مقام کے بعد سے کشمیر کی وہ سرسبز وادی جو تقریب ۸۰ میل لمبی اور بیس سے بہ میل چوڑی ہے شروع ہوتی ہے۔ یہ سمندر کی سطح سے قریب ۶۰۰۰ فٹ اونچی ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دنیا کی بہترین جگہ ہے اور سوئیزرلینڈ بھی اس کے سامنے پھیکا نظر آتا ہے۔ ویری ناگ سے ½ ۱ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم سری نگر جا پہنچے۔ ڈل گیٹ کے قریب پانی میں لگی ہوئی ہوس بوٹس یعنی ناوگھروں میں ہم نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔

ہاوس بوٹ یعنی ناوگھر کشمیر میں خاص چیز ہے۔ یہ پانی میں کھڑا رہنے والا ناو کی شکل کا مکان ہے یہ رہائش کے سب سامان سے آراستا خوب صورت لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ درجہ اول کی ہاوس بوٹ میں کم سے کم تین کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں دو پلنگ آ سکتے ہیں۔ ایک لگ کھانے کا کمرا اور دوسرا بیٹھنے کا کمرا یعنی ڈرائنگ روم ہوتا ہے ہر کمرے کے ساتھ مسل خانا پاخانا بجلی اور نل سب لگے ہوتے ہیں۔ درجہ دوم وسوم کے ناوگھر کچھ چھوٹے یا کم کمروں والے معمولی ہوتے ہیں۔ کشمیر سرکار کی طرف سے ان ناوگھروں کا نرخ مقرر ہے۔ ہماری بوٹ کا نام سیر منزل تھا۔ اس کا مالک نیک طبیعت بہت خاطر کرنے والا رحیم اکھورا ہے۔ ہم اسے فی آدمی ۱۰ روپے کرایا دیتے تھے جو کافی سستا سمجھنا چاہیے اس کرایے میں ناو کا پورا استعمال خدمت۔ صبح کی چائے اور حاضری دوپہر اور رات کا کھانا بھی شریک تھا۔

شہر سری نگر کے چاروں طرف دور اور پاس پہاڑوں کا زبردست سلسلا ہے اور شہر کے بیچ سے دریائے جہلم بہتا ہے اس کے ایک طرف ڈل لیک اور ناگین لیک نام کی دو بہت بڑی بڑی جھیلیں ہیں جن کا پانی بہت صاف اور میٹھا ہے۔ یہ سری نگر کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتی ہیں

اوران جھیلوں میں کھڑی رہنے والی ہاؤس بوٹس اوران میں مقیم انسانوں کی زندگی نہایت خستگوار نباتی ہیں۔ شہر کی دوسری آبادی اوران میں رہنے والوں کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

لکڑی کی چھوٹی ناؤ کی قسم کے ٹرکارے، چھوٹی ایک چپو سے چلنے والی کشتیاں زندگی کی تمام ضروریات ان میں رہنے والوں کو مہیا کرتی ہیں۔ ٹرکاروں میں بیٹھ کر ہم سبزیاں جا سکتے ہیں۔ ان میں بسنے والوں کی سچ پوچھو دنیا ہی الگ ہوتی ہے، اور اسے ہم پانی کا شہر کہدیں تو غیر واجب نہ ہوگا۔

ہم سری نگر کل دس دن ٹھہرے۔ ہمارا مرکز ہماری بوٹ ہاؤس ہی رہا۔ ہم لوگ تیار ہوکر صبح ۹ بجے بس پر سوار ہوتے اور سری نگر یا اس کے قریب کے مشہور مقامات کو دیکھنے جاتے۔ بعض دن کو نہیں، دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی لے جانا ہوتا تھا۔ اور ہم شام کو کھانے کے وقت واپس لوٹتے تھے سری نگر اور اس کے اردگرد دیکھنے کے لائق اتنے مقام ہیں کہ دس دن میں ہم کچھ ہی مقام دیکھ سکے۔ مگر جن مقامات کی تعریف ہم نے سب سے زیادہ سنی تھی انہیں ہم نے ضرور دیکھنے کی کوشش کی ان میں چشمہ شاہی، نشاط باغ، شالیمار، ہارون وولر لیک گندھر بل سون مرگ، گلمرگ کھلن مرگ۔ شنکر اچاریا کا مندر، ناگن لیک ڈل لیک قابل ذکر ہیں۔

اس درمیان میں ہم نے دو تین دن بارامولا اوڑی میں ہونے والے نیشنل کانفرنس کے جلسے بھی دیکھے۔ صدر ریاست جموں وکشمیر اور پرائیم منسٹر سے ملاقاتیں کیں۔ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ لڑکیوں کا کالج اور مدرسا بھی دیکھا۔ لوگوں سے بھی ملے جن میں پونی ڈرائیور، بوٹ مین، ٹانگا ڈرائیور کسان اور مزدور سوشل ورکر وغیرہ وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔

جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب اپنی طرح کے الگ الگ ہیں اور ہر ایک کی اپنی اپنی خصوصیتیں ہیں جو دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کو زبان سے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ قدرت نے ان مقامات کو وہ خوب صورتی عطا فرمائی ہے جو دیکھنے والے کو ساکت کر دیتی ہے چشمہ شاہی کا میٹھا پانی جیسے بار بار پینے کو دل چاہتا ہے نشاط باغ کے چلتے ہوئے دل کش فوارے۔ اس میں رنگ آمیز پھولوں کی مہک سبزہ زار سیب اور روسرے پھلوں سے لدے ہوئے درخت شالیمار اور ہارون کے دلفریب منظر سون مرگ کی برفانی چوٹیاں چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ اور ان کے درمیان میں بہتا ہوا دریا مست ہوائیں۔ چشمے۔ سالانہ یہ سب کشمیر کی خوب صورتی کو ہر خیال سے مکمل کرتے ہیں۔

سری نگر سے ہم چند دن کے لیے پہلگام اور وہاں سے امرناتھ کی طرف بھی گئے۔ راستے میں ہم نے پام پور میں کیسر کے کھیت، اننت ناگ اور مشن کے چشمے بھی دیکھے چند دن واڑی۔ شیش ناگ اور پنج ترنی تک ہی پہنچے تھے کہ رات کو اتنی برف پڑی کہ امرناتھ کے سب رستے بند ہوگئے اور چاروں طرف سوائے برف کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دیا ہمارے ساتھ بہنیں بھی تھیں۔

یہ ایک عجیب منظر تھا جو زندگی میں شاید ہی کسی کو دیکھنا نصیب ہوتا ہو۔ پنج ترنی سے اس لیے ہمیں مایوس واپس لوٹنا پڑا۔ مگر برف کی ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کو دیکھنے گھٹنوں تک برف میں چلنے اور اتنے میں روئی کے گالوں کی طرح برف کو پڑتی دیکھنے کے شوق نے ہماری وہ مایوسی ختم کر دی اور پورے تین روز بعد صحی سلامت سری نگر واپس آجاتے۔

غرضکہ ہم نے کشمیر میں ۱۵ دن اس قدرخشی کے گذارے کہ ان کی یاد زندگی بھر رہے گی۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس ملک میں بسنے والے ہر انسان کو دنیا کی اس خوب صورت اور دل کش جگہ کو زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور دیکھنا چاہیے اور ایسا

کشمیر کے لوگوں کی ایک زبردست خدمت ہے۔ ہندستانی ادب

تھامس ایڈیسن

یوسیس

(گیارہ سو ایجادیں کرنے والا سائنسداں)

دنیا کے عظیم ترین محسنوں میں صرف اوتار پیغمبر فلاسفر مفکر، ڈاکٹر سیاست داں ہی نہیں بلکہ سائنسداں اور ایجاد و اختراع کرنے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ انہیں میں سے ایک برگزیدا ترین ہستی ایڈیسن کی بھی ہے۔ انہوں نے دنیا کو فونوگراف، ٹاکی اور خاموش فلمیں، بجلی کے بلب اور بجلی کی ریل بیش بہا افادیت کی اشیا ہی نہیں دیں بلکہ مزید گیارہ سو ایجادوں سے دنیا کو صنعتی لحاظ سے بھی مالا مال کر دیا ہے ذیل میں ان کے کچھ ولی چسپ حالات کا مطالعہ فرمایئے

بہت سے ملکوں کے سائنسدانوں کی اختراعی قابلیت اور محنت و دماغ سوزی نے جدید میکانکی دور کے سینے کو ایک حقیقت بنانے میں بڑا حصا لیا ہے لیکن ان میں سے شاید ہی کسی فرد واحد کی ایجادات نے امریکا کے موجد تھامس ایلوا ایڈیسن کی طرح دنیا پر اتنا بھاری اثر نہیں ڈالا۔ ایڈیسن کی سال گرہ ہر سال فروری کے مہینے میں منائی جاتی ہے۔

ایڈیسن نے جو گیارہ سو ایجادیں کی ہیں ان میں فونو گراف (جو اسے اپنی ایجادوں میں سب سے زیادہ پسند تھا) بجلی کے لیمپوں میں روشن ہونے والا تار (جس کے لیے دنیا اسے ہمیشہ یاد کرتی ہے) خاموش اور بولنے والی فلمیں۔ کاربن ٹیلی فون، ٹرانسمٹر اور بجلی سے چلنے والی ریل جیسی اختراعات شامل ہیں۔

صرف اتنی ہی ایجادوں کے باعث ہی ایڈیسن کو موجدوں کی صف اول میں جگہ ملتی۔ لیکن اس نے ڈپلیکیٹنگ مشین اولین لاؤڈ اسپیکر میگا فون کچے لوہے سے نفیس ترین بریک نکل لوہے کی پٹری اور وہ دوسری بہت سی ایجادیں کی ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں کام آتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے دو شین تیار کی جسے لیبارٹری یعنی تجربہ گاہ کہا جاتا ہے۔

ایڈیسن کا مقولا

ایڈیسن اکثر کہا کرتا تھا کہ "قوت اختراع یا ذہانت میں دو فی صد خیال اور ۹۸ فی صد پسینا ہوتا ہے۔" (یعنی قوت اختراع اور ذہانت کے ساتھ محنت کرنا ضروری ہے۔) ناکامیوں سے اسے مزید کوششوں کی تحریک ہوتی یہاں تک کہ وہ کامیابی حاصل کر لیتا۔

پہلی ایجاد

ایڈیسن نے پہلی ایجاد ۱۹ برس کی عمر میں کی تھی۔ یہ کانگریس میں ووٹ ریکارڈ کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ لیکن کانگریس کو اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ ایک صاف گو نمایندے نے اس سے کہا کہ "اے نوجوان ایک کانگریسی نہیں چاہتا کہ اس کا ہر ایک ووٹ ریکارڈ ہو جائے۔" ایڈیسن نے یہ سبق خوب یاد رکھا۔ اس وقت، اسے اس بات کا بخوبی علم ہو گیا کہ اسے کیا کام کرنا چاہیے، اور وہ منڈیوں میں اپنی ایجادوں کی کھپت کو پہلے سے ہی یقینی بنا لیتا۔ اس طرح اپنے مقاصد میں قطعی پختگی سے وہ اپنا وقت بے کار تجربوں میں ضایع نہ کر نے سے بچ گیا۔

پیدائش

ایڈیسن میلان اوہایو (امریکا) میں ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا تھا اور مشکل سے تین مہینے اسکول میں پڑھا۔ اس کے بعد اس کی ماں خود اسے تعلیم دیتی رہی۔ اسے اگرچہ اس بات کی ضرورت نہیں تھی تاہم وہ لڑکپن میں ریل گاڑیوں میں اخبار اور مٹھائیاں بیچتا۔ اس آمدنی سے وہ کتابیں اور اپنی لیبارٹری کے لیے سامان خریدتا رہتا تھا۔

عجیب واقعہ

ایک وقت ایڈیسن کو ایک ریل گاڑی میں دلچسپ واقعہ پیش آیا جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس طرح موقع محل سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت رکھتا تھا۔ ایک بزرگ صورت خوش پوشاک شخص نے اس سے کہا کہ یہ جو اخبار بیچتا پھرتا ہے انہیں پھینک دے۔ وہ اسے ان کی قیمت ادا کر دے گا تاکہ وہ آرام سے بیٹھ سکے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایڈیسن اپنی گاڑی میں واپس آگیا۔ جہاں اس نے مزید اخبار اور رسالے وغیرہ رکھ چھوڑے تھے۔ وہاں سے کچھ اور رسالے اٹھا لایا اس شخص نے ایڈیسن سے پھر کہا کہ یہ رسالے بھی پھینک دو اور ان کی قیمت بھی اس نے ادا کر دی۔ ایڈیسن اسی طرح اپنے رسالے اور اخبار وغیرہ لاتا گیا۔ اور وہ بزرگ شخص ان کی قیمت ادا کرتا اور پھینکوا تا گیا۔ آخر اس نے پوچھا کہ اب تمہارے پاس کتنے اخبار اور رسالے وغیرہ باقی ہیں ایڈیسن نے جواب دیا کہ اب تو سوٹ کیس خالی رہ گیا ہے اس شخص نے کہا وہ بھی لے آؤ اور پھینکدو۔ ایڈیسن نے ایسا ہی کیا اور اس کی قیمت بھی اسے مل گئی۔

تقدیر کی اس اتفاقیہ یاوری سے ایڈیسن نے بجلی کے متعلق کتابیں خریدیں اور ان کا مطالعہ سنجیدگی سے شروع کر دیا۔

بجلی کا بلب بنانے کے تجربوں کے دوران ایڈیسن نے ایک اور دریافت کی جس سے عالمی معاشرت میں ایک انقلاب آگیا۔ اسے "ایڈیسن ایفکٹ" کہا جاتا ہے۔ جس کی بنا پر ریڈیو بنایا گیا۔ اس سے جدید الیکٹرانک ٹیوب بنایا گیا جس پر ریڈیو کی نشریات لمبے فاصلے کے ٹیلی فون۔ ایکسرے، موسیقی کے الیکٹرانک آلات اور بہت سے دوسرے طریقے اور ایجادیں عمل میں آئی ہیں۔

عزت افزائی

ایڈیسن کی اختراعی قوت اور ایجادات کے اعتراف میں امریکی کانگریس نے اسے ۱۹۲۸ء میں ایک خاص تمغا دے کر سرفراز کیا۔ بہت سی یونیورسٹیوں کی طرف سے اعزازی ڈگریوں کا اور امریکا کی نیشنل اکاڈیمی آف سائنسز کی رکنیت کے علاوہ ایڈیسن کو فرنچ لیجن آف آنر کا کمانڈر بنایا گیا۔ اور برطانیا کی آرٹ سوسائٹی نے البرٹ تمغا دیا۔ امریکی انجینئرنگ سوسائٹیوں کی طرف سے بھی اسے جان فرٹز کا انعام ملا۔ ۱۹۱۴ء میں اس نے جرمنی کا ایتھانو تمغا پایا۔

انتقال

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں انتقال کے وقت تک ایڈیسن نے گیارہ سو ایجادیں پیٹنٹ کرائی تھیں۔ کسی بھی فرد واحد کے نام پر امریکا کے متفقہ دفتر نے آج تک اتنی ایجادوں کو پیٹنٹ کرانے کی سند نہیں جاری کی ہیں۔

صنعتوں کا قیام

ایڈیسن کی ان ایجادوں کی وجہ سے جو صنعتیں اور کارخانے قایم ہوئے ان کی مالیت کا تخمینہ ۲ ارب ڈالر لگایا گیا تھا۔ اور یہ لاکھ لوگ کام پر لگے ہوئے ہیں اگر ان کو بھی شمار کیا جائے جو ایڈیسن کی ایجادوں سے براہ راست قایم نہیں ہوئیں لیکن جو ایڈیسن کی ان سائنٹفک معلومات کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی تھیں جو ایڈیسن کی تحقیق کا نتیجہ تھیں تو یہ تعداد دو کروڑ افراد اور ان کے گھر والے ہوں گے۔

خش طبعی

فضلی شاہین بی اے

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات ۔ ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

خش طبعی اور زندہ دلی ہمارے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے غذا ۔ اگر خش مزاجی اور ظرافت دنیا سے اٹھ جائے تو زندگیاں کتنی بوجھ ہو جائیں ۔ اور وقت کاٹنا کتنا مشکل ہو جائے فکروں اور پریشانیوں کے ہجوم اور زندگی کے تلاطم انگیز لمحے اس ہنسی کی بدولت گذر جاتے ہیں ۔

ہماری گھریلو زندگی کس قدر بے کیف ہے ہم میں غصا اور غم اور خامشی مسرت اور خندہ پیشانی سے کہیں زیادہ ہیں ۔ ہم اپنی اس مختصر زندگی کا زیادہ حصا رنجیدہ اور ملول رو کر گذار دیتے ہیں ۔ خوشی اور شادمانی کی نذر ہونے والا وقت بہت ہی کم ہوتا ہے ۔

آج کل اقتصادی کش مکش نے ہماری معاشرت کا نقشا ہی بدل دیا ہے ۔ مرد روزگار کی فکر میں پریشان اور سرگرداں ہیں ۔ عورتیں اور لڑکیاں گھر کے بارے میں غمناک اور افسردا میں ۔ بچے اپنی تعلیمی مصروفیات میں لگے ہوئے ہیں ۔ ایسی حالت میں جبکہ تفکرات کے بادل چاروں طرف چھائے ہوں ہم معنوی طور پر ہی ہنستے مسکراتے رہیں تو غنیمت ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہنسی تو امیروں اور دولت مندوں کا حصا ہے ایک ایسا شخص جسے پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی اور جو افلاس و ناداری پستی میں گھرا ہوا ہے اس کے لبوں پر ہنسی کیسے آسکتی ہے ۔ اس کے منہ سے خوشی کا کوئی کلمہ کیوں کر نکل سکتا ہے ۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ہے ۔ ایک جھونپڑی میں رہنے والا کسان جو صبح سے شام تک چلچلاتی دھوپ میں پیرٹ کی خاطر ہل چلاتا ہے وہ اپنی زندگی کیسی خوشی اور مسرت سے گذارتا ہے وہ ہنستا اور گاتا ہوا زندگی کے بحر بے پایاں کو عبور کر لیتا ہے یہ ہنسی ہی اس کی زندگی کا سہارا ہے ۔

اگر ہم اپنی زندگی کا سنہری زمانا دوسروں کی برائی عیب جوئی اور خدغرضی میں گذار دیں اور معاشی تفکرات میں ڈوبے رہیں تو ہم کہاں کے عقلمند ہیں ۔ اگر کوئی واقعا ہماری طبع کے خلاف ظہور پذیر ہوتا ہے تو ہم اسے کیوں نہ ہنس کر یا مسکرا کر ہی ٹال دیں ۔ مسکرانے سے ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی بلکہ ہمارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جائے گی اور ہماری روح ایک قسم کی تسکین محسوس کرے گی ۔

ہم کبھی نہیں سوچتے کہ ہماری زندگی کتنی معمولی اور حقیر باتوں میں بسر ہوتی ہے اور ہماری پریشانیاں کتنی ادنا قسم کی ہیں ۔ دھوبی نے کپڑے ٹھیک نہیں دھوئے ہم نے تیوری چڑھائی ۔ ہماری سائیکل کا کوئی پرزا خراب ہو گیا ہم ملول ہو گئے ۔ ہماری کتاب گم ہو گئی ہم آزردا ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ سالن میں نمک تیز ہے ہمارا پارا چڑھ گیا اگر ہم کسی فرصت کے وقت غور کریں تو یہ باتیں کتنی معمولی اور حقیقت نظر انگیز ہیں ۔

سب سے بڑا گناہ کسی کا دل دکھانا ہے اور سب سے بڑا ثواب کسی کو ہنسانا یا خش کرنا ہو سکتا ہے ۔ صبح ہم ہنستے ہوئے اٹھے کیوں نہ تمام وقت زندہ دلی میں گذار دیں ۔ اپنے احساس لطیف اور ذوق ظرافت سے خدکو بھی لطف اندوز کریں ۔ اور دوسروں کو بھی محظوظ کریں ۔ اگر ہم میں یہ مادا نہیں تو کسی ایسے شخص کی صحبت میں بیٹھیں جو روتی صورتوں کو ہنسا دے ہنسی ایک متعدی مرض ہے ایک کو ہنسا دیکھ کر دوسرا بھی ہنسنا شروع کر دیتا ہے ۔

خش باش فطرتیں سوسائیٹی کے لیے نعمت غیر مترقبا ہیں ۔

خشی طبع انسان اگر کسی وقت افسردہ ہوگا تو تمام اس کی اداسی کو محسوس کریں گے۔ مگر اس کے برعکس اگر ایک چڑچڑے مزاج کا آدمی کبھی بھولے سے ہنس بھی دے تو کوئی اس کی ہنسی کو اتنی اہمیت نہیں دے گا۔ مردوں میں ظرافت کا مادہ فوقیت پایا جاتا ہے اس کے مقابلے میں صنف نازک میں یہ مادہ کم پایا جاتا ہے وہ صرف مردوں کے ظریفانہ اقوال سے لطف اٹھانے پر اکتفا کرتی ہے۔

اگر ہم اپنے دماغ کو بے جا فکروں سے آزاد رکھیں تو زندگی ہمیں ایک بار محسوس نہ ہو۔ اگر ہم روز روز کے امور میں دلچسپی لیں اور ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچیں کہ اس کام سے ہماری زندگی زیادہ پر لطف ہو جائے گی تو ہمیں یہ کام کرنا دوبھر محسوس نہ ہو۔ اور غم کبھی ہمارے پاس تک نہ پھٹکے۔

ہمارے ملک میں (بہ استثنائے معدودے چند مغربی ممالک) اتنی پژمردگی کیوں پائی جاتی ہے۔ زندگی کی کشمکش تو جہاں بھی انسان موجود ہیں پائی جاتی ہے پھر دوسرے لوگ کیسے خوش رہتے ہیں۔ دراصل ہم چھوٹے بے معنی کاموں کے واسطے ہم اس قدر پریشان اور متفکر ہو جاتے ہیں کہ یہ محل سنجیدگی ظرافت پر غالب آجاتی ہے اگر ہم چاہیں تو ہر بات میں ظرافت کا پہلو نکال سکتے ہیں۔ عربی مقولہ ہے جس طرح نمک کھانے کو لذیذ بناتا ہے اسی طرح کلام میں ظرافت کی تھوڑی سی چاشنی اس کو پر لطف اور دلچسپ بنا دیتی ہے اس کے علاوہ فلسفیانہ اور منطقی خشک دلائل کے ساتھ جو بات کہی جائے اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا اس بات کا جو خوش طبعی کے ساتھ کہی جائے۔ اگر ہم ہر بات کا جواب مسکراکر دیں تو دوسرے انسان پر اس کا زیادہ اثر ہوگا۔ کہتے ہیں کہ زندہ دل انسان کی صحت زیادہ بہتر ہوتی ہے اور بیماریاں اسی سے دور بھاگتی ہیں۔ وہ زندگی دل میں انقباض سا پیدا ہوتا ہے جو انسان کو موت کی طرف لے جاتا ہے۔

شبستانوں کی سی خاموشی۔ فلسفیانہ زندگی۔ قبرستانوں کا سا شور و غوغا اور جھٹیار خانوں کی سی تو تو میں میں اگر ہماری زندگی سے نکل جائے تو ہماری زندگی کتنی خشگوار اور پرامن ہو سکتی ہے۔ ہماری زندگیاں اسی فانی دنیا میں بھی بہشت کا نمونہ بن سکتی ہیں۔

ہنس مکھ لوگ ہر جگہ اور ہر موقع پر ہنسی کا سامان پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے خود ساختہ غموں اور مصیبتوں کو کم کر دینا چاہیے۔ اور اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنی پریشانیوں کی ناقدر کر دیں۔ اور قہقہوں کے طوفان سے غم و اندوہ کو اس دنیا سے دور بھگا دیں۔ دوسروں کی لغزشوں اور خلاف طبع باتوں پر کتابچینی کرنا اور ذرا ذرا سی باتوں پر دل کو مکدر رکھنا ہماری زندگی کا جزو بن چکا ہے اور ہم اس کے بغیر زندگی گذارنے میں ایک وقت محسوس کرتے ہیں۔

اگر ہم عزم کر لیں کہ آج سے ہم خندہ جبیں رہیں گے اور دوسروں کو بھی ہنسائیں گے تو ہم یقیناً کامیاب ہو سکیں گے ہمارے غم انگیز اور مرا افزا آئینہ زندگی سے تفکرات کا عنصر کم ہو جائے گا۔ ہمیں دوستوں اور رشتے داروں کی بغض و حسد کی باتوں پر نہ بگڑنا چاہیے۔ ہمارا بگڑنا دوسروں سے زیادہ خود ہمارے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے اس دنیا میں ناخوشگواریاں زیادہ ہیں اور کامیاب انسان وہی ہے جو بڑے بڑے حوادث کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ بلکہ انھیں زندگی کا ایک چیز سمجھکر مسکراتا ہوا ان کا استقبال کرے۔ اگر ہم چاہیں تو ان تلخیوں کو ظرافت کی چاشنی میں ڈبو کر نہایت شیریں اور خشگوار بنا سکتے ہیں۔ اور ان سے پژمردہ دلوں میں شگفتگی اور افسردہ آنکھوں میں تازگی پیدا کر سکتے ہیں۔

دنیا کی تلخیوں پر مسکرانا اور مشکلات میں ہنسنے کا نام

ریاست اور فرد کا رشتا

پی۔ ولسن ہیریس

ہر شخص کو خیالات کی آزادی حاصل ہو وہ اپنی مرضی کے مطابق سوچ سکے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ اس کا یہ حق حقیقی جمہوریت کی بنیاد ہے۔ وہ ریاست کا مالک اور ریاست اس کی نوکر ہے۔

ہماری سیاسی زندگی کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ریاست اور فرد کے درمیان کس قسم کا رشتا قایم کیا جائے۔ اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے برابر زندگی بسر کرنے کی اجازت ہو۔ بشرطیکے وہ دوسروں سے صحیح طریقے سے پیش آئے۔ اور ان کو اپنے رویے سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچائے اس کے علاوہ ریاست اس کی بھلائی بہتری کے لیے وہ سبھی انتظامات کرے جو وہ خود آسانی سے نہیں کر سکتا یا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ ریاست اور فرد کے مثالی تعلقات کا ایک ضروری حصہ یہ بھی ہے کہ ریاست پر تمام پابندیوں کا کنٹرول ہو۔

اس بات پر کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ ریاست کو فرد کی زندگی میں اس کے فائدے کے لیے کس حد تک دخل دینا چاہیے مثال کے طور پر ریاست لوگوں کی آمدنی پر ٹیکس عاید کرتی ہے اور یہ چیز اس کی زندگی میں ایک قسم کی مداخلت ہے لیکن ٹیکس لگانا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ریاست کے کاروبار ہی نہیں چل سکتے۔ لہٰذا ہر شخص ٹیکسوں کی پابندی کو تسلیم کرتا ہے۔ بشرطیکے ریاست لوگوں سے ٹیکسوں کی شکل میں جو روپیا حاصل کرتی ہے اس پر لوگوں کے نمایندوں کا کنٹرول ہو لوگوں کو یہ دیکھنے کا حق حاصل ہو کہ ریاست ان کے روپے کو کس طریقے سے صرف کرتی ہے۔ بعض ممالک میں بیر یا شراب خریدنے پر پابندی لگائی جاتی ہے اس قسم کی پابندی سے شخصی آزادی میں ضرور فرق پڑتا ہے مگر لوگ اس قسم کی پابندی کو اس لیے منظور کر لیتے ہیں کہ یہ چیز مجموعی طور پر ان کے مفاد میں ہے۔

ضروری آزادیاں

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ فرد کو خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل ہو بشرطیکے وہ اظہار خیالات کا کوئی توہین آمیز طریقہ اختیار نہ کرے۔ اسے اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ جو چاہے کہے جو چاہے لکھے اور جو چاہے پڑھے آمریت پسند ریاستوں کا بدترین پہلو یہ ہے کہ وہ نہ صرف پریس پر پابندیاں عاید کر دیتی ہیں بلکہ وہ اسے ڈرا دھمکا کر مجبور کرتی ہیں کہ وہ ایک خاص قسم کی چیزوں کو شایع کرے اسے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے اور جو اخبار نافرمانی کرتا ہے اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔

یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پریس کو مکمل آزادی ملنی چاہیے یا کیا اخبارات زمانہ جنگ میں ایسی خبریں شایع کر سکتے ہیں جن سے دشمن کو امداد ملتی ہو اس سوال کا سیدا سادا جواب یہ ہے کہ پریس کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ملک کے کاز کو نقصان پہنچانے کی اجازت دی جائے یہ چیز قابل ذکر ہے کہ برطانیا میں پہلی اور دوسری

عظیم جنگوں کے دوران اخبارات پر لازمی سنسر شپ عاید نہیں کی گئی تھی۔ اخبارات پر اعتماد کیا گیا تھا کہ وہ اپنے کالموں میں ایسی کوئی چیز نہیں چھاپیں گے جس سے قومی مفاد کو نقصان پہنچتا ہو۔ اور انہوں نے اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

دل و دماغ کی آزادی حقیقی معنی میں اس وقت حاصل کی جا سکتی ہے جب تعلیم حاصل کرنے کی آزادی بھی حاصل ہو۔ ہر بچے کا یہ حق ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے اور متعدد ممالک میں ریاست ایک خاص درجے تک مفت تعلیم اور لازمی تعلیم کا انتظام کرتی ہے اور ہر بچہ ایسی تعلیم حاصل کر سکتا ہے جو تعلیم کو لازمی اس لیے بنایا جاتا ہے کہ بعض والدین بچوں کی جانب اپنی ذمے داریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن تعلیم عام بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ تمام بچوں کو ایک ہی رنگ کی تعلیم دی جائے۔ پسندیدہ بات تو یہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں طرح طرح کے تجربے کیے جائیں۔ اور ہر شخص کو اس بات کا فیصلہ کرنے کی آزادی ملنی چاہیے کہ وہ اپنے بچے کو کس قسم کی تعلیم دینا چاہتا ہے۔

سچائی کی تلاش

عالم قسم کی تعلیم میں اور خاص کر سائنٹفک ریسرچ کے کام میں ہر فرد کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ آزادی سے سچائی کی کھوج کرے۔ ایک بار سائنسدانوں پر پابندیاں عاید کرنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ ان کی دریافتیں بائبل کی رائج نشریجات کے خلاف تھیں۔ روس میں آج کل سائنسدانوں پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعلیمات اور تحریروں میں ایسے خیالات کا اظہار کریں جو حکومت کے مخصوص سیاسی نظریوں کے عین بالکل برابر ہوں۔ یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے! ایسی بات اس طرح ہر کسی کی شخصیت کو روک دیتی ہے۔

آمریت پسندی اور مغربی تہذیب کا یہی فرق ہے جمہوریت کی بنیاد دل و دماغ کی آزادی ہے جبکہ آمریت پسند ریاستوں میں اس قسم کی آزادی کا نشان نہیں ملتا ایک جمہوری نظام میں ہر شخص اس خیال سے ریاست کی حمایت کرتا ہے کہ وہ اس کی بھلائی بہتری کے لیے ضروری ہے وہ ریاست کا مالک ہے اور ریاست اس کی نوکر۔ اور یہی چیز اس کی آزادی کی ایک حقیقی ضمانت ہے۔

امپیریل کیمیکل انڈسٹریز کی طرف سے لندن یونیورسٹی میں چار وظائف کا پیش کش

مرکزی وزارت تعلیم کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ لندن یونیورسٹی نے چار ریسرچ فیلوشپ و تحقیقات کے وظائف کے لیے درخواستیں طلب کی ہیں۔ یہ وظائف امپیریل کیمیکل انڈسٹریز کی طرف سے مائیکوکیمسٹری، کیمیائی طریقہ علاج انجینئرنگ خام دھاتوں کو صاف کرنے کا فن علم الادویات، علم طبیعات وغیرہ کے مضامین سے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں دیے جائیں گے ان وظیفوں کی مدت ابتدا میں تین سال مقرر کی گئی ہے اور مدت کا آغاز یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء سے ہوگا۔ امیدواروں کا تعلیمی معیار عموماً پی۔ ایچ۔ ڈی کا ہونا چاہیے اور ان کی تحقیقات کے نتائج بھی شایع شدہ ہونے کے علاوہ تیس سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے ضروری معلومات اور درخواستوں کے فارم وزارت تعلیم کے اسکالرشپ اینڈ الفا میشن ڈویژن سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

چ-۱

موسیقی میں تحقیق کے قومی ادارے کا قیام

پیکنگ کے شمال مغربی مضافات میں موسیقی میں تحقیق کے قومی ادارے کا اس کی اپنی ہی عمارت میں منعقد ایک تقریب میں افتتاح کیا گیا۔ یہ ادارہ جو تحفظ موسیقی کے مرکزی ادارے کے ساتھ ملحق ہے چین کی موسیقی کے ثروت مند ورثے کی باضابطہ تحقیق یعنی کلاسیکی موسیقی اور لوک سنگیت کی تحقیق کے فرائض سرانجام دیتا ہے اور اپنے کام کو نغمانگاری، فن موسیقی کے مظاہرے اور موسیقی کی تربیت کے سلسلے میں موجود اسکولوں سے جوڑتا ہے تاکہ چین کے موسیقی کے کلچر کو بالا ماں کیا جا سکے۔

اس ادارے کے تین شعبے ہیں جو کلاسیکی موسیقی لوک سنگیت اور اقلیتی عوام کی موسیقی سے متعلق ہیں۔ اس ادارے کے ڈائرکٹر فن موسیقی کے نظریاتی اصولوں کے مشہور ماہر لی۔ یو آن چنگ ہیں اور کلاسیکی موسیقی کے ماہر یانگ۔ ین۔ لیو ہیں یہاں قدیم چین کی موسیقی کے چند اور ماہر بھی تحقیق کا کام کرتے ہیں۔ اور ابھرتے ہوئے نوجوان موسیقار بھی۔ ان میں موسیقی کی تاریخ کے مشہور ماہر شینگو چیالن ہیں۔ لوتان (ستار کی قسم کا ایک ساز) بجانے والے چاؤ۔ نورشی ہیں اور پیپہ (بہت سے تاروں والا ایک ساز) بجانے والے سُا۔ ان ہوئے موسیقی میں تحقیق کا قومی ادارہ اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے اور ایسا ادارہ چین میں پہلے کبھی قائم نہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی میں باضابطہ تحقیق گذشتہ چار سالوں میں یعنی تحفظ موسیقی کے مرکزی ادارے کے قیام کے وقت سے جاری ہے۔ جاپان کے خلاف جنگ کے دوران۔ ان میں جو اس وقت آزاد کرائے گئے علاقے کی راجدھانی تھا۔ موسیقاروں نے بہت کام کیا تھا۔ ۲۷ مارچ کو افتتاحی تقریب موقع پر ڈپٹی ڈائرکٹر لی۔ یو۔ آن چنگ نے جو رپورٹ پڑھی اس میں کہا کہ گذشتہ چار سالوں میں تحفظ موسیقی کے مرکزی ادارے نے ملک کے ہر ایک حصے سے کوئی دو ہزار سے زاید لوک گیت اور مقامی اور ہر اجمع کیے یہ گیت دور افتادہ مقامات سے بھی جمع کیے گئے جہاں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کے عوام آباد ہیں۔ اب اس ادارے میں موسیقی کی تخلیقات اور گیتوں کی کل گنتی ۲ ہزار ہو چکی ہے۔ منتخب گیتوں کے ۱۲ سے زیادہ مجموعوں کو ابھی آخری ترتیب دیا گیا ہے اور ان میں سے کچھ گیتوں کو شائع بھی کیا گیا ہے۔

آپ نے آگے چل کر کہا کہ تاریخی نوعیت کا مواد موسیقی میں تحقیق کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے تلاش اور ریکارڈ کیا گیا ہے اس میں گیتوں کی لکھی ہوئی دھنیں ہیں ان کے تیار کیے گئے ریکارڈ ہیں سازوں پر بجائے جانے والے قلم بند نغمے ہیں قدیم سازہیں۔ انیسویں صدی میں تائے پنگ کی عظیم بغاوت سے متعلق کسانوں کے گیت ہیں۔ اور دوسری انقلابی خانہ جنگی کے وقت کے (۱۹۲۷ سے ۱۹۳۷) گیت ہیں۔

کی۔ یو آن چنگ نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ ۱۹۴۹ء کے بعد سے تحفظ موسیقی کے مرکزی ادارے نے چین کی موسیقی کی تاریخ سے متعلق مواد کی بہت سی نمائش بھی دکھائیں۔ اس بات نے نہ صرف چینی عوام میں بلکہ سوویت یونین چیکوسلواکیا، ہنگری، جرمنی اور دوسرے ملکوں سے آنے والے اشخاص میں بھی گہری دلچسپی کو ابھارا ہے۔

اپنی رپورٹ کے آخر میں لی۔ یو۔ آن چنگ نے کہا کہ آنے والے پانچ سالوں کے اندر یہ ادارہ چین کی موسیقی

سے متعلق ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ ادارہ گیتوں کو جمع کرنے کلاسیکی اور لوک سنگیت کا مطالعہ کرنے کے کام کو جس میں اقلیتی عوام کا لوک سنگیت بھی شامل ہوگا آگے بڑھائے گا۔ اس میدان میں سوویت یونین کے انتہائی ثروت مند تجربے کی طرف خاص دھیان دے گا۔ لوک سنگیت کو ترقی دینے پر خاص طور سے توجہ صرف کی جائیگی تاکہ چین کے محنت کش عوام کی تہذیبی زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔

افتتاحی تقریر کے بعد اکنسرٹ (مجلس موسیقی) منعقد کی گئی کو انگ۔ لنگ گیتوں کی قدیم دھنیں جنہیں ایک ہزار سال سے زاید مدت میں کبھی بجایا نہیں گیا انہیں نامور فنکاران بجانے والے کو آن چنگ بیو نے پیش کیا۔ تحفظ موسیقی کے مرکزی ادارے نے قدیم دھنوں کو ضبط تحریر میں لانے اور انہیں سلجھانے کے لیے مطالعے اور تحقیق پر لمبی رقم صرف کیے۔ اور کو آن نے جب ان دھنوں کو پیش کیا تو سب نے انہیں بڑی توجہ کے ساتھ سنا۔ دوسرے موسیقاروں اور اوپیرا سے متعلق مرکزی تجرباتی تھیٹر کے فنکاروں نے کلاسیکی موسیقی اور لوک سنگیت سے متعلق دوسری ۸ چیزیں پیش کیں۔

افتتاحی تقریب میں تہذیبی معاملات کی وزارت کے نائب وزیر۔ لیو۔ چی۔ منگ اور پیکنگ کے ایک سو سے زاید نامور ادیب موسیقار اور شاعر موجود تھے۔

اس ادارے میں پبلک کے لیے ایک مستقل نمائش کھولی گئی ہے جہاں موسیقی سے متعلق دو اسٹیار رکھی گئی ہیں جن کا ذکر ڈپٹی ڈائرکٹر نے کیا۔

اگر آپ مصنف ہیں اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجئے۔ اس لیے کہ یہی وہ میگزین ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے

آکسفورڈ یونین کا صدر ایک ہندستانی طالب علم

بمبئی کے ایک طالب علم مسٹر آر۔ بین آئر کو آکسفورڈ یونین سوسائیٹی کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ مسٹر آئر ۱۹۵۰ء میں رہوڈز وظیفے پر آکسفورڈ آگئے تھے اور سیاسیات فلسفا اور معاشیات کا ایک کورس کرنے کے لیے مینگڈلن کالج میں داخل ہوئے تھے وہ بمبئی یونیورسٹی کے بی۔ اے آنرز ہیں۔

آکسفورڈ یونین سوسائیٹی جو اس یونیورسٹی کی تمام انجمنوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے ۱۸۲۳ء میں قایم ہوئی تھی اس کے پاس اپنی عمارت اور میدان ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا اس یونین سے ایک کلب اور بحث مباحثے کی ایک سوسائیٹی کا کام لیتے ہیں۔ اس کی عمارت میں کلب کی تمام سہولیات موجود ہیں اس کا بحث مباحثے کا ہال پارلیمنٹری نمونے پر تعمیر کیا گیا ہے اور نشستیں بھی پارلیمنٹری طرز کی ہوتی ہیں۔ برطانیا کے کئی ممتاز سیاست دانوں نے اپنی ابتدائی تربیت اس یونین میں حاصل کی تھی۔ مثال کے طور پر گلیڈسٹن اس یونین کے ابتدائی زمانے میں اس کا ایک ممتاز رکن تھا۔ یونین کی صدارت ایک عالا اعزاز المقصور کی جاتی ہے۔

جسم کا اندرونی معالج ۔ خون

۱۰۱

خون جسم انسانی کے رگ و ریشے میں نہ صرف غذائی مادا اور حیات بخش آکسیجن ہی پہنچاتا ہے بلکے جسم انسانی کا اندرونی معالج بھی ہے اور جسم کے اندر داخل ہونے والے بیماریوں کے جراثیم سے نبرد آزما رہتا ہے۔

خون کے سیال حصے میں سرخ و سفید خلیات ہوتے ہیں جو "جسیمے" پلیٹ لیٹس اور گمک کہلاتے ہیں۔ ایک مکعب ملی میٹر (۳۹۳۔ واپنج) خون میں پچاس لاکھ سرخ زنگ کے "جسیمے" اور تقریباً ۷۰۰۰ سفید "جسیمے" ہوتے ہیں اور یہی سفید "جسیمے" کثیر تعداد میں جسم کے اس حصے کی جانب تیز حرکت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور خون کی نالیوں کی دیواروں سے داخل ہو کر اثر زدہ حصے کا محاصرہ کر لیتے ہیں اور ان جراثیم کو ہلاک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی سفید "جسیمے" کے اندر ۵ سے ۲۰ تک جراثیم دیکھے گئے ہیں۔ بیماری کے جراثیم نہایت تیز قسم کے زہروں سے مسلح ہوتے ہیں۔ چنانچہ جراثیم اور مدافعت کرنے والے سفید "جسیموں" کی جنگ میں "جسیمے" مات کھا جاتے ہیں۔ اور ان کے "مردے" اور "زخمی" زیادہ تعداد میں ایسی پیپ کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو ایسے حالات میں پائی جاتی ہے جس حصے میں پیپ بڑھ جاتی ہے اسے انبیس یا پھوڑا کہتے ہیں۔

خون جسم کی خود اصلاحی صلاحیت کو تقویت پہنچاتا ہے چنانچہ جب زخم کی وجہ سے جسم سے خون جاری ہو جاتا ہے تو منجمد خون ہی ایک ایسا قدرتی ذریعہ ہے جس کی بدولت خون کا بہنا بند ہو جاتا ہے۔ خون کے منجمد ہونے کے عمل میں بہت ہی پیچیدہ اور کیمیاوی طریقے شامل ہیں۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ اگر خون میں منجمد کرنے والا مادا جسے معمول طور پر موجود ہے تو نتائج بہت تکلیف دہ ثابت ہوں گے اس صورت میں خون نالیوں میں منجمد ہو جائے گا۔ درحقیقت امر واقعہ یہ ہے کہ اس خون میں ایک کیمیا مادا بھی موجود ہوتا ہے جو کسی حادثے کے وقت خون منجمد ہو جاتا ہے۔

بلند مقامات پر پھیپھڑوں میں ہوا کی کمیابی کے اندر آکسیجن کے دباؤ کا پھیلاؤ کم ہوتا ہے اس لیے ہر سرخ "جسیمیا" پھیپھڑے کو مکمل طور پر پر کیے بغیر ہی گذر جاتا ہے تاہم یہ کمی زیادہ تیز گردش کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے اور ہر "جسیمے" کے چکروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور "جسیموں" کی تعداد میں اضافہ "تلی" کی وجہ سے ہو جاتا ہے جہاں ان "جسیموں" کا خزانہ موجود رہتا ہے اگر پھر بھی ضرورت باقی رہے تو طویل معدیوں کے گوشے سے خون پیدا کرنے والے اعضاء حرکت سے "جسیمے" مستقل طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے خون جسم کو صحت مند رکھنے کے معاملے میں بنیادی خدمت انجام دیتا ہے اگرچہ سفید "جسیمے" بھی ایک بہت اہم کام سرانجام دیتے ہیں مگر سرخ "جسیموں" کا کام بھی کچھ کم اہم نہیں۔

ہندستانی زبان

اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

بچوں کا رسالا

ن۔ا

رسالا پائنیر (فرنچز) کے دفتر میں بہت سے لوگ آیا کرتے ہیں۔ بڑے بھی (لکھنے والے) اور بچے بھی (پڑھنے والے) لیکن یہ تخصیص بھی درست نہ ہوگی کیونکہ بچوں میں ہمارے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں میں بڑے بھی۔

رسالے کے ایڈیٹر بڑے اور بچے پڑھنے والوں اور بڑے اور بچے لکھنے والوں سے باقاعدہ تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق سے ہمیں اپنے پروگرام مرتب کرنے مناسب مسئلے چھیڑنے اور رسالے کو اور زیادہ دلچسپ بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ہمارے ہاں مصنفوں کی بڑی طویل فہرست ہے بچوں کے لیے لکھی ہوئی بہترین تصانیف میں سے بہت سی ایسی ہیں جو سب سے پہلے "پائنیر" میں شایع ہوئی تھیں ہمارے بچوں میں اے۔ گائیدار کی کتابیں سب سے زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریباً تمام کہانیاں اور ناول سب سے پہلے "پائنیر" ہی میں شایع کرائے انہیں میں ان کا ناول "تیمور اور اس کی ٹولی" بھی شامل ہے جس کو ہمارے ملک کے تمام اسکول بچے اور بچیاں جانتے ہیں۔ سن میخائیلوف کے مشہور اور رحم دل دیو "ٹام دی ٹاور" کا تعارف پڑھنے والوں سے "پائنیر" ہی نے سب سے پہلے کرایا تھا۔ اس رسالے نے قدرت اور جانوروں کے متعلق م۔ پرشنین۔ ک۔ پاستووسکی اور وریبائکی کی کہانیاں ب۔ ژیتکوف کی سمندری کہانیاں، ل۔ کاسل، واولیسوا۔ س۔ استونک اور ن۔ دوردنکو وا اور بچوں کے سب سے پرانے ادیب

سمونوف و۔ تواردووسکی، س مارشک اور ا۔ بارتو کی نظمیں اور بہت سے دوسرے ادیبوں کی کہانیاں اور نظمیں شایع کیں پریلی ادیبوں کی تصنیفات کے ترجمے ہمارے رسالے میں باقاعدگی سے شایع ہوتے رہتے ہیں۔

پریلوں کی کہانیاں دنیا بھر کے بچے بڑے شوق سے سنتے اور پڑھتے ہیں۔ مختلف قوموں کی پریلوں کی کہانیاں "پائنیر" کے ہر شمارے میں ملیں گی۔

ابھی حال ہی میں جب ہندستانی قصے کہانیاں جب ہمارے رسالے میں شایع ہوئے تو پڑھنے والوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ہمارے رسالے کا خاص اور سب سے بڑا حصہ ادبی ہے لیکن پورا رسالا اسی پر مشتمل نہیں ہوتا۔ مضمون، کہانیوں، ناولوں اور نظموں کے علاوہ ایڈیشن دینے والے مضمون بھی ہوتے ہیں سوویت سرزمین اور اس کے قدرتی حالات کے متعلق چھوٹے چھوٹے مرقعوں میں بچوں کو اپنے وطن کے متعلق اور زیادہ معلومات فراہم کرتے اور اس سے اور بھی زیادہ محبت کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ تواریخی مضامین واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کرکے بچوں کی کتابی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ خود بچوں کی لکھی ہوئی کہانیاں مختلف تکنیکل مشغلوں کھیلوں وغیرہ کے حلقوں کے متعلق، سکول بچوں کے لیے منظم کی ہوئی سیروں اور اپنے آس پاس کے علاقوں میں نئی دریافتیں کرنے والے نوعمر سیاحوں کے متعلق، نوعمر مشاہدین قدرت کی کوششوں کے متعلق بچوں میں شوقیہ فن کاروں کے پیش کیے ہوئے

دل چسپ، غیر نصابی سرگرمیوں کو بچوں میں مقبول کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں اس قسم کے جو مضامین دغیرہ شایع ہوئے اور سب سے زیادہ دل چسپی کے ساتھ پڑھے گئے وہ محبوب مشغلوں کے متعلق کہانیاں تھیں۔ ایک تیرہ سالا بہت تراش نے پھولوں کے پودے لگانے سے محبت کرنے والی ایک نئی سی بچی نے گلائیڈر وغیرہ بنانے کا شوق رکھنے والے ایک لڑکے نے اسکیٹنگ کے شوقین ایک بچے نے اپنے اپنے محبوب مشغلوں سے حاصل ہونے والی مسرت کے متعلق مضامین لکھے۔ یہ کہانیاں دوسرے بچوں میں کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنانے کی دل چسپی پیدا کرتی ہیں۔ سائنس سے متعلق سوالات کو رسالے میں کافی زیادہ جگہ دی جاتی ہے۔ سائنس اور انجینیرنگ میں نئی دریافتوں کی خبروں کے ساتھ ساتھ سائنسی ایجادوں اور مشہور سائنسدانوں کی کوششوں کے متعلق کہانیاں بھی شایع کی جاتی ہیں۔ ادارے کے ذمے دار افراد بچے کو ان علوم کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنا خاص طور پر ہم تصور کرتے ہیں جن کے ابتدائی اسباق اس کو اسکول میں دیے جاتے ہیں۔ ان علوم کی عملی اہمیت سمجھانا بھی وہ ضروری تصور کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے اور معقول بات بھی ہے کہ اس میگزین (رسالے) میں سائنس اور انجینیرنگ کا جو حصہ ہے اس کا مقصد پڑھنے والوں کو ان علوم کی تازہ ترین دریافتوں اور ایجادوں سے واقف رکھنا اتنا نہیں جتنا کہ انہیں سائنسی مسئلوں پر دل چسپی لینے کے لیے ابھارنا ہے اسی لیے ایسے مسئلوں پر بچوں کی اپنی کوششوں کے متعلق مضامین رسالے میں بہ حیثیت شایع کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نو عمر مشاہد قدرت کا قصاحیں نے اپنے علاقے میں پائے جانے والے حیوانات کا مطالعہ کیا اور بعض جانوروں اور پرندوں کی زندگی کے متعلق چند خلیے تصویریں بھی اتاریں۔ اسٹالن گراڈ کے ایک اسکول میں حلقۂ آثار قدیمہ کے ممبروں کا ایک سفر نامہ جسکے وہ قدیم "سہر وا جگا" کا محل وقوع دیکھنے گئے اور بچے کی دریافتیں بھی کیں۔ گاؤں کے اسکولی بچوں کے متعلق ایک مضمون جنہوں نے اپنے اسکول کے لیے ایک بجلی گھر بنایا۔

اپنے خطوں میں اور ہمارے عملے سے ذاتی ملاقاتوں کے دوران ہمارے رسالے کے پڑھنے والے پردیسی مزدور طبقے کے بچوں کی زندگی کے متعلق بین قومی صورت حالات کے متعلق عالمی امن کی جدوجہد کے متعلق اکثر سوالات کیا کرتے ہیں۔ رسالا ان تمام سوالوں کے مناسب جوابات دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بچوں کو مختلف ملکوں کے نمائندہ مجاہدین امن کے متعلق معلومات ہونی چاہئیں اسی لیے ہم نے "مجاہدین امن" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا اور پچود اکو پال رابسن، زولو کیوری، ہنری مارٹن اور الوالعزم مجاہدین امن کی زندگی اور کارناموں سے متعارف کیا۔

بچے فنون لطیفہ سے بڑی دل چسپی رکھتے ہیں۔ رسالا "پائنیر" بچوں کو مصوروں، بت تراشوں، موسیقاروں اور سوویت جمہوریوں کے لوک گیتوں نیز پردیسی فنون لطیفہ سے روشناس کراتا ہے چنانچہ جب ماسکو میں ہندستانی فنون لطیفہ کی نمایش شروع ہوئی تو رسالے میں ہندستانی مصوری کے چند شاہکاروں کی تصویریں شایع کی گئیں جو سوویت مصور اور فن کار ہندستان ہو آئے تھے۔ انہوں نے ہندستان کے قدیم اور جدید آرٹ، اجنتا اور ایلورا کے مندروں کی نفیس تراش قدیم تصاویر، بت تراشی اور تصویر کشی کے متعلق مضامین لکھے۔ اور بچوں کے اس رسالے میں شایع کرنے کے لیے دیے۔

"پائنیر" جن بچوں کو اپنا پیغام پہنچاتا ہے ان کی زندگی تاثرات اور احساسات سے بھرپور ہے ان کی دل چسپیاں وضع وضع کی ہیں اور ان کا دایرا وسیع ہے۔ وہ طرح طرح کے بے شمار سوالات پوچھتے رہتے ہیں اور رسالے کو ان کے جوابات دینے ہوتے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے لکھنے والوں میں مختلف علوم و فنون کے مستند ماہروں کا ہونا ضروری ہے مختلف پیشوں کے لوگ ہمارے رسالے کے ذریعے بچوں سے گفتگو کرتے اور اپنے علم و تجربے میں ان کو اپنا شریک بناتے ہیں۔ اسکول کا ایک استاد انہیں اسکول کے امتحانوں کی تیاری کا سوزوں ترین پروگرام بتاتا ہے۔ روسی فیڈریشن کے عوامی فن کار رس۔ اویرا نے سوویت تھیٹر کے نئے نئے شوقینوں کو اپنے اسکول میں کٹ پتلیوں کے تھیٹر کی تنظیم کے لیے حال ہی ذرائع بہترین طریقے سے منظم کرنے کے طریقے بتاتے ہیں نغمانگار دشوت نکا کو وچ انہیں عظیم نغمانگار م۔ گلنکا کی تخلیقات سے روشناس کراتے ہیں، قطب کشتمالی کے مشہور مباحث کے اوشاکوف بچوں کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے اس خطے میں سفر کیا اور سورنا یا زمیا جزیروں کو تلاش کر کے نقشے میں ان کی مقام بتایا۔ پہلے ان جزیروں کے وجود کا کسی کو علم نہ تھا۔ و۔ فاورسکی بچوں کو نقش نگاری کے آرٹ سے روشناس کراتے ہیں۔ ایکڈیمیشین ن۔ لسی نیکو یوں کی کاشت سے دلچسپی رکھنے والے اسکولی بچوں کو صلاح اور مشورا دیتے ہیں تے بجلی گھروں اور تیروں کے معماروں جہازرانوں پر کام کرنے والوں مزدوروں اداکاروں سائنس دانوں ڈاکٹروں اور بہترین کھلاڑیوں کا اس رسالے کے ذریعے ہی پڑھنے والوں سے تعارف کرایا جاتا ہے۔

ہمارے رسالے کا ایک مستقل عنوان "ہماری ڈاک" کا تھیلا" ہے۔ اس کے تحت بچوں کے لکھے ہوئے مضامین آتے ہیں۔ رسالے کے اس حصے میں اسکول کی زندگی کے متعلق بچوں کی دلچسپی کے جمالیاتی مسایل کے متعلق کتابوں کے متعلق بچوں کے لکھے ہوئے خطوط، نظمیں، تصویریں، کہانیاں وغیرہ شایع ہوتی ہیں۔ فن مصوری کی خداداد صلاحیت رکھنے والے بچوں کا ایک گروپ مہینے میں دو تین بار رسالے کے ادارتی دفتر میں جمع ہوتا ہے رسالے کے ایک دلچسپ مستقل عنوان "کلیاک" (روشنائی کا دھبا) کے تحت وہ خدمضامین وغیرہ تزئین دیتے ہیں۔ بچے لفظ دھبے کو محض کتابوں اور کاپیوں پر سیاہی کے دھبوں کے معنی میں ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ تراوٹ میں ہرج کرنے، دستی میں گڑبڑ پیدا کرنے والی تمام نامعقول حرکتوں کے لیے بھی اسکولی بچے یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہی حرکتیں نوعم طنز نگاروں کا نشانہ بنتی ہیں" دھبے" پڑھنے والوں میں بہت مقبول ہیں۔ رسالے کے اس حصے کے نام بہت سے خطوط آیا کرتے ہیں لیکن رسالے کا مزاحیہ حصہ یہیں تک محدود نہیں ہے۔ ہم مزاحیہ کہانیاں، نظمیں اور کارٹون باقاعدگی سے شایع کرتے ہیں۔

ہر شمارے میں ایک حصہ مطبوعات کا ہوتا ہے۔ اس میں کتابوں پر تبصرے کتابوں سے متعلق پڑھنے والوں کے تبصرے اور ادیبوں کے اپنی تصنیفوں کے متعلق مضامین شایع ہوتے ہیں۔

اس رسالے کے پیش نظر مقصد بچوں کے پڑھنے کے لیے دلچسپ مواد پیش کرنا ہی نہیں بلکہ انہیں اپنی تعلیم کے سلسلہ میں مدد دینا اور مشورا دینا بھی ہے۔ یہ مقصد مختلف مضامین سے اور خاص طور پر ایک مخصوص حصے سے پورا ہوتا ہے جس کا نام "سوالوں کے جوابوں کا کارخانہ" رکھا گیا ہے۔ اس ذیل میں مختلف اوزاروں سے کام لینے کے صحیح طریقے کسی نہ کسی چیز کا ماڈل بنانے کا طریقہ خوردبین، دوربین اور بچوں کی دلچسپی کی دوسری چیزیں استعمال کرنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔

بچوں کی دلچسپیوں سے متواتر آگاہ رہنے کی غرض سے ہمارے رسالے میں شایع ہونے والی چیزوں کے اثر کی پڑتال کرتے ہمارے نامزگار اسکولوں گھروں میں بچوں کی کمیٹیوں اور نوخیز گھروں میں جاتے رہتے ہیں۔ ہم رسالے کے ہر شمارے کو لے کر اس کے مضامین وغیرہ کے متعلق بچوں سے بحث کرتے ہیں۔

امریکی عورتوں کی ترقی

یو سیس

زندگی کے قریب ہر ایک شعبے میں امریکی عورتوں کی نمایاں ترقی اور ان کے اس مطالبے نے کہ مردوں کے برابر کام اور ان کے برابر تنخواہ دی جائے نہ صرف امریکا کے لوگوں اور حکومت امریکا کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہے بلکہ اس نے دنیا کے دوسرے حصوں کی عورتوں کو بھی تقویت پہنچائی ہے اس وقت کوئی ایک کروڑ ۹۰ لاکھ یا ملک میں مزدوروں کی مجموعی تعداد کی ایک تہائی عورتوں پر مشتمل ہے۔ عورتیں زیادہ تر سکریٹری۔ بک کیپر۔ اسٹور کلرک۔ خادمہ۔ نرس، ٹیلی فون آپریٹر وغیرہ کے کام کرتی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ہزاروں عورتیں ڈاکٹر ڈینٹسٹ (دانتوں کا ساز) وکیل، جج، مصنف، آرٹسٹ، جرنلسٹ (اخبار نویس) اور قوموں کی افسر بھی ہیں۔ کوئی پانچ لاکھ عورتیں امریکا کی فیڈرل (مرکزی) حکومت کی ملازمت میں ہیں۔ ڈینٹسٹ ایک سو سال پہلے جب کوئی لڑکی کام کر کے روزی کمانے کا خیال کرتی تو وہ اپنے لیے جو کام تجویز کر سکتی تھی اسے اس کے ہی الفاظ میں سنیے "جب میں نے اپنی روزی آپ کمانے کا فیصلہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یا تو میں اسکول میں پڑھا سکتی ہوں۔۔۔ یا سینے پرونے کا کام ہاتھ میں لے سکتی ہوں، یا کسی کارخانے میں یا گھریلو خادمہ کے طور پر کام کر سکتی ہوں" لیکن کر سکنے کی مہارتی کی جگہ "کر سکتے" کی بھی کوئی وجہ نہیں رہی۔ اب تو عورتوں کے لیے کام کرنے کا میدان بہت وسیع ہے لیکن محدود پیمانے پر اسکولوں میں پڑھانے کے کام نے عورتوں کو جس قدر اپنی طرف کھینچا ہے اور کسی کام نے اس قدر نہیں کھینچا۔ جہاں تک دفتری کاموں یعنی سکریٹری وغیرہ کے کاموں کا تعلق ہے۔ ان میں اب عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ انجینئرنگ، کمرشیل، میں عرصے سے عورتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی مگر اب بچاؤ کی کوششوں کے سلسلے میں تربیت پائے انجینئروں کی بہت زیادہ ضرورت ہے اس لیے اب عورتوں کے لیے بھی یہ میدان کھل گیا ہے

اگرچہ عورتوں کے لیے کام کرنے کے وسیع میدان کھلے ہیں لیکن جس قدر مرد ان پیشوں کی ٹریننگ لیتے اور ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اس قدر عورتیں نہیں کرتیں۔ طب کے پیشے میں ۹ ہزار عورتیں ہیں۔ ان سب سے پانچ میں سے چار پرائیویٹ پریکٹس کر رہی ہیں۔ اور باقی تنخواہ دار عہدوں پر تعینات ہیں تربیت یافتہ لیڈی ڈاکٹروں کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ ہتھیار بند فوجوں کے لیے ڈاکٹروں کی مانگ ہے امریکا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بحری بیڑے نے لیڈی ڈاکٹروں کو بھرتی کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں آرمی کسی قدر پیچھے ہے لیکن رومن میڈیکل سپیشلسٹ کور میں بچہ ماہر لیڈی ڈاکٹر جنہیں خاص خاص کاموں کی ٹریننگ حاصل ہوتی ہے بھرتی کرنے کی اجازت ہے۔

جو عورتیں قانون پڑھتی ہیں اور پرائیویٹ پریکٹس میں ان کو مرد وکیلوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ان میں بہت تھوڑی ہوتی ہیں جن کو اپنی پریکٹس جمانے کا موقع ملتا ہے اور اس میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اس لیے اکثر عورتیں تنخواہ دار ملازمتیں تلاش کر لیتی ہیں۔

عورتوں کی اجرت کا مسئلہ

مساوی کام اور مساوی تنخواہ کے اصول کی حمایت زیادہ تر بڑے بڑے گروہوں یا انجمنوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔

لیکن قانون بنا دینا یا برابر تنخواہ کے قاعدے وضع کر لینا تو عورتوں کے لیے تنخواہ اور اجرتوں کی برابری حاصل کرنے کے سلسلے میں صرف ایک قدم ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ان بنائے ہوئے قواعد کو جاری کر دیا جائے اب چونکہ بچاؤ کے سلسلے میں کام آنے والی اشیا کی تیاری میں بہت سی عورتیں ملازم ہیں۔ اس لیے ان عورتوں کو مردوں کے برابر تنخواہ دے اور اس کے سلسلے میں بنائے گئے قواعد کو نافذالعمل بنانے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

عام طور پر عورتوں کی آمدنی مردوں کی اوسط آمدنی سے کم ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں عام طور پر ان کارخانوں اور صنعتوں نیز پیشوں میں ملازم ہیں۔ جن میں تنخواہیں اور اجرتیں عموماً کم ہوتی ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں عورتوں کی اوسط آمدنی مردوں کی اوسط آمدنی کی قریباً ۴۵ فی صدی تھی۔ البتہ گھریلو کاموں میں جہاں مرد بہت کم کام کرتے ہیں عورتوں کی اوسط آمدنی مردوں کی نسبت ۵۳ فی صدی ہے۔

انتظامی محکموں، ٹرانسپورٹیشن اور عام شہری فواید کی ملازمتوں میں جہاں برابر تنخواہ کا اصول مدت سے نافذ ہے۔ عورتوں کی اوسط آمدنی مردوں کی نسبت کسی قدر زیادہ یعنی انتظامی محکموں میں ۴۷ فی صدی اور ٹرانسپورٹیشن اور عام شہری فواید کی ملازمتوں میں ۶۷ فی صدی ہے۔ یہ آمدنی کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کی آمدنی سے بہت زیادہ ہے برعکس اس کے عموماً تجارت اور ذاتی ملازمتوں میں مساوی تنخواہ کا اصول ابھی ابھی کس حد تک جاری ہونے لگا ہے ان دونوں صنعتوں میں ۱۹۵۰ء میں عورتوں کی اوسط آمدنی مردوں کی اوسط آمدنی کی ترتیب وار ۴۸ فی صدی اور ۳۳ فی صدی تھی۔

عورتوں کے لیے کام کے نئے میدان بھی کھل رہے ہیں بہت سی عورتوں نے پرانے کام چھوڑ کر ایسے نئے کام اختیار کیے ہیں جن میں تنخواہ زیادہ اور جھگڑا کم ہے۔ مثال کے طور پر گھریلو کاموں پر لگی ہوئی عورتوں کی امداد جو دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے کم ہوتی جا رہی تھی اب اور بھی کم ہو گئی ہے اور اپریل ۱۹۵۱ء سے اپریل ۱۹۵۲ء کے درمیان ایک لاکھ چوبیس ہزار عورتوں نے یہ کام چھوڑ کر دوسرے کام اختیار کر لیے۔ اس سال کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں اور اس قسم کے دیگر کاموں میں لگی ہوئی عورتوں کی تعداد میں بھی بھاری کمی واقع ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں اسی عرصے میں دفتری کاموں میں تین لاکھ ۵۳ ہزار اور ٹیکنیکل کاموں میں ۲ لاکھ ۴۲ ہزار عورتوں کا اضافہ ہو گیا۔ بنکوں کا کاروبار ایسا ہے جسے پہلے صرف مردوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا مگر اب اس میدان میں بھی عورتوں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ اور ثابت کر دیا ہے کہ ان کو کسی بھی ذمے داری کے کام پر لگا دیا جائے۔ وہ اسے پورا کر کے دکھا دے گی۔ تازہ ترین اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکا میں بنک ملازموں کی آدھی سے زیادہ تعداد عورتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان کی زیادہ تر تعداد کلرک ہے مگر امریکا بھر کے بنکوں میں چھ ہزار عورتیں آفیسر بھی ہیں ان میں چھ بنکوں کی مالک یا حصہ دار ہیں، ۲۷ پوسٹ ماسٹر ۲۰ بنک پریذیڈنٹ اور ۳۳ وائس پریذیڈنٹ ہیں۔

تعلیم و تدریس

درس و تدریس ابھی تک عورتوں کا سب سے زیادہ مرغوب اور دل پسند پیشہ ہے اس پیشے میں امریکا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن اونچے درجوں یعنی پروفیسری وغیرہ میں نہیں ماسوائے ۱۹۵۰-۵۱ء کے امریکا کے ٹیچرز کالجوں سے جس قدر لوگوں نے ڈگریاں حاصل کیں عورتوں کی تعداد مردوں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے جہاں تک تعلیم کے میدان میں انتظامی عہدوں کا تعلق ہے ہائی اسکول پرنسپلوں میں عورتوں کا تناسب ۶۹ فی صد

ہے ان میں سے پچ سٹی اسکولوں کی پرنسپل ہیں ۱۹۳۹ء میں ۴۶ عورتیں سپرنٹنڈنٹ آف اسکولز تھیں۔ آج ڈھائی ہزار آبادی کے ۳۸۸ شہروں میں ۸ سپرنٹنڈنٹ آف اسکولز میں سے ایک عورت ہے۔ لیکن موخر الذکر شہروں کے ابتدائی اسکولوں کی آدھی سے زیادہ پرنسپل عورتیں ہیں امریکا میں ۶۹ زنانا کالج ایسے ہیں جو کسی خاص طبقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان میں سے گیارہ کالجوں کی پرنسپل عورتیں ہیں پچ عورتیں کالجوں میں پورے وقت کی پروفیسر بھی ہیں۔

تجارت و صنعت و حرفت میں

تجارت و صنعت و حرفت میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے کے لیے عورتوں کے امکانات اس قدر زیادہ نہیں جس قدر مردوں کے لیے ہیں۔ تجارت و صنعت و حرفت کے بہت سے اعلا عہدے مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں مگر جوں جوں عورتیں تجربہ کاری کے عہدوں کے لیے اپنے آپ کو اہل ثابت کرتی جارہی ہیں توں توں یہ خیالات بھی غلط ہوتے جارہے ہیں اور اب تجارتی اور صنعتی دنیا کے بھی کئی اہم عہدوں پر عورتیں نظر آنے لگی ہیں۔

امریکا کی تین افسر اعلا عورتیں ہیں ایک عورت اسٹینوگرافر سے ترقی کر کے امریکن ایرلائنیز کی وائس پریذیڈنٹ بن گئی ہے۔ قریب ایک ہزار عورتوں کے پاس تجارتی ہوائی جہاز چلانے کے لائسنس ہیں ان میں سے ۲ ایسی ہیں جن کو امتیازی نشان عطا کیا گیا ہے۔ ریڈیو کارپوریشن آف امریکا کے بورڈ کی ایک ممبر عورت ہے ایک اور عورت ولیسٹرن یونین ٹیلی گراف کمپنی کے بورڈ کی ممبر ہے ایک بڑی بھاری واشنگ مشین کمپنی کی وائس پریذیڈنٹ عورت ہے ملک کے ایک اہم ترین اخبار نیویارک ہیرالڈ ٹریبون کی پریذیڈنٹ بھی عورت ہے نیویارک کے ایک بڑے بھاری ڈپارٹمنٹ اسٹور (فرم) کی پریذیڈنٹ بھی ایک عورت ہے اسی طرح دو اور بڑی نیویارک کی فرموں اور ایک واشنگٹن کی بڑی فرم کی وائس پریذیڈنٹ بھی عورتیں ہیں سالٹ لیک سٹی کے ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور میں ۱۴ افسروں میں سے تین عورتیں ہیں یونیورسٹی آف منی سوٹا پریس کی افسر اعلا ایک عورت ہے اور اس کا سارا اسٹاف بھی عورتوں پر مشتمل ہے۔ شمالی امریکا کے محکمے پرواز کی ایک چیف انجینیر بھی عورت ہے۔ تجارت میں عورتوں کی کامیابی کی اس قسم کی سیکڑوں (جو کسی قدر کم نمایاں ہیں) مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اور جوں جوں عورتیں تجارت اور صنعت و حرفت میں زیادہ اقدام رکھ رہی ہیں اس قسم کی مثالوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔

ملازمتوں میں بیاہی عورتوں کی تعداد

۱۹۵۱-۵۲ء میں ملازمتوں کے متعلق اعداد و شمار سے دو باتوں پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے۔ (۱) یہ کہ لیبر فورس یعنی کام کرنے والی عورتوں میں بیاہی عورتوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے (۲) بڑی عمر کی عورتیں بھی زیادہ تعداد میں ملازمت اختیار کر رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے کی نسبت ملک میں بیاہی اور بڑی عمر کی عورتوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔

۱۹۵۱ء میں کام کرنے والی عورتوں میں شادی شدہ عورتوں کی تعداد ۵۵ فی صدی تھی یہ تعداد ۱۹۵۰ء کی نسبت بہ قدر تین فی صدی زیادہ ہے۔ اور ۱۹۴۰ء کی تعداد سے کوئی ۱۹ فی صدی زیادہ ہے۔ ۱۹۵۱ء کے اعداد و شمار یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ تمام شادی شدہ عورتوں میں سے ۲۷ فی صدی کام کر رہی تھیں۔ بیوا اور طلاق دی ہوئی عورتوں کی ۳۶ فی صدی ملازمت میں تھی۔ اور پچاس فی صدی غیر شادی شدہ عورتیں کام کرنے والی عورتوں میں تھیں۔

۱۹۴۰ء سے بڑی عورتوں کی طرف سے ملازمت کرنے کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے اگرچہ جنگ کے بعد لیبر فورس میں عورتوں کی تعداد کم ہوگئی مگر بڑی عمر کی کام کرنے والی عورتوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں ۴۵ سال کی عمر کی کام کرنے والی عورتوں کی تعداد پچاس لاکھ تھی۔

اور وہ کل کام کرنے والی عورتوں کی تعداد کا ۲۶ فی صدی تھیں۔ ۱۹۵۱ء میں ۴۵ سال کی عمر کی کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۱۵ لاکھ تھی اور وہ کل کام کرنے والی عورتوں کی تعداد کا ۲۰ فی صدی تھیں۔ ۱۹۵۱ء میں ۴۵ سال اور اوپر عمر کی کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۲۰ لاکھ ہوگئی۔ جو کام کرنے والی عورتوں کی مجموعی تعداد کا ۲۳ فی صدی تھی۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۵۱ء کے دس برس کے عرصے میں ۳۴ اور ۳۴ سال کے درمیان عمر کی عورتوں کی تعداد پچاس فی صدی سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے اور ۴۵ اور ۶۴ برس کے درمیان کی عمر کی عورتوں کی تعداد تو ۸۷ فی صدی بڑھ گئی۔ کام کرنے والی عورتوں کی اوسط عمر جہاں ۱۹۳۱ء میں ۲۷ برس تھی وہاں ۱۹۵۱ء میں ۳۷ برس ہوگئی۔

گھر سے باہر کے کاموں میں عورتوں کی تعداد کے بڑھ جانے کی ایک وجہ بچاؤ کے کام میں آنے والی چیزوں کی تیاری میں اضافہ ہے لیکن عام طور پر کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں اضافہ نہ گی ضرورتوں کے لیے بھرتی نہیں۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ صنعت و حرفت میں توسیع ہو رہی ہے اور عورتوں اور مردوں دونوں کی زیادہ سے زیادہ بطور کاریگر ضرورت پڑتی ہے۔

اس صدی کے اوایل سے ہی عورتوں کا رجحان کام کرکے روزی کمانے کی طرف بڑھتا ہی چلا آرہا ہے جس طرح پچھلے زمانے میں جب جب پیداوار بڑھانے کی ضرورت پڑی ہے کاریگروں اور کام کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح اب بچاؤ کے کاموں کے لیے سامان کی تیاری کا ضرورت ہے۔ اس لیے کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

مضمون نگار حضرات مضامین صاف اور خوش خط روانہ کریں

جسم انسانی سے فضلات کا اخراج

ہم جتنی خوراک کھاتے ہیں وہ سب کی سب ہمارے جسم میں جذب نہیں ہوتی۔ اس کا کچھ حصہ فضلات کی صورت میں ہمارے جسم سے خارج ہوتا رہتا ہے یہ فاضل مادہ اگر جسم کے اندر ہی جمع رہے تو اس سے جسم انسانی کے مختلف اعضا کے قدرتی عمل میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ خوراک کے جس حصے میں غذائیت کا عنصر ہوتا ہے اس کے ہضم ہو چکنے کے بعد فاضل مادہ جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔ جسم انسانی کو اس فاضل مادے سے پاک رکھنے میں پھیپھڑے اور جلد بھی اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ جسم میں جو زہریلی کاربن ڈائی آکسائڈ گیس پیدا ہو جاتی ہے وہ پھیپھڑوں کے ذریعے ہمارے جسم سے خارج ہوتی ہوتی رہتی ہے اور دیگر فضلات پسینے کے ذریعے جسم سے باہر نکلتے رہتے ہیں۔ فاضل مادے کو جسم انسانی سے خارج کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ گردے ہیں۔ گردے بعضوی شکل کے دو عضو ہوتے ہیں اور خاص قسم کے بہت سے چھوٹے چھوٹے خلیات پر مشتمل ہوتے ہیں ان کا کام پانی اور فاضل مادے کو خون سے علیحدہ کرنا اور پیشاب کی صورت میں اسے جسم سے خارج کرنا ہے۔

پیشاب کی صورت میں جسم انسانی سے خارج ہونے والے پانی کی مقدار پر کنٹرول رکھنے سے گردے جسم انسانی میں دورا کرنے والے خون کی مقدار پر بھی کنٹرول رکھتے ہیں اور اسے مطلوبا سطح پر برقرار رکھتے ہیں۔ جب پانی کی بہت زیادہ مقدار خارج ہو جاتی ہے تو گردے زیادہ مقداریں بلکہ پیشاب کو خارج کرنا شروع کر دیتے ہیں پسینے کی زیادتی یا قے آنے سے جب زیادہ مقدار میں پانی جسم سے خارج ہوتا ہے تو گردے بھی پیشاب کی صورت میں کم مقداریں پانی خارج کرتے ہیں

چینی ادیب لہسون

چ-۱

پیکن کے بڑے اخباروں نے چینی ادب میں اشتراکی حقیقت پسندی کی داغ بیل ڈالنے والی شخصیت لہسون کی ستراویں برسی پر خاص مضامین شائع کیے۔ پیکن کے انگلش ویکلی "پیپلز ڈیلی" میں چینی ادیبوں کی یونین کے ڈپٹی چیرمین فینگ سیو فینگ نے لکھا "لہسون ــــ بیسویں صدی کے حقیقت پسند عالمی ادب کے استادوں میں سے ایک ہیں اور چینی ادب میں اشتراکی حقیقت پسندی کے علمبردار پیش رو ہیں۔"

فینگ نے جو خود بھی ایک سرکردہ ادیب اور نقاد ہیں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ "لہسون سے سب سے زیادہ اہم ہے خاص طور پر ان کی حقیقت پسندی سے کیونکہ چین میں ادب آج عوام کے تخلیقی کام کی خدمت کر رہا ہے۔"

"لہسون کی نگارشات، اور ان کی حقیقت پسندی کی عظیم ترین قدر یہ ہے کہ انہوں نے چین کے عوامی انقلاب کے اصل حالات کی آئینہ داری کی۔ آپ کی قوت فکر کی ترقی نے چین کے عوامی انقلاب کے ارتقا کی جھلک دکھائی۔" آپ نے آگے چل کر کہا۔

فینگ سیو فینگ نے جو لہسون کے نزدیکی دوستوں میں سے ایک تھے لکھا "لہسون ادبی جن تھے اور ساتھ ہی ساتھ عظیم انقلابی اور مفکر بھی تھے۔" آپ نے پھر لہسون کا تذکرہ ایک ایسے انسان کے طور پر کیا جو انقلابی فکر و نظر کے ذریعے جاگزیں اور سماج کی طرف غیر مصالحانہ رویہ رکھتا تھا جس کا مشاہدہ تیز تر تھا اور جو بلا خوف و خطر زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کرتا تھا جو پرانی اور مرتی ہوئی ہر چیز کی بیباکی سے مخالفت اور نئی ابھرتی ہوئی انقلابی طاقتوں کی حمایت کرتا تھا۔

آپ نے کہا "ان کا عظیم انقلابی نقطۂ نظر اور جنگجویانہ جذبہ ان کی ادبی تخلیقات میں جھلک رہا ہے لہسون نے انقلاب کے لیے لکھا۔ ان کے لیے ادب انقلاب میں ایک جنگ آزما ہتیار تھا۔ اور حقیقت پسندی اس ہتیار کے بنانے کی لازمی ضرورت۔"

لہسون پرانے چین میں رہتے تھے جس پر رجعت پرستوں کی حکمرانی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں سماج کی شیطان صفت طاقتوں کو بے نقاب کرنے میں صرف کیں۔ یہاں تک کہ ان کی ابتدائی حقیقت پسند نگارشات میں بھی عوام کی شجاعت اور انقلاب کے لیے تمنا کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جو ان کی بعد کی تخلیقات میں پورے طور پر واضح ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں لہسون نے چینی ادب میں اشتراکی حقیقت پسندی کی بنیاد رکھی۔ فینگ شیو فینگ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "لہسون کے ادبی ارتقا کے زمانے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۱۹۲۶ء سے پہلے وہ انقلابی جمہوریت پسند تھے اور ۱۹۲۶ء کے بعد ایک مارکسی۔ یہ ارتقا لہسون کے لیے آگے کی طرف ایک عظیم تر قدم تھا اور چین کے دانشوروں کے لیے ایک بہت بڑا واقعہ۔" آخر میں فینگ سیو فینگ نے چینی کے ادیبوں پر زور دیا کہ وہ لہسون کی نگارشات اور ورثے میں چھوڑے ہوئے ان کے ادبی سرمائے کا مطالعہ کریں۔ اور اسے نئے چینی ادب کے لیے آگے بڑھائیں۔

تبصرے

خاص نمبر

گل صد رنگ نمبر جس طرح سے لوگ مختلف ہوا کرتے ہیں اسی طرح سے ان کا ذوق شوق بھی الگ الگ ہوا کرتا ہے بعض بلبل بعض تیتر، بٹیر بعض کبوتر اور مرغ بازی کے شوقین ہیں تو بعض پتنگ بازی کے دیوانے اور چند جھوٹ بازی اور دنگل بازی کے شیدائی۔ سنتے ہیں کہ جنون کے درجے پر آدمی عقل کی بازی بھی لگا دیتا ہے جس کی مثال بزرگ محترم سردار صاحب سر جگت سنگھ ہیں، جنہیں "بھیر بازی" کا چسکا سا پڑ گیا ہے اپنا سب کچھ لاہور کے نذر کر آنے کے بعد بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری مفلسی تنگ دستی اور پریشان حالی کے باوجود "رہنمائے تعلیم" کو دلی سے دوبارہ نہ صرف جاری کیا بلکہ موقع موقع سے اب تک کئی ایک خاص نمبر بھی نکال ڈالے۔

جاننے والوں اور خصوصاً صحافتی دنیا کو معلوم ہے کہ سردار صاحب "رہنمائے تعلیم" کو ایک عرصے سے نقصان میں چلا رہے ہیں اور اس پر طرفہ یہ کہ خاص نمبر پر خاص نمبر بھی نکالے جا رہے ہیں۔ مفلسی کی حالت میں تنگدستی کی زندگی بسر کرتے ہوئے خاص نمبروں کی ہمت کرنا "صحافتی جنون" نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایک ایسے علم و ادب کے شیدائی اور "جنون" کی ہر طرح سے مدد امداد کرنا نہ صرف حکومت کا فرض ہے بلکہ اس کی ذمے داری علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے طبقوں پر بھی عاید ہوتی ہے اگر سردار صاحب کی کسی اور طرح مالی اعانت نہ کی جا سکے تو کم سے کم یہ ضرور کیا جائے کہ ہر ہر مذاق آدمی ان کا تازہ ترین "گل صد رنگ نمبر" نہ صرف خود خریدے بلکہ اپنے جان پہچان والوں کو بھی اس کی خریدی پر مجبور کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سردار صاحب جیسا صابر آدمی اسی امداد پر قناعت کر لے گا۔

"گل صد رنگ نمبر" واقعی اسم با مسمّا ہے جس میں آپ کو علم و ادب کے شاہکار گل بوٹوں کی رنگا رنگی نظر آئے گی نظم و نثر کے پچاسی موضوعات پر مشتمل اس گلستان ادب میں آپ "تعلیم و تربیت" کے مفید مضامین بھی پائیں گے اور "ادب و اخلاق" کے پند و نصائح بھی۔ اس چمنستان ادب میں اگر ایک طرف علمی دنیا پر ناصحانہ انداز میں تنقید و تبصرہ موجود ہے تو دوسری طرف یہ شاہکار نمبر ادیبان اجل کے "اقوال و افکار" کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ان عنوانات کے سوا "افسانے اور کہانیاں" "مشاہیر" "سیر و سیاحت" "مزاحیہ کالم" "دستکاری" "لسانی دنیا" "داستان حیات" "اور "حفظان صحت" وغیرہ وغیرہ اس بے نظیر نمبر کے خاص خاص موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نمبر نظموں اور غزلوں کے انمول موتیوں کی مالاؤں سے بھی مزین ہے۔

مختصر یہ کہ اس خاص نمبر میں ہر شخص کے مذاق کی چیز ملے گی۔ انہیں وجوہ کی بنا پر ہم ہر ایک شخص سے اس نمبر کے خریدنے کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔

آرٹ پیپر کے رنگین ٹائیٹل کے ساتھ ۱۶۰ صفحے کا یہ گلدستہ نمبر دو روپے بھیج کر دفتر "رہنمائے تعلیم" پھٹی والان۔ دریا گنج۔ دہلی سے آپ ضرور بہ ضرور منگوا لیجیے "ا"

عزیز الحسن ضیا (ضیا بنا)

جدائی

وہ مجھ سے کہا کرتے تھے "دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی!"

لیکن قسمت کی دیوی اس تصور کی رعنائیوں پر مسکرا دی تھی ان کی موت نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور اب دنیا کی کوئی طاقت میرے لیے وجہ انبساط نہیں۔

اے کاش، اسرافیل اپنا صور پھونکنے سے اور قیامت کا ستارہ طلوع ہو جائے

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹-اے-اعظم پورا-شرقی-پی-او-جوبلی حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظورا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی-ام-خان-ام-اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

جلد (۱۴) نمبر (۱۰)

شہریور ۱۳۶۳ف جولائی ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	اختر موہانی وارثی	۳	
ارشادات عالیہ	اعتبار الملک جناب آغا مہدی	۴	
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	سی-جی-چٹرجی ممبر یونین پبلک سروس کمیشن	۵	
غزل	حکیم سید حسین محشر موہانی	۷	
ہائیڈرازائین	سید محمد ام-اے پروفیسر شعبہ دواسٹانیا یونیورسٹی	۸	
جنت نظیر کشمیر کی تعلیمی سیر	ایلفرڈ شنکمین	۱۰	
جوتے	ایاز عصمی		
امریکا کے اصلی باشندے	یوسیس	۱۵	
شبنم رومانی کی کہانی ان کی زبانی	شبنم رومانی	۱۷	
ہندستان میں بولی جانے والی زبانیں اور بولیاں	ا-ا	۲۰	
افکار ناتمام	ظفر عالمگیر	۲۱	
وکٹوریا ٹاور	پی-ال-رکھتا	۲۲	
لیگلی	نشاط اختر	۲۳	
سوانگت	صالحا عابد حسین	۲۴	
رابندر ناتھ ٹیگور اور سوویت یونین	ا-کو ماروف	۳۰	

ہمارے خیالات

اعلیحضرت حضور نظام کا پانچ کروڑ کا ٹرسٹ

(پہلی قسط)

ایک اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ حال ہی میں علیحضرت حضور نظام نے غریبوں کے لیے پانچ کروڑ روپے کا ٹرسٹ قایم کیا ہے۔ اسی اطلاع میں یہ خبر بھی تھی کہ اس فنڈ میں سے کچھ رقم تعلیمی اغراض کے لیے بھی وقف رہے گی۔

ہمیں اس سے کہ نہیں کہ حضور نظام نے اپنی اولاد اور عزیز و اقربا کے لیے چالیس کروڑ کا ٹرسٹ قایم کیا ہے یا اس سے زیادہ اولاد کے لیے کون ہیں کرتا۔ اس لحاظ سے حضور نظام کا یہ کام کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے اس لیے کوئی تعجب اس کے مانع نہیں ہو سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے کے جلد جلد بدلتے برق رفتار رسی تیزی سے بدلتے حالات کا لحاظ کرتے بعض طبقوں کے نزدیک کمی زیادتی کا سوال پیدا ہو سکتا ہے مگر رائج وقت قانون اور فطری قانون کی روشنی میں ایسے اعتراضات بے وزن ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس سے ہٹ کر یہ مطالبا ایک حد تک واجبیت رکھتا ہے کہ حضور نظام نے اپنی حقیقی اولاد کے لیے جہاں کروڑوں ہی روپے کا ٹرسٹ قایم کیا ہے تو اپنی معنوی اولاد ۔۔ رعایا کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ چنانچہ حضور نظام کے اس حالیا اعلان کو اسی سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔

ہم جہاں تک سمجھتے ہیں ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد کی کوئی تفصیل شایع نہیں ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کہ غریبوں کے لیے کس نوعیت اور کس قسم کا ٹرسٹ قایم ہوگا۔ اور تعلیمی اغراض پر رقم کس طرح سے خرچ کی جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ ٹرسٹ قایم کرنے والے کو اس کا پورا پورا اختیار ہے کہ ٹرسٹ کی رقم سے جو بھی منافع حاصل ہو اس کے خرچ کی تقسیم اپنی مرضی یا اس کمیٹی کی ایما پر ہو، جو اس مقصد کے لیے قایم کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹرسٹ کی تفصیلات کا منظر عام پر آجانا ہی زیادہ بہتر ہے۔

ہم یہ ضرور کہیں گے کہ عوام کی بھلائی بہتری کے سلسلے میں پانچ کروڑ کا ٹرسٹ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ہماری رائے میں اگر حضور نظام اس سے بھی زیادہ اجاری سرمائے سے کئی ایک چھوٹی بڑی صنعتیں جاری کروا دیں تو اس سے دیرپا فایدہ ہوگا۔ ایک یہ کہ ملک میں بیروزگاری کا کسی حد تک حل نکل آئے گا اور دوسرے یہ کہ ان کاموں کے خالص منافع کا ٹرسٹ محض تعلیمی اغراض کے لیے قایم کر دیا جائے ۔۔۔۔

ملک کا تعلیمی فنڈ بہت ہی گرا ہوا ہے۔ ہمارے معاشرے کی خرابیوں کا اصل سبب تعلیم کی کمی اور جہالت کی کثرت ہے اس کے دور کرنے کی واحد صورت تعلیم کو عام کر دینا ہے حکومت اس لیے نہیں کر سکتی کہ اس کا موازنا اجازت نہیں دیتا اور عوام اپنی اولاد کو اس لیے تعلیم نہیں دلا سکتے کہ ان کی جیبیں خالی ہیں۔ ان کٹھن حالات میں ملک کے سرمایہ دار اور مالدار طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اس طرف دھیان دیں۔ ان طبقوں سے ہم کسی اور فرصت میں مخاطب ہوں گے۔ اب اس وقت تو ہمارا روئے سخن صرف حضور نظام ہی کی طرف ہے۔

..لوں تو خود ہمارا خیال اس خصوص میں قلم اٹھانے کا تھا مگر جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ حضور نظام نے عوامی ٹرسٹ کا اعلان کر دیا ہے جس میں تعلیمی اغراض کی طرف بھی اشارا ہے تو ہم نے

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

یہ کس کا نام لب پر نزع میں بے اختیار آیا
کہ تسکین روح کو حاصل ہوئی دل کو قرار آیا

جو آیا بھی تو ہمراہ خزاں دور بہار آیا
کہ ہر اک پھول گلشن کا نظر بے اعتبار آیا

جناب شیخ سے جب ذکر جنت بار بار آیا
تصور آستان یار کا بے اختیار آیا

انہیں کے در سے عمر چند روز امانگ لایا تھا
انہیں کے در پہ بار زندگی سر سے اتار آیا

سر محشر اسے بڑھ کر لیا آغوش رحمت نے
گناہوں کو جو اپنے یاد کر کے آنسو بار آیا

خرد والے ہزاروں اس کی محفل میں گئے لیکن
نہ کوئی باخبر نکلا، نہ کوئی ہوشیار آیا

نہ پوچھ اس وقت کا میعار کیف میکشی واعظ
نظر ساغر میں جب عکس جمال روے یار آیا

انا الحق جن کو کہنا تھا رہے وہ ظرف کی حد میں
جو تھا محروم ظرف بیخود ی بالائے دار آیا

میں دیوانا سہی لیکن ہوا کیا اہل دنیا کو
مرا ہی تذکرا کیوں سب کے لب پر بار بار آیا

نئے دور تغیر نے تو دنیا ہی بدل ڈالی
ہزاروں بار دور ناانقلاب روزگار آیا

وہ دنیا ہو، لحد ہو، یا قیامت ہو کہ محشر ہو
ہر اک منزل پہ دیوانا ترا تجھکو پکار آیا

تجلی اور اس پر وہ کشش حسن تجلی کی
غرض جو آیا بزم یار میں پروانا وار آیا

بس اب رہنے بھی دے تو ہین باب میکدا واعظ
در کعبہ سے بھی اب تک کوئی باد اگسا آیا

بحمد اللہ نظر آنے لگے آثار محشر کے
سنبھل اے دل کہ وقت وعدہ فردا یار آیا

چمن آزاد ہے لیکن چمن میں رہ نہیں سکتے
ہماری کج ادا کا باغباں کو اعتبار آیا

اسیکو حاصل گور غریباں ہم سمجھتے ہیں
خرام ناز جاناں کی حدوں میں جو مزار آیا

جہان عشق والفت میں خرد کی رہبری کیسی
ترا دیوانا عقل و ہوش سے بیگانا وار آیا

سحر ہوتے خوشی سے جان دیدی مرنے والے نے
دم رحلت یہ کس کا نام لب پر بار بار آیا

مری ہستی کا پردا جب نظر سے اٹھ گیا افقر
تو ہے پردا نظر ہر سمت مجھکو حسن یار آیا

ارشادات عالیہ

اعتبار الملک ۔ دل شاہجہانپوری

تھا لطف آخری یہ نسیم بہار کا
گل کر گئی چراغ ہمارے مزار کا

دریائے عشق کا وہ تلاطم کہ الاماں
ہر موج میں وہ جوش دل بیقرار کا

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب
دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقش بہار کا

پیش نگاہ شوق ہے انجام آرزو
نقشہ کھنچا ہوا ہے شب انتظار کا

برق طپاں، شہاب فلک، شوخی شرر
سب سے الگ ہے رنگ دل بیقرار کا

پھرتی ہے شکل دام و قفس اب نگاہ میں
رخصت ہوا یہیں سے زمانا بہار کا

کہتا ہے جوش دل یہ دم ضبط بار بار
میں ہوں شریک گریہ بے اختیار کا

یہ جوش غم یہ داغ تمنا یہ قید دام
یہ عالم چمن یہ زمانا بہار کا

کہتے ہیں لوگ حضرت دل بھی ضمیر کو
یہ دوسرا ہے نام اسی بیقرار کا

سلسلہ نمبر (۶)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

سی۔ جی۔ چیٹرجی
ممبر یونین پبلک سروس کمیشن

(سرکاری ملازمتوں کے لیے نوجوانوں کو تیار کرنے میں یونیورسٹی کی تعلیم کی اہمیت)

میری خواہش ہے کہ ڈگری یا فتا طلبا کے لیے ہر یونیورسٹی میں پبلک سروس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا جائے جہاں انہیں ایسے مواقع مہیا ہوں کہ ان میں قیادت اختراع فیصلے کی قوت دقیقہ رس بصیرت اور فراغیس کی پاکیزگی ایسی صلاحیتیں پیدا کی جاسکیں اور حقیقت میں یہی سرکاری ملازمین کی خوبیاں ہیں۔

یونیورسٹی تعلیم کے اغراض اور مقاصد ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں۔ اور میں ان کی تشریح کرنے کی جرات نہیں کروں گا البتہ اس تعلیم کا ایک مقصد ایسے تعلیم یافتہ مرد و عورتیں تیار کرنا ضرور ہونا چاہیے جو ملک کی عالا سول سروسز کے ذہین نجوں اور کریکس اور تربیت اور تجربے کے بعد حکومت کے صیغۂ انتظامی (ایگزیکٹو) کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے اہل ہو جائیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی ملک میں یونیورسٹی کی تعلیم کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ اجزئی طور پر اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس تعلیم کو حاصل کرنے والے طلبا مذکورا کسوٹی پر کس حد تک پورا اترتے ہیں۔

ہمارے ملک کے نظم و نسق کا بنیادی ڈھانچا بہت پرانا اور فرسودہ ہے اور پے در پے فتوحات کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اب تک قائم ہے انگریزوں نے اس کی بنیاد دوبارہ انتظامی ڈھانچا قائم کرنے کی کوشش کی اگرچہ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فاش غلطیاں کیں لیکن انگریز ایک ایسا ڈھانچا قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں گاؤں کے پٹواری سے لے کر آئی۔ سی۔ ایس تک درجہ وار آسامیاں پیدا کی گئیں جیسے ایک دفعہ ونسٹن چرچل نے فولادی ڈھانچے کا نام دیا تھا میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ گذشتہ چند سال کے دوران ہماری نئی حاصل کی ہوئی آزادی کو تغیر اور تبدل کے تھپیڑوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور وہ اس انتظامی ڈھانچے کے سہارے ہی قایم رہی ہے جو ہندستان کو انگریزوں سے ورثے میں ملا ہے ہر ایک حکومت کو چاہے اس کی بنیاد کسی ہی اصول پر رکھی گئی ہو اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انتظامی مشینری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر حکومت جمہوری نظام کے تحت ہو تو جتنا ہی جمہوری کنٹرول زیادہ ہوگا اس کے مطابق ہی سول سروس کا اہل اور دیانت دار ہونا لازمی ہے جمہوریت سے مراد عوام کی حکومت برائے عوام نہیں بلکہ اس پارٹی کی حکومت ہے جو عام انتخابات میں اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی پارٹی بھی ہمیشہ برسر اقتدار نہیں رہ سکتی جمہوریت میں اختیارات ایک پارٹی سے دوسری کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کبھی ایک نظریے کے لوگ برسر اقتدار ہوتے ہیں اور کبھی اس سے بالکل مختلف نظریے رکھنے والے لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں۔ ان حالات میں انقلاب کو روکنے اور نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لیے کسی ایسی انتظامی مشینری کا قیام ضروری ہے جو ان تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکے بھارت میں معاشی و سماجی ترقی کے وسیع پروگرام پر آغاز عمل کے بعد نظم و نسق اور سول سروسز پر مطلوبا عملا

تعینات کرنے کے بارے میں ہمارے ملک کی ضروریات تقریباً ایک ہزار فی صد بڑھ گئی ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ عملا چیلنج کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یونیورسٹیاں ہی ہیں۔ صرف مرکزی سروسز کی خالی آسامیوں کو پر کرنے کے لیے ہر سال کم سے کم دو سو نوجوانوں کی ضرورت رہتی ہے۔ تقریباً چار ہزار گریجویٹ یونین پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے تحریری امتحانوں میں بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے ہر سال تقریباً ۸۰۰ طلبا اس میدان پر پورے اترتے ہیں جو ان امیدواروں کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے انہیں کمیشن کی طرف سے ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ سخت آزمایش کے بعد کمیشن کی طرف سے کامیاب امیدواروں کی ایک فہرست شایع کی جاتی ہے جس میں درج تقدادِ حکومت کی ضروریات سے تقریباً ۲۰ فی صد زیادہ ہوتی ہے ان ملازمتوں کے لیے کمیشن کی طرف سے جو ۱۲۰۰ امیدوار منتخب کیے جاتے ہیں وہ بلاشبہ عالا قابلیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے کسی دوسرے ملک میں اسی قسم کے حالات کے تحت منتخب امیدواروں سے کسی لحاظ سے کم اہل ثابت نہیں ہوں گے ان شکایات میں بہت حد تک صداقت ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں نہ صرف تعلیم کا بلکہ وسیع نقطۂ نگاہ سے بھی معیار گر رہا ہے لیکن اس کے اسباب بڑے پیچیدہ ہیں اور اس کا تمام تر الزام طلبا پر نہیں تھوپا جا سکتا۔

یونیورسٹیوں اور انتظامی عملے کے بارے میں میں یہ کہوں گا کہ یونیورسٹیاں اس سلسلے میں ہماری ضروریات کو پورا کر رہی ہیں لیکن اس میں اصلاح کے امکانات وسیع ہیں۔ یونیورسٹیوں میں طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد اساتذہ اور پروفیسروں کی کم تعداد و قلیل تنخواہوں کھیلوں اور نصاب سے باہر کی دوسری سرگرمیوں کے لیے مواقع کی کمی اساتذہ اور طلبہ کے درمیان ذاتی تعلقات استوار کرنے کے امکانات کی کمی اور سیاست دانوں کی طرف سے سیاسی اغراض کے لیے نوجوانوں کو آلہ کار بنانے کی کوششوں کو اگر ہم سامنے رکھیں تو یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوگی کہ ہندستان میں یونیورسٹیوں کی تعلیم کیوں ایک بہت بڑی تباہی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے لیکن یونیورسٹیوں کو بند کرنے کی دھمکیوں سے تعلیم میں اصلاح نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ہندستان کے نوجوانوں کو یا موجودہ تعلیمی نظام کو بحیثیت مجموعی ملزم نہیں گردانا چاہیے آخر انگریزوں کے زمانے میں اسی تعلیمی نظام نے ہمارے بعض عظیم رہنما پیدا کیے۔ ہندستان کے بعض سرکردہ رہنماؤں کی موجودگی برطانوی اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی روایات کی مرہون منت ہے۔

یونیورسٹی تعلیم میں صلاح کے متعلق اپنے ذاتی تجربوں کی بنا پر میری یہ رائے ہے کہ ہر یونیورسٹی میں دو قسم کی انجمنیں قایم کی جانی چاہئیں۔ ایک کیریر بیورو جس کے ذریعے طلبا کو اس بارے میں مشورہ دیا جائے کہ انہیں زندگی میں کونسا پیشا اختیار کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کے مطابق ترقی کر سکیں دوسرے ادارے کے ذریعے انتظامی سروسز کے لیے ان امیدواروں کو مزید تربیت بہم پہنچانے کا اہتمام کیا جائے جو ابتدائی امتحانوں میں کامیاب ثابت ہوں۔

مختصر یہ کہ ہر یونیورسٹی میں جو پبلک سروسز ڈیپارٹمنٹ قایم کیا جائے اس کا ایک ڈایرکٹر مقرر کیا جائے جو نہ صرف نمایاں تعلیمی اعزاز کا مالک ہو بلکہ انتظامی امور میں بھی وسیع تجربہ رکھتا ہو۔ یونیورسٹی کے وہ منتخب ٹیچر اس ڈائرکٹر کے ساتھ مل کر کام کریں۔ جو نہ صرف بعض خصوصی مضامین کے ماہر ہوں۔ بلکہ اس فریضے کو انجام دینے کے لیے دوسرے شخصی صفات کے حامل بھی ہوں۔ تدریجی طور پر ان استادوں کو معقول معاوضہ دیا جانا چاہیے اور ان پر روز روز کی پڑھائی کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے اس گروپ میں جو طلبا شامل ہوں وہ اپنی پسند کے مضمون

کی ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے پڑیں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں سرکاری ملازمتوں کے لیے آئندہ امیدواروں کی حیثیت میں مذکورہ اسکیم کے ڈائرکٹر اور اس کے تحت کام کرنے والے خصوصی عملے سے گہرے ذاتی تعلقات قائم کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس گروپ کے طلبا کو غیر رسمی مباحثوں اور سماجی تعلقات پیدا کرنے کے مواقع اکثر بہم پہنچائے جائیں۔ اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ شعبہ سرکاری ملازمت کے امتحانوں کے سلسلے میں درس گاہ کی شکل اختیار نہ کیا جائے۔ اس کا مقصد اس سے بلند تر ہونا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ اس کے تحت تربیت حاصل کرنے والے طلبا میں رہنمائی کرنے۔ کسی کام کو شروع کر سکنے کی جرأت کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے اور ہر قطعی غیر جانبدارانہ رائے قائم کر سکنے اور سب سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی وہ تمام عالا صفات پیدا کی جائیں جن کا کسی اچھے سرکاری ملازم کی شخصیت میں موجود ہونا لازمی ہے

غزل

حکیم سید حسین محشر موہانی

نگاہ مست ساقی سے اگر مخمور ہو جائے۔ وہ میکش بے نیاز دہر انگور ہو جائے
وہ رہ کر کیا کرے اے باغباں ہم آشیانوں کا جب فصل بہار آئے چمن سے دور ہو جائے
خدا کیجے خدا کیجے دل آزاری کی باتوں سے سیاہ ایسا شکستہ ساغر بلور ہو جائے
یونہی کچھ دیر سے دل کی حالت دیکھیے ہے کہ گہرا زخم ہو جائے تو پھر ناسور ہو جائے
نہ محشر ہی بپا ہو اور نہ ہو پھر پرسش محشر جو وہ ظالم وہاں معصوم صورت ہو
مگر آخر گرا بیہوش ہو کر پائے ساقی پر کرے وہ کیا نظر ملتے ہی جو مخمور ہو جائے
کسی حالت میں محشر جوڑ نے سے بڑھ نہیں سکتا
وہ دل ان کی نگاہوں سے جو گر کر چور ہو جائے

امراض دل کے علاج کے نئے طریقے

سوویت یونین میں جراحی کے اداروں میں دل کی بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں بڑے چونکا دینے والے نئے طریقوں پر عمل کیا جا رہا ہے ان علاقوں میں دل کے پیدائشی مرض کا علاج جراحی کے ذریعے علاج بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں سوویت یونین کی طبی سائنس کی اکیڈمی کے صدر اور مشہور و معروف سائنسداں الکزینڈریا کو لیف کو بڑی کامیابی نصیب ہو رہی ہے جس شفاخانے میں وہ ڈاکٹر کے فرائض انجام دیتے ہیں اس نے ایسے امراض کا موثر طریقہ علاج عمل جراحی کی مدد سے ایجاد کر لیا ہے جن کو اب تک ناقابل علاج تصور کیا جاتا تھا۔

دل کے پیدائشی امراض کے علاج کے لیے لینن گراڈ میں پیوتر کیریا لوف کامیاب عمل جراحی سے کام لیتے ہیں وہ سوویت یونین کی طبی سائنس کی اکیڈمی کے ایک رکن ہیں۔ ایک چھ سالا بچی ولودیا تاز نتیف اس شفاخانے میں چند ماہ قبل لایا گیا جس کے نگران عالا کیریا لوف ہیں دل کی بیماری کی وجہ سے اس بچے کے داہنے خون میں گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے کے طور پر اس کی جلد نیلی پڑ گئی تھی۔ اس لڑکی کی ان زبردست بیماریوں سے نجات کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اس پر ایک پیچیدہ عمل جراحی کیا جائے۔ خود پروفیسر نے یہ فرض انجام دیا انہوں نے اس رگ کو الگ کر دیا جس سے خون بازو کی طرف لوٹتا ہے انہوں نے نس کو کاٹ دیا اور پھر اس کے بعد اس رگ کو پھیپھڑے سے ملا دیا۔ عمل جراحی کے دوران میں انہوں نے کئی درجن باریک ترین کانٹے دل میں لگائے۔ ابھی وہ یہ عمل جراحی کی میز پر ہی تھی کہ اس ننھے مریض کا دوران خون درست ہو گیا اس کی جلد کی نیلاہٹ مٹ گئی جو اس مرض کی علامت ہے۔ آج ولودیا ترتعیت بہت ہی خوش و خرم رہتا ہے اور چستانی و ورزش بھی

ہائیڈرازائین

سید محمد ام۔ اے
پروفیسر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

ایک عرصے تک تجربہ خانوں میں ایک دوا محض حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی اور کوئی اس کے عجیب و غریب خواص سے واقف نہیں تھا۔ یہ دوا بلکل پانی جیسی تھی اور اس کی بو امونیا سے کسی قدر ملتی جلتی تھی لیکن دوسری عالم گیر لڑائی میں جرمن کیمیا دانوں نے اس دوا سے ہوائی جہاز کا ایک ایسا ایندھن تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی جو غیر معمولی قوت کا حامل تھا۔ ان کی تحقیقات نے انکشافات کا ایک وسیع باب کھول دیا۔ اور اب ہائیڈرازائین ایک درجن سے زیادہ کاموں میں استعمال ہو رہی ہے

اس کے ایک جز کے بارے میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ وہ تپ دق کا ایک موثر علاج ہے۔ ایک اور جز کی یہ خاصیت دریافت ہوئی ہے کہ وہ پودوں کے نشو و نما کو روک دیتا ہے۔ اگر اس کو گھاس یا باڑ پر چھڑک دیا جائے تو گھاس یا باڑ بڑھنے سے رک جاتی ہے اور اس کو بار بار کاٹنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ہوائی جہاز کے ایندھن کے طور پر ہائیڈرازائین کا استعمال ۱۹۴۳ء میں شروع کیا گیا۔ برمن (جرمنی) میں نار پیڈو نسکل کے عجیب و غریب طیاروں کا بیڑا تیار کیا گیا۔ یہ طیارے آسمان پر اس تیزی سے پرواز کرنے لگے جو شہاب ثاقب میں ہوتی ہے ان کی پرواز کے وقت لگن گرج کی عجیب و غریب آواز پیدا ہوتی ہے ان طیاروں کی کامیاب آزمائشی پرواز کے ختم پر ان کے چلانے والے نے نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کیا کہ ان طیاروں میں اوپر چڑھنے کی ایسی قوت جو آج تک کسی کے ذہن میں بھی نہیں آئی اور یہ کہ ان کی رفتار فی گھنٹہ (۲۱۴۰) میل ہے۔

اس کامیاب تجربے کے بعد دنیا کا سب سے پہلا جنگی راکٹ طیارہ بنایا گیا جس کا نام سرشمیٹ ۱۶۳ بی رکھا گیا پھر تو نازیوں نے اس قسم کے تین سو طیارے بنائے اور جنگ کے آخری مہینوں میں برطانیا اور امریکا کے کئی سو ہوائی جہاز گرا کر برباد کر دیے۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو ایک طیارہ ۱۶۳ اور اس کو بنانے والا جرمن ماہر ڈاکٹر الگزینڈر ریش امریکیوں کے ہاتھ لگے۔ امریکیوں نے اس ماہر کو مورا کے لیک کیالی فورنیا بھیج دیا۔ تاکہ وہاں وہ اپنے تجربے جاری رکھے۔ برطانیا کو بھی اس طرح کا ایک طیارہ ہاتھ لگا۔ اور روسیوں نے بھی اس خاص طیارے کو حاصل کیا اور اس کے ساتھ اس کے بنانے کے اوزار سانچے اور ماہرین فن کی خاص تعداد فراہم کر لی۔ جرمن نمونے کی نقل ہی نہیں کی گئی بلکہ اس میں بہت سے اصلاح بھی عمل میں آئی۔ اور اب یہ جو ایک چھوٹا خطرناک ہوائی جہاز تھا ہوائی جنگ کے طریقوں میں حیرت انگیز انقلاب کا باعث بن گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جس ایندھن سے یہ طیارے چل رہے تھے اس کی نسبت بھی کئی نئی باتیں دریافت ہوئیں۔

ہائیڈرازائین ایسی چیزوں سے بنائی جاتی ہے جو بہت ہی سستی اور کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں امونیا، کلورائین اور کاسٹک سوڈا ہیں۔ لیکن اس کی تیاری کے لیے کافی وقت درکار ہے اور اس کی لاگت بھی قبل جنگ اس قدر زیادہ تھی کہ اس کا بنانا بڑے حوصلے

کا کام تھا۔ اب تو یہ اس قدر مہنگی نہیں رہی۔ پچھلے سال اس کی تیاری کی لاگت اس قدر سستی ہو گئی کہ سابقہ لاگت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اگر بڑی مقدار میں تیار کی جائے تو اس میں اور بھی کمی ہو سکے گی۔ یہ عجب بات ہے کہ جیسے جیسے اس کی لاگت کم ہوتی جاتی ہے اس کے استعمال اور فوائد کے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔

ہائیڈرازائین سے جو عجیب و غریب چیزیں بنائی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ کارآمد تپ دق کی دوا ہے اور آج کل امریکا کے کئی تجربہ خانوں اسکوب اینڈ سن، ہاف من، لاروشے اور جرمنی کی بیر کمپنی سب ہی اس دوا کو تیار کر رہے ہیں۔ اور سب نے اپنے اپنے طور پر تحقیقات کر کے یہ دوا دریافت کی ہے ایک دوسرے کی کوششوں سے واقف ہوئے بغیر ان تجربہ خانوں کے محققین نے اس دوا کو تجربہ خانوں کے ایسے جانوروں پر استعمال کیا جو دق کے جراثیم رکھتے تھے سب ہی نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اگرچہ یہ سب تجربے پورے طور پر دنیائے سائنس کے سامنے نہیں آئے ہیں پھر بھی ہم تپ دق کے علاج کے لیے یہ دوا دوسری تمام دواؤں کے مقابلے میں زیادہ سستی اور کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

اس کے دوسرے اجزا پر مزید تجربے ہو رہے ہیں اور دوسری بیماریوں کے علاج کے طور پر ان کے مفید یا غیر مفید ہونے کی تحقیقات جاری ہے اس وقت تک اس کا پتا چلا ہے کہ اس کا ایک جزا ایسا ہے جو خون کے دباؤ کے علاج میں مفید ثابت ہو سکتا ہے ایک اور جز پیشاب کے سدوں کو صاف کرنے کی اچھی خاصیت رکھتا ہے ایک اور جزا ایسا ہے جو مرغیوں کی ایک وبائی بیماری میں بہت مفید علاج ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی ہائیڈرازائین سے امریکا میں ایک اور دوا ایم ایچ ۴ تیار کی گئی ہے جو لوگوں پر آزمائی جا رہی ہے۔ لوباٹو کے پودے پر اس کو چھڑکا گیا تو اس کا نشو و نما رک گیا اور ایک مقرر احد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس خاصیت کا علم ہونے کے بعد اس کو کئی کاموں میں استعمال کیا گیا۔ جنگلی گھاس پر جو بہت جلد بڑھ جاتی ہے جب اس کو چھڑکا گیا تو وہ ایک انچ اور بڑھ کر رک گئی۔ اب سے تین برس پہلے بڑے پیمانے پر اس کی آزمائش اس طرح کی گئی کہ ڈھائی سو ایکڑ رقبے کی گھاس اور سڑک کے کنارے کی باڑ پر اس کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ باڑ جو بہت جلد بڑھ جاتی تھی اور جس کو کاٹنے چھانٹنے پر کافی پیسے خرچ ہوتے تھے وہ ایک مقررہ حد تک پہنچ کر رک گئی۔ جہاں اس کا تجربہ کیا گیا وہاں صرف سال میں دو مرتبہ گھاس کاٹنے کی ضرورت پڑی۔ اور جس علاقے میں اس کا تجربہ نہیں کیا گیا۔ وہاں ایسی ہی گھاس کو ۱۹ مرتبہ کاٹنا پڑا۔

پودوں کے لیے نیند لانے والی دوا کی حیثیت سے ایم۔ ایچ بہ کسانوں اور دوسرے صارفین کے لیے بہت ہی مفید چیز ثابت ہو رہی ہے۔

جب آلو ایک عرصے کے لیے محفوظ کر دیے جاتے ہیں تو کچھ دنوں کے بعد ان میں کونپلیں پیدا ہو کر ان کی غذائیت کو ختم کر دیتی ہیں اور وہ بے کار محض ہو جاتے ہیں۔ جب ان پر ایم۔ ایچ بہ کا تجربہ کیا گیا تو بہت ہی کامیاب نتائج برآمد ہوئے۔ کونپلیں پیدا ہونے سے رہ گئیں۔ یہ آلو کھانے میں بہت ہی اچھے ثابت ہوئے اور اب کئی کاشتکار کامیابی کے ساتھ اپنے آلوؤں کے لیے اس کو کام میں لا رہے ہیں۔

اسی طرح پیاز پر بھی اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا اور اب تو گاجر، شلجم اور چقندر پر بھی اس کے تجربے کامیاب ثابت ہو گئے ہیں۔ (ماخوذ)

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کر کے چندہ منی آرڈر کر دیجیے۔ وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا

جنت نظیر کشمیر کی تعلیمی سیر

ایلفرڈ ڈنکمین

(ایک ماہر تعلیم کے تاثرات)

جب ہمارا ہوائی جہاز درہ بانہال سے گذرا تو موسم اچھا تھا۔ ہم ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بادلوں سے اوپر پرواز کر رہے تھے بلکہ ہمارے ہوائی جہاز کے پہیے جیسے بادلوں کے اوپر سوار معلوم ہوتے تھے کیسا دلکش منظر تھا۔ سفید بادلوں کی موجیں ہمارے نیچے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیاں سر اٹھائے تاک رہی تھیں۔ یا یوں کہیں کہ برف پوش پہاڑوں نے ہمارے گرد ایک ہالا بنا رکھا تھا۔ پھر ہم بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑوں سے چند فٹ اوپر چلا گئے۔ ہمارے ہوائی جہاز کا سایا بھی ہمارے ساتھ ہی پرواز کر رہا تھا

سری نگر میں دوسرے سیاحوں کی طرح میں بھی ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا تھا۔ اس سال سری نگر میں ستر ہزار کے قریب لوگ باہر سے سیر کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے یعنی پچھلے برس کی تعداد میں قریب ڈیڑھ گنا زیادہ۔ ہم لیے تو نہیں جہاں بھی جانا ہوتا ہم سیلوں — اسی رہائشی کشتی میں چلے جاتے تھے لیکن شہر میں جانے کے لیے شکارا کی ضرورت پڑتی تھی۔ میں ہر روز شکارا میں بیٹھ کر جھیل ڈل جاتا اور وہاں تیرتا تھا۔ ایک روز میں شالیمار باغ اور جھیل ناگن دیکھنے گیا تھا۔ ان میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ بھی پانی کی تہہ میں پودوں کی دنیا جس میں کئی جانور موجود تھے۔ اور گہرے پانی کے نیچے بالکل صاف دکھائی دیتے تھے۔

لیکن تعلیم کے پیشے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے کشمیر کے فردوسی نظاروں کو دیکھنے میں ہی محو نہیں رہ سکتا تھا مجھے اسکول اور اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو بھی دیکھنا تھا۔ کشمیر کے ڈائریکٹر تعلیم مجھے چند اسکولوں میں لے گئے جن کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا ہے تعلیم کے زمرے میں کشمیر میں کتنا ٹھوس اور تعمیری کام ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں سچ مچ بہت متاثر ہوا۔ کشمیر میں ایک نئے نظام تعلیم کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ میں نے جموں و کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد ایک یونیورسٹی جلسے میں تقریر بھی کی۔ مستقبل کے بارے میں طلبا اور پروفیسر بہت پرامید تھے۔ لیکن یونیورسٹی سے بھی زیادہ اہم ابتدائی اسکول اور چھوٹے بچوں کے اسکول تھے۔ آخری میں ہندستان میں ایک نئی چیز تین برس پہلے سری نگر کے ایک گنجان آباد علاقے میں تجربے کے طور پر ایک چلڈرن گارڈن کلاس کھولی گئی تھی۔ اس وقت کشمیر میں چھوٹے بچوں کے قریب ۲۰۰ اسکول کھل چکے ہیں۔ ابھی اور بھی کھل رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں سے بعض میں ایسا جذبہ موجود تھا جسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا۔ جب میں سری نگر سے صرف دس میل پر واقع موضع نگلو کا اسکول دیکھنے گیا تو وہاں نوے لڑکے تھے جنہوں نے سائنس کی تعلیم کے بہت اچھے تجربے کر دکھائے۔ کئی لڑکوں نے مجھے کشمیری زبان میں بتایا کہ وہ آکسیجن کس طرح تیار کرتے ہیں۔ یہ لڑکے سات آٹھ برس کی عمر کے تھے لیکن وہ کیمیائی ادویات کے تجربات اس خوبی اور اعتماد سے کر رہے تھے جس سے نیویارک لندن یا ایمسٹرڈم کے طلبا اپنے

کیمسٹری کے ساز و سامان کو استعمال کرتے ہیں۔

بس نے سری نگر سے چالیس میل دور متن کے ہائی اسکول کا معائنہ کیا۔ یہ بنگ انتر ناگ سے بھی پرے ہے۔ یہاں تین چار برس کی عمر سے لے کر اوپر تک کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ انہوں نے محض اپنی کوششوں سے ایک مشاہداگاہ، ایک نباتی عمارت اور پینٹنگ اور دستکاری کا تجربہ گاہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ آؤٹ ڈور کلاسز کے لیے الگ جگہ مخصوص کی گئی تھی۔ اس کی عمارت بن رہی تھی۔ اس اسکول میں چھوٹے بچوں کے کام کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ چھوٹے چھوٹے شناش لباس ذہین بچوں کو کھیل کو دمیں مشغول دیکھ کر مجھے مستقبل نہایت حوصلہ افزا نظر آیا۔

میں نے بڑی عمر کے لوگوں کو تعلیم دینے والے اسکولوں میں دیکھا کہ لوگ عام طور پر بہت غریب ہیں لیکن وہ ذہین اور چست ہیں۔ کشمیر میں مفت تعلیم کے نئے پروگرام اور استادوں کی تنخواہوں میں اضافے کو دیکھ کر مجھے کشمیر کے لیڈروں کی قابلیت تسلیم کرنی پڑی۔ تین ہزار نئے ابتدائی اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ صرف اسکولوں کی تعداد بڑھانے کا ہی پروگرام نہیں بنایا گیا ہے۔ بلکہ کشمیر میں موجود ۷۰ سے ۷۵ فی صد تک بے علمی کو ختم کرنے کی اسکیمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ استادوں کو تربیت دینے کے لیے ایک ایسا چلتا پھرتا ٹریننگ اسکول بنایا گیا ہے کہ اس جیسی عالا انسٹی ٹیوشن میں نے سارے ہندستان میں کہیں نہیں دیکھی ہے اس اسکول میں تجربے کار اور تعلیم سے دلی لگن رکھنے والے استاد شامل ہیں جو دیہاتی اسکولوں میں جا کر نہ صرف نئے استادوں کو تربیت دیتے ہیں اور ان میں نئی زندگی پیدا کرتے ہیں بلکہ وہ کشمیر کے روایتی اسکولوں کی بھی کایا پلٹ دیتے ہیں ان کی کوششوں کے جو نتائج ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں انکو دیکھ کر مجھے کشمیر کی لازمی تعلیمی ترقی کے بارے میں کوئی شبہا نہیں رہا۔

ماسکو ریاستی یونیورسٹی کے بارے میں ایک رنگین فلم

"سائنس کا محل" کے نام سے ماسکو ریاستی یونیورسٹی کے بارے میں ایک رنگین فلم تیار ہوئی ہے۔ اس فلم میں سینما کے شائقین لینن ہلز پر واقع اس یونیورسٹی کی وسیع عمارت کے ایک ایک گوشے کا نظارہ کر سکیں گے۔ وہ اس کے بڑے بڑے لکچر ہال لیبارٹریاں اور اس کے اندر طلبا کے اقامت خانے دیکھ سکیں گے۔ یونیورسٹی کی نئی عمارت ایک عظیم الشان عمارت ہے جس میں ۳۷ بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کا مجموعی رقبہ ۲ لاکھ ۶ ہزار کیوبک میٹر ہے۔

گورنیٹ کے چوڑے زینوں پر سے گذر کر یہ رستا سب سے بڑے پھاٹک تک جاتا ہے جہاں سے وسط عمارت تک ستا جاتا ہے جس کا کلسس دار مینا روں کی بلندی تقریباً ایک کلو میٹر (اکلیو میٹر = ۵/۸ میل) کی چوتھائی کے برابر ہے۔ مرمر کے وسیع ہیٹھ سے زینے اسمبلی حال کی طرف چلتے ہیں جہاں ڈیڑھ سو آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ مرکزی عمارت سے ہی متصل طلبا کا کلب گھر ہے جس میں ایک تھیٹر ہال ہے اور ایک ورزش خانا۔

طلبا کو جو سرمایا سپرد کیا گیا ہے وہ سب سامعین کو فلم میں نظر آجاتا ہے۔ یونیورسٹی کا کتب خانا سوا لاکھ رسالے اور اس میں دس لاکھ سے زیادہ کتابیں محفوظ ہیں۔ مرکزی عمارت کے دونوں طرف طلبا کی اقامت گاہیں ہیں جن میں طلبا کے لیے چھ سو آرام دہ کمرے اور مدرسوں کے لیے فلیٹ ہیں۔ یونیورسٹی کے اپنے زراعتی باغات ہیں جو تقریباً چالیس ہیکٹیر (اہیکٹیر = ڈھائی ایکڑ) زمین کے رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ شجریات کے شعبے میں پانچ سو اقسام کے پیڑ پودے موجود ہیں۔

جوتوں کی ایجاد

آیاز عصمی

(طنز و مزاح)

کہتے ہیں کہ جوتوں کی ایجاد سب سے پہلی بار چین میں ہوئی مگر یہ پتا نہیں چلا کہ سب سے پہلے جوتا کس نے چلوایا یا پہلا جوتا جو چلا وہ کس کا تھا۔ یہاں روسو کا ایک جملہ شاید کام آجائے کہ بڑا ہی غور طلب ہے وہ آدمی جس نے سب سے پہلے کہا کہ "یہ چیز میری ہے" ——— یقیناً دنیا میں پہلی بار جوتا بھی اسی غرض آدمی نے چلوایا ہوگا۔ مگر یہاں ہمیں جوتوں کے "چلنے چلانے" پر ہی نہیں بلکہ ان کی ساخت اور قسموں پر بھی لکھنا ہے۔

جوتوں کو ان کی ساخت کے اعتبار سے چار یا پانچ یا اس سے زیادہ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول قسم دیسی جوتوں کی ہے جو دیسی میں بنتے ہیں اور دیسی کہلاتے ہیں۔ یہ قسم زیادہ مشہور اس لیے نہیں ہوسکی کہ اس کی بناوٹ میں ستعمال ہونے والی اشیا اور اس کے بنانے والے اس سرزمین پر پائے جاتے ہیں جو عرصے تک ایک ایسی قوم کے زیر اثر رہ چکی ہے۔ مگر دیسی جوتوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کافی مضبوط ہوتے ہیں۔ اور جو جوتے چلتے ہیں ان کی مضبوطی ثابت کرنے کو یہ ثبوت کیا کم ہوگا کہ جنگ کے دوران یہ جوتے لاکھوں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے۔ چلے اور ان کے "چلنے" کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ ایک بار تو بڑی زور شور سے چلے تھے (ملک کی مائیں تو سڑکیں اکثر دن تک لال ہو گئے تھے نتیجے میں تھک ہار کر جوتوں کے جوڑے جوڑے نہ رہے بلکہ ایک چنے کی دو دال کی طرح الگ الگ جا گرے مگر یہاں میں یہ نہیں لکھوں گا کہ اس علمود گی سے ایک مسلم ملک کی اقتصادیات، معاشیات اور سیاسیات پر کیا اثر پڑا۔ بہرحال جب دیسی جوتے چل رہے تھے پولیس بھی موقع واردات پر حاضر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پولیس اگر اس وقت سچ مچ اپنے فرائض کو پہچانتی اور غیر جانبدار رہ کر صرف اپنے فرائض انجام دیتی تو شاید معاملا اس حد کو نہ پہنچتا۔ اور تو اور "ہر چہ درکان نمک رفت نمک شد" کے مصداق فوج نے بھی جوتے چلائے اور چلوائے ہیں بڑی دلچسپی لی اور نتیجے میں دیسی جوتوں کے بات جو چیز آسکی وہ تھی "ذلت اور تباہی ———!"

جوتوں کی دوسری قسم بدیسی کہلاتی ہے۔ یہ قسم یورپ و امریکا میں بنتی ہے اور ہمارے ملک میں امپورٹ (IMPORT) کی جاتی ہے۔ اس قسم کے جوتوں پر یہ لکھنا تو خطرے سے خالی نہیں کیونکہ یہ قسم خیر سے عوامی تو ہوتی ہی نہیں۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے جوتے بھی "کافی چلتے ہیں" اور صرف حکومت کے ایوانوں، اسمبلی ہالوں اور شیئر بازاروں (SHARE MARKET) میں چلتے ہیں اور چونکہ یورپین قوم کو ہمارے ملک کے ارباب حل و عقد نے اپنا مربی تسلیم کر لیا ہے اس لیے جب یورپ و امریکا کے جوتے چلتے ہوں تو پولیس اس میں کچھ بولنا دخل در معقولات سمجھتی ہے اور احتراماً خاموش رہتی ہے ——— بات پر بات نکل آئی۔ یورپی و امریکی جوتوں کے تذکرے پر ایک تو یہ نوا ورتازہ انبازا جوتے کی بات یاد آگئی۔ یہ جو خالص امریکن میڈ (AMERICAN MADE) ہے بتایا جاتا ہے کہ ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے یہ تازا جوتا بہت بڑا ہے اور انتہائی مکروہ شکل بھی اس جوتے کا ذکر آج کل ملک بھر میں بڑے زوروں پر ہو رہا ہے بہت ممکن ہے کہ اس کی آمد پر ملک میں جوتے چلنے بھی لگیں۔

بہر حال یہ تو عوام پر منحصر ہے کہ وہ اس نازا جوتے کو پسند بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ مگر یہ جوتا بھیجا جا رہا ہے بڑے ہی اہتمام سے۔ نہایت ہی خوب صورت پیکیٹ میں، پالش سے اچھی طرح چمکا کر تاکہ عوام اس کی بڑائی اور ظاہر خوبصورتی سے مرعوب ہو جائیں مگر اس کے بھدے اور بھونڈے پن پر کسی کی نگاہ نہ پہنچ سکے۔ اس جوتے کا نام میڈو (MEDO) ہے حق تو یہ ہے کہ اس جوتے کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ یہ ایک "جوتا" ہے اور ایک نہایت عظیم الشان جوتا۔ جوتوں کی اور بھی بہت ساری قسمیں یورپ و امریکا کے بڑے بڑے سوداگروں سے دوسرے الائیڈ (ALLIED) ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں مگر شکلیں سب کی جدا گانا ہوتی ہیں۔ کبھی یہ کسی "معاہدے" کا روپ دھار کر آتے ہیں کبھی ڈالر کی شکل میں کبھی مشن بن کر اور کبھی گیہوں کی صورت میں۔

جوتوں کی ایک اور بھی قسم ہے جس کا استعمال زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے مگر صرف زردار گھرانوں میں یہ قسم چاندی کے جوتے کہلاتی ہے یہ قسم آج بھی پائی جاتی ہے اور فی زمانا تو چاندی کے جوتے بڑے زور و شور پر چلتے ہیں بہت سے ایسے "مخصوص" قسم کے کاریگر ہیں جن کے لیے بڑے لوگ اس خاص قسم کے جوتے کا ہی استعمال کرتے ہیں اور مشاہدا بتاتا ہے کہ جہاں ہڑ اور چھلکری کی جگہ چاندی کے جوتے لگائے جاتے ہیں وہاں رنگ بھی کافی چوکھا آتا ہے۔

جوتوں پر کچھ لکھنے کا خیال یوں پیدا ہوا کہ آج کل ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں بھی جوتوں کا بازار بہت گرم ہے اور جوتے بڑے زور و شور پر چل رہے ہیں۔ انڈو چائنا، ٹرکیسٹ، ملایا، برما، ایران مصر چیکو سلواکیا، برٹش نیو گنی، غرض یہ کہ دنیا بھر میں قومی جھنڈے کم اور جوتے زیادہ لہرا رہے ہیں۔ کھلے فضا میں اڑ رہے ہیں۔ یہاں یہ بات لکھ دینی ضروری ہے کہ جوتے جب آقاؤں کی طرف سے چلتے ہیں تو اسے آقاؤں کا حق سمجھا جاتا یا اسے ملک میں بدامنی کی روک تھام کے سلسلے کی ایک کڑی کہہ لیا جاتا۔ مگر جب عوام تنگ آمد بہ جنگ آمد کی مثل پر عمل کرتے ہوئے جوتے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو آج کل کی اصطلاح میں اس "جائز حرکت" کو بغاوت بدامنی یا تخریبی کارروائی کے نام سے پکارا جاتا ہے کچھ بھی ہو مگر زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیا کی تقریباً ساری ہی قومیں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اب تو ایسا بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ وہ قومیں جو ایک عرصے تک اپنے حاکم آقاؤں کے جوتوں کے تلے چاٹ کر ہی خوش ہوا کرتی تھیں، اب تو انہوں نے بھی جوتے ہاتھوں میں اٹھا لیے ہیں۔ وہی جوتے جن کو استعمال کر کے آقا حضرات کو اپنے محکوموں سے بلند تر اور افضل سمجھتے تھے جب محکوموں کے ہاتھ آئے تو "آقاؤں کے سر چڑھ گئے"۔ بلکہ بعض بعض جگہ تو اس سے بھی اونچے ہو گئے یعنی درختوں پر چڑھ گئے یعنی ایک تو جوتے خدی کر یلا تھے اوپر سے نیم چڑھے گئے تو اور بھی کڑوے ہو گئے دنیا کے ایک علاقے میں تو آج بھی یہ جوتے درختوں پر جھولتے ہوئے ہیں اور جہاں آقاؤں کے گروہ کا کوئی فرد ادھر سے گذرا یہ جوتے اتنی زور سے اوپر سے گرتے کہ سر پر اوڑھی ہوئی خود (HELMET) توڑ کر سیدھے بھیجے میں اتر گئے کبھی کبھار یہ صرف چند یا پیسی کرنے پر ہی اکتفا کر جاتے ہیں۔ جوتوں کی یہ خاص قسم "آج کل" اتر یقا میں پائی جاتی ہے اور اس کے استعمال کرنے والے مائو مائو کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح کے کچھ جوتے کبھی ہمارے ملک میں بھی چلے تھے۔ اور بڑے زور و شور سے چلے تھے۔ اگرچہ تب بھی ولیے ہی جوتوں کو ہی نصیب ہوئی تھی اور بدیسی جوتوں نے ملک چھوڑ کر بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی تھی اور ایسا تو ہونا ہی چاہیے تھا کیوں کہ میں پہلے ہی عرض

کر چکا ہوں کہ دیسی جوتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر بھلا ہو بدیسی جوتوں کا ان میں ایک مقناطیسی کشش بھی بہت ہی طاقت ور ہے۔ اور دیسی جوتے شاید اس کشش کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ بدیسی لوگ تو بھاگ گئے مگر سارے بدیسی جوتے یہیں چھوٹ گئے۔ بلکہ اپنے اندر کی مقناطیسی کشش کی وجہ سے دیسی جوتوں کے ساتھ چپک گئے اور آج تو دیسی جوتے عام طور پر یہ مصرع گنگناتے نظر آتے ہیں کہ

"من توشدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی"

اور جواب میں بدیسی جوتے اس شعر کا دوسرا مصرع دہرا دیتے ہیں

"تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

اور پھر دونوں جوتے فضا میں ایک پر اسرار اور معنی خیز "چر رچوں" بکھیر دیتے ہیں۔ سیاسی اصطلاح میں اس دیسی اور بدیسی گٹ جوڑ کو کشش دولت مشترکا کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اور ساتھ ہی دوسرے بہت سارے ممالک میں ایسی کشش یا گٹ جوڑ کو کشش محلیل قوام متحدا بھی کہا جاتا ہے بلکہ دوسری اصطلاح ہی پہلی اصطلاح پر دن بدن چھاتی جا رہی ہے اس سلسلے میں یہاں ایک بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ ہم انسانوں کی طرح ہمارے پیروں سے لپٹے رہنے والے جوتے بھی دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں ایک طبقہ "اونچا" طبقا کہلاتا ہے اور دوسرا "نیچا طبقا"۔ ان دونوں طبقوں کا فرق اس قدر نمایاں ہے کہ عدد سا ختا فانون اور رسم و رواج کی طرح جوتوں میں بھی "چر رچوں" بولنے ٹھوکریں مارنے اور دوسرے جوتوں سے گٹ جوڑ کر کے بقیہ تمام جوتوں کا نصیبا لگاڑنے یا سنوارنے کا حق صرف ان ہی جوتوں کو حاصل ہے جو جوتوں کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک بات یاد آ گئی اور بات کیا یاد آئی جوتوں کی ایک اور قسم دریافت ہوئی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہمارے ملک میں اوپر بیان ہوئی کششوں میں کچھ کمی تھی اور بدیسی جوتوں کا پورا پورا تسلط تھا اور عوام اس تسلط کو ایک گھناؤنا جوتا سمجھ کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس وقت جو بدیسی جوتے چلتے تھے اتنے کاٹی تکڑے ہوتے تھے کہ ان کا بھاری بھرکم پن کچ لوگوں کو ملک و قوم سے غداری تک کرنے پر راضی کر لیتا تھا مگر واہ رے انگلش کٹ کا طریقا اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ حسن و سلیقے سے جو کام کیا جائے وہ کچ تو بھلا لگے گا ہی۔ یہ بھی کہا کہ کسی نے زبان ہلائی اور اس کی زبان گدی سے باہر کھینچ لی گئی۔ اس وقت تو ایسا ہوتا تھا کہ زبان چلانے والوں کو ذات پات کی بنیادوں پر گروہوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ کچ دلوں گروہوں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ پھر ان کے آپس میں جوتے چلوا دیے جاتے تھے اور آخر میں دلجوئی کے خیال سے انہیں خطابات سے نوازا جاتا۔ سر، خان بہادر، رائے صاحب اور راجا تک راجا بنا دیا جاتا۔ کچ لوگوں کو لائیسنس اور پرمٹ کی بخشش ہی جاتی کہا جاتا ہے کہ خطابات لائیسنس اور پرمٹ بھی جوتوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مگر جس طرح مسور کی دال کے لیے یہ موسم مناسب نہیں اسی طرح ایسے جوتوں کے لیے بھی چندیا کا "ہلو" ہونا نہایت ضروری ہے اسی سلسلے میں جوتوں کی ایک اور قسم بھی نکل آئی "اسٹے کرسی کا جوتا" کہتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ کبھی چرب زبان جوتے باز کو ایک اونچی سی کرسی پر بٹھا کر کبھی اس کی چندیا اور کبھی اس کے موضع پر ایک بھاری بھرکم چاندی کا جوتا رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اس کی بولتی بند رہے مگر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بقار خانے میں نہ سہی اسٹیج کے ارگرد اس کا یعنی کرسی نشین کا طوطی بولتا رہے ہاں تو یہ وہ بخششیں ہیں جنہیں بخش کر یہ آسمانی ملک و قوم کا بیڑا غرق کروایا جا سکتا تھا۔ اور آج تک یہ کارخیر وہی طبقا انجام دے رہا ہے جو پہلے بھی اپنے آقاؤں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ چلتے چلاتے جوتوں کی جو تھوڑی بہت خصوصیات رہ جاتی ہیں انہیں بھی گنوا دوں کہ جوتے چلائے جا سکتے ہیں برسائے جا سکتے ہیں اٹھائے جا سکتے ہیں۔ ان کے بنا دئے گئے جا سکتے ہیں (بنا دئے اکثر دو پر دیسی ممالک کی سرحدوں پر ہوتے ہیں۔) جوتے پڑتے ہیں انہیں پاؤں میں پہنا جا سکتا ہے۔ ہاتھ میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور جب کسی کو عزت عزت دینی ہو تو جوتوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ دیکھا آپ نے جوتوں کی کتنی قسمیں ہیں۔ ویسے اور بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ مگر ان کا ذکر پھر کبھی۔

امریکا کے اصلی باشندے

یو سیس

امریکا کے اصلی باشندے نیگرو نہیں۔ جیسا کہ غلط طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جنھیں سرخ فام انڈین (ھند ستانی) لکھا جاتا ہے جو وہاں نہ جانے کب سے آباد ہیں چونکہ ان لوگوں کا زیادہ تر حال عوام کے سامنے نہیں آتا۔ اس لیے نیچے ان کے متعلق کچھ حالات پیش کیے جاتے ہیں

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ امریکا کے اصلی باشندوں (سرخ فام انڈین یا ہند ستانی) کی نسل ختم ہو رہی ہے لیکن معاملا اس کے برعکس ہے۔ پچھلی صدیوں میں ان کی آبادی مسلسل طور پر بڑھتی آئی ہے اس صدی کے آغاز میں ان کی آبادی ۲ لاکھ ۳۷ ہزار تھی آج چار لاکھ تک پہنچ چکی ہے یعنی ۵۰ فی صد اضافہ ہوا ہے۔

شہریت کے مکمل حقوق کے علاوہ ان انڈینوں کو مزید مراعات بھی حاصل ہیں جو امریکی حکومت اور ان کے بزرگوں کے ساتھ معاہدوں کے تحت دی گئی ہیں۔

آبادی یہ انڈین امریکا کی تقریباً ہر ریاست میں رہتے ہیں۔ دس ریاستوں میں دس ہزار اور آری زونا میں ۶۶ ہزار انڈین بستے ہیں۔ تخمیناً ۵ کروڑ ۶ لاکھ ایکڑ زمین امریکی سرکار نے ان لوگوں کے استعمال کے لیے خصوصی طور پر وقف کر رکھی ہے وہ چاہیں تو اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں صرف اسی علاقے میں رہنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ انہیں امریکا میں جہاں کہیں بھی وہ چاہیں جائیداد حاصل کرنے کا حق حاصل ہے کوئی بھی کام کرنے کی آزادی ہے اور ان کے بچے پبلک سکولوں میں تعلیم پا سکتے ہیں۔

حقوق ۱۹۲۴ء میں امریکی کانگریس نے ایک قانون منظور کیا تھا جس کے تحت امریکا اور الاسکا میں رہنے والے تمام انڈینوں کو شہری اور ووٹ دینے کے مکمل حقوق حاصل ہیں اور وہ سٹر بننے کی شرائط کے تحت (مثلاً پڑھائی لکھائی، سکونت وغیرا) دوسرے شہریوں کی طرح یہ بھی ووٹ دے سکتے ہیں۔

قابل شہریوں کی کمیٹی نے (سٹی زنز کمیٹی) مفصل تحقیقات کے بعد جو جو سفارشیں پیش کی تھیں ان کے مطابق امریکی سرکار نے ان انڈینوں کے متعلق ۱۹۳۴ء میں ایک نئی پالیسی کا آغاز کیا۔ یہ کمیٹی جن کو لیکر مدبروں کے تحت شروع ہوئی تھی۔ اور بعد میں مشہور ماہر معاشرت جن کولیر نے اس میں مزید توسیع کی تھی ان سفارشوں میں حسب ذیل امور شامل تھے انڈینوں کے استعمال کے لیے زمینوں کی بحالی۔ ہر قبیلے کو میونسپل کمیٹیاں قایم کرنے کا موقع دینا۔ تمام قسم کے فنون حرفتوں زبانوں اور لوک رہن سہن طور طریقوں کو فروغ دینے میں حوصلا افزائی کرنا وغیرا وغیرا۔

اس سے پہلے ان امور کی حوصلا شکنی کی جاتی تھی مختصر یہ کہ اس نئی پالیسی کے تحت ان انڈینوں کے

شخصی وقار اور ذاتی احترام کو تسلیم کیا گیا ہے۔

پچھلے چند برسوں میں ان انڈینوں نے تعلیم میں خاصی ترقی کی ہے ۱۹۵۰ء میں ۳۳ وفاقی ہائی اسکول تھے۔ جن میں سے تقریباً ۲۰ فی صد طلبا عالا تعلیم کے لیے کالجوں میں داخل ہوئے ۱۵ برس کے عرصے میں ڈھائی ہزار طلبا نے کالجوں میں عالا تعلیم پانے کے لیے حکومت سے قرض پر رقمیں لیں۔ ان لوگوں کو جو تعلیمی سہولتیں دی گئی ہیں ان میں ہمبروک کیرولینا کا انسٹیٹیوٹ کالج بھی شامل ہے۔

اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد ۱۹۵۰ء میں ۲۶۷۱۶ تھی۔

صحت و تندرستی

ان ہندستانیوں کے لیے محکمہ صحت نے امریکا اور الاسکا میں ۴ ہسپتال کھول رکھے ہیں جن میں سالانا ۶۰ ہزار بیماروں کا علاج معالجا کیا جاتا ہے۔

اکثر انڈین اپنے گذارے کے لیے اپنی مساعی پر انحصار رکھتے ہیں۔

بہت سے ہندستانی ابتدائی زمانے کی دستکاریوں سے روزی کماتے ہیں۔ بنا و اجاس کے کمبل اور زیورات چینی کے برتن، ٹوکریاں وغیرا امریکا کی دستکاریوں میں سے مشہور ہیں۔ ایک ادارا انڈین آرٹس کرافٹس بورڈ انڈین نوجوانوں کی اس امر میں حوصلا افزائی کرتا ہے کہ وہ دستکاریاں اور حرفتیں سیکھیں اور حرفت کاروں اور صناعوں کو قابل فروخت سامان بنانے کا مشورا بھی دیتا ہے۔

ترقی

پچھلے بیس برسوں میں اور بعض صورتوں میں پچھلے دس برسوں سے بھی کم عرصے میں انہوں نے شاندار ترقی کی ہے بہت سے مخصوص علاقوں میں امداد باہمی کی انجمنیں قایم کی گئی ہیں۔ انہیں یہ انڈین لوگ ہی چلاتے ہیں اور یہ انڈینوں کے لیے ہی مخصوص ہیں۔

چنانچہ بنیاری کی دکانیں، مویشی خانے بھیڑ بکریاں پالنے کے فارم، لکڑی چیرنے کے کارخانے، ڈیری فارم، فنون و حرفت، کیننگ خوراکی اشیا ڈبوں میں بند کرنے کی صنعتیں وغیرا اسی طرح چلائی جارہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے انہیں جو قرضے دیے گئے تھے انہوں نے ان میں سے تقریباً ۹۹ فی صد قرضے واپس ادا کر دیے ہیں۔

ہر برس انڈینوں کی ایک خاصی تعداد اپنے مخصوص علاقوں سے نکل کر کام کاج حاصل کرنے کے لیے دوسرے علاقوں میں جاتی ہے۔ صنعتی مرکزوں کے نزدیک جہاں مخصوص علاقے ہیں ان میں ان کی تعداد سب سے زیادا ہے اگرچہ بہت سے قصباتی انڈین مخصوص علاقوں میں رہنے والے انڈینوں سے بھی رشتے اور تعلقات رکھتے ہیں تاہم وہ شہری لوگوں کے ساتھ بھی تیزی سے گھل مل جاتے ہیں اور کلہاما میں جہاں انڈینوں نے مدتوں تک تعلیم پائی ہے وہاں کے باشندوں میں وہ بڑی خوبی سے گھل مل گئے ہیں۔

انڈین امریکا کی کانگریس اور ریاستی لیجسلیچروں کے ممبر رہے ہیں اور اس وقت بھی ہیں۔ وہ عدالتوں میں ججوں، قانون دانوں، ڈاکٹروں، معلموں اور کامیاب تاجروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

عالمی جنگوں میں خدمات

دونوں عالمی جنگوں میں ان انڈینوں نے شاندار اور نمایاں رکارڈ قایم کیا ہے پہلی عالمی جنگ میں ۸ ہزار انڈین بھرتی ہوئے تھے۔ دوسری عالمی جنگ میں ۲۵ ہزار انڈینوں نے جنگی خدمات انجام دیں اور ویمن آکزیلری کور (عورتوں کی امدادی فوج) میں ہزاروں انڈین عورتوں نے شرکت کی۔

خاص کر تاوا جو کے بحری بیڑے نے بڑی خدمت انجام دی یہ اپنی قبائلی زبان میں لوگوں تک احکام پہنچاتے تھے اور یہ ایسا گوڑ تھا جسے دشمن حل نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں جنگوں میں بہت سے انڈینوں کو بہادری کے انعامات بھی ملے ہیں۔

انڈینوں کے متعلق جدید ترین قانون بنایا گیا ہے کہ انہیں بدستور مرکز کے تابع ہی رکھا جائے لیکن انڈین چاہتے ہیں کہ انہیں بتدریج ریاستی حکومتوں کے تحت کیا جائے۔

شبنم رومانی

شبنم رومانی کی کہانی ان کی زبانی

"مرزا عظیم بیگ چغتائی" کا ہم نام اور ہم ذات ہوتے بھی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں ظرافت نگار نہیں ہوں۔ ۳۰ دسمبر ۲۸ء کو شاہ جہاں پور (یو۔پی) کے ایک سفل خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ میرے والد ماجد مرزا اطہر بیگ چغتائی مرحوم خرد تخلص کرتے تھے اور اساتذہ کے قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے مگر ان کی زندگی میں یہ حقیقت ان کی کسرِ نفسی کے پردوں میں چھپی رہی اور ان کے انتقال کے بعد ان کی لائبریری نے یہ راز فاش کیا۔ مرے جد امجد آغا مرزا غلام محمد بیگ چغتائی دورِ شاہجہانی میں نواب بہادر خاں کے ہمراہ غزنی سے تشریف لائے تھے اور مستقل طور پر شاہجہاں پور میں آباد ہو گئے۔

میں فطرتاً حساس اور رومان پسند واقع ہوا ہوں بچپن ہی سے میرا رجحان شعر و ادب کی طرف رہا ہے۔ میں نے دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور سات آٹھ برس کی مشق کے بعد کسی استاد کامل کی ضرورت محسوس کی۔ میری خوش نصیبی کہ جانشین امیر مینائی، اعتبار الملک حضرت قبلا دل شاہجہاں پوری نے میری شفقانہ رہنمائی قبول فرمائی۔ میں نے اس نیک سیرت حضرت فن کے قدموں پر ادب کے ماتھا لوں اور آفتابوں کو جھکتے دیکھا۔ میں نے ان کی متانت اور کم گوئی میں بچوں کی سی معصومیت اور فرشتوں کا سا جلال پایا۔ وہ لکھنؤ اور دلی کے واحد مشترک نمائندے ہیں۔ حضرت مضنی امیر مینائی کے شاگرد رشید ہوتے ہوئے بھی انہوں نے دلی اسکول کی داخلیت کو اپنی شاعری کا غالب رنگ بخشا۔ اور داخلیت کے مصور ہوتے ہوئے بھی خارجی محاسن سے اپنے کلام کو رنگ روپ اور لطافت دی۔ وہ ہندستان کے پہلے "مجتہد الشعرا" ہیں جن کے بارے میں صف اول کے شاعروں اور نقادوں نے ان کے فن کی بلندی اور عظمت کے گیت گائے ہیں۔ جہاں آرزو، ثاقب، سیماب فانی، صفی، عزیز، اثر، بیخود، نوح، جلیل، یاس، تاجور اور حسرت سے انہوں نے خراج تحسین وصول کیا ہے وہاں اقبال، نیاز، مجنوں، فراق، سرور، کلیم، سہیل، احسان جوش، کیفی، سپرو اور شاداں وغیرہ نے بھی ان کی مسلم الثبوت شخصیت اور مستند کلام کا تحریری اعتراف کیا ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ میری تمام تر شاعرانہ صلاحیتیں انہیں کی رہنمائی کا پرتو ہیں۔

میں نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر میری افتادِ طبع کو غزل کا میدان زیادہ راس آیا ہے اور میں نے غزل کو دنیا کی تمام اصناف شاعری میں وسیع تر اور ممتاز تر پایا ہے۔ میں نے پاکستان آنے کے بعد نظمیں بہت کہی ہیں۔ مگر مجھے جتنا پیار اپنی غزلوں سے ہے نظموں سے نہیں۔ حالانکہ میری متعدد نظمیں توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ اور بعض ارباب نظر کی رائے ہے کہ میں نظم و غزل پر یکساں قادر ہوں۔"

۴۸ء میں میں نے بریلی سے ماہنامہ "شبنم" کا بھی اجرا کیا تھا۔ جسے صف اول کے شاعروں اور ادیبوں اور نقادوں کا تعاون حاصل تھا مگر یہ ادبی جریدہ میری نقل سکونت کی وجہ سے زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔

اگر میں یہ کہہ دوں کہ میری غزلوں کی ہیروئن ایک نیت مہرو ماہ ہے تو شاید یہ روایت پرستی ہوگی — ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کبھی ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ جس کی بھیانک تعبیر سے آج تک لرز رہا ہوں۔ میرا آرٹ غزل اور نظم کے روپ میں ایک ایسی شخصیت سے متعارف کراتا ہے جسے میں نے اپنے

سے بہت قریب سمجھا ہے اور آج اس کو اپنا ظاہر بنا دینے کے باوجود (یہ باطن) پائے ہوئے ہوں۔ میرے فن کی یہ ہیروئن (جو میرے لیے مر چکی ہے) میرے فن کے لیے ہمیشہ زندہ رہے گی۔

نظم گو شعرا میں اقبال اور جوش کے علاوہ اروش صدیقی اختر شیرانی اور پروفیسر شور کو میں اس دور کا نمائندہ سمجھتا ہوں۔ غزل گو حضرات میں حسرت، دل اور اصغر کے علاوہ جگر مرادآبادی فراق گورکھپوری، نہال سیوہاروی، ماہر القادری عبدالحمید عدم اور سراج الدین ظفر کے قافلہ سالاروں میں ہیں ــــ مگر میں ان میں سے کسی کو بھی اپنے لیے قابل تقلید نہیں سمجھتا۔ میں انفرادیت پسند ہوں اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی شاعری کو ان جادوں پر چلا سکوں جو میرے اپنے تراشے ہوئے ہیں۔ ادب میں "احتیاط پسندی" اور "رجعت پسندی" میرا مسلک رہا ہے۔ اسی لیے نہ مجھے رجعت پسند طبقے کا اعتماد حاصل ہے نہ ہی ترقی پسند طبقے کا ــــ اور میں خوش ہوں کہ یہ فصیلیں اپنی جگہ خود ہی ایک طبقہ ایک منزل، ایک آدرش ہوتی ہیں!!

نظم میں میرے ہندستانی کلام کا انتخاب "ستاروں کے کنول" اور پاکستانی کلام کا مجموعہ "شمعوں کے چراغ" مرتب ہو چکے ہیں۔ نثر میں میرے افسانوں کا مجموعہ "نہ جھوٹ نہ سچ" اور ایک واقعاتی ناول "ناہید" زیر ترتیب ہیں۔

ذیل میں نمونہ کلام پیش کر رہا ہوں ــــ

اے فطرت کمزور انساں جب تک تمنا ہو پوری
یہ دشواری وہ دشواری یہ مجبوری وہ مجبوری
ان رنگیں رنگیں ہونٹوں میں ملتی ہے بہار تو یکساں
ان نازک نازک آنکھوں سے ڈھلتی ہے شراب نگوری

جیسے مرمر کی سلوں پر مٹے رنگیں کا بہاؤ
تم کو اظہار محبت کی قسم پھر سر ماؤ
میں نے واپس تو لیا لفظ "محبت" لیکن
سوچتا ہوں کہ مری بھول کو تم بھول نہ جاؤ

میرے جذبات محبت کا سہارا لے کر
بات تو جب ہے کہ تم خود مری آغوش میں آؤ
میں نے تقدیر کو تدبیر سے ٹکرایا تھا
میری ناکام تمناؤں پہ آنسو نہ بہاؤ
جشن الفت ہے ترے ہات کے آئینے میں
دیکھ تقدیر کی دوشوخ لکیروں کا ملاؤ

غم دوراں کا گراں شور ذرا دم لے لے
آ رہی ہے مرے کانوں میں کسی کی آواز
کتنی پیارے رنگ ہے توفیق فدایان کرم
نہ وہ آہوں کی عبادت نہ وہ اشکوں کی نماز
مسکراتا ہے ستارہ، مہ کامل کے قریب
آ وہیں تم کو بتاؤں دل بیتاب کا راز

ہستی کی تفسیر ہیں ہیں پھولوں کے بھیگے آنچل
تیری جوانی جیسے گلاب میری محبت جیسے کنول
منزل بخت پر ہنستی ہے گونے والے دیکھ سنبھل
بکھرے بکھرے سے گیسو ڈھلکا ڈھلکا سا آنچل

تم کو خود حسن کا احساس نہیں ہے لیکن
آئینہ سامنے رکھ دوں تو پسینا آجائے
ہنسنے والے تجھے ٹوٹے ہوئے تاروں کی قسم
دیکھ اچھی نہیں ہوتی کسی مظلوم کی "ہائے"
ان کی پلکوں پہ لرزتا ہوا آنسو شبنم
میری قسمت کا ستارا ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے

جن ستاروں کو سمجھتا ہے زمانا تقدیر
وہ ستارے ترے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں
جب کوئی تذکرۂ مہر و وفا کرتا ہے۔ کچھ نہ پوچھو کہ ہم اس وقت کہاں ہوتے ہیں۔

حسن فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گل تو رس مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

وہاں میرا نیازوں نشیں ہے جہاں سجدہ بھی توہین جبیں ہے
فریب حسن کا شکوہ نہیں ہے۔ محبت خود ہی مار آستیں ہے
جہاں تم ہو وہاں دنیا ہے لیکن۔ جہاں میں ہو وہاں کوئی نہیں ہے

شمع گل پوشش اور آغوش میں پروانوں کی
سخت ذلت ہے جوانی کے گھبانوں کی
ان کا یہ کہنا ہے کہ میں عرض حقیقت کر دوں
روز فرمائشیں ہوتی ہیں جو افسانوں کی
وقت چپکے سے قریب آکے دبے پاؤں سے
شوق تصویر بناتا رہا ارمانوں کی

لب پہ نالے پر ہنسی ہے مگر اشک ڈھل رہے ہیں
مری جستجو میں وہ بھی مرے ساتھ چل رہے ہیں
ابھی شب ہے شمع سوزاں ابھی کیا سحر کا دھڑکا
ابھی تو بھی جل رہی ہے ابھی ہم بھی جل رہے ہیں
یہ لباس مریمی ہے کہ ورق ہیں چاندنی کے
یہ شباب آتشیں ہے کہ چراغ جل رہے ہیں

اشک رہ کے پرستے ہیں مری آنکھوں سے۔ یہ جینا کہیں ساون کا مہینا تو نہیں
لب مشتاق تک آکے مچل جاتی ہے۔ مئے کہنہ کوئی نوخیز حسینا تو نہیں
دیکھنا ہے گل و شبنم کی ہم آغوشی سے ان کے عارض پہ حیا کا پسینا تو نہیں

دل بھی کس درجہ ترے عشق میں جذباتی ہے
بعض اوقات تو اپنے پہ ہنسی آتی ہے
ایک گل وہ ہے جو خنداں ہے سر زلف عروس
اک کلی وہ ہے جو کھلنے سے بھی شرماتی ہے

اشک بن کر مری آنکھوں سے برستی ہے بہار
زلف بن کر ترے شانوں پہ گھٹا آتی ہے
حسن کی جدت جلوہ فگنی ہے بیکار
کہ ابھی عشق کا انداز روا یاتی ہے
ٹوٹتا ہے جو کوئی نجم درخشاں شبنم۔ دیر تک دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

کہاں تک بہر طور غم کھایئے۔ یہی زندگی ہے تو مر جایئے
تمنا یاں نہیں آپکے خد و خال۔ ذرا اور نزدیک آجایئے

نکل آیا ہوں تری زلف سے کوسوں آگے میں نہ کہتا تھا کہ مشکل ہے مری ہم سفری
رنگ بھر دیتی ہے جذبات میں کیسے کیسے اے مری جان تمنا تری سادہ نظری
مجھے گمراہ نہ کر دے کوئی غارتگر ہوش یہ مری عمر جواں، یہ مری تنہا سفری
میں بتاؤں تجھے تعریف غزل کی شبنم
مرے جذبات کی رانی مرے خوابوں کی پری

رہزن دل، تیرا قانون۔ دشمن جاں تیرا دستور
نظروں کا دل کش ٹکراؤ۔ فطرت کا معصوم قصور
چاہے نظر ہی کام آجائے۔ ہم ان کو دیکھیں گے ضرور

جوش حیا اور تیز نفس۔ سرخ کنول پر امرت رس
اس دنیا میں پیار کہاں۔ یہ دنیا ہے بزم ہوس
ساز چھڑا۔ ساغر ٹکرائے ہائے تری آواز کا رس
عہد طرب۔ اک عمر عزیز۔ عمر عزیز۔ اک سرد نفس
اللہ اللہ بائیسے ہونٹ
پھول کا رنگ نکھر کا رس
زلف کھلی، پلکیں جھپکیں۔ ابر بہار اب کھل کے برس
میرا شکوں مجھکو دے کر
اپنا کرم لے لو واپس

ہندستان میں بولی جانیوالی زبانیں اور بولیاں (۱-۸)

ہندستان کے رجسٹرار جنرل کے دفتر کی طرف سے ملک کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی زبانوں کے لحاظ سے آبادی سے متعلق اعداد و شمار کا ایک مقالا شایع کیا گیا ہے جو سات سو سے زیادہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں ان پندرہ زبانوں کے مطابق آبادی کے تفصیلی اعداد و شمار شایع کیے گئے ہیں جن کا ذکر ہندستان کے آئین میں کیا گیا ہے اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی مقامی نوعیت کی تقریباً ۲۰۰ بولیوں سے متعلق اعداد و شمار بھی اس مقالے میں درج کیے گئے ہیں۔ ان میں اگرا والی امبہاٹی اور بازاری وغیرہ بعض ایسی زبانیں بھی شامل ہیں جنہیں سارے ملک میں صرف ایک ایک شخص بولتا ہے ان تمام مقامی زبانوں میں بات چیت کرنے والے اشخاص کی مجموعی تعداد ۳۰ لاکھ سے زیادہ نہیں۔ ۱۹۵۱ کی مردم شماری میں بعض اشخاص نے ۶۳ غیر ملکی زبانوں کو مادری زبان کے طور پر درج کرایا ہے۔ اسی مقالے میں ان غیر ملکی زبانوں کی فہرست بھی شایع کی گئی ہے۔

اس سے پہلے یہ امر بحث کا موضوع رہا ہے کہ آیا بعض مقامی بولیوں کو علحدہ زبانیں قرار دیا جائے یا انہیں کسی دوسری زبان کی بگڑی ہوئی شکل ہی سمجھا جائے۔ اس سوال پر بھی اختلاف رائے رہا ہے کہ مقامی بولی کا ماخذ کسی زبان کو قرار دیا جائے۔

مثال کے طور پر کیا بھاری بھرکم اجتماعی نام کی کوئی زبان ہے اسی طرح یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کوکنی یا قاعدہ زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ یا محض ایک مقامی بولی کا اگر بہیلی کو مقامی بولی تصور کیا جائے تو کیا اس کا ماخذ ہندی کو سمجھا جائے یا گجراتی کو۔

اوپر کے شکوک اور مشکلات کے پیش نظر اس بار یہ فیصلا کیا گیا تھا کہ مردم شماری میں جو شخص اپنی مادری زبان کا کوئی نام لکھوائے اسے ہی درست سمجھکر اس کے مطابق زبانوں سے متعلق ضروری اعداد و شمار مرتب کیے جائیں اور گذشتہ مردم شماری میں زیادا تر ریاستوں میں اس اصول پر عمل کیا گیا ہے۔ بہار۔ حیدرآباد۔ مدہیہ بھارت اور راجستھان کی ریاستوں میں مردم شماری کے عہدے داروں نے بعض بولیوں کو ان زبانوں کے گروپ میں شامل کر دیا ہے جن کے بارے میں یہ امر بلکل واضح تھا کہ یہ مقامی بولیاں متعلقا زبانوں سے ہی نکلی ہیں۔ اسی طرح اتر پردیش، مدھیہ پردیش، بنگال وندھیان پردیش اور میسور کی ریاستوں میں بھی بعض مقامی بولیوں کو بعض بڑی زبانوں کے گروپ میں شامل کر دیا گیا ہے کہ لوگوں نے اپنی مادری زبان کا جو نام لکھوایا ہے اسے اسی طرح رہنے دیا جائے۔ اس رپورٹ میں اس سلسلے میں ہر ریاست سے متعلق درج اعداد و شمار کی ضلع وار تفصیل بھی دی گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس کس علاقے میں ایک سے زیادا زبانیں بولی جاتی ہیں۔

رپورٹ کے پہلے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ آئین میں مندرج زبانوں کو بولنے والے اشخاص کی آبادی کتنی ہے۔ چونکہ پنجاب، پیپسو، دلی۔ ہماچل پردیش اور بلاسپور کی ریاستوں میں مردم شماری کے دوران زبان کے اندراج کے معاملے پر بحث چھڑ جانے کے باعث اسے بے اثر قرار دیدیا گیا تھا اس لیے ان زبانوں یعنی ہندی اردو ہندستانی اور پنجابی سے متعلق اعداد و شمار کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

× کشمیر اسی بولیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور عام طور پر اسی اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے

چنانچہ جن لوگوں نے اپنی مادری زبان ہندی لکھوائی تھی ان کے متعلق کل ہند تعداد بیان نہیں کی گئی۔

رپورٹ کے دوسرے باب میں ان ۲۳ زبانوں نے متعلق اعداد و شمار درج کیے گئے ہیں جو خصوصیات کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ زبانیں شیڈولڈ قبایل میں مادری زبان کے طور پر بولی جاتی ہیں۔ اور دوسری یہ کہ انہیں بولنے والے اشخاص کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے تیسرے باب میں ہندستان کی دوسری ایسی چوبیس زبانوں کے نام درج کیے گئے ہیں جنہیں بولنے والوں کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔

دکنی اور پوربی ہندستان کے بعض حصوں کے افراد کو زبان کے لحاظ سے کسی زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکا مثلاً کے طور پر ریاست ٹراونکور کوچین کے ان لوگوں کی زبان کے بارے میں تفصیلات فراہم نہیں کی گئیں جو ملیالم تامل۔ ہندی، تلگو، کوکنی، کنڑی، گجراتی اور مراٹھی کے سوا کسی اور زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔

پنجاب میں جالندھر کے مقام پر اعداد و شمار کو ترتیب دینے کے دفتر کو آگ لگ جانے کے باعث ۱۲۶۸۶۰۲ اشخاص سے متعلق ریکارڈ نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کی زبان سے متعلق اعداد و شمار اس مقالے میں شایع نہیں کیے جا سکے

دلی یونیورسٹی میں برطانوی کتابوں کی نمائش

حال ہی میں دلی یونیورسٹی کے اولڈ کنووکیشن ہال میں برطانوی کتابوں کی ایک نمائش کی گئی تھی جس کا افتتاح دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا۔ اس نمائش کا انتظام برٹش کونسل نے کیا ہے اور اس میں ۵۰۰ کتابیں رکھی گئی ہیں ان کو دیکھنے سے یہ اندازا لگایا جا سکتا ہے کہ حالیہ سالوں میں برطانیہ میں طبعیات سیاسیات معاشیات

افکار نامہ نامہ

نظمیں عالمگیر

کہرام ہے فلک پر اک شور ہے جہاں میں
اپنا گیا قضا کو، دیوانا زندگی کا
آئی تھی موت شمع تاباں کا روپ لے کر
گل کر گیا اسے بھی پروانا زندگی کا

(ایک دوست کے پاکستان جانے پر)

یہ خاک نہ ہو جائے بچانا اسے یارب
اک ننھے ستارے سے گگن چھوٹ رہا ہے
گل کی طرح خاموش ہوں کچھ کہہ نہیں سکتا
افسوس کہ بلبل سے چمن چھوٹ رہا ہے

گلوں کو ساتھ لیے سوگوار جاتی ہے
چلے بھی آؤ چمن سے بہار جاتی ہے
مری حسین امیدوں کی پھول سی دنیا
کسی ستارے کی مانند جھلملاتی ہے

(ھولی)

مری اجڑی ہوئی دنیا سے تصور میں ابھی
جھلملاتا ہے وہ منظر وہ شرارت وامنگ
تھام کر ہات کسی نے یہ کہا تھا مجھ سے
اب کہاں بھاگ کے جاوگے کہو ڈالوں رنگ

گلستاں جن کی نوازش سے سلگ اٹھا ہے
خون سے ان کے ہر اک راہ کو رنگیں کر دو
پھینک دو رنگ کو اے اہل چمن اور آؤ
گل فروشوں کے یہ خون سے ہولی کھیلو

وکٹوریا ٹاور

پی۔ ال۔ رٹرنا

(تاریخ کا مخزن)

ویسٹ منسٹر محل کے وکٹوریا ٹاور میں دنیا کا ایک بہترین تاریخی خزانا موجود ہے۔ اس کے محافظ خانے میں برطانوی پارلیمنٹری حکومت سے متعلق چار سو سال پرانی ۵ لاکھ تاریخی دستاویزیں پڑی ہوئی ہیں ان میں ممتاز و عظیم شخصیتوں اور ظالموں اور مظلوموں کی تحریریں بھی شامل ہیں ——

لندن کا وکٹوریا ٹاور ویسٹ منسٹر محل کا ایک حصا ہے اور یہ بگ بین کے بالکل پاس ہی کھڑا ہے۔ دنیا کا یہ سب سے بڑا مربع نما ٹاور ہے اور اس کے محافظ خانوں میں نہایت قیمتی تاریخی ذخیرا موجود ہے۔

مورخین ایک سو سال سے ایک عظیم لوہے کے ایک چکردار زینے کے ذریعے اوپر جاکر اس کے محافظ خانوں میں تاریخی مواد حاصل کرتے رہے ہیں۔ اب یہ زینا چند دنوں کا مہمان ہے بہت جلد اس کی جگہ بجلی کا ایک لفٹ لگا دیا جائے گا۔

اس ٹاور کی مرمت کا کام آج سے پندرا سال پہلے شروع ہوا تھا۔ جنگ کی وجہ سے مرمت کے کام میں رکاوٹ پڑ گئی تھی جنگ کے بعد ایک نئے ہاوس آف لارڈز کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اور اس طرح وکٹوریا ٹاور کی مرمت کی رفتار سست پڑ گئی۔ گذشتا سال سے یہ کام اچھی رفتار سے چل رہا ہے

اس کے محافظ خانوں میں ممتاز شخصیتوں ظالموں اور مظلوموں کی چار سو سال کی پرانی تحریریں پڑی ہوئی ہیں ان تحریروں میں آپ کو دنیا بھر کی پارلمنٹوں کی "ماں" یعنی برطانوی پارلیمنٹ کی پوری داستان مل جائے گی۔

۱۴۹۷ء سے پارلیمنٹ کے ریکارڈ رکھنے کی ذمے داری ہاوس آف لارڈز پر رہی ہے اس میں تقریباً ۵ لاکھ مختلف قسم کی دستاویزیں محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ آج کل ہاوس آف لارڈز کے مقابلے میں ہاوس آف کامنز (ایوان عام) کا ریکارڈ نام سنا جاتا ہے لیکن پارلیمنٹ کے ریکارڈ اس کی نگرانی میں کبھی بھی نہیں رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ اپنی مجموعی حیثیت سے ہاوس آف لارڈز میں کام کرتی ہے۔ شاہی حکمران پارلیمنٹ کی رسم افتتاح اسی ایوان میں ادا کرتا ہے شاہی کمیشن متفقا اقدامات اسی ایوان میں منظور کرتا ہے اور پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے بل بدرجہ آخر اسی ایوان میں قانونی شکل اختیار کرتے ہیں۔

تمام دستاویزوں کا محافظ پارلی منٹ کا کلرک ہوتا ہے اس کا عہدا ایک بہت پرانا عہدا ہے ایک طویل عرصے تک یہ تحریریں اور دستاویزیں صرف پارلی منٹ کے استعمال کے لیے تھیں۔ لیکن برطانوی تاریخ کے مستند حالات جاننے کی ضرورتوں نے مجبور کر دیا کہ اس پابندی کو کچھ ڈھیلا کر دیا جائے اور پچھلی صدی میں یہ تاریخی خزانا تاریخ کے طلبا کے لیے بھی کھول

دیا گیا۔ ممتاز مورخ مینکلے ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے شروع ہی میں اس خزانے سے فائدہ اٹھایا۔

اب ہر شخص اس عظیم تاریخی ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کوئی معقول وجہ پیش کر سکے۔ ۱۸۴۶ء میں پارلیمنٹ دفتر میں اس مقصد سے ایک علاحدہ شعبہ قائم کر دیا گیا تھا کہ جو ان دستاویزوں کا معائنہ کرنا چاہتا ہے۔ پہلے ہی سے پوسٹ کارڈ یا ٹیلیفون کے ذریعے یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ کونسی دستاویز دیکھنا چاہتا ہے۔

اس ٹاور میں آپ کو ہر قسم کی تحریر مل جائے گی۔ مثلاً ہنری ہشتم کے زمانے کے امرا کے ناموں کی فہرستیں، امریکی جنگ آزادی کے حالات، ملکہ کیرولین کا مقدمہ، ملکہ میری کا مقدمہ اور اس کی پھانسی سے متعلق دستاویزیں۔ اس کے خطوط — غرض کہ آپ کو اس ٹاور میں ہر قسم کا تاریخی مواد مل سکے گا۔

۲۲

تھی مگر کبھی اس کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہو جاتیں کہ وہ اپنے کانوں سے سن لیتی!

شکستہ حال جھونپڑی اس کی ناکامی قسمت کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ کھولنے کی کرخت صدائیں فضا میں اس طرح گونجیں گویا اس کی تقدیر پر قہقہے لگا رہی ہوں۔ وہ اپنے بیمار شوہر کے پاس گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور دیر تک فضا میں بازگشت کرتی رہی۔ غریب اور بھوکے مزدور کی آنکھیں کھلی تھیں گویا کہہ رہی ہوں "جانے والا جا چکا"

دوسری صبح دنیا والوں نے ایک دیوانی عورت کو جس کے کپڑے اس کی عریانیت پر تلے تھے سڑکوں پر دوڑتے دیکھا۔ اس پگلی کے زبان سے یہ الفاظ بار بار ادا ہو رہے تھے "کہیں دیکھا ہے تم نے میرے پتی کو"

پھر ایک طویل قہقہا اور پراسرار خاموشی۔

پگلی

شاہد اختر

رات تاریک تھی بے حد تاریک۔ گناہگار کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ۔ گھنگھور گھٹائیں آسمان کے سینے پر رقص بہیمی کر رہی تھیں۔ اس ہنگامۂ مسلسل کی دنیا سے دور انگڑائیاں لے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ستارا بادل کے نقاب سے اس طرح جھانکتا گویا بھولے ہوئے راہی کو اپنی منزل کا پتا دے رہا ہو! سرکیس سائیں سائیں کر رہی تھیں اور چاروں طرف ہو کا عالم۔ سارا شہر خاموش تھا مگر ایک عالیشان مکان سے ساز کے چھڑنے کی مترنم صدائیں ہلکی ہوئی ہواؤں کے ساتھ مل کر دل کے دھڑکنوں کو تیز کیے دیتی تھی۔ لیکن اس ہنگاموں کی دنیا سے دور ایک بوسیدہ جھونپڑے سے دبی ہوئی آہوں کی آواز میں سارے رومان پرور تخیلات کے شیرازے منتشر کر دیتی۔ اس جھونپڑی میں ایک مزدور اور ایک اس کی شریک زندگی اور ایک معصوم روح پرورش پا رہی تھی۔

وہ بھوکی تھی! تین دن کے مسلسل فاقوں سے اس کا ایک ایک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اپنی ماں کا احساس کیے بغیر دنیاوی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہوتی رہی اور زمین کے خشک لب تر ہوتے گئے۔ غم و الم کے اس طوفان نے غریب مزدور کی دنیا ہی بدل دی اور وہ بستر علالت پر آ گرا۔

وہ بھوکی تھی، غریب تھی! اور تو اور اس کا خیال بھی ناممکنات میں سے تھا۔ ناچار ہو کر اس نے وہ راہ اختیار کی جس پر انسان انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گامزن ہوتا ہے وہ بھیک مانگنے چلی۔

رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ اور ماہتاب اپنی ضیا پاش کرنوں سے دنیا کے ذرے ذرے کو تابانی کا سبق دے رہا تھا۔ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی طرف، واپس ہوئی اس وقت اس کے ہاتھ میں چند کھنکتے ہوئے سکے بے چین ہو رہے تھے اور وہ انہیں اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے تھی۔ چہرے پر مسرت کی ایک بہار رقصاں

سواگت

صالحہ عابد حسین

(ٹالسٹائی کی ایک کہانی کا ترجمہ)

ایک بڑی سی عمارت کی سب سے نچلی منزل کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں سے ایک میں مارٹن رہتا تھا۔ اس کی کوٹھری میں صرف ایک کھڑکی تھی جس میں سے سڑک پر گذرنے والے راہگیروں کے صرف پاؤں ہی نظر آ سکتے تھے۔ اس کی گذر بسر پر اپنے جوتوں کی مرمت پر تھی۔ وہ لوگوں کے پاؤں دیکھ کر ہی پہچان لیا کرتا تھا کہ سڑک پر سے کون گذر رہا ہے۔ اس لیے کہ یہاں رہتے اسے بہت دن ہو چکے تھے۔ اور پاس پڑوس کے لوگوں میں سے کوئی مشکل سے ایسا ہوگا جس کے جوتوں کی دو تین یا کم سے کم ایک بار اس نے مرمت نہ کی ہو۔ اس کے پاس کام کی کمی کبھی نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ مسالا اچھا لگاتا۔ کام دھیان سے کرتا۔ اور مزدوری واجبی لیتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جھوٹے وعدے نہ کرتا تھا اور جتنا کام اس کے بس کا ہوتا اتنا ہی لیتا تھا۔ آس پاس کے سب لوگ اسے جانتے اور مانتے تھے۔ اور جوتوں کی مرمت کا بہت سا کام اس کے پاس آتا رہتا تھا۔

مارٹن ہنسیا سے نیک آدمی تھا مگر اب تو جیوں جیوں بڈھا ہوتا جاتا۔ اس کی پرہیزگاری اور رحمدلی اور زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ہر وقت اپنی آتما کی مکتی کی فکر رہتی اور خدا پرستی کا بھاؤ دن بہ دن بڑھتا جاتا تھا۔

اب سے پہلے اپنا نجی کام شروع کرنے سے قبل وہ کسی دوسرے کی دکان پر کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی بیوی ایک تین سالی کا بچا چھوڑ کر چل بسی۔ اس کے پہلے سب بچے دودھ پینے کے زمانے ہی میں چل بسے تھے۔ بیوی کے مرنے کے بعد پہلے تو مارٹن نے سوچا کہ بچے کو اپنی بہن کے پاس گاؤں میں بھیج دے۔ مگر پھر اس کا دل نہ مانا۔ اس نے سوچا "میرے کیپٹن کو باپ کے بجائے دوسروں کے پاس رہنا پڑے گا نہیں میں اسے خود ہی پالوں گا۔"

مارٹن نے مالک کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا۔ اور اس کوٹھری میں آکر رہنے لگا۔ اور خدا اپنا کام کرنے لگا۔ مگر بچوں کے معاملے میں مارٹن بڑا ہی بدنصیب تھا۔ بچا ذرا ہی بڑا ہوا تھا اور بڑی خشی خشی باپ کا تھوڑا سا ہاتھ بٹانے لگا تھا کہ ایک دن اسے تیز بخار چڑھا اور ہفتے بھر کے اندر اللہ کا پیارا ہو گیا۔ مارٹن کے دکھ اور نراشا کی انتہا نہ تھی۔ یہاں تک کہ بھگوان کے خلاف الول جلول بکنے لگا۔ وہ رنج و غم کی پرستھتی میں بار بار پرارتھنا کرتا کہ وہ مر جائے۔ وہ خدا سے شکایت کرتا رہتا کہ تو نے مرے اکلوتے بچے کو تو مار ڈالا اور خدا جو بڈھے کو زندا چھوڑ دیا۔ اسی غصے میں اس نے پرارتھنا کے لیے گرجا جانا چھوڑ دیا۔

کچھ دن بعد ایک دن اس کے گاؤں کا ایک سادھو پرش اس سے ملنے آیا۔ آٹھ سال سے وہ برابر پاک استھانوں کی تیرتھ یاترا کے لیے جاتا رہتا تھا۔ مارٹن نے اپنا دکھ سنایا۔ اور اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔

"میرے بزرگ بھائی! میں خدا سے اس کے سوا اور کچھ نہیں مانگتا کہ وہ مجھے موت دیدے۔ میرے لیے اب دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔"

بڈھے تیرتھ یاتری نے جواب دیا۔

"مارٹن ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ ہم خدا کے بھید کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ جو ہم چاہتے ہیں وہ نہیں بلکہ خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ وہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کی یہی مرضی تھی کہ تمہارا بچا مر جائے اور تم زندہ رہو تو اس میں کوئی اچھائی ہوگی۔ تمہاری

اس نراشا اور بیزاری کی وجہ یہ ہے کہ تم دوسروں کے لیے نہیں بلکہ خوشیوں کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہو"

"انسان اور کس لیے زندہ رہنا چاہتا ہے اپنی خوشی ہی کے لیے تو؟" مارٹن نے پوچھا۔

"نہیں انسان کو خدا کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ اسی نے تمہیں زندگی کی پونجی دی۔ تمہیں اس نعمت کو اسی کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ جب تم خدا کے لیے زندہ رہنا سیکھ جاؤ گے تو تمہارا یہ دکھ درد دور ہو جائے گا۔ اور زندگی تمہیں آسان نظر آنے لگے گی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

مارٹن کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر پوچھا "خدا کے لیے آدمی کیسے زندہ رہتا ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "ہمیں عیسیٰ مسیح نے خدا کے لیے زندہ رہنے کا رستہ دکھایا ہے کیا تم پڑھنا جانتے ہو۔ اچھا تو پاک کتاب کی ایک کاپی خرید لاؤ۔ اور اسے پڑھو پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ خدا کے لیے کیسے زندہ رہا جاتا ہے!"

بوڑھے کی باتیں مارٹن کے دل میں اتر گئیں۔ وہ اسی دن بائبل کی ایک پرتی خرید لایا۔ اور اسے پڑھنا ارمھ کر دیا پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ صرف چھٹی کے دن اسے پڑھا کرے گا لیکن اس پاٹھ سے اسے ایسی شانتی ملی کہ اس نے روز پڑھنا شروع کر دیا۔ کبھی تو اسے پڑھتے پڑھتے اتنی دیر ہو جاتی کہ چراغ کا تیل ختم ہو جاتا تھا۔ جتنا زیادہ وہ پڑھتا جاتا اس پر یہ بات صاف ہوتی جاتی تھی کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کا دل پہلے سے کہیں زیادہ ہلکا اور خوش رہتا تھا اور دن بھر اس کے موہ سے نکلتا رہتا "تیری شان بڑی ہے۔ تیری شان بڑی ہے۔"

اب مارٹن کی ساری زندگی بدل گئی۔ پہلے وہ چھٹی کے دن شراب پی لیا کرتا تھا۔ اور نشا کی حالت میں راہ گیروں کو چھیڑتا تھا اور لوگوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ اب اس نے یہ سب باتیں چھوڑ دی تھیں۔ وہ سویرے سے اپنے مرمت کے کام میں لگ جاتا اور کام ختم کرنے کے بعد دیا جلا کر رات گئے تک بائبل پڑھتا رہتا تھا۔ وہ جتنا زیادہ اسے پڑھتا اتنا ہی آسانی سے مطلب سمجھتا جاتا تھا۔ جو جو باتیں وہ کتاب میں پڑھتا ان پر غور بیٹھ کر سوچتا کہ اس کی اپنی زندگی اس سیکھ پر کہاں تک پوری اترتی ہے۔

ایک دن وہ بیٹھا دیر تک کتاب پڑھتا اور اس کی سیکھ پر اپنی کاریوں کو تولتا رہا۔ ادھر سمابت کر دینے کا وقت آگیا تھا۔ مگر اس کا جی کتاب چھوڑ دینے کو نہ چاہتا تھا۔ آج وہ بائبل میں سے وہ قصا پڑھ رہا تھا جب ایک امیر فریسی نے مسیح کو اپنے گھر بلایا مگر ان کا سواگت پریم اور آدر سے نہ کیا پر ایک پاپی استری نے ان کے پاؤں اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے۔ اس نے پڑھا۔

پربھو مسیح نے رئیس سے کہا "تو نے میرا کوئی سکار نہیں کیا میرا سواگت نہیں کیا۔ لیکن اس گناہ گار صورت نے اپنے بالوں سے میرے پاؤں کو جھاڑا ہے اور آنسوؤں سے انہیں دھو ڈالا۔"

مارٹن نے عینک اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ اور سوچنے لگا۔ "فریسی میرا جیسا خدغرض ہوگا جسے بس اپنی ہی فکر رہتی ہے اسے یہ خیال نہ آیا کہ اپنے مہمان کو چائے پلائے۔ منہ ہاتھ دھلائے۔ اور آرام پہنچائے۔ اور پھر مہمان بھی کون مہمان! ہمارا راجا۔ ہمارا مالک! اگر وہ میرے یہاں آجائے تو کیا میں بھی ایسا ہی کروں گا؟" مارٹن کا سر اس کے ہاتھوں پر جھک گیا۔ اور وہ میز پر سر رکھ کر نندرا مائی کی گود میں سو گیا

"مارٹن!" سہسا ایک آواز اسے اپنے کان میں سنائی دی۔

"کون ہے؟" اس نے نیند ہی کی اوستھا میں پوچھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ پھر کسی نے اسے پکارا اور اس بار بلکہ صاف آواز اسے سنائی دی۔ "مارٹن! مارٹن! کل سڑک پر دیکھیو۔ کل مارٹن نے اپنی آنکھیں ملیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سپنا تھا یا جاگتے میں اس نے

یہ واقعہ سنا تھا۔

اگلے دن صبح کو وہ سویرے اٹھا۔ آگ جلائی۔ گوبھی کا شوربا اور آلو پکانے لگا۔ کیتلی میں چائے کا پانی چڑھا دیا۔ اور کھڑکی کے قریب بیٹھ کر جوتوں کی مرمت شروع کر دی۔

وہ برابر کل کی گھٹنا کے سمبندھ میں سوچ رہا تھا۔ کبھی تو اسے یہ خیال ہوتا کہ یہ سپنا تھا اور کبھی وہ یہ محسوس کرتا کہ اس نے وہ آواز جاگتے میں سنی تھی۔ اسے خیال آیا کہ یہ ناممکن نہیں۔ کیا ایسی باتیں پہلے نہیں ہو چکی ہیں۔

وہ کام کرتے کرتے بار بار جھک کر کھڑکی میں سے سڑک پر گذرنے والوں کو دیکھ لیتا تھا۔ اس لیے کہ بغیر جھکے اسے رستا چلنے والوں کے کیول پیر ہی دکھائی پڑتے تھے۔

ایک چھوکرا نئے جوتے پہنے گذر گیا۔ پھر ایک بہشتی آیا اور چلا گیا۔ اس کے بعد ایک بڈھا ایک غریب سپاہی اس کی کھڑکی کے قریب آیا۔ مارٹن اس کے پرانے جوتوں کو پہچانتا تھا۔ ایکن سپاہی نے رحم کھا کر اسے اپنے گھر کے نوکروں کے ہاتھ بٹانے کے لیے اپنے یہاں رکھ لیا تھا۔ اس سے شاید برف ہٹانے کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے اپنا پھاوڑا اٹھایا اور مارٹن کی کھڑکی کے سامنے سڑک پر سے برف ہٹانے لگا۔ مارٹن نے اسے دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے سوچا کہ میں کچھ سٹھیا سا گیا ہوں یہاں یہ بچارا برف ہٹانے آیا اور میں سمجھا کہ حضرت مسیح سے ملنے پدھارے ہیں۔

مارٹن نے دس بار اٹھنے لگا کر کھڑکی میں سے پھر جھانکا بڈھے نے اپنا پھاوڑا دیوار سے لگا دیا تھا۔ اور غالباً تو ستا رہا تھا یا گرم ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

مارٹن نے سوچا "میں اسے بلا کر چائے پلا دوں تو کیا ہرج ہے۔ چائے کا پانی بھی بس ہونے ہی والا ہے۔"

اس نے جوتے سینے کا سوجا نیچے رکھ دیا پہلے چائے بنائی اور پھر کھڑکی کے شیشے کو جا کر کھٹکھٹانے لگا۔ بڈھے نے پلٹ کر دیکھا تو مارٹن نے اوس سے اندر آنے کو کہا۔ اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ اور کہا "آؤ اندر آ کر ذرا گرم ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں بہت سردی لگ رہی ہے۔"

"خدا تم پر اپنی برکتیں نازل کرے!" بڈھے نے جواب دیا اور اپنے کپڑوں اور جوتوں پر سے برف جھاڑنے لگا کہ مارٹن کی کوٹھری خراب نہ ہو۔

مارٹن نے کہا "فکر نہ کرو۔ فرش میں خود صاف کر لوں گا۔ آؤ! دوست بیٹھ جاؤ۔ اور تھوڑی چائے پی لو۔"

ایک پیالا بھر کر اس نے اپنے مہمان کو دیا۔ اور ایک خود پینے لگا۔ اس نے ذرا دیر میں اپنا پیالا خالی کر دیا۔ اور شکریہ ادا کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا جی ایک پیالا اور پینے کو چاہتا ہے۔

"اور ہو گے" مارٹن نے پوچھا اور اسے اور چائے دی۔ مگر مارٹن کی نظر برابر کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھی۔

بڈھے نے پوچھا "کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے؟" مارٹن بولا "کیا بتاؤں میتر۔ مجھے کہتے لجا آتی ہے میں سچ مچ کسی کا انتظار نہیں کر رہا لیکن کل رات میں نے ایک آواز سنی تھی۔ اور اس وچار کو اب تک اپنے من سے دور نہیں کر سکا ہوں۔ تمہیں معلوم کہ میں نے جو کچھ سنا وہ کیسول میرا بھرم ہے۔ یا سچ مچ ایسا ہوا تھا؟ میں بائبل میں مسیح کا ایک قصہ پڑھ رہا تھا کہ کس طرح وہ ایک رئیس کے گھر گئے۔ اور اس نے ان کا اچیت سواگت نہیں کیا۔ میں نے سوچا اگر وہ میرے ہاں پدھاریں تو میں کیا کروں گا۔ ٹھیک اس سمے مجھے اپنے کان میں ایک آواز سنائی دی "میرا انتظار کرو، میں کل آؤں گا۔" پھر دوسری بار بھی میں نے یہ واکیا سنا۔ اگرچہ یہ کہنے میں جھجکتا ہوں مگر یہ بات سچ ہے کہ آج میں اپنے "سوامی" کی پرتیکشا کر رہا ہوں۔"

بڈھا خاموشی سے سنتا رہا۔ اور خالی پیالا میز پر رکھ دیا مارٹن نے اسے تیسری بار چائے سے بھرا اور بولا "لو اور پیو۔ تم پر بھگوان دیا کریں۔" وہ چائے پیتا رہا۔ اور مارٹن اسے عیسیٰ مسیح کے دیا اور پریم غریبوں، مریضوں اور مزدوروں

کی محبت اور مہانو بھون کی کہانیاں سناتا رہا۔

چائے سماپت کر کے بڈا سپاہی بولا۔ "بہت بہت شکریا مارٹن۔ تم نے مجھے انمک بھوجن بھی دیا۔ اور جیمانی بھی۔ بہت بہت دھنیوا واد"

"پھر آنا۔ یہاں ہمیشا کھلے دل سے تمہارا سواگت کیا جائیگا" مارٹن بولا۔

جب وہ چلا گیا تو مارٹن نے آخری پیالی چائے کی نکال کر پی۔ اور پھر اپنے کام پر بیٹھ گیا۔ اب بھی وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا جاتا تھا۔ اور مسیح کے انگن کی امید اور ان کے وچن اور کارنامے اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔

دو سپاہی گزرے۔ ایک کے پاؤں میں سرکاری جوتے تھے دوسرے کے پاؤں میں اپنے بنجی پڑوس کا ایک رئیس نیے چمکدار بوٹ پہنے ہوئے آگے بڑا چلا گیا۔ ایک ڈبل روٹی والا ٹوکری لیے ہوئے آیا۔ اور گذر گیا۔ اس کے بعد ایک عورت آئی۔ اس کے پاؤں میں گھر کے بنے ہوئے پرانے جوتے اور بالکل پھٹے ہوئے موزے تھے۔ کھڑکی کے قریب آکر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ مارٹن نے جھک کر اسے دیکھا۔ وہ کوئی اپنجی عورت تھی جس کی گود میں ایک ننھا سا بچا تھا جس کو دیوار سے ٹیک لگا کر وہ تیز برفیلی وایو سے بچانے کی وپھل پریٹن کر رہی تھی۔ مگر واسٹو میں اس کے پاس کوئی ایسی چیز تھی ہی نہیں جس میں لپیٹ کر بچے کو سردی سے بچا سکے۔ وہ گرمی کے ٹھنڈے کپڑے پہنی تھی۔ اور وہ بھی پھٹے ہوئے تار تار۔ مارٹن نے کھڑکی میں سے بچے کے رونے کی آواز سنی جیسے ماں لاکھ چپ کرا رہی تھی۔ مگر وہ روے چلا جاتا تھا۔

مارٹن نے کہا "سردی میں کیوں بچے کو لیے کھڑی ہو۔ یہاں اندر آجاؤ نا۔ یہ سردی سے بچ جائے گا" عورت نے اچرج سے اس بڈے کو دیکھا جو ایک ایرن پہنے اور ناک کی پھننگی پر عینک رکھے کھڑا اسے بلا رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کوٹھری میں چلی آئی۔ مارٹن اسے پلنگ کے پاس لے گیا اور کہا۔ "لو بیٹی یہاں آگ کے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور بچے کو دودھ پلا دو"

میں نے صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں تو دودھ کہاں سے اترے گا" یہ کہہ کر اس نے بچے کے منھ میں دودھ دے دیا۔

مارٹن نے سر ہلایا۔ پھر ایک برتن میں گوبھی کا شوربا انڈیلا کچھ روٹی نکالی۔ دلیا بھی نکالا۔ مگر وہ ابھی تیار نہ ہوا تھا۔ اس نے ایک پتائی پر شوربا اور روٹی رکھ دی اور کہا "لو بیٹھ کر یہ روٹی کھا لو۔ میں اتنی دیر بچے کو سنبھالتا ہوں۔ میرے بھی بچے تھے بیٹی۔ میں جانتا ہوں انہیں کیسے بہلایا جاتا ہے"

عورت نے بیٹھ کر کھانا کھانا شروع کر دیا اور مارٹن نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اور بھانت بھانت کی ترکیبوں سے اسے بہلانے لگا۔ آخر بچا ہنس ہی پڑا۔ اور مارٹن خش ہو گیا عورت کھانا کھاتی جاتی تھی۔ اور اپنی بپتا سناتی جاتی تھی

"میں ایک سپاہی کی بیوی ہوں۔ آٹھ مہینے ہوئے میرے میاں کو کہیں لام پر بھیج دیا گیا۔ اور تب سے آج تک مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں مل سکا۔ اس وقت تک یہ بچا پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور میں ایک گھرانے میں کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔ مگر اس کے پیدا ہونے کے بعد انہوں نے مجھے الگ کر دیا کہ بچے والی کو ہم نہیں رکھتے۔ اب میں تین مہینے سے بے کار ہوں۔ میں برابر کوشش کرتی رہی کہ کہیں مجھے کوئی کام مل جائے۔ مگر آج تک تو ملا نہیں۔ جو کچھ میرے پاس تھا سب بیچ کر کھا گئی۔ میں نے چاہا کہ انا کی نوکری ہی مل جائے مگر مجھے کوئی نہیں رکھتا کہ ایسی بھوکوں مری عورت ہم کیا کریں گے اس لیے میں ایک بیوپاری کی بیوی کے گھر گئی تھی۔ اس کے یہاں میرے گاؤں کی ایک استری نوکر ہے جس نے مجھے نوکری دلانے کا بچن دیا تھا۔ مگر وہاں سے جواب ملا کہ ابھی نہیں۔ ہفتے بھر بعد آنا۔ وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔ اور میں بلکل تھک گئی ہوں۔ اور یہ غریب بچا بھوک سے بے چین ہے۔ وہ تو کہو ہماری مکان دارنی بچاری دیا لو عورت ہے جس نے اب تک مجھے کوٹھری سے نکالا باہر نہیں کیا۔ نہیں تو میں کہاں جاتی"

مارٹن نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "تمہارے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے؟"

"گرم کپڑا کہاں سے ہوتا۔ میری آخری دھرو ہر ایک گرم چادر تھی اسے بھی آج میں نے آٹے آنے میں گروی رکھا دیا۔" عورت نے یہ کہہ کر بچے کو مارٹن سے لے لیا۔ مارٹن اٹھا اور الگنی پر پڑے ہوئے کپڑوں کو ٹٹول کر ایک پرانا لیا دانکال لایا۔ اور کہنے لگا "لو اگرچہ یہ پرانا ہے مگر بچے کو لپیٹنے کے لیے کافی ہوگا۔"

عورت نے ایک نظر لیا دے پر اور ایک بڈے پر ڈالی اور رو پڑی "تم پر خدا کی رحمت ہو۔ شاید یسوع نے تمہارے دل میں یہ ڈالا کہ تم مکھڑ کی میں سے مجھے دیکھ لو نہیں تو آج یہ بچا سردی سے ٹھٹھر کر مرہی جاتا۔ سویرے اتنی کڑی سردی تھی کہ ہاتھ پاؤں گلے جارہے تھے۔"

مارٹن مسکرایا اور بولا "بیشک مسیح ہی کی بدولت میں نے مکھڑ کی میں سے دیکھا تھا۔" اور اس نے عورت کو اپنا سپنا سنایا کہ کس طرح اس نے مسیح کی آواز سنی تھی کہ وہ آج اس سے ملنے آئیں گے۔

"کون جانے یہ دنیا میں سب کچھ سمبھو ہے۔ وہ بھی لیا دے کو اپنے اور بچے کے گرد لپیٹا۔ جھک کر مارٹن کو سلام کیا اور اس کا شکریا ادا کرنے لگی۔

"لو مسیح کے نام پر یہ لو۔ اس سے اپنی چادر چھڑوا لینا" یہ کہہ کر مارٹن نے آٹے آنے کے پیسے عورت کے ہاتھ پر رکھ دیے اور پھر اسے جاکر دروازے تک چھوڑ آیا۔

اس کے جانے کے بعد مارٹن نے کچ کھایا۔ اور برتن صاف کر کے پھر اپنے کام کو لیکر بیٹھ گیا۔ اب بھی وہ مکھڑ کی کو نہیں بھولا تھا۔ جب کبھی کوئی سایہ اس پر پڑتا تو وہ فوراً دیکھتا کہ کون جارہا ہے۔ اس کی جانتے والے بھی اور اجنبی لوگ بھی گذر رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ یوں ہی چلا جاتا۔ ایک دفعہ مارٹن نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت آئی جس کے ہاتھ میں سیبوں کی ایک بڑی سی مگر قریب قریب خالی ٹوکری تھی۔ شاید وہ بہت سے سیب بیچ چکی تھی اور پیٹ پر لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا۔ جو وہ اپنے گھر لے جارہی ہوگی۔ گٹھا بھاری ہونے کی وجہ سے وہ تھک گئی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ اسے ایک کندھے سے دوسرے پر کرے۔ اس نے ٹوکری زمین پر رکھ دی۔ گٹھے کو ٹکایا کہ پھر اسے اٹھائے اتنے میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس کی ٹوکری میں سے ایک سیب لے کر اچک کر بھاگنا چاہتا تھا کہ بڑیا نے اسے پکڑ لیا۔ وہ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر عورت اسے مضبوطی سے پکڑے تھی۔ اس نے اس کی ٹوپی اتار کر اسے بالوں سے پکڑ لیا تھا۔ اور اسے گالی دے رہی تھی۔

مارٹن کا اوزار اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ بھاگتے میں اس کی عینک بھی گر کر ٹوٹ گئی۔ مگر وہ اسے اٹھانے کے لیے رکا نہیں۔ بڑیا لڑکے کے بالوں کو کھینچ رہی تھی۔ اور برابر گالیاں دے دے کر دھمکی دے رہی تھی کہ وہ اسے پولیس میں دے گی۔ لڑکا اپنے کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا۔ "میں نے سیب لیا تو نہیں۔ پھر تم مجھے کیوں مار رہی ہو؟ چھوڑ دو مجھے!"

مارٹن نے جاکر بچے کو بڑیا سے چھڑایا "بس نانی بس خدا کے لیے اب اسے معاف کر دو اور چلا جانے دو۔"

"ہیں، میں اسے ایسا سبق دوں گی کہ سال بھر تک یاد رکھے گا۔ میں اس بدمعاش کو پولیس کے حوالے کروں گی!" بوڑیا بولی۔

"جانے دو نانی، جانے دو، اب یہ ایسا نہیں کرے گا۔ مسیح کے نام پر اسے چھما کر دو۔"

بوڑیا نے لڑکے کو چھوڑ دیا۔ لڑکا بھاگنے لگا مگر مارٹن نے اس کو پکڑ لیا۔ اور کہا "نانی سے معافی مانگو۔ اور دیکھو پھر کبھی ایسا کام نہ کرنا۔ میں نے خود تمہیں سیب اٹھاتے دیکھا تھا۔"

لڑکا رونے اور معافی مانگنے لگا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے اور لو یہ ایک سیب" مارٹن نے بڑیا کی لوکری میں سے ایک سیب اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "نانی۔ میں تمہیں اس کے پیسے دیدوں گا۔"

"اسی طرح تو تم لوگ لوگوں کا ستیناس کرتے ہو۔ ایسے لڑکوں کے تو اتنے کوڑے لگنے چاہئیں کہ یاد رکھیں۔"

"ارے نانی، ہم انسانوں کا یہی ڈھنگ ہے لیکن خدا کا یہ طریقہ نہیں اگر وہ بھی ذرا ذرا سے قصوروں پر کوڑوں کی سزا دے تو پھر ہمارے بڑے بڑے گناہوں کا کیا کچ عذاب نہ ہوگا۔" مارٹن نے جواب دیا۔ اور وہ بوڑیا کو مسیح کے وہ قصے سنانے لگا جن میں ان کی دیا اور چھما کی چرچا تھی۔ آخر میں بولا خدا ہم سے کہتا ہے کہ تم لوگوں کو معاف کرو۔ تب ہی تمہارے گناہوں کو بخشوں گا۔ اور پھر اس معصوم بچے کو چھما کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بچے بہت بری طرح بگڑتے جاتے ہیں" بڑیا کہنے لگی۔

"تبھی تو بڑوں کو اچھی مثال بن کر سامنے آنا چاہیئے" مارٹن کی یہ بات سن کر بڑھیا بولی۔ "ہاں میں بھی تو یہی کہتی ہوں۔ میرے سات بچے تھے۔ جن میں سے صرف اب ایک لڑکی زندہ ہے۔" اور پھر بڑھیا نے اسے سارا قصہ سنایا کہ وہ کس طرح اپنی لڑکی کے ساتھ رہتی ہے۔ اور اس کے کتنے بچے ہیں۔ اور وہ نانی سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ یہ باتیں کرتے کرتے اس کے چہرے پر نرمی اور محبت نظر آنے لگی۔ آخر میں بولی۔ "سچ مچ یہ اس کا بچپن ہی تو تھا۔ خدا اسے معاف کرے۔" یہ کہہ کر بڑھیا اپنی لکڑیوں کا گٹھا اٹھانے لگی تو لڑکا بولا "نانی میں تمہارے بجائے اسے اٹھالے لیتا ہوں۔ میں بھی تو اسی رستے جا رہا ہوں۔" بڑیا نے اپنا سر ہلایا اور وہاں کہہ دیا تھوڑی دیر میں وہ دونوں سڑک پر باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ سیب کے پیسے لیتے کا بڑیا نے مارٹن سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

جب تک وہ نظر آتے رہے مارٹن کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ جب گرجا کے دروازے میں لگی تو یہ بڑی پر اپنی لوٹی ہوئی چیز کی وہ اب پھر اپنے اوزار لے کر کام کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن اب کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور مارٹن کے لیے سلائی کرنا مشکل تھا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک پر لالٹینیں جلانے والا روشنی کر رہا ہے تو اسے یاد آیا کہ اب دیا جلانے کا سمے آ گیا ہے۔ اس نے روشنی جلائی اور مرمت کا کام پورا کر کے دیکھا تو اب جوتا بالکل ٹھیک تھا۔ اب اس نے چراغ میز پر رکھا۔ اور بائبل نکال کر پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ وہ اس جگہ کو نکالنا چاہتا تھا جہاں سے کل اس نے پڑھنا چھوڑا تھا۔ مگر کتاب دوسری جگہ سے کھل گئی۔ مارٹن کو اب پھر کل کا سپنا یاد آیا۔ اور ایسا یاد آیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے کسی بچے کے پیروں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ بچے لوگ کوٹھری کے اندھیرے کونے میں کھڑے ہیں مگر وہ یہ نہ جان سکا کہ وہ کون ہیں۔ اس کے کان میں کوئی پھسپھسایا۔ مارٹن کیا تم مجھے نہیں جانتے؟"

"کون ہے" مارٹن نے سوچتے ہی سوچتے میں کہا۔

"وہ میں ہوں" اندھیرے میں سے بڈا سپا ہی آگے بڑا اور پھر غایب ہو گیا۔

"اور یہ میں ہوں" ایک اور آواز آئی۔ اور بچے کو گواہی لیے ایک عورت آگے بڑی۔ اور مسکرائی۔ بچا ہنسا اور دونوں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

"یہ میں ہوں" پھر آواز آئی۔ اور سیب والی بڑیا اور لڑکا آگے بڑے۔ مسکرائے اور غایب ہو گئے۔

مارٹن کو اپنے دل میں ایک انمک آنند کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے سینے پر کر اس کا نشان بنایا۔ اور پاٹھیہ کے لیے بائبل کی طرف اگرشت ہوا۔ پہلے ہی پنے پر اس کی نظر ان لائنوں پر پڑی "میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا دیا میں پیاسا تھا۔ تو نے میری پیاس بجھائی۔ میں اجنبی تھا مگر تو نے

رابندر ناتھ ٹیگور اور سوویت یونین

ا۔ کومارو ف

بیس برس سے زیادہ عرصا ہوا کہ بنگالی زبان میں کلکتے سے ایک چھوٹی سی کتاب شایع ہوئی تھی جس کا سادا سا نام تھا "مکتوبات روس" کتاب کے مصنف ہندستان کے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اس میں سوویت یونین کے متعلق حقایق بیان کیے ہیں۔

غیر ملکوں سے تہذیبی تعلقات قایم کرنے والی سوسایٹی کی دعوت پر ۱۹۳۰ء میں ٹیگور سوویت یونین گئے تھے۔ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے کہ ایک نئی دنیا کی تخلیق کس طرح ہو رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ سوویت یونین میں تعلیم عام کی تنظیم کس طرح کی جا رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں کیا کچھ کامیابیاں حاصل کی جا چکی ہیں۔

یہ وہ زمانا تھا جبکے سوویت عوام اپنی قوتیں اشتراکی صنعت اور نیا پنی کاشتکاری کی تخلیق پر صرف کر رہے تھے۔ اور کلچر کو ترقی دے رہے تھے جو کہ نئی نوع انسان کی تاریخ میں پہلی بار عوام کی دسترس میں آیا تھا۔

سوویت عوام کی پر امن تخلیقی محنت ان کے اتحاد اپنے شاندار مقصد یعنی اشتراکی سماج کی تعمیر کی تکمیل کے لیے ان کے جوش و خروش سے رابندر ناتھ ٹیگور بہت ہی متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا "ان ملکوں میں جہاں صرف پیسے اور طاقت ہی کا وجود ہے۔ جہاں ہر فرد روپے پیسے کے لالچ کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہاں ایسا اتحاد ممکن ہی نہیں ہے" سوویت عوام کی تخلیقی کوشش کی زبردست تاریخی اہمیت کو ٹیگور تسلیم کرتے تھے چنانچے انہوں نے لکھا ہے" روس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ مستقبل کی شاہراہ کی تعمیر ہے"

سوویت عوام کے کلچر کی زبردست ترقی کی واضح تصویر پیش کرتے ہوے انہوں نے بیان کیا کہ "سوویت کلچر کی حیات بخش قوت لازوال ہے۔ اور یہ حقیقی معنوں میں عوام کا کلچر ہو گیا ہے"۔ انہوں نے لکھا کہ "موسیقی اور تھیٹر کی ترقی اور کامیابیاں غیر معمولی ہیں۔ انقلاب کے بعد سخت آزمایشی دور میں اور قحط کے زمانے میں وہ یعنی سوویت یونین کے محنت کش عوام مضمون زگار، گیت گاتے۔ اور ڈرامے کھیلتے تھے۔ اور اس زمانے میں تاریخ جو زبردست ڈرامے پیش کر رہی تھی یہ ان سے بے تعلق نہ تھے۔ بیابان میں طاقت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قوت کی اصلی تصویر تو وہاں ملتی ہے جہاں پتھروں کے ڈھیر سے ابلتا جھاگ اڑاتا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ جہاں ایک زمانے کی بنجر بستا سر زمین موسم بہار میں حسین اور دلفریب لالا زار بن جاتی ہے"

سوویت یونین میں تعلیم عام کی زبردست کامیابیوں نے ٹیگور کو گرویدا کر لیا۔ خاص طور پر سوویت نظام تعلیم کی حقیقی جمہوریت تعلیم اور عملی زندگی کے قریبی تعلق اور نئی پود کی تعلیم کی انسان دوستانا نوعیت نے انہیں بہت ہی متاثر کیا۔ انہوں نے لکھا ہے "اگر میں نے خدا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہوتا تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا کہ محض دس برس کے عرصے میں وہ لاکھوں لوگوں کو جہالت اور تحقیر کی تاریکیوں سے نکال سکیں گے۔ اور انہیں نہ صرف حروف تہجی سکھا لیں گے بلکے انہیں انسانی وقار کا احساس بھی دلا دیں گے۔ یہاں میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے تعلیم کو زندگی کے ساتھ ملا دیا ہے۔ وہ تعلیم اس لیے نہیں دیتے کہ تعلیم حاصل کرنے والے امتحانات پاس کر لیں۔ عالم بن جائیں بلکے وہ

آدمی کو انسان بنانے اور اس کو علم حاصل کرانے کے لیے تعلیم دیتے ہیں۔"

اشتراکی طرز زراعت کی اندسر نو تنظیم کے نتائج کا انہوں نے بڑی گہری دلچسپی کے ساتھ مشاہدا کیا۔ استحصال کرنے والوں کے جبر و استبداد سے سوویت دیس کے لاکھوں کسانوں کی نجات فاقا کشی اور تہذیبی پسماندگی کی لعنت سے ان کا چھٹکارا سوویت کسانوں کے بچوں پر ان کے متعلق انہوں نے لکھا ہے "کسانوں نے محض کتابیں پڑھنا ہی نہیں سیکھ لیا ہے۔ ان کا سوچنے کا طریقہ بدل گیا ہے ذہنی اعتبار سے انہوں نے ترقی کی ہے وہ انسان بن گئے ہیں۔ کسانوں کی اخلاقی سوجھ بوجھ کو بلند کر کے سوویت حکومت نے نئی زندگی کی وسیع بنیادیں استوار کر دی ہیں۔" انہوں نے ہندستانی دیہاتوں کی خوب صورت تشبیہیں دیکر ان نئی مشینوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے سوویت کسانوں کی محنت کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ انہوں نے لکھا "میرا عقیدہ ہے کہ ہمارے دیس میں سری کرشن زراعت کے دیوتا تھے۔ وہ ایک گوالے کے گھر پیدا ہوئے تھے اور ان کے سوتیلے بھائی بلرام ہلدھر تھے۔ وہ ہل ہی انسان کی مشینی قوت کا جد امجد ہے مشین زراعت کو قوت دیتی ہے۔ روسی زراعت نے بلرام کو اپنے ہاں بلا لیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح وہاں کھیتوں کی میڑیاں ہر جگہ غایب ہو گئی ہیں۔ اور نئی مشینوں کی مدد سے زمین جوبے کار اور بنجر تھی حیات بخش زمین بن گئی ہے"

سوویت کسانوں کے متعلق اپنا تاثر گراٹیگور نے ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا "پہلے وہ فاقا کش بے سہارا اور بے زبان تھے اب ہزاروں مشینیں ان کے کھیتوں میں پہنچ گئی ہیں پہلے وہ ایسے لوگ تھے جو ہمارے دیس میں کرشن کے گوالے کہلاتے تھے آج وہ بلرام کی فوج میں شامل ہیں۔"

سوویت یونین میں قومی استبداد اور قومی دشمنی کا وجود نہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ٹیگور نے لکھا ہے۔ "وہاں کی پالیسی منافع کے لالچی لوگوں کی لالچ سے دانستہ رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سارے روس کی قومیں اور لوگ بلا تفریق تعلیم کی نعمت سے متمتع ہیں اور سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔۔۔" سوویت یونین کے تمام لوگوں کی مادی فلاح و بہبود اور ان کی حالت میں بنیادی اصلاح کا اور ان کی کی اقتصادی اور تہذیبی ترقی کا انہوں نے بہت ہی پرجوش انداز میں ذکر کیا ہے انہوں نے بہت سے اعداد و شمار ان رقموں کے متعلق پیش کی ہیں جو قومی جمہوریوں کی تہذیبی ضروریات پوری کرنے کے لیے خرچ کی جاتی ہیں۔ ان اسپتالوں اسکولوں اور دوسرے تہذیبی اداروں کی تعداد بتائی ہے جو سوویت دور حکومت میں قومی جمہوریوں میں قایم کیے گئے تھے۔ انہوں نے سوویت قومی جمہوریوں میں صنعت اور تعلیم عام کی "تیز رفتار ترقی" کا ذکر کیا ہے اور وہ بے شمار شکلیں گنوائی ہیں جنہیں ان جمہوریوں کی اقتصادی اور تہذیبی ترقی کے سلسلے میں حل کرنا پڑا۔ "سوویتوں کو خاموش تیاری کے لیے دو سو برس درکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے یہ کام پچھلے دس برسوں ہی میں مکمل کر لیا۔"

ہندستان کے اس عظیم شاعر نے اشتراکیت کے دیس کی کامیابیوں کو اس کے سماجی نظام کی نوعیت سے وابستہ کیا ہے ٹیگور ایک حساس فن کار اور حقیقت پسند تھے۔ اور اسی لیے ان کی نظر بنیادی خصوصیت پر پڑی ۔۔۔ یعنی "انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا موجود نہ ہونا اسی کی بدولت عوام کی تخلیقی قوتیں بلا روک ٹوک ترقی کرتی ہیں۔ وہاں کی ملیں اور فیکٹریاں ملکی یا غیر ملکی سرمایا داروں کو اپنی تجوریاں بھرنے کی غرض سے نہیں چلتیں۔ وہ عوام کی ملکیت ہیں۔ یعنی تفریح اور زندگی کی تمام نعمتیں پوری طرح انہیں کو (محنت کش عوام کو مضمون نگار) حاصل ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں عوام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور وہ سماج کی کتاب کا محض آخری باب نہیں بلکہ اس کے ابواب ضخان پر مشتمل ہیں۔"

ٹیگور بخوبی سمجھتے تھے اور انہوں نے واضح طور پر بتایا بھی کہ سوویت دیس کے سماجی نظام کی نوعیت امن کے لیے

اس کی سچی کوششوں کی دلالت کرتی ہے۔ اس سے سوویت یونین کی محنت اور سامراجی ملکوں کے حکمران حلقوں کی امن کے متعلق بنا وٹی باتوں کے درمیان فرق کو انہوں نے بخوبی واضح کیا ہے ٹیگور نے لکھا ہے کہ سوویتوں کے پیش نظر مقصد حلقہائے اثر کو وسیع کرنا یا محفوظ رکھنا نہیں ہے۔ ان کا نصب العین تعلیم عام کا بہتر نظام پیدا کرنا اور عوام کی مادی فلاح و بہبود کے لیے جن بنیادوں کی ضرورت ہے انہیں استوار کرنا ہے۔ انہیں سب سے زیادہ امن کی ضرورت ہے امن کی حمایت میں ہندستان کے عظیم شاعر نے آج سے بیس برس پہلے جو یہ باتیں کہی تھیں ان کی پوری اہمیت ہمارے زمانے میں بھی باقی ہے جبکہ امن کے لیے دنیا کی تمام قومیں زبردست جدوجہد کر رہی ہیں۔

اپنے وطن واپس جانے کے بعد بھی ٹیگور نے سوویت یونین کی زندگی سے برابر دلچسپی قایم رکھی۔ اور وہ سامراجیت اور فاشسٹ حملہ آوروں کی عملی مخالفت کرتے رہے جب ۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں فاشسٹ قزاقوں نے سوویت یونین پر حملا کیا تو عظیم مہاتما شاعر نے جو ان دنوں بستر مرگ پر تھے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "سوویت عوام کو فاشسٹ حملا آوروں پر فتح حاصل ہوگی"۔

اپنی تصنیف میں سوویت یونین کے متعلق سچی باتیں لوگوں کو بتا کر ٹیگور نے سوویت یونین اور ہندستان کی قوموں کے درمیان دوستانا تعلقات بڑھانے کی بڑی اہم خدمت انجام دی۔ یہ تعلقات پچھلے دنوں اور بھی زیادہ وسیع اور مضبوط ہو گئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام اس عظیم ہستی کی اس زبردست خدمت کو کبھی نہ بھول سکیں گے۔

ہندستانی زبان
اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

غیر ممالک کے ثقافتی تعلقات کی انجمن کا قیام

پیکنگ میں حال ہی میں غیر ممالک کے ثقافتی تعلقات کے لیے چین کی عوامی انجمن قایم کی گئی۔

اس کا مقصد چینی عوام اور دوسرے دیسوں کے عوام کے درمیان تعلقات کو مزید بہتر بنانا اور ان کے درمیان تہذیبی تبادلے کو فروغ دینا ہے یہ انجمن چین کی دس عوامی جتھا بندیوں کے ایسا پر جن میں چین کی امن کمیٹی اور ٹریڈ یونینوں کی کل چین فیڈریشن شامل ہے۔ شتر کا طور پر قایم کی گئی۔

عوامی جتھا بندیوں کے ۱۰ سے زاید نمایندوں اور نامور ادیبوں فن کاروں، سائنس دانوں تعلیم کے ماہروں اور دوسری سربرآوردہ شخصیتوں نے ۳ رمئی کو افتتاحی جلسے میں شرکت کی کو موجو چین کی امن کمیٹی اور چین کے ادبی اور فنی حلقوں کی فیڈریشن کے چیرمین نے اس افتتاحی جلسے کی صدارت کی میٹنگ میں انجمن کے قواعد وضوابط کو منظور کیا گیا۔ اور اس انجمن کے ۱۱۶ ممبر اور ۲۹ سٹینڈنگ ممبر چنے گئے۔ جو یلونان کو چیرمین چنا گیا۔ ہنگ سی۔ لن، یانگ۔ ہان۔ شینگ اور ہنگ شین کو نائب چیرمین چنا گیا۔ او۔ چین، چنگ۔ چنگ کو انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

انجمن کے افتتاح کا اعلان کرتے ہوئے کو موجو نے کہا کہ۔ دوسرے دیسوں کے عوام کے ساتھ تہذیبی تبادلے کے سلسلے میں چین شاندار قومی روایات رکھتا ہے اور ان کو نئے چین کے وجود میں آنے پر ترقی دی گئی ہے۔

آپ نے آگے چل کر کہا کہ دوسرے دیسوں کے عوام نئے چین کو خلوص کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں۔ ۲۰ سے زاید دیسوں نے اب چین کے ساتھ دوستی کی انجمنیں اور تہذیبی رشتوں کے لیے انجمنیں قایم کی ہیں۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں اوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹-اے۔ اعظم پورہ شرقی۔ پی او۔ جوبلی حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظورا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپیے

امرداد ۱۳۶۳ف

جلد ۱۴

نمبر ۹

قیمت ایک چار آنے

جون ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	افقر موہانی	۳	
ایک سیاہ گلاب کو دیکھ کر	سید جلیل حسن جلیل بی اے (ال ال بی (علیگ) ملتان	۴	
غلط فہمی	شبنم رومانی	۵	
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	ڈاکٹر اے۔ ال ایار وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی	۶	
قطعات	پروفیسر یوسف حسین خاں	۷	
کشمیر کی ایک جھلک	ہربنس ام الگزینڈر	۸	
دو اقتباسات کے ساتھ ان تعلیم اور طلبا کا تناؤ	ب۔ ا	۹	
سوویت یونین میں تعلیم عام کے بنیادی اصول	پروفیسر ا۔ ن۔ میدنسکی	۱۰	
طرح آتش	جلیل قدوائی	۱۲	
سچی باتیں	سندر لال	۱۳	
حمام زادا	ایاز عصمی	۲۲	
غزل	حکیم سید حسین مخمور موہانی	۲۵	
امریکا کی جنگ آزادی کا ہیرو	یوسیس	۲۶	
غزل	صفی احمد (بہاری)	۲۸	
شعرا کے تخلص	فضا (جالندھری) فاضل آ	۲۹	
پیکنگ میں تعلیمی اور تہذیبی کانفرنس	چ۔ ا	۳۱	
غزل	مخضر سندیلوی	۳۲	

ہمارے خیالات

سنسکرت کو قومی زبان بنایا جائے

(قرارداد آل انڈیا سنسکرت کانفرنس)

برا کس کو مانوں بھلا کس کو جانوں یہ سب روپ میرے .....

"سنسکرت ہرگز قومی زبان نہیں بن سکتی"

(کملاپتی مصرا جنرل سکریٹری آل انڈیا سنسکرت پریشد)

حال ہی میں لکھنؤ میں آل انڈیا سنسکرت پریشد کے اجلاس ہوئے تھے اس کانفرنس میں سنسکرت کی اہمیت پر زور دیا گیا اور دھواں دار تقریروں کے بعد آخر میں یہ قرارداد پاس کی گئی کہ ــــ

"سنسکرت کو قومی زبان قرار دیا جائے"

دو روز تک کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ ان اجلاسوں میں کچھ اختلافی رنگ بھی ضرور تھا۔ جس کو آج کل کی عام اصطلاح میں "آئیرن کرٹن" میں رکھا گیا۔ جس کا ثبوت پریشد کے جنرل سکریٹری مصرا کے اس بیان سے ملتا ہے جو انہوں نے اپنی نجی پریس کانفرنس میں دیا۔

کتنے ہی اچنبھے کی بات ہے کہ ایک طرف تو سنسکرت کو قومی زبان بنانے کی قرارداد منظور کی جاتی ہے اور دوسری طرف اسی کانفرنس کے سکریٹری کا یہ کہنا کہ ــــ

"سنسکرت جنتا کی بھاشا نہ ہے اور نہ رہے گی سنسکرت ایک ایسی بھاشا ہے جو نہ بولی جاتی اور نہ سمجھی جاتی ہے اس کے پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اس لیے ایک ایسی بھاشا قومی زبان نہیں بن سکتی۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر کی قرارداد سب کی رائے کے ساتھ منظور نہیں کی گئی۔ سنسکرت کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں اختلاف ضرور تھا جس کو عمداً چھپایا گیا اور مصرا کے بیان کے بعد تو اس کا بھانڈا ہی پھوٹ گیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے!

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں پنڈت نہرو لال نے کہا ہے کہ

"بعض لوگ سنسکرت کو اس دیس کی راشٹر بھاشا بنانے کے سپنے دیکھ رہے ہیں۔ اور سنسکرت بھری ہندی کو اپنے لکشش (مقصد) تک پہنچنے کی کیول پہلی سیڑھی سمجھتے ہیں۔"

کبیر نے کہا ہے کہ "سنسکرت ہے کوپ جل بھاشا بہتا نیر" چار سو سال گذرنے کے بعد آج بھی ہم سنسکرت کو کنویں کے ٹھہرے ہوئے پانی کے برابر پا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا قومی زبان بننا ظاہر ہے۔ ہندستان کی قومی بھاشا صرف "ہندستانی" ہی ہو سکتی ہے۔

یہ صرف ہمارا ہی نعرا نہیں ہے بلکہ اس کا ثبوت آئے دن ملتا رہتا ہے۔ ہندستان کے بڑے بڑے لیڈر اپنی تقریروں میں "ہندستانی" کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جی، مہاتما گاندھی جی، مراجی دیسائی وغیرا جیسے چوٹی کے لیڈر ہر وقت اس بھاشا کی اہمیت جتاتے آئے ہیں۔ اس کے باوجود "ہندستانی" کو

حقایق و معارف

افقر موہانی

کتنا ہجوم سجدہ تھا ایک جبین پر کے تھا
سارے زمین کا ہو رہا یار کے سنگ در کے تھا

نکلے ہیں دونوں شعلے اک نالہ پر شرر کے تھا
سوز غم فراق سے دل بھی جلا جگر کے تھا

وہ بھی نہیں ہے آپ میں آپ کے بے خبر کے تھا
خوب کیا سلوک غم عشق نے چارہ گر کے تھا

ختم ہوئی نہ گفتگو آ گئی منزل طلب
ان کے حریم ناز میں پہنچا ہوں نامہ بر کے ساتھ

جس پہ تھا اپنا آشیاں حیف کہ تھا جہاں گلستاں
مجھکو بھی پھونکا برق نے باغ میں اس شجر کے تھا

شیخ حرم بنا تو ہی سجدہ کعبہ کیا کروں
میری جبیں ہے مشترک یار کے سنگ در کے تھا

فکر حیات و موت کیا پرسش حشر و نشر کیا
سیکڑوں غم ہیں اور بھی زندگی بشر کے تھا

کاٹی ہے یوں شب فراق چشم ستارہ نے
جھپکی نہیں ہے ایک پل نہ ہوئی سحر کے تھا

ایسی بھی ایک سانس تھی جاکے جو پھر نہ آسکی
مٹ گیا طول زندگی فرصت مختصر کے تھا

ارض و سما کی گردشیں اس کی نظر میں کچھ نہیں
جس کا سفینہ حیات رقص میں ہو بھنور کے تھا

شاہ ہو یا غریب یا افقر غم نصیب ہو
پہنچیں گے اس کے در پہ سب یک ہی رہگذر کے تھا

ایک سیاہ گلاب کو دیکھ کر

سید جلیل حسن جلیل
بی۔ اے۔ ال ال۔ بی (ملتان)

(اس نظم کو ان سیاہ تتلیوں، بھونروں اور ننھے ننھے شکر خوروں کے نام معنون کرتا ہوں جو اپنے پروں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹوں سے اس خون آلود گلاب کے گرد محو پرواز تھے۔ جلیل)

اے مطربۂ فطرت رنگیں کے ترانے
عنوان محبت کے طرب ریز فسانے

تو چاند سے بہتر ہے ستاروں سے حسیں ہے۔ جنت کے دلآویز نظاروں سے حسیں ہے
خوابیدۂ محبت کے اشاروں سے حسیں ہے۔ فردوس جوانی کی بہاروں سے حسیں ہے

تکتی ہے تجھے رشک سے کلیوں کی جوانی
آئینا بنی جاتی ہے پانی کی روانی

جیتا ہے فریبی محبت کے سہارے۔ حیرت سے تجھے دیکھتے رہتے ہیں ستارے
آنکھوں میں لیا لیتے ہیں فطرت کے نظارے۔ میں نے بھی تصور میں ترے عکس تارے

آباد ترے دم سے مرے دل کی شبستاں
اے ماہ جبیں ماہ صفت ماہ بداماں

اے مطربۂ فطرت رنگیں کے ترانے۔ عنوان محبت کے طرب ریز فسانے
آتی ہے صبا خذ ترے جھونکے کو جھلانے۔ ہر شب کو مسیحا ہیں تجھے خواب سہانے

بلبل نے تجھے خون جگر دے کے ہے پالا
قدرت نے تجھے حسن کے سانچے میں ہے ڈھالا

ہنگام سحر بستر راحت سے اٹھانے۔ خابوں کے سکوں بیز جزیروں سے بلانے
پیغام تجھے صبح طرب کا سنانے۔ آتی ہے نسیم سحری آپ جگانے

بھاتی ہیں نہیں جب تری من مانا ادائیں
صحن چمنستاں میں مچلتی ہیں ہوائیں

سب تجھ میں سمو دی ہیں قدرت کی نیرنگیاں۔ عکس خ رنگیں سے تشفق رنگ فضائیں
پریوں کی دلآویز دوا بانہیں۔ دیکھیں تجھے حوریں تجھے ابد تک بھلائیں

اپنے دل پر درد کی آواز سنا دوں
آ اے گل رنگیں تجھے اک بات بتا دوں

جب حسن کے جلوے تجھے تڑپا نہ سکیں گے۔ جذبات مرے خون کو گرما نہ سکیں گے
قدرت کے کھلونے تجھے بہلا نہ سکیں گے۔ یہ چاند ستارے مرے پاس آ نہ سکیں گے

ہو جائے گا جب حسن نگاہوں سے گریزاں
جب چاند نظر آئے گا اک پیکر بے جاں

رک جائے گی جب میرے جنوں کی روانی۔ پیری میں بدل جائے گی جب میری جوانی
اے زہرہ جبیں اپنے تصور کی زبانی۔ دہراؤں گا تیری اداؤں کی کہانی

بھولی ہوئی یادوں سے دل آباد کرو گی
میں تیری جوانی کو بہت یاد کرو نگا

غلط فہمی

لب خاموش میں لیتی تھی شفق انگڑائی
مرے غم خانے پہ گھر آئی تھی ساون کی گھٹا
میں نے زلفوں میں لگایا تھا جو اک رخ گلاب
اور جب اپنے پر اوراق دیئے تھرتھرا

کیوں نہ ہو ساغر گلرنگ کی بھر لی بھتیں
جب رے دوش پہ زلفوں کی لٹیں کھول بھتیں
زیر لب شدت جذبات سے کچھ بول بھتیں
شب مہتاب کی تنہائی میں لب سی لی بھتیں

خوف تھا تم کو زمانے کی غلط فہمی کا
بڑی معصوم بڑی نیک بڑی بھولی بھتیں

اور جب وقت پرستوں نے بنا وقت کا جال
لب رنگیں کے تبسم کی لپٹ سے جل کر
وقعت چند دمکتے ہوئے انگاروں نے
مرے افکار پریشاں میں لب اکر تم کو

اور جو وقت نے ضد تم سے تمہیں چھین لیا
رونے والوں نے تبسم سے تمہیں چھین لیا
مند محفل انجم سے تمہیں چھین لیا
مری غزلوں کے ترنم سے تمہیں چھین لیا

نہ محبت کو پکارا تھا نہ کچھ بولی بھتیں
شب مہتاب کی تنہائی میں لب سی لی بھتیں

اور جب ایک نئے گھر کو سدھارین کر شاعر
اور جب چاندنی پیشانی پہ جھومر کا
اور جب محفل کی ہر اک زندہ حقیقت ناہید
اور جب ایک دمکتا ہوا محمل نے تم کو
اور جب ایک مرد کی آغوش نے بخشی تسکین

گھر کی ملکہ دل سرتاج کی رانی بن کر
ایک بے داغ محبت کی نشانی بن کر
رہ گئی "آج" کی دل چسپ کہانی بن کر
لے لیا گود میں "زندان جوانی" بن کر
کھو گئیں خد میں فلو پطرۂ ثانی بن کر

اور پھر طرفا خموشی نے مجھے لوٹ لیا
اور پھر "خانا بدوشی" نے مجھے لوٹ لیا

اور پھر تم نے کہا خانا بدوشوں کو "سلام"
اور پھر تم نے کیا "ترک وطن کا شکوا"
اور پھر مجھ کو یہ دیکھ کر کہ "خفا ہوں تم سے"

تم نے سوچا کہ "چلو ایک حسیں کھیل سہی"
تم نے جانا کہ "چلو ایک بڑی بات کہی"
تم نے سمجھا کہ "یہ ہے مغدرت کج نگہی"

آج وہ راز بھی سن لو کہ جو اب تک نہ سنا
آج وہ بات بھی کہدوں کہ جو اب تک نہ کہی

میں نے مانا دل معصوم کا انکار ہو تم
غیر مشروط پرستش کی طلبگار ہو تم
یوں بھی ہو میری نگاہوں سے بہت دور مگر

غیر مشروط پرستش مجھے منظور مگر
تم کو منظور جو حالات کی تجدید نہیں
"تم کوئی اور ہو شاید" میری ناہید نہیں

شبنم رومانی

سلسلۂ نمبر (۷)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

ڈاکٹر اے۔ ال مدلیار
وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی

ہندستان کی قومی سرگرمیوں پر حکومت اور عوام کی سب سے زیادہ توجہ تعلیم کے مستقبل پر مرکوز ہے تعلیم کی موجودہ صورت حال سے بیزاری ہے اور اس میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جارہا ہے لیکن اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ موجودہ تعلیم نے ناقص ہونے کے باوجود بھی زندگی کے ہر شعبے میں مشاہیر پیدا کیے ہیں جن کی اخلاقی بلندی حب وطنی اور وطن دوستی کے طفیل ہم نے آزادی حاصل کی ہے اور جن کی بدولت ہم امن و فلاح انسانی کا پیغام دوسرے ملکوں کو پہنچا سکے ہیں۔

علاوہ اس کے اس امر کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ دنیا بھر کے تعلیم کے بنیادی اصولوں میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو تعلیم دی جاتی تھی وہ ان وقتوں کے لیے موزوں ہوتی تھی۔ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کی نا قابل قیاس ترقی نے نظام انسانی کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے لہٰذا لوگ جدید تعلیم کے متعلق اظہار خیال کرتے وقت اس امر کو بھول جاتے ہیں کہ جدت کے مسئلے کا تعلق زمانے سے نہیں بلکہ نظریے سے ہے یہ بہتر ہوگا کہ لوگ ہندستان میں تعلیم کے مستقبل کا مسئلہ اس جذبے سے حل کرنے کی کوشش کریں کہ ان میں تعلیم دینے کی بجائے تعلیم حاصل کرنے کی زیادہ خواہش ہے علاوہ اس کے ایک غلط تصور یہ بھی ہے کہ پیش نظر مقصد خواندگی ہے اور جب بچا تھوڑا بہت پڑھ لکھ جائے تو وہ اپنی صلاحیت کے مطابق تعلیم کے مزید مدارج خود ہی بہ آسانی طے کر سکتا ہے جو اقوام کے انہیں ایام میں عادات و اطوار کی تشکیل ہوتی ہے۔ تیک جذبات اور ذہن کی تشنو نما کے ساتھ ہی امنگوں اور جوش کو صحیح راہ پر ڈالا جاتا ہے اگر تعلیم کے بنیادی اور ضروری اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ امر صحیح طریقۂ تعلیم کے لیے بہت ہی مہلک ثابت ہوگا۔

میری ذاتی رائے میں تعلیم کا دوسرا درجہ سیکنڈری تعلیم ہے اور اسی تعلیم کی بدولت ملک کے جمہوری نظام کا پس منظر تشکیل پاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں نوجوان سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے رفتہ رفتہ شہری حقوق کی قدر و قیمت سے آشنا ہوتے ہیں۔ اور یہیں پر ان میں اپنی ذمے داریوں اور فرائض منصبی کا احساس پیدا ہوتا ہے بہر حال ہندستانی آئین میں ۱۴ سال کی عمر تک ہر بچے کو تعلیم دینے کے حقوق کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور مزید تعلیم کی خواہش رکھنے والوں کے لیے انتظامات کی ذمے داری لی گئی ہے لیکن اس عمر کے بچوں کے تعلیمی رجحانات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک ہی طرز کے تعلیم کے انتظامات فراہم کرنا کوئی پسندیدہ امر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تعلیم کے نصابات بھی مختلف نوعیت کے ہونے ضروری ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس ضمن میں بہت ہی کم ترقی کی گئی ہے۔

ٹکنیکل تعلیم

جدید معاشرت پر سائنس کے موثرات نے عوام کی بہتری اور بہبودی کے لیے پروجیکٹوں کی بہ کثرت تعمیر کا خیال پیدا کیا اور پانچ سالہ پلان بھی جو زرعی، صنعتی

اقتصادی تجارتی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ سائنس کے انہیں اثرات کا نتیجہ ہے لیکن ان پروجکٹوں کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے کہ زراعت، صنعت یا تجارت کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد کا فراہم ہو سکے۔ اسی سبب سے ملک کے نوجوانوں کے لیے ٹیکنیکل تعلیم کے فوری مواقع فراہم کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ علاوہ اس کے متعدد کمیشنوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ سیکنڈری تعلیم کے بعد تعلیم کے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جن کی بدولت صنعتی نظام کے لیے کارآمد عملی ہنرمندی حاصل ہو سکے۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ہر قسم کی تعلیم کے لیے اچھی لیاقت و قابلیت کے تربیت یافتہ اساتذہ اشد ضروری ہیں۔ اور جو اس پیشے سے انس و محبت رکھتے ہوں اور تعلیم دینے کی خصوصیت کے حامل ہوں۔ مختلف نوعیت کے موجودہ طرز تعلیم کی ترقی یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں صحیح طرز کے اساتذوں کے لیے کشش پیدا ہو۔ بدقسمتی سے آج انسانی صفات اور ادبیات عالیہ کی تعلیم کو بے کار اور فضول خیال کیا جاتا ہے لیکن اگر تعلیم کے بنیادی اصولوں کو درست طریقے پر ذہن نشین کر لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ نوجوان کے دل و دماغ کی نشوونما انسانی صفات اور ادبیات عالیہ کی تعلیم سے ہوتی ہے۔

آج کل یونیورسٹی کی تعلیم پر بہت کچھ چینی کیجاتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم محض سرکاری نوکری حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے لہٰذا اگر عالا تعلیم کو سرکاری نوکریوں میں بھرتی کے طریقے کی تباہ کاری سے بچانا ہے تو بھرتی کے طریقے اور نظریہ میں فوری تبدیلی کرنا اشد ضروری ہے۔

تعلیم کی ترقی اور خوش حالی کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ امر یہ ہے کہ آج کل لوگ غیر ملکی زبانوں کے ذریعے بین قومی ادب کے مطالعے کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں حالانکہ قدیم زمانے میں بین قومی یونیورسٹیوں میں لوگ بکثرت ہوتے تھے۔

آج کل عالا تعلیم کے بیمار کو سب سے بڑا خطرا تعلیم میں منافع بازی کے رجحانات کی آمد سے پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی درسگاہیں ظہور میں آ رہی ہیں جو قابل اعتراض نوعیت کے ڈپلومے اور ڈگریاں دے رہی ہیں اور حکومت نے بھی ان میں سے کئی ڈگریوں اور ڈپلوموں کو تسلیم کر لیا ہے لیکن جب تک اس قابل اعتراض عنصر کو دور نہ کیا جائے گا تعلیم کا مستقبل محفوظ نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی موزوں معیار قائم رہ سکتا ہے۔

آخر میں موصوف نے کہا کہ اس ملک میں تعلیم کا مستقبل متعلقہ اشخاص کے لیے بہت سنجیدہ اور اہم مسئلہ ہونا چاہیے آج تعلیمی جدوجہد کی ناؤ سیاسی جنگ و جدل کے بھنور میں پھنس گئی ہے لہٰذا تعلیم و انتظامی اشخاص یا جو تعلیم کے متعلق کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہوں ان کو اس مسئلے کا حقیقی حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قطعات

پروفیسر یوسف جمال انصاری ایم۔اے

۱
حسن افسردا عشق رنجیدا
تم بھی غم دیدا میں بھی غم دیدا
اتنے بل ہیں مرے مقدر میں
جتنی ہے زلف نازپیچیدا

۲
تم سے تعبیر پوچھتا ہوں میں
میں نے دیکھا سا خواب دیکھا ہے
دامن چاک چاک میں اپنے
ایک خنداں گلاب دیکھا ہے

۳
ہر فسانے میں اک حقیقت ہے
ہر حقیقت میں اک فسانا ہے
کیا کہوں اے حسین کیا نہ کہوں
ہمہ تن گوش اک زمانا ہے

کشمیر کی ایک جھلک

ہورس الگزینڈر

(کشمیر کا حسن جو کیتا کے روزگار ہے پر کیف سکون جو دل کو طمانیت پہنچاتا ہے)

جھیل ڈل میں رہا اپنی کشتی پر پہنچنے کے لیے جب سیر کار میں بیٹھتے ہیں تو یہاں دل اور دماغ پر سکون اور اطمینان کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام شہروں کے شور و غل سے پاک ہے صرف چپوؤں اور کشتی سے ٹکیلیاں کرتی ہوئی لہروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ آسمان پر تارے جگ مگ کرتے ہیں اور برف پوش پہاڑوں کے عقب سے ماہتاب چاندنی بکھیرتا ہوا بام فلک پر نمودار ہوتا ہے۔ غرض کہ ایک ایسا پر کیف منظر سامنے آ جاتا ہے جو مثل جنت ہے۔

کشتی میں لکڑی کے تختوں پر چلنے سے جو چوں چوں کی آواز آتی ہے وہ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور جب لکڑی کا مکان پانی پر تیرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک عالم خواب میں جا پہنچے ہیں۔

کشتی کے مکان کی کھڑکی سے باہر جب نظر ڈالیں گے تو رام چڑیا پرندے کبھی آپس میں لڑتے اور کبھی پیار و محبت کی حرکتیں کرتے بکثرت دکھائی دیں گے ان پرندوں کی کثرت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید کشمیری مچھلیوں کو بچانے کی غرض سے ان پرندوں کو مار کھاتے ہوں گے لیکن نہیں قدرت نے مچھلیوں کی کثرت، پرندوں کی کثرت اور آدمیوں کی کثرت کے ذریعے ایک قسم کا توازن پیدا کر دیا ہے یہاں پر ابابیلوں کے جھنڈ کے جھنڈ بجلی کے تاروں پر بیٹھے چہچہاتے اور رس بھرے نغمے الاپتے ہوئے نظر آئیں گے ہزاروں کی تعداد میں یہ پرندے وادی کا نظارہ پیدا کرتی ہے اس کے علاوہ یہاں قسم قسم کے خش نما پرندوں کی بھی کثرت ہے۔ اگر آپ لاہوں برف کی چٹانی کی کشمیر میں پرورش پاتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ کشمیر کی خش نما جھیلوں اور پہاڑوں کے مناظر سے اکثر لوگوں کا دل سیر ہو جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز کشمیر کے پہاڑ ہیں۔

پہل گام اور وادی لیدر کے گرد اگرد صنوبر اور سرو کے بلند قامت درخت کھڑے ہیں جن کی چوٹیاں آسمان سے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہ درخت ایسے عظیم الشان ہیں کہ ان کو دیکھنے کے لیے سر اٹھانا پڑتا ہے شاید قدیم زمانے کے چینی مصور ان درختوں کی تصویر کشی سے پہلے کئی برس تک ان کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہوں گے۔

پہل گام کے جنگل میں گذشتہ موسم سرما کی برفباری اور برف کے تودوں کی زد سے گرا ہوا ایک درخت دیکھا گیا جڑ کے قریب کی سطح پر تین سو دائرے پائے گئے ایک دائرہ ایک سال کی عمر کو ظاہر کرتا تھا اس حساب سے اس درخت کی عمر تین سو سال کی تھی جو زبان حال سے کہہ رہا تھا "میں یہاں تین سو سال سے ہوں مجھ پر کئی صدیوں کے موسم گذرے ہیں تو سال ہا سال قبل سے کھڑا ہوں" صنوبر کا یہ جنگل ایسا سنسان ہے کہ اس میں گھنٹوں چلنے کے بعد پرندوں کے چہچہانے یا درختوں کی ٹہنیاں گرنے کے سوا اور کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔

وادی میں سیر کرنے سے ایک دوسرا منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ تیزی سے بہتے ہوئے پانی کا شور۔ آبشاروں کا دلکش منظر اور پہاڑوں پر برف باری کے بعد چوٹیوں کی سفید پوشی اور ان پر سورج کی کرنوں کی چمک ایک عجیب

کی سیاحت کرنے جاویں گے وہ اگر فردوس روئے زمین است۔ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

دولت مشترکا کے ماہرین تعلیم اور طلبا کا تبادلہ

(۱)

حال ہی میں کیمبرج کے مقام پر دولت مشترکا کی یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کالجوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے دوران کامن ویلتھ طلبا اور ماہرین تعلیم کے تبادلے کے موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوئی۔ پانچ سال پہلے آکسفورڈ کے مقام پر یونیورسٹیوں (کی جو کانفرنس بلائی گئی تھی اس میں اس بات پر بہت زور دیا گیا تھا کہ کامن ویلتھ ممالک کے ماہرین اور طلبا کا آپس میں تبادلہ ہونا چاہیے اس کانفرنس کے فوراً بعد حکومت برطانیہ نے برٹش کونسل کو ۲۵۰۰۰ پونڈ کی رقم دی تھی تاکہ تبادلے کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔

برٹش کونسل کی اسکیم کے تحت تین قسم کے اسکالروں کے تبادلے کا انتظام کیا گیا تھا۔ پہلی قسم ان سینیر اور ممتاز اسکالروں کی تھی جو تھوڑی سی مدت کے لیے دوسرے ممالک کا دورہ کرتے تھے۔ دوسری قسم یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی تھی جو اپنی یونیورسٹیوں سے تقریباً ایک سال کی رخصت پر دوسری یونیورسٹیوں کا دورہ کرتے تھے اور تیسری قسم جونیئر اسکالروں کی تھی جو اپنے درسی پیشے کے آغاز میں ایک یا دو سال کے لیے دوسرے ممالک میں جاتے تھے۔ کیمبرج کانفرنس کی بحثوں سے ظاہر تھا کہ دوسرے کامن ویلتھ ممالک کی یونیورسٹیاں بھی اس قسم کے تبادلے کے حق میں ہیں۔ اور اس سلسلے میں متعدد ممالک میں کافی کام بھی ہو چکا ہے۔

برٹش کونسل کی اسکیم کی کانفرنس نے بہت تعریف کی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ اس اسکیم کو وسعت دی جانی چاہیے۔ کانفرنس میں ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ نوآبادیات کی یونیورسٹیوں اور باقی کامن ویلتھ ممالک کی یونیورسٹیوں کے درمیان تبادلے کا سلسلہ شروع کیا جائے اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے کہ باقی دولت مشترکا کے ممالک آپس میں بھی طلبا اور ماہرین تعلیم کا تبادلہ کریں۔

ایک دلچسپ اور زوردار بحث کے بعد کانفرنس نے یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ تمام یونیورسٹیاں اپنی اپنی حکومتوں سے اس بات کی درخواست کریں کہ تبادلے کے سلسلے کو بڑھانے کے لیے ایک مشترکا کامن ویلتھ فنڈ قائم کیا جائے۔ یہاں یہ بتانے کی خاص ضرورت نہیں کہ کانفرنس میں شامل ڈیلی گیٹوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ کامن ویلتھ ممالک اور غیر برطانوی ممالک اور خاص کر مغربی یورپ و امریکا کے درمیان بھی طلبا اور ماہرین تعلیم کا تبادلہ ہونا چاہیے۔ کانفرنس نے فنل پرانٹ اسکیم کی کامیابی کی بہت تعریف کی۔

قدیم اور نادر چیزوں کی نمائش

ملکہ الزبتھ دوم کی والدہ کے زیر سرپرستی لندن میں پرانی اور نادر چیزوں کے جو پاری مشہور میلا منعقد کر رہے ہیں۔ جس میں شاہی خاندان کے افراد کی جمع کی ہوئی بعض چیزیں بھی رکھی جائیں گی۔ اس میلے میں دنیا بھر کے پرانی اور نادر چیزوں کے شوقین شرکت کرتے ہیں۔ یہ میلا نوادر اشیا کی ایک منڈی کا کام دیتا ہے کیونکہ مانگی ہوئی بعض چیزوں کو چھوڑ کر باقی سب چیزیں قابل فروخت ہوتی ہیں۔

پروفیسر ا۔ ان بیدنسکی

سوویت یونین میں تعلیم عام کے بنیادی اصول

سوویت تعلیم کے پیش نظر مقصد انسان کی ہمہ گیر نشو و نما کی ضمانت کرنا کمیونسٹ سماج کے معماروں کی نئی نسل کو تعلیم دینا ہے سوویت اسکول ذہنی، اخلاقی، جسمانی اور جمالیاتی تعلیم دیتا ہے

پورے سوویت یونین میں سات جماعتوں تک کی تعلیم عام اور لازمی ہے تمام قوموں کے بچے سات سال کی عمر سے تعلیم شروع کرتے ہیں جو مفت دی جاتی ہے دس جماعتوں تک کی تعلیم ٹھوس طریقہ سے ترقی کر رہی ہے ۱۹۵۵ء تک (سات اور ستر برس کی عمر کے) تمام بچوں اور نوجوانوں کے لیے دس جماعتوں کی تعلیم سوویت یونین کے تمام بڑے شہروں میں عام اور لازمی قرار دیدی جائے گی اور آیندہ پانچ برس میں تمام شہروں اور دیہی بستیوں میں بھی اقدام کرنے کے لیے زمین ہموار ہو جائے گی۔

سوویت اسکول جو کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو سوویت یونین کی تمام قوموں کے بچوں کو یکساں تعلیم دیتا ہے اور طلبا کی مادری زبان ذریعہ تعلیم ہونے کی ضمانت کرتا ہے حقیقی معنی میں تمام جنتا کا عام پبلک اسکول ہے۔

سوویت یونین میں خاص رعایت یا حقوق رکھنے والے کوئی اسکول نہیں اور نہ ایسے اسکول ہی ہیں جہاں سے مزید تعلیم کے امکانات ختم ہو جاتے ہوں۔ سوویت یونین کے کسی اسکول میں داخلے پر کوئی پابندی یا رکاوٹ نہیں ہے آٹھویں، نویں اور دسویں جماعتیں سات جماعتوں تک کے اسکول کا براہ راست سلسلا ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ سوویت نظام تعلیم کا بنیادی اصول ایک متحد اور مربوط اسکول کا ہونا ہے جس کے سلسلے کی تمام کڑیوں کے درمیان براہ راست تعلق ہو۔

سوویت یونین میں اسکول قطعی لادینی ہے اور اس کو کلیسا سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

سوویت اسکول میں نئی نسل کو مکمل عام تعلیم دی جاتی ہے انسانیات، ریاضی اور مطالعہ قدرت کی بنیادی تعلیم کو پروگرام میں اہم مقام دیا جاتا ہے۔ سوویت اسکول ان کوتاہیوں سے پاک صاف ہے جو انقلاب سے پہلے کے روس کے اسکول کی خصوصیات تھیں اور بعض ملکوں میں آج بھی موجود ہیں سوویت اسکول کلاسکی مدرسہ عالیہ کے ایک طرفہ رجحان سے پاک ہے۔ جہاں لاطینی اور یونانی زبان کی تعلیم کے لیے کئی گھنٹے روزانا مخصوص ہوتے تھے اور مطالعہ قدرت کے لیے بہت کم وقت دیا جاتا تھا یا ذرا بھی وقت نہ دیا جاتا تھا۔ سوویت اسکول تنگ عملیت پسندی اور تنگ افادیتی نوعیت سے پاک ہے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے نیا دانتر ہائی اسکولوں میں بھی خامیاں پائی جاتی ہیں اور ان میں مختصر نویسی، کھاتا نویسی اور دوسرے تجارتی مضامین اور گھریلو سائنس کے لیے کئی گھنٹے وقف کیے جاتے ہیں اور عام مضامین کی تعلیم کے لیے بالکل ہی ناکافی وقت دیا جاتا ہے۔

سوویت اسکول کے نصاب تعلیم میں مادری اور روسی زبانوں ان زبانوں کے ادب اور ریاضی کی تعلیم پر سب سے زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے۔ ثانوی اسکول میں تمام گھنٹوں میں سے پچاس فی صدی سے بھی زیادہ انہیں مضامین کو دیے جاتے ہیں۔ ثانوی اسکول کے پروگرام میں مطالعہ قدرت طبیعیات اور کیمیا کو بھی اہم مقام حاصل ہے (ایک

ہزار دو سو گھنٹوں سے زیادہ) پروگرام میں مطالعہ قدرت کے لیے چھ سال (چوتھی سے نویں جماعت تک) طبیعیات کے لیے پانچ سال (چھٹی سے دسویں جماعت تک) کیمیا کے لیے چار سال (ساتویں سے دسویں جماعت تک) مقرر ہیں۔ جغرافیا اور تاریخ کی بھی بنیادی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ چھ سات سال تک برابر جاری رہتا ہے۔ پروگرام میں تیسرا اہم ترین مقام غیر ملکی زبانوں کو دیا گیا ہے (سات سو چھبیس گھنٹے)

سوویت اسکول کے پروگراموں کا اگر انقلاب سے پہلے کے روس اور غیر ملکوں کے متعلقہ اسکولوں کے پروگراموں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوویت اسکول عام مضامین پر کہیں زیادہ گھنٹے صرف کرتے ہیں اس کے وجوہ یہ ہیں (۱) سوویت اسکول میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا (۲) لاطینی کی تعلیم کا نہ ہونا (۳) سال کے دوران میں اسکولی دنوں کا زیادہ ہونا اور (۴) چھ دن کا اسکولی ہفتہ (جبکہ بعض ملکوں میں کلاسیں ہفتے میں صرف پانچ روز ہوتی ہیں۔)

مضمون کی مکمل تعلیم دینے کی غرض سے سوویت اسکول میں تربیت کے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ جماعت میں تعارفی لکچر اور سبق، گھر کا کام اور بطور خود پڑھائی، طلبا کا نقشے وغیرہ تیار کرنا، نقشوں، ماڈلوں، نمونوں، تصویروں اور ایسے ہی دوسرے بصری ذرایع کا استعمال، لیبوریٹری میں مشق اور سیر و سیاحت اپنے طور پر مطالعہ اور پڑھی ہوئی چیزوں کو دہرانے کے لیے بھی کافی وقت دیا جاتا ہے۔

سوویت اسکول کے پروگرام اور نصاب سرکاری تاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی پابندی تمام اسکولوں کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ سوویت یونین کی تمام جمہوریوں کے ہر اسکول کے لیے پروگرام اور نصاب یکساں ہوتے ہیں۔ (کبھی تھوڑا رد و بدل بھی ہوتا ہے) سات جماعتوں اور دس جماعتوں کے تمام اسکولوں کا پروگرام اور مضامین یکساں ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار ملکوں کے اسکولوں کے مقابلے میں سوویت اسکول کی ایک اور امتیازی خاصیت ہے کیونکہ سرمایہ دار ملکوں میں مختلف وضع کے اسکول ہوتے ہیں۔ جہاں مختلف قسم کے رجحانات حاوی ہوتے ہیں جس کے ایک دوسرے سے مختلف پروگرام اور نصاب ہوتے ہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ہائی اسکولوں کے طلبا محض چند مضامین بھی منتخب کر سکتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا کی معلومات اور تعلیم کا دایرا ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ سوویت علم تعلیم اور اسکول کے طلبا کی مختلف دل چسپیوں اور رجحانات کو کیسے پیش نظر رکھ سکتے ہیں بعض بچوں کو ریاضی سے زیادہ دل چسپی ہو سکتی بعض کو مطالعہ قدرت سے اور بعض کو تاریخ وغیرہ سے

اگرچہ سوویت نظام تعلیم عام کا تمام اسکولوں اور متعلقہ جماعتوں کے لیے یکساں پروگرام اور نصاب تعلیم ہوتا ہے۔ مگر غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ان تمام دل چسپیوں کی پوری طرح تسکین کی جاتی ہے۔ اسکولوں میں تنظیم کیے ہوئے مختلف حلقے بچوں کے متعدد غیر نصابی ادارے نونہالوں کے تہذیب گھر، کلب، نوجوان کمیونسٹوں، نوجوان مشاہدین قدرت وغیرہ کے مراکز۔

سرمایہ دار ملکوں کے اسکولوں کے مقابلے میں سوویت اسکول کی نمایاں امتیازی خصوصیت پولی ٹکنیکل تعلیم ہے اس کے معنی ہیں طلبا کو سادہ ترین آلات پیداوار کے استعمال کی عادت ڈالنا اور پیداوار کے اصولوں کی ابتدائی معلومات بہم پہنچانا۔۔۔ پولی ٹکنیکل تربیت کی غرض سے ریاضی طبیعیات کیمیا، مطالعہ قدرت، جغرافیا اور مکینیکل ڈرائنگ کے اساتذہ اصنعت اور زراعت میں ان علوم کے اصولوں کو کام میں لانے کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ طلبا عملی کام کی عادتیں طبیعیات کی لیبارٹری کے کارخانوں میں (لکڑی، دھاتوں وغیرہ کا کام کرکے) بصری ذرایع اور آلے تیار کرکے حاصل کرتے ہیں۔ وہ اسکول

کے میدان میں کام کرکے پھلوں کے درخت ترکاریاں اور پھولوں کے پودے لگاتے ہیں۔ بچے مختلف شوق پورے کرنے کے لیے نوعمر ٹیکنیشینوں نوعمر مشاہدین قدرت وغیرا کے حلقوں میں بڑے شوق سے شامل ہوتے ہیں۔ بجلی گھروں، فیکٹریوں کارخانوں سرکاری فارموں اور مشین و ٹریکٹر اسٹیشنوں کی سیر کے لیے بچوں کو لے جایا جاتا ہے اور وہ بڑے بڑے صنعتی کارخانوں اور فارموں سے روشناس ہوتے ہیں

وضاحت کر دینے کی غرض سے اور اس امر کے پیش نظر کہ سوویت یونین سے باہر اخبارات میں پولی ٹکنیکل تعلیم کی نوعیت اکثر غلط انداز میں پیش کی جاتی ہے یہاں یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ اس کے معنی عام مضامین کی تعلیم یا کسی ٹکنیکل علم کی مہارت کو محدود کرنا نہیں ہے کیونکہ پولی ٹکنیکل تربیت ٹکنیکی مضامین کی تعلیم کی جگہ نہیں لے لیتی بلکہ اس کے برعکس پولی ٹکنیکل تربیت عام تعلیم کو پورا کرتی اور اس کا تعلق عمل سے پیدا کرتی ہے۔ پولی ٹکنیکل تعلیم عام سائنس کی تعلیم کو محض رسمی اور محض کتابی ہونے سے محفوظ کرتی ہے۔ اور نظریاتی علم میں دلچسپی کو بڑھاتی ہے کیونکہ پولی ٹکنیکل تعلیم طلبا کو عام تعلیم کی عملی قدر و قیمت سے واضح طور پر روشناس کراتی ہے کوئی ایک پیشا ترک کرکے دوسرا اختیار کرتے اور پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے کی سہولت بہم پہنچاتی ہے اور ذہنی اور جسمانی محنت کے درمیان تفریق ختم کرنے میں مدد دیتی ہے

سوویت اسکول بچوں میں سوویت حب وطنی اپنی اشتراکی مادر وطن سے محبت اور اس کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دینے کا جذبا پیدا کرتا ہے۔ سوویت اسکول بچوں کو دوسری قوموں کا احترام کرنا اور دوستی کرنا سکھاتا ہے۔ نوآبادیاتی اور محکوم ملکوں میں عوام پر سامراجی ظلم و ستم سے غیر ملکوں میں نسلی امتیاز اور فوجی غیر مساوات سے اور دوسرے ملکوں کی خودمختاری اور خود اختیاری کو محدود کرنے کے لیے سامراجیوں کی چالوں سے سوویت طالب علموں میں غم و غصہ پیدا ہو جاتا ہے سوویت یونین کے طالب علم مظلوم قوموں کی ظالموں کے خلاف جدوجہد سے اور دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کے لاکھوں کروڑوں نیک نیت لوگوں کی امن کے لیے عظیم الشان جدوجہد سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

سوویت اسکول بچوں میں اشتراکی انسان دوستی کا جذبا محنت کش انسان سے محبت اور عزت اس کی قوت اور صلاحیتوں میں عقیدہ مستقبل کے متعلق رجائی نظریا اور یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ ساری دنیا کے محنت کش عوام کی مشترک کوششوں سے تمام قوموں کو مسرت اور امن و امان نصیب ہو جائے گا۔

طرح آتش

جلیل قدوائی
بی اے
(پاکستان)

لہر کے گھاؤ سہ رہا ہے یہ شکستہ تن ترا کیا۔ ملتی نہیں ہے حق کو مدد فریاد نا کیا
کیوں خوار جگاں دہر کے زیر جھکاؤں۔ کافی نہیں ہے اس کا مجھے آستانا کیا
کیا کیا دغا فروں کو زمانا دکھا چکا۔ اب دیکھنا ہے اور دکھائے زمانا کیا
دنیا کا ضمیر نہ بیدار کر سکی۔ چھونکے گی برق آہ مرا آشیانا کیا
کیوں راز کی طرح سے چھپاتے ہیں اہل دل۔ الفت کا فعل بھی ہے کوئی جرم نا کیا
تنکے سن یار کا بھی بھرم آج کھل گیا۔ ان پر پڑی ہے میری نظر دیکھنا کیا

شاعر بھی عشق باز بھی ہوں ہیں کوئی جلیل
لکھے گا مجھ سے بڑھ کے غزل عاشقانا کیا

سچی باتیں

سندر لال

ٹنڈن جی اور ہندستانی کلچر سوسائٹی

ٹنڈن جی کا اور ہمارا سمبندھ آج کم سے کم ۴۰ برس پرانا سمبندھ ہے یا پورشوتم داس ٹنڈن اور ہم دونوں الہ آباد لا کلاس میں پڑھتے تھے وہ دوسرے سال ایل۔ ایل۔ بی میں اور ہم پہلے سال میں۔ پھر ایک ساتھ ہوتے تھے روز ایک دوسرے سے ملنا ہوتا تھا۔ ٹنڈن جی ہم سے چار سال بڑے ہیں اس دن سے آج تک ہم دونوں میں پریم برابر بڑھتا گیا ہم انہیں ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھتے رہے اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے دل میں ان کے لیے بڑی محبت ہے بڑی عزت ہے ہمیں وشواس ہے کہ ان کے دل میں بھی ہمارے لیے اتنی ہی محبت ہے۔

راج نیتک جیون میں پردیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ پریم اور ادھک بڑھتا گیا ملنوں ہم نے مل کر کام کیا کئی باتوں میں ہمارا ان کا مت بھیڈ بھی رہا ہے۔ اور اب بھی ہے اسطرح کا مت بھیڈ کسی بھی دو بھائیوں میں ہونا ایک معمولی بات ہے لیکن اس مت بھیڈ سے ہمارے آپس کے پریم میں آج تک نہ کبھی فرق پڑا اور نہ آیندہ پڑ سکتا ہے۔

کچھ باتوں میں ٹنڈن جی میں اور ہم میں مت بھیڈ رہا ہے تو بہت سی باتوں میں ہماری ان کی رائے ہمیشا ملتی بھی رہی ہے آج بھی کئی باتوں میں جن میں ٹنڈن جی کی رائے آج کل کے سرکاری لوگوں کی رائے سے نہیں ملتی ہماری رائے ٹنڈن جی سے ملتی ہے مثال کے لیے ہمارے آدھک تو حاکم کھدر اور گاؤں کے دھندوں میں اس طرح کا وشواس نہیں رکھتے جیسا ٹنڈن جی اور ہم ٹنڈن جی اس دیش کے لاکھوں گاؤں کو زندہ رکھنے اور سکھ و لمبی بنانے کے حق میں ہیں۔ ہمارے بہت سے آج کے حاکم ان سے بن پڑے تو گاؤں کو ختم کر کے شہروں میں کھپا لینا چاہتے ہیں۔ ہماری رائے اس بارے میں پوری طرح ٹنڈن جی کی رائے سے ملتی ہے۔ ٹنڈن جی ہندی اور ہندستانی گھی کو دیش کی تندرستی اور عام لوگوں کی مالی بہبودی کے لیے ناشکر سمجھتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے حاکم اس بارے میں ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ لال گڑ کے مقابلے میں مل کی سفید چینی ترقی کی پہچان ہے۔ ان کے وہ وان سائنٹیفک انہیں بتاتے ہیں کہ ہندستانی گھی تندرستی کے لیے بہت مفید چیز ہے انہیں دیا آتی ہے ٹنڈن جی جیسے ان لوگوں پر جو گھنٹوں لا گھی اور ہندستانی گھی کی بحثوں میں بتا دیتے ہیں۔ ہم ان باتوں میں سولا آنے ٹنڈن جی کے ساتھ ہیں۔ ملوں کی سفید چینی اور ہندستانی گھی دونوں کو ہم دیش واسیوں کی تندرستی کے لیے ناشکر مانتے ہیں ہمیں اپنے ان حاکموں پر دیا آتی ہے جنہیں اپنی آنکھوں اور گلی گلی کے آپنے دن کے تجربوں پر اتنا بھروسا نہیں ہے جتنا اپنے خاص سائنٹسٹوں پر۔ ہم ان باتوں پر یورپ اور امریکا کے ان بے لاگ سائنس دانوں کی رائے سے بھی واقف ہیں جو پوری طرح ہم سے سہمت ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بھارت کی عام جنتا جس دن سچ مچ جاگے گی اور اپنے بھلے برے کو سمجھے گی اس دن ہندستانی گھی کے کارخانوں کا چلنا دیش میں ناممکن ہو جائے گا۔ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن میں ہماری رائے ٹنڈن جی کی رائے سے ملتی ہے ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ ٹنڈن جی راج نیتی کو گاندھی جی کے اپدیشوں کے انوسار شدھ سدا چار کے اصولوں پر قایم رکھنا چاہتے ہیں جیسے ہمارے آج کے بہت

حاکموں کو راج نیتی اور سدا چار کے اصولوں میں کوئی سمبندھ ہی دکھائی نہیں دیتا۔ ویشن کے ایک بہت بڑے نیتا کے جن کا نام ہم اس وقت لینا نہیں چاہتے اور جن کے دوسرے ایک گنوں کے لیے ہمارے دل میں بڑی عزت ہے ایک موقع کے یہ صاف شبد ہیں WHAT HAS POLITICS TO DO WITH MORALSI یعنی راج نیتی کا سدا چار سے کیا واسطہ؟ ٹنڈن جی اور ہم دونوں اس لگاؤ کو غلط اور نانوانتی کے لیے گھاتک مانتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہم نے کیوں یہ بتانے کے لیے کہی ہیں کہ ہمارے دل میں ٹنڈن جی کے لیے کافی پریم اور آدر ہے۔

بھاشا کا سوال ان سوالوں میں سے ہے جن میں ٹنڈن جی کی اور ہماری رائے الگ الگ ہیں۔ اس سوال پر پچھلے دنوں پارلیمنٹ کے اندر کافی گرما گرمی رہی ہم وہاں کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ پر اس بحث کے اندر ہندستانی کلچر سوسائٹی کا نام بھی لیا گیا۔ بات یہ تھی بھارت سرکار نے پچھلے دنوں ایک انگریزی ہندی کوش تیار کرنے کا کام ہندستانی کلچر سوسائٹی کو سونپا۔ اور اس کے لیے سوسائٹی کو دھن کی مدد بھی دی ہماری راشٹر بھاشا ہندی کیا اور کیسی ہونی چاہیے اس پر الگ الگ رائے ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ ویشن میں کسی بھی سوال پر الگ الگ طرح کے وچار ایک درجے تک جیون کا چنہ ہیں پر پارلیمنٹ میں اس سوال پر بولتے ہوئے ٹنڈن جی نے ہندستانی کلچر سوسائٹی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں جنہیں اخباروں میں پڑ کر ہمیں تھوڑا سا دکھ ہوا۔ کوئی اور اس طرح کی باتیں کرتا تو شاید ہم اس پر دھیان بھی نہ دیتے لیکن ٹنڈن جی کے لیے ہمارے دل میں جو جگہ ہے اس نے ہمیں یہ نوٹ لکھنے پر مجبور کیا۔ ہندستانی کلچر سوسائٹی کے بارے میں ان کے کہنے کا سار یہ بتایا جاتا ہے۔

"ہندستانی کلچر سوسائٹی کہاں اور کیا چیز ہے کسی کو نہیں معلوم۔ اس کا کہیں کوئی دفتر نہیں سنا ہے۔ کسی ذی کے رہنے کے مکان میں اس کے نام کا دفتر ہے اس سوسائٹی نے آج تک ہندی میں کوئی کتاب نہیں نکالی۔ اس کا کوئی ساہتیہ نہیں۔ اس نے کبھی کوئی جلسا یا کانفرنس نہیں کی۔ وغیرہ وغیرہ"

ٹنڈن جی جان بوجھ کر غلط بات کہنے والے آدمی نہیں ہیں۔ پھر یہ باتیں ان کے موہ سے کیسے نکلیں۔ ہم دونوں الہ آباد میں رہتے ہیں۔ اکثر ان سے ملنا ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی باتیں بھی ان سے بہت بار ہو چکی ہیں سر تیج بہادر سپرو سوسائٹی کے بانیوں میں ہے اور اس کے پہلے صدر تھے۔ ڈاکٹر تارا چند پر سوں اس کے خزانچی رہے سر سپرو ڈاکٹر تارا چند ٹنڈن جی اور ہم اکثر ملتے رہے ہیں اور طرح طرح کی باتیں بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ہندستانی کلچر سوسائٹی کی ماسک پتر کا "نیا ہند" کی بھاشا اس کے ہجوں اور اس کی پالیسی کے بارے میں خود میری ٹنڈن جی سے ایک بار بات چیت ہوئی ہے ایک بار مجھے یاد ہے وہ میری اس رائے پر بہت خوش ہوئے تھے کہ اردو لکھاوٹ میں سے ذ، ض، ظ، ث، ط، ح اور ع کو نکال دیا جائے اور ان حرفوں کی جگہ سب لفظوں میں صرف ز، س، ت، ہ اور ا سے کام لیا جائے۔ ہمارے لائق دوست عثمانیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر جعفر حسین کی بھی یہی رائے ہے ان کے لیکھ نیا ہند میں اسی طرح چھپتے بھی ہیں۔ "نیا ہند" ناگری اور اردو دونوں لکھاوٹوں میں اپنے ڈھنگ کا اکیلا پرچا ہے اور آج لگ بھگ دس برس سے برابر نکل رہا ہے "نیا ہند" کا اپنا پریس ہے اس پریس کے لیے سوسائٹی کے دفتر کے لیے اور سوسائٹی میں کام کرنے والوں کے رہنے کے لیے ہندستانی کلچر سوسائٹی نے چار الگ الگ مکان ساڑھے تین سو روپے ماہوار کرائے پر لے رکھے ہیں۔ ہندی اردو اور انگریزی میں سوسائٹی کی پچیس سے اوپر کتابیں ان دس سال میں نکل چکی ہیں جن میں سے آدھک تو ہندی میں ہیں

اور کئی کئی ایڈیشن ہو چکے ہیں۔ سوسائیٹی کی کتاب "گیتا اور قرآن" کو دونوں دھرموں کے ودوانوں نے سراہا ہے اس کے ایک حصے کا عربی ترجمہ عرب ملکوں میں بھی پسند کیا گیا ہے۔ اس سے بھگوت گیتا کے بارے میں ان کی جانکاری بڑھی ہے ہم یہاں ہندستانی کلچر سوسائیٹی کی کتابوں کا وگیان کرنے نہیں بیٹھتے۔ ہماری لگ بھگ ساری کتابوں کی ایک ہی غرض ہے وہ ہے راشٹر بھاشا کی سیوا۔ اور الگ الگ دھرموں نے لوگوں میں ایک دوسرے کے دھرموں کی جانکاری اور ایک دوسرے سے پریم پیدا کرنے کی کوشش شاید ہندستانی کلچر سوسائیٹی ملک کی اکیلی سنستھا ہے جس نے کم سے کم ایک کانفرنس میں مہتر بہنوں کے ہات سے دال روٹی پکوا کر اور انہیں سے پرسوا کر سیکڑوں اونچی جات کے ہندوؤں اور کٹر مسلمان مولویوں کو بٹھا کر ایک ساتھ بھوجن کرایا۔ ہندستانی کلچر سوسائیٹی الگ الگ مذہبوں اور الگ الگ جاتوں کے لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ شادیوں میں بھی کافی اور عملی حصا لیتی رہی ہے۔ اس سوسائیٹی کے سکھے ہوئے کام کرنے والوں میں سے پانچ اس وقت چین میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے تین پیکنگ یونیورسٹی میں چینی نوجوانوں کو ہندی پڑا رہے ہیں اور دو اسی یونیورسٹی میں چینیوں کو اردو پڑا رہے ہیں۔

سوسائیٹی کی کتابوں کا اسٹاک اس وقت بھی ایک لاکھ روپے سے اوپر کا ہے۔ سوسائیٹی کی شاخیں دیش کے کئی صوبوں اور بڑے بڑے شہروں میں اپنی شکتی کے انوسار ملی محبت کے اسی نیک کام میں لگی ہوئی ہیں۔ ابھی حال میں سوسائیٹی نے ہندستانی کلچر کے اوپر سارے بھارت سے نبندھ لکھوا کر منگوائے تھے اور اچھے نبندھوں کے لیے انعام کا اعلان کیا تھا۔ کلکتہ۔ مدراس۔ پونا۔ بمبئی۔ پٹنا امرتسر اور دور دور کے حصوں سے لوگیا وہ والوں نے نبندھ لکھ کر بھیجے جن میں سے سوسائیٹی نے دو نبندھوں پر پانچ پانچ سو روپے دو پر ڈھائی ڈھائی سو روپے اور دو پر سوا سوا سو روپے لکھنے والوں کو انعام دیا۔

ہمیں ہندستانی کلچر سوسائیٹی کا اس طرح گن گان کرتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے ہم اس گن گان کو آگے بڑھانا نہیں چاہتے۔ ہم سمجھتے ہیں ان میں سے بہت سی چیزیں ٹنڈن جی کو معلوم ہیں باقی باتیں بھی اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں اگر ٹنڈن جی پارلیمنٹ میں چرچا کرنے سے پہلے جاننا چاہتے تو انہیں بہت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ ہندی ساہتیا سمیلن کے کارناموں کے مقابلے میں ہندستانی کلچر سوسائیٹی کی یہ سب چیزیں بہت ہی کم ہیں۔ ہندی ساہتیا سمیلن کی شاندار عمارتوں کے مقابلے میں ہندستانی کلچر سوسائیٹی کے کرائے کے مکان جھونپڑی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ ساہتیا سمیلن کے پریس کے سامنے ہندستانی کلچر سوسائیٹی کا پریس ایک بہت چھوٹی چیز ہے۔ "نیا ہند" کی ہزار دو ہزار کی گاہک سنکھیا سے سمیلن پتر کا کی گاہک سنکھیا کئی کئی گنی ہوگی۔ ہندستانی کلچر سوسائیٹی کو ای امتحان بھی نہیں لینا یہ دوسری بات ہے کہ سمیلن کی کسی بات سے ہم سہمت نہ ہوں لیکن کل ملا کر ہندی ساہتیا سمیلن نے آج تک دیش کی جو سیوا کی ہے اس کی ہمارے دل میں بڑی قدر ہے۔ ہندستانی کلچر سوسائیٹی ہندی ساہتیا سمیلن کے سامنے ایک چھوٹی سی غریبانہ چیز ہے۔ لیکن ٹنڈن جی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کے چھوٹا یا غریب ہونے کی وجہ سے اسے نیچی نگاہ سے دیکھیں۔

ہندستان سرکار اور ہندی کی سنستھائیں

اپنی پارلیمنٹ کی تقریر میں ٹنڈن جی نے اور جو باتیں کہیں ان میں سے کچھ ہمیں اس سے بھی ادھک عجیب لگیں۔ کہا جاتا ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہندستان سرکار نے جب کہ ہندستانی پرچار سبھا اور دھاسبلی کیہڈمی اعظم گڑھ اور ہندستانی کلچر سوسائیٹی الہ آباد کو بڑی بڑی رقمیں دی

ہیں اس نے ہندی ساہتیا سمیلن الہ آباد اور ناگری پرچارنی سبھا بنارس جیسی ہندی کی پرانی سنستھاؤں کو کچھ نہیں دیا۔ ہم اس بات کو پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے جواب میں بتلایا اور ہم میں سے بہت سوں نے سن رکھا تھا کہ پچھلے چند سال کے اندر موجودہ ہندستان سرکار اور اس کی ایجوکیشن منسٹری ہندی ساہتیا سمیلن کو پورے پانچ لاکھ روپے گرانٹ دے چکی ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے لیے ابھی ۱۹۵۴ء کے شروع میں ہندستان سرکار کی ہندی شکشا سمتی نے جس کے ہم بھی ایک ممبر ہیں سوا لاکھ روپے کی گرانٹ کی سفارش کی ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا کی درخواست پر اس گرانٹ کی تجویز ہم نے خود سمتی میں کی تھی۔ جن سنستھاؤں کو گرانٹ دیئے جانے کی ٹنڈن جی نے شکایت کی ہے ان کی چھوٹی چھوٹی گرانٹیں اوپر کی دونوں گرانٹوں کے سامنے ایسی ہی ہیں جیسی ہندی ساہتیا سمیلن کی عمارتوں کے سامنے ہندستانی اکیڈمی سوسائٹی کے کرائے کے مکان۔

ہمیں دکھ اس ہے ٹنڈن جی کبھی بھی جان بوجھ کر غلط بات نہیں کہہ سکتے۔ نہ انہیں دیش کے کسی آدمی یا سنستھا سے دویش ہو سکتا ہے۔ وہ ایک صاف دل اور اونچے آدرشوں کے انسان ہیں۔ پر انجانے میں ہی کسی طرح غلط بیانی تو ہو گئی اور اس سے دوسروں کے ساتھ بے انصافی بھی ہو گئی اور لوگوں پر غلط اثر بھی پڑ گیا۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا۔ ہماری سمجھ میں صرف ایک بات آ سکتی ہے ہم خدا لڑسٹھ سال کی عمر میں کئی بار دکھ کے ساتھ آنو بھو کر چکے ہیں کہ کبھی کبھی ہم اپنے رات دن ساتھ رہنے والے لوگوں کے نام بھی بھول جاتے ہیں عمر کا اثر ہمارے دماغ اور خاص کر ہماری یادوں پر پڑتا ہی ہے۔ ٹنڈن جی تو ہم سے کئی برس بڑے ہیں۔ کوئی دوسرا کارن ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

اپنی تقریر میں ٹنڈن جی نے شکشا منتری مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی چھینٹے پھینکے جو بہت سے لوگوں کو اچھا نہیں لگا۔ نہ ٹنڈن جی کی شوبھا کو بڑھاتا ہوا معلوم ہوا۔ یہاں ہم ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتے۔ ہمیں معلوم ہے اور ہمیں اس کا دکھ ہے کہ دیش میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہیں مولانا ابوالکلام آزاد کا شکشا منتری ہونا کسی طرح نہیں بھاتا۔ بہت سوں کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ ہندستان کا شکشا منتری کوئی غیر ہندو ہو جیکے پہلی کی آزادی میں بڑی گنتی ہندوؤں کی ہے اس طرح کے بہت سے لوگ سیکولر راج کی کلپنا کے بھی ورودھی ہیں اور یہاں کے راج کو اسی طرح ہندو راج بنا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں جس طرح پاکستان کے بہت سے لوگ اپنے یہاں کی حکومت کو مسلم حکومت۔ پر ٹنڈن جی کو ہم ایسے لوگوں میں نہیں گنتے جہاں تک ہم جانتے ہیں دھرم مذہب کے معاملے میں ٹنڈن جی کافی آزاد خیال ہیں۔ وہ ہندو مسلم ایکتا کے وشواسی ہیں اور ہندو مسلم یا عیسائی یا سکھ سب وچاروں کے ورودھی ہیں۔ وہ دنیا کی کسی کتاب یا کسی شاستر کو نربھرانت اور سدا پرمان نہیں مانتے۔ وہ جات پات چھوا چھوت کے دشمن ہیں۔ ہندو بیاہ شادیوں میں جو سنسکرت کے منتر پڑھے جاتے ہیں ٹنڈن جی اس کے بھی خلاف ہیں۔ ٹنڈن جی کی رائے ہے کہ ہمارے سنسکاروں میں سارا کام ہندی میں یا دیسی بھاشاؤں میں ہونا چاہیے سنسکرت میں نہیں۔ ٹنڈن جی کبیر صاحب کے بھگت ہیں اور ان کے اس کہنے کو ٹھیک مانتے ہیں۔ سنسکرت ہے کوپ جل بھاشا بہتا نیر یعنی سنسکرت کنویں کا رکا ہوا پانی ہے اور بول چال کی بھاشا بہتا ہوا دریا۔ کوئی ننگ نظر سا ہندو ٹائپ ہندو مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف اس طرح کی باتیں کرتا تو

ہمیں دکھ نہ ہوتا۔ لیکن ٹنڈن جی کے موتھ سے ہمیں یہ اچھا نہیں لگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے پچھلی ایک پیڑھی کے اندر جس طرح آزادی کی تحریک میں حصالیا اور ہندو مسلم ایکتا کے لیے کام کیا جس طرح انہوں نے ڈٹ کر مسلم فرقا پرستی کا ورودھ کیا اور جس طرح اس ورودھ کے کارن انہیں لگاتار ذلتیں اور بے عزتی برداشت کرنی پڑی۔ جو قربانیاں انہوں نے کیں اور جس طرح ان سب آزمائشوں میں سے سونے کی طرح چمکتے ہوئے باہر نکلے جس طرح گہرے سنکٹ کے سمے میں ہشیاری اور اساد ھارن بردباری کے ساتھ انہوں نے کانگریس کے بھاگیہ کی حیثیت سے کانگریس کی ناؤ کو کھیا یہ چیزیں ٹنڈن جی سے چھپی نہیں ہیں۔ ہم کسی سے تلنا کرنا نہیں چاہتے پر ہمارے بڑے سے بڑے نیتاؤں میں لانے گنے ہی ہیں جو اس طرح کی پریکشاؤں میں سے نکلے ہوں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خود ٹنڈن جی کے دل میں مولانا کی بڑی عزت ہے اور انہیں مولانا سے پریم بھی ہے انہوں نے اپنی تقریر میں یہ کہا بھی تھا ہم مانتے ہیں بھارت سرکار میں بھی بہت سی کمی ہے۔ ہماری ایجوکیشن منسٹری میں بھی کئی طرح کی کمی ہیں بہت سی چیزیں جو ایجوکیشن منسٹری کو کرنی چاہیے تھیں وہ ابھی تک نہیں کر پائی شاید ان حالات میں کر بھی نہیں سکتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی ہر وچار سے ہم سہمت نہیں ہیں پر یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد ہم بڑی نمرتا کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد آج کانگریس میں اور ہندستان سرکار میں جس جگہ پر ہیں ان کا وہاں ہونا دیش کے اور باہر کے ان لوگوں کے لیے جو طرح طرح سے ہماری کمزوریاں دیکھنے اور اچھالنے کی ہی کوشش کرتے رہتے ہیں موتھ توڑ جواب ہے۔ مولانا کا اس جگہ ہونا ہمارے راج کے سیکولر راج ہونے کا زبردست اور کھلا ثبوت ہے جب تک مہاتما گاندھی زندہ رہے تب تک خاص کر اس اصول کو دھیان میں رکھتے ہوئے جس کے لیے مہاتما گاندھی نے اپنی جان دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد گاندھی جی کا بہت بڑا اور شاید سب سے بڑا سہارا رہے۔ آج مولانا آزاد کا وجود دوہارے ایک مضبوط ریشمی دھاگا ہے جو کروڑوں مسلمانوں اور کروڑوں ہندوؤں کے دلوں کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے کسی سے چھپا نہیں کہ دیش واسیوں کے ایک حصے میں جو مولانا آزاد کے سکشا منتری ہونے کے خلاف بھاونا ہے اس کی جڑ میں روپے میں پندرہ آنے سامپردائکتا ہے ٹنڈن جی سے ہم آشا کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو سمجھا بجھا کر اس غلط بھاونا کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ ہر ہار اشٹر بھاشا ہندی کو اس کی ٹھیک جگہ دلوانے کے لیے ایجوکیشن منسٹری کی کوششوں کا سوال سو یہ چاہیے تھا کہ اس پر کچھ بھی کہنے سے پہلے ٹنڈن جی ان کوششوں اور سرکاری یوجنا کو پہلے اچھی طرح معلوم کر لیتے اور پھر پریم کے ساتھ اسے زیادہ بہتر بنانے میں مدد دیتے۔

راشٹر بھاشا ہندی

اب ہم راشٹر بھاشا ہندی کے بارے میں کچھ باتیں کہہ دینا چاہتے ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ بھاشا کے سوال پر دیش میں الگ الگ وچار ہیں ایسے معاملوں میں سچائی شاید آگے چل کر کئی طرح کے وچاروں کے میل اور ان کی ٹکروں سے ہی پیدا ہوتی ہے اسی لیے ہمارے دلوں اور دماغوں میں ایک دوسرے کے وچاروں کے لیے آدر اور سہنشیلتا بھی ہونی چاہیے کٹرتا اور اسہنشیلتا نہ ہمیں کبھی سچائی تک پہنچا سکتی ہے اور نہ دیش کا بھلا کر سکتی ہے۔ ہم خدا پنے کو راشٹر بھاشا ہندی کے کچھ سیوکوں میں گنتے ہیں۔ سماچار پتروں کے لیکھوں پالیسکوں کے روپ میں ہندی لکھنا ہم نے آج سے لگ بھگ پچاس برس پہلے شروع کیا تھا۔ اور ان پچاس برس کے اندر اچھے یا برے کم سے کم ہزاروں ہی ریم کاغذ ہندی میں رنگ ڈالے ہوں گے۔ دیش کے ہندی پریمیوں نے یہاں تک کہ ہندی کے بڑے سے بڑے ودوانوں نے

سے ہمیں پر ہماری سیوا کی ذمہ بھی کی ہے۔ انہیں یاد ہو یا نہ یاد ہو ہمیں اس چیز کا ابھیمان ہے کہ خدا ہمارے بڑے بھائی ٹنڈن جی نے ہماری بھاشا اور بھاشا سیوا کو انیک بار سراہا ہے۔ ہماری راشٹر بھاشا ہندی کیا ہونی چاہیے اور اس کا روپ کیا ہونا چاہیے۔ اس پر ہمارے اپنے وچار ہیں جنہیں ہم انیک بار صاف صاف کہہ چکے ہیں یہاں ہم پھر ایک دو باتیں دہرا دینا چاہتے ہیں۔

پہلی یہ کہ ہماری بھاشا کے لیے ہندی نام پیارا ہے ان پچاس برس میں اور اپنی زندگی بھر ہم نے ہزاروں بار اسے ہندی کہا ہے اور پیار کے ساتھ کہا ہے۔ پر ہمیں ہندستانی نام بھی پیارا ہے۔ ہندی اور ہندستانی دونوں نام دونوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ ہندی اس بھاشا کے نئے عربوں کا دیا ہوا نام ہے اور عربی رنگ لیے ہوئے ہے۔ اور ہندستانی ایرانیوں کا دیا ہوا نام ہے اور فارسی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ہندستانی نام ہمارے گرو اور راشٹر پتا مہاتما گاندھی کو بہت پیارا تھا چڑھ ہمیں دونوں میں سے کسی نام سے نہیں پر جیسا ہم کہہ چکے ہندستانی نام بھی ہمیں پیارا ہے اس کا ایک اور کارن ہے ہم جس روپ میں اپنی راشٹر بھاشا کو بڑتا اور پھیلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہم ہندی اور ہندستانی کو دو بھاشائیں نہیں مانتے جو ہم لکھ رہے ہیں یہی ہماری ہندی ہے اور یہی ہماری ہندستانی۔ ہم بھاشا کے پھیلاؤ کو اوھک سے اوھک بڑا رکھنا چاہتے ہیں اسی میں ہمیں دیش کی بھلائی اور بھاشا کی اننتی دکھائی دیتی ہے۔ عام طور پر کتابی ہندی کو ہندی کہا جاتا ہے اور بول چال کی بھاشا کو ہندستانی۔ ہم اس وچار کو غلط اور ہانیکر مانتے ہیں کہ کتابی بھاشا اور بول چال کی بھاشا بلکل ایک دوسرے سے الگ الگ ہونی چاہیے اویکھے سے اویکھے ساہتیا میں بھاشا وہی ہوت بھاشا رہ سکے گی جو عام لوگوں کی بول چال کی بھاشا کے اوھک سے اوھک پاس ہو جنتا کی بھاشا سے دور بھاشا نہ راشٹر بھاشا بن سکتی ہے۔ اور نہ بہت دنوں جی سکتی ہے اسی لیے ہم ہندی اور ہندستانی کو ایک دیکھنا چاہتے ہیں ایک سمجھتے ہیں

دوسری بات ہم اپنی بھاشا کے اندر سے ایسے شبدوں کو نکالنا چاہتے ہیں سے اور کسی بھاشا سے بھی آئے ہوں عام لوگوں کی بھاشا میں رچ پچ گئے ہیں بھاشا کے ساتھ اور جنتا کے ساتھ دشمنی کرنا اور دیش کی اننتی میں روڑے اٹکانا سمجھتے ہیں۔ دنیا کی ہر بھاشا دوسری بھاشاؤں سے شبد لے لے کر اپنے کو مالا مال کرتی رہتی ہے اسی میں بھاشاؤں کی اننتی ہے اور یہی بات یونائیٹڈ کنٹری کی انیک پگڈنڈیوں میں سے ایک بڑے معرکے کی پگڈنڈی ہے مثال کے لیے انگریزی بھاشا کی انگلینڈ یا امریکا کی چھپی ہوئی کسی بھی اچھی سے اچھی ڈکشنری کو ہم اٹھا لیں اس میں دس بیس نہیں سیکڑوں نہیں شاید کئی ہزار شبد ہندستانی بھاشاؤں کے ملیں گے۔ انگریزوں نے آم اور بھات کھا کر پہلے پہل کھائے۔ آج تک وہ انہیں مینگو اور چیک فروٹ کہتے ہیں انہوں نے ان پھلوں کے لیے نئے نام نہیں گڑے یہ دونوں نام ہندستانی ہیں۔ ریل کو واشپیان یا دخانی سواری اور ٹکٹ کو پردیش پتر یا داخلا نامہ کہنے کی کوشش کو ہم دیش اور بھاشا دونوں کے ساتھ دشمنی کرنا اور نا سمجھی مانتے ہیں ایسے ہی ہزاروں اور فارسی/عربی/ترکی، چینی، مصری اور انگریزی سے آئے ہوئے شبد ہیں جو ہماری جنتا کی بولی میں رچ پچ گئے ہیں۔ اور جنہیں راشٹر بھاشا ہندی سے نکالنے کی کوشش کرنا بھاشا کی سیوا کرنا نہیں ہے۔ اسے مٹانا ہے جو اوھیا ایک ہمارے بچوں کو یہ بتلاتے رہتے ہیں کہ مزدور اردو ہے اور شرمک ہندی۔ جہالت اردو ہے اور مورکھتا ہندی اور مزدور یا جہالت لکھنے پر بھاشا کی وشودھتا کے نام پر لڑکوں کے نمبر کاٹ لیتے ہیں وہ بے چارے انجانے میں راشٹر بھاشا ہندی کی سیوا کرنے کے بجائے اسے مٹا رہے ہیں

تیسری بات یہ کہ راشٹر بھاشا ہندی کو موقع بے

موقع سنسکرت کے کٹھن شبدوں اور واکیوں سے بھرنے کی کوشش کو بھی ہم غلط اور راشٹر بھاشا کے لیے آہنکر مانتے ہیں۔ ہم یہاں ان لوگوں سے بات نہیں کر رہے ہیں جو سنسکرت ہی کو اس دیش کی راشٹر بھاشا بنانے کے سپنے دیکھ رہے ہیں اور سنسکرت بھری ہندی کو اپنے لکش تک پہنچنے کی کیول پہلی سیڑھی سمجھتے ہیں۔ ہمیں سنسکرت سے پریم ہے وہ اس دیش کی ایک پرانی بولی ہے ہمارے پرکھوں کے اوچھے سے اوچھے وچار سنسکرت گرنتھوں میں بند ہیں۔ اس میں وہ وارثستک گیان اور ادھیاتمک خزانا بھرا ہوا ہے جو دنیا کو ابھی سیکڑوں اور ہزاروں برس کام دے سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں لوگ سنسکرت پڑیں۔ اور ہم چاہیں نہ چاہیں دنیا پڑے گی۔ آج بھی افغانستان اور روس جیسے دیشوں میں اور یانیک یورپی دیشوں میں بھی سنسکرت کی پڑائی جس طرح پڑھ رہی ہے اور جتنا دھیان اس کی طرف دیا جا رہا ہے اس کا ہمیں اندازا بھی نہیں ہو سکتا پیکنگ کے شہر میں چیکوسلواکیا کے راج دوت کے ساتھ سنسکرت میں باتیں کر کے ہمیں ایسا لگا کہ جیسے کسی کنوئیں کے مینڈک کو کنوئیں سے باہر لا کر اس کی آنکھیں کھول دی جائیں۔ پر ہم دنیا کی کسی بھاشا کو کسی دوسری بھاشا سے اونچ نیچ نہیں مانتے۔ سنسکرت نہ کوئی پاک ہے اور نہ عربی سنسکرت سے زیادہ پاک اور نہ ان دونوں میں سے کوئی چینی، جاپانی، روسی، پنجابی، سندھی یا دنیا کی کسی بھی بھاشا سے زیادہ پاک ہے۔ بھاشائیں سب بھاشائیں ہیں اور ہمارے دنیا کے کام کاج کے لیے کیول سادھن مایر ہیں ہندی ایک جیوت بھاشا ہے۔ اس کے اپنے نیم ہیں۔ اپنے قاعدے ہیں اپنی گوامر ہے اپنا شبد بھنڈار ہے۔ وہ سب سے میل جول اور لین دین رکھنا چاہتی ہے۔ پر وہ کسی کی غلام نہیں بننا چاہتی اور نہ ہے اس نگاہ سے کبیر صاحب کی اس بات کو ہم پھر دہراتے ہیں۔ سنسکرت ہے کوپ جل بھاشا بہتا نیر اگر ہم چھولتے نہیں تو ٹھیک ہی وچار کہیں تلسی داس جی نے بھی پرگٹ کیا ہے۔ ڈاک خانا یا ڈاک گھر کو پیترالے کہنا۔ کلی کو بھاروا ایک کہنا انکوائری آفس کو پوچھ تاچھ دفتر نہ کہہ کو پرش نالے یا انویشن نالے کہنا ہم نہ راشٹر بھاشا کا بھلا کرنا مانتے ہیں اور نہ دیش کی سیوا۔

چالو ہندی، ہندستانی شبدوں کے دل سنسکرت و دیسوں کی طرف جلنے کے رجحان کو بھی ہم بہت دور سے غلط مانتے ہیں۔ ہمیں ایک گھٹنا یاد آ گئی۔ دلی میں ہمارے کمرے میں کچھ مٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ہمارے پرم مٹر پنڈت وشو بندھو ڈائریکٹر ویدک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور بھی تھے۔ تتسم اور تدبھو شبدوں کے اپیوگ پر بحث چل رہی تھی۔ پنڈت وشو بندھو دیر تک چپ چاپ سنتے رہے آخر میں انہوں نے بڑی شانتی کے ساتھ کہا۔ ان کے شبد ہمیں ابھی تک یاد ہیں: "جبھی سول شبدوں پر جا دگے تو بڑی کٹھنائی پڑا جائے گی۔ ویدک کے انوسار مول شبد کون دو ہی ہیں۔ انہیں سے دنیا کے سب شبد اور سب بھاشائیں نکلی ہیں۔ کتے کی بھوں اور بندر کی چی" پنڈت وشو بندھو یہ کہہ کر چپ ہو گئے اور ہم سب ہنس پڑے۔ یہ بات بڑے معرکے کی اور سچ تھی۔

جو غلطی آج راشٹر بھاشا ہندی کے حوالے پر نا سمجھ پریمی کر رہے ہیں وہی غلطی اردو والے بھی کر چکے ہیں اور اس میں سب سے بڑا گناہ شاید مولانا ابوالکلام آزاد نے ہی کیا ہے انہوں نے کسی زمانے میں اردو میں عربی کے کٹھن شبدوں اور عربی ترکیبوں سے بھرا ہوا ایک نیا اسٹائل ہی ایجاد کر دیا تھا۔ مولانا آزاد ایک بہت اونچے درجے کے ادیب ہیں یہ غلطی اس طرح کے ادیب سے اس زمانے میں قدرتی غلطی تھی۔ پر مولانا انہیں دنوں بہت جلد ہی اپنی غلطی کو محسوس کر لیا اور تب سے اب تک وہ اس کا کافی پرایشچت بھی کر چکے ہیں اس نگاہ سے ہم اردو اور ہندی کو دو بھاشائیں مانتے ہی نہیں۔ ہم مہاتما گاندھی کے اس اصول کے پوری طرح قائل ہیں کہ اردو اور ہندی دونوں کو ہماری راشٹر بھاشا میں

اس طرح مل کر ایک ہو جانا چاہیے جس طرح الہ باد کے سنگم میں گنگا اور جمنا۔

"اپنے ہندی پریمی بھائیوں سے ہماری پرارتھنا ہے کہ وہ شانتی کے ساتھ اس بات پر وچار کریں کہ کیا کارن ہے کہ جب کہ ہم ہندی کو بائیس کروڑ لوگوں کی بھاشا اور دیش کی راشٹر بھاشا کہتے ہیں تو ہندی دینک اخباروں کی بکری دوسری بھاشاؤں کی بکری سے اتنی کم ہے۔ بنگلہ۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تمل اور تیلگو کے اول درجے کی دینک اخباروں کی بکری پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک ملے گی۔ اور ہندی کے اچھے سے اچھے دینک کی بکری شاید پندرہ ہزار اردو کے اخباروں کی بکری بھی اس سے ہندی کے اخباروں سے ادھک ہے کارن صاف ہے ہماری آج کل کی کتابی یا اخباری ہندی جنتا کی بولی نہیں ہے ہم کسی تاریخ کے کسی ہندی اخبار کو اٹھالیں بھینچنے کی جگہ پرشت کرنا بامنے کی جگہ ورتن کرنا اور دیکھنے والوں کو پرشنیش درشی لکھنا راشٹر بھاشا ہندی اتنی سیوا کرنا نہیں اس کا گلا گھوٹنا ہے ہمیں اس بارے میں اپنے دلوں کو بڑا کرنا اور اپنی چال کو بدلنا ہوگا۔"

سنسکرت کے شد اور تتسم شد بھی جو ہماری بولی میں رچ پچ گئے ہیں یا جو نئے سنسکرت شد ہمارے لیے آسان اور اپیوگی ہوں ان کا راشٹر بھاشا ہندی میں سواگت کرنے کے لیے ہم دل سے تیار ہیں پر اس بارے میں بھی کئی طرح کے غلط وچار ہندی پریمیوں میں پھیلے ہوئے ہیں اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندی کو دوسری بھاشاؤں کے ادھک شبدت لانے کے لیے اس میں ادھک سنسکرت شبدوں کا لینا تو ٹھیک ہے یہ بات اگر بالکل غلط نہیں تو آدھی سے زیادہ غلط ضرور ہے۔ ایک تو بہت سی دوسری بھاشاؤں میں سنسکرت کے جو شد چالو ہیں وہ ادھک تر تتسم روپ میں نہیں تدبھو روپ میں ہیں۔ شری راج گوپال چاری کو آپ راج گوپالا چاریا کہنے لگیں گے تو وہ آپ سے لڑ پڑیں گے۔ دوسرے اردو فارسی اور ہزاروں شد ایسے ہیں جنہیں ہندی سے آج کل نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے اور جو تامل اور تیلیگو جیسی دور کی بھاشاؤں میں بھی اسی روپ میں یا اس سے ملتے جلتے روپ میں اور ارتھوں میں چالو ہیں۔ اس طرح کچھ شبدوں کی فہرست ہم دوسری جگہ دے رہے ہیں۔ ہم نے مدراس پرانت کے دہر دکھن تک لگ بھگ ہر ضلع کا دورا کیا ہے اور ہم پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کے عام لوگوں میں ہماری ملی جلی بولی جتنی اچھی طرح اور آسانی سے سمجھی جاتی ہے اتنی آج کل کی سنسکرت بھری ہندی نہیں سمجھی جاتی۔

ہماری اپیل

انت میں ہم اپنے پیارے اور آدرنیا بھائی ٹنڈن جی سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ راشٹر بھاشا ہندی کے ہٹ میں ان غلط اور کٹر پرورتیوں کو روکیں۔ ہندی کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیں۔ اردو ہندی کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے لگ بھگ سارے اردو ساہتیا کو ہندی ساہتیا مان لیں اسے ناگری لپی میں چھپوا کر ہماری اسکولی اور کالجی کتابوں میں شامل کرا دیں۔ غالب نے اپنی بول کو ہندی کہا ہے ہم بھی ان کی بولی کو ہندی اور اچھی ہندی مانیں۔ اور اسے ویسے ہی اپنا دیں جیسے پریم یا بھارتیندو کی بھاشا کو بھارت کی دوسری بھاشاؤں کو ان سب شبدوں کو جو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہندی میں آسانی سے کھپ سکتے ہیں۔ کھپا لیں اس طرح راشٹر بھاشا ہندی کو ہم بھارت کی ساری بھاشاؤں کا سنگم بنالیں ہمیں وشواس ہے کہ ہندی کے معاملے میں دیش اگر مہاتما گاندھی کی بنیادی باتوں کو مان لیا ہوتا نام پہلے ہی ہندی

ہی رہتا تو ہندی کا جو دوہ دیش کے کئی حصوں میں ہوا اس کا ایک حصا بھی نہ ہوتا اور انگریزی کو شاید یہ پندرا برس بھی نہ ملے ہوتے اب بھی ہمارے لیے رستا وہی ہے۔

بھاشا کے معاملے میں چین کی مثال بھی ہمارے لیے کام کی ہو سکتی ہے۔ وہاں بھی الگ الگ بھاشائیں ہیں۔ ڈاکٹر سن یات سین نے پرانت پرانت کے بیچ کام کے لیے ایک راشٹر بھاشا کی ضرورت محسوس کی۔ پیکنگ اور اس کے آس پاس کی بولی پر اس کی بنیاد ڈالی گئی۔ بڑے بڑے وودوانوں کی کمیٹیاں بنیں۔ انہوں نے بڑی بڑی ڈکشنریاں بنائیں اور گرامریں لکھیں۔ نئی راشٹر بھاشا کو سب پرانتوں کے اپنانے یوگیا بنانے کی کوشش کی گئی۔ پر وہ بھاشا اس قابل بھی نہ بنی کہ اس کی کتابیں دس دس ہزار بھی بک سکیں۔ اس کی حالت اس بچے کی سی ہوئی جو ماں کے پیٹ سے مرا ہوا پیدا ہوا ہو۔ ایک پیڑھی یوں ہی گذر گئی۔ دیش میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ آخر جنتا کے سچے سیوکوں اور بادستے تنگ کا بول بالا ہوا۔ انہوں نے وہ سب ڈکشنریاں اور گرامریں پھاڑ کر پھینک دیں۔ اور لگ بھگ سب پرانتوں کی بھاشاؤں سے آسان اور ملتی جلتی چیزیں لے کر وہ راشٹر بھاشا بنالی۔ اور ایک سال کے اندر بنالی جس کا ڈھانچا تو ابھی تک پیکنگ کے آس پاس کی بولی ہی ہے پر جس میں لکھی ہوئی کتابیں آج دس دس بیس بیس لاکھ کی گنتی میں چھپتی اور بکتی ہیں اور جنہیں کسی پرانت کے بھی ان پڑھ چینیوں کے سامنے پڑھ کر سنا و تو ایک بچا بھی سمجھ لے گا۔

بھارت کی راشٹر بھاشا وہی بھاشا ہوگی جو ہر طرح کی ہٹ دھرمی کو ترنا اور تنگ نظری سے اوپر ہوگی اور جو پوری طرح جنتا کی بھاشا کو اپنائے ہوئے جنتا ہی کی بھاشا ہوگی۔ آخر میں ہم ایک ہندی اخبار سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد کے کچھ سال پہلے کے ان شبدوں سے اس نوٹ کو ختم کرتے ہیں۔

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی ہی مایوسی (نراشا) ہوئی کہ ایک طرف سے لے کر دوسری طرف تک ہر طرف تنگ خیالی چھائی ہوئی ہے۔ تنگ خیالی آپ سمجھیں (نیرو مائینڈڈنس) دماغ کا چھوٹا اور سمٹا ہوا ہونا اور ہر طرح کے پھیلاؤ اور اونچائی سے انکار کرنا۔ میں آپ سے کہوں تو کیا ہم ایسا تنگ دماغ لے کر بڑی قوم نہیں ہو سکتے۔ ہندستان کی قدیمی بڑائی اور ترقی کو اسی تنگ خیالی نے تاریکی (اندھکار) میں ڈال دیا تھا۔ اور یہ بڑی ہی خطرناک بات ہے کہ ہم پھر اسی طرف جھک رہے ہیں۔"

ہم پچاس برس سے اپنے پیارے دیس کی نبض کو دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں وشواس ہے کہ وہ تنگ خیالی جس کی مولانا شکایت کرتے ہیں۔ شام کی اڑتی ہوئی دھوپ کی طرح جا رہی ہے۔ دیش آگے بڑھے گا۔ ہندی بھی بڑھے گی کیوں بھارت میں نہیں دنیا میں ہندی اپنی جگہ لے گی ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ٹنڈن جی اگر ایک بار ارادہ کر لیں تو اس نیک اور ضروری کام میں جتنی مدد وہ دے سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ (نیا ہند سے شکریے کے ساتھ)

سب رس

ماہ نامہ

ادارہ ادبیات اردو کا ماہی اور جون کا شمارہ کانفرنس نمبر ہوگا

حیدرآباد کی اس کانفرنس میں اردو کے جن مشاہیر شعرا اور ادیبوں نے شرکت فرمائی ان کے وہ خطبات، تقاریر اور مقالے جو کانفرنس میں پڑھے گئے انہیں سب رس آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے کانفرنس کے سلسلے میں جو مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا اس کی کامیاب نقلیں بھی زینت رسالا کی جا رہی ہیں اس شمارہ کی ضخامت دو سو صفحات سے زیادہ ہی رہے گی۔ قیمت تین روپے ہوگی لیکن متقل خریداروں سے علیحدہ قیمت نہیں لی جائے گی رسالے کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔

پتہ۔ ماہ نامہ سب رس، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن

حرام زادا

ایاز عصمی

(موپاساں کے ایک افسانے کا آزاد ترجمہ)

اس نے اپنی ناتوانی اور بے چارگی کے علاوہ اپنے دن بھی دیکھے تھے۔ بندرا برس کی عمر میں دار و اگیل کے پاس والی سڑک پر ایک گاڑی سے اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں اس وقت سے وہ سڑک پر بھیک مانگ رہا تھا۔ جب وہ اپنی بے ساکھی کے سہارے چلتا تو اس کے کندھے کانوں کے برابر آجاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا سر دو پہاڑ کی وادیوں کے درمیان ڈوب گیا ہے۔

بچپن میں اس نامراد کو بلیٹس کے پادری نے ایک کھائی میں پڑا پایا تھا۔ اور پھر بعد میں مسیحیت کے مقدس آب سے پاک کیا ساری ہدایات سے بے نیاز دوسرے کی مہربانی اور بخشش پر اس کی پرورش ہوتی رہی جب گاؤں کا نائب کسی مضحکہ خیز قصے کہنے کے صلے میں اسے برانڈی کے کئی گلاس پلا دیتا تو نشہ سے سرشار ہو کر لڑکھڑاتا پھرتا اور اس کی زندگی کا جزو بن گئی۔ بس اپاہج بنا بیٹھا رہتا دوسروں کا دست نگر۔

پہلے ڈی ایلوری نے اسے ڈربے کے بیلو والے سگ خانے میں جگہ دی اور یہ اسی سگ خانے میں محل سے منفصل کھیت کے قریب سو جاتا۔ جب سے بھوک لگتی تو مطبخ میں روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے اور کچ شراب مل جاتی۔ کبھی کبھی ڈی ایلوری اسے اپنے مکہ خاص کے روزن یا زینے سے پھینک کر چند سکے بھی دیدیتی لیکن وائے تمہن کہ اب تو وہ بھی مر چکی تھی۔

گاؤں کے لوگ اسے مشکل ہی سے کچھ دیتے وہ تو لوگ اسے پچھلے چالیس سالوں سے اچھی طرح جانتے تھے ہمیشا اسی حالت میں دیکھا تھا وہ انہیں تین چار جانے ہوئے گاؤں میں گھوم گھوم کر بھیک مانگتا۔ وہ نئے پن کا عادی نہ تھا اسی لیے باوجود اپنی تمام کوششوں کے دل سے مجبور ہو کر سرحد پار کسی نئے گاؤں میں نہ جا سکا۔ اس کی نگاہیں سرحدی درختوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتی تھیں۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ آیا اس سرحد کے پار بھی دنیا بستی ہے یا نہیں۔ جب کسان اسے کھیتوں میں یا میدانوں پر چلتے دیکھتے تو چیخ کر کہتے کہ:۔

"یہاں کی بجائے کسی دوسرے گاؤں میں کیوں نہیں جاتے" وہ لاجواب ہو جاتا اور اپنی بے ساکھی کے سہارے ایک خوف مبہم خوف اژدہا نے چہروں کے نئے لگنے والے چہروں کو مشکوک اور شبہ ناک نگاہوں کے خوف کے زیر اثر گھٹتا ہوا آگے بڑھ جاتا جب وہ شارع عام پر جوڑی بنا کر چلنے والے پولیس مین کو دیکھتا تو مارے خوف کے پتھروں کے انبار کے پیچھے یا جھاڑیوں میں چھپ جاتا۔

پولیس کو دیکھ کر وہ غیر معمولی سرعت سے لپکنے لگتا۔ جیسے کوئی جنگلی جانور تیزی سے اپنے غار کی طرف بھاگا جا رہا ہو۔ وہ اپنے کو بے سہارا چھوڑ دیتا اور گھٹنوں پر خرگوش کی مانند لڑکتا ہوا نشیب کی طرف نظر سے اوجھل ہو کر ایک خفیر سا "دھبا" بن جاتا۔ اس کے جسم سے لپٹے ہوئے چیتھڑے اور بھی گرد آلود ہو جاتے ان پولیس کے آدمیوں سے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی تھی۔ پھر بھی اس پر ایک ناقابل بیان خوف طاری رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ خوف اسے نادیدہ باپ سے ورثے میں ملا تھا۔

اس دنیا میں اسے پناہ گیری کے لیے کوئی سہارا

نہ تھا۔ گرمیوں میں جہاں پاتا سو رہتا اور جاڑے میں اپنی انتہائی چالاکی و پرکاری سے کام لے کر پیال پر یا اصطبل میں دبک رہتا۔ اور صبح سویرے چپکے سے دوسروں کی نظروں سے بچ کر نکل آتا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے اور اسی لیے شاید وہ مکانات کے تمام درستوں سے اچھی طرح واقف تھا جس میں وہ آسانی گھس کر پناہ لے سکتا جب وہ بچ کھانے کی چیزیں اکٹھی کر لیتا تو اپنی حیرت انگیز صلاحیت سے کام لے کر پیال میں اپنی بیساکھی کی مدد سے دو ستونی خول بنا لیتا پھر اپنی ناتواں و نزار کاایوں کے سہارے رینگ کر اندر داخل بیٹھتا۔ اور اسی طرح چار پانچ دنوں بغیر کسی جنبش و حرکت کے اسی خول میں پڑا رہتا انسان کو پناہ کی کتنی ہی ضرورت ہے۔

بغیر کسی انسانی محبت اور پیار کے جانے ہوئے وہ اسی طرح انسانوں کے گرد حیوانوں کی مانند زندگی بسر کر رہا تھا کسان اسے حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ لوگ اسے "گھنٹا مہاراجا" کہہ کر پکارتے تھے اس لیے کہ وہ اپنی بیساکھی کے سہارے ایک لٹکتے ہوئے پنڈولم کی مانند گھنٹی دینا یا خدا انسان سے بھی کتنا نہیں واقع ہوا ہے۔

دو دنوں سے کسی نے اسے کچھ دیا تھا نہ اس نے کچھ کھایا ہی تھا۔ اب لوگوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اسے آتے دیکھ کر کسان دور ہی سے چلا کر کہتے۔

"یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی تین دن ہوئے کہ تمہیں روٹی کا ایک ٹکڑا دے چکا ہوں۔" اپنی بیساکھی کے سہارے وہ جلد ہی پھر دوسرے دروازے پر پلٹ جاتا اور وہاں سے ولیا ہی دو ٹوک جواب پاتا دل کو برا دینے والا سوہاتی جواب اور عورتیں احتجاج کہتیں۔

"کوئی برسوں آواروں اور نکموں کی کفالت نہیں کر سکتا" لیکن آواروں کو بھی بہر حال بھوک لگتی ہے۔ غذا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ سینٹ ہلیر وا روایل اور بلیٹس گاؤں میں اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر سوالی کرتا رہا لیکن کنجوس کی جھولی اور غریب کا پیٹ ہمیشہ خالی رہتا ہے اس کی جھولی میں دھیلا نہ ٹیکا تو پیٹ کہاں سے بھرتا۔ اب اس کی امیدوں کا مرکز صرف لوڑ تولس رہ گیا تھا لیکن لوڑ تولس پہنچنے کے لیے چھ میل کا جانکاہ سفر طے کرنا پڑتا۔ اور یہاں جیب اور پیٹ دونوں خالی تھے۔

مجبوری اور ضرورت جو بھی کرا دے کم ہے اس نے بھی کر ہمت کس کر اپنے کو لوڑ تولس کی سڑک پر ڈال دیا۔

دسمبر کا مہینہ تھا اس کے سارے جسم میں برف کی سوئیاں رینگ رہی تھیں اور برفانی ہوائیں کھلے ہوئے کھیتوں سے لپٹی ہوئی ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخوں سے ٹکرا کر عجیب اور وحشیانہ آوازیں پیدا کر رہی تھیں آکاش پر بادل کے ٹکڑے ایک نامعلوم انجانی منزل کی اور سے تیرتے چلے جا رہے تھے۔ اور زمین پر بے بس بھوک سے نڈھال لنگڑا اپنے کو تولتا ہوا چیتھڑوں سے بندھی ہوئی چوبی ٹانگوں اور بیساکھی کے سہارے تھکن سے چور بڑھتا چلا جا رہا تھا آہستہ آہستہ جیسے زندگی کی ساری گرانبار اس کی چوبی ٹانگوں میں آکر سمٹ گئی ہو۔

گھڑی گھڑی کھائی کے کنارے بیٹھ کر وہ ستانے لگتا۔ بھوک کے باعث اسے ایک عظیم ناقابل برداشت روحانی اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے تخیل میں روٹی ہی روٹی بسی ہوئی تھی۔ اور بس۔ لیکن روٹی حاصل کرنے کی اسے کوئی سبیل نہ دکھتی تھی۔

تین گھنٹوں کی جانگزارہ نوردی کے بعد گاؤں کے سرحدی درختوں کو دیکھ کر اس نے اپنی رفتار تیز کر دی جیسے صبح کا بھولا شام کو جلد سے جلد لوٹا جا رہا ہو۔

دست سوال دراز کرنے پر پہلے ہی کسان نے ایک اہانت آمیز طریقہ پر اسے جواب دیدیا۔

"تم پھر پہنچ گئے دشمن جان۔ خدا معلوم کب ہم لوگوں

کو تم سے رستگاری ملے گی۔" اور بے چارا لنگڑا کھسیٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ دربدر ٹھوکریں کھاتا رہا۔ لیکن بے سود وہ ایسی شامت زدگی اور استقلال سے امیدوں کے سہرے جالے بنتا رہا۔ لیکن بے سود۔

تب اس نے کھیتوں اور کھلیانوں کا رخ کیا بارش کی وجہ سے سیلی کچی زمین میں اس کی بیساکھی دھنس دھنس جاتی اور وہ مشکلوں سے نکالتا اور بڑھتا رہا۔ لیکن ہر جگہ ڈانٹ اور پھٹکار کے سوا کچھ نہ ملا۔ کڑاکے کی سرد ہوا دلوں میں سیرات کر جانے والی سردی پڑ رہی تھی۔ دماغ منجمد اور روح بوجھل ہو رہی تھی ایسی زبردست ٹھنڈک میں کچھ دینے کے لیے مٹھی بھی کھولنا کتنا دشوار تھا۔

تمام دیر آشنا مکانوں اور دروازوں کی ٹھوکروں کے بعد نڈھال ہو کر وہ چیکٹ کے کھیت کے ملحق کھائی کے پاس بیٹھ رہا۔ اس نے اپنے جسم کے گرد کی تمام گرہوں کو کھول دیا۔ اور بیساکھی اپنے دونوں جانب زمین پر رکھ دی۔ وہ اسی طرح کافی دیر تک بھوک کی شدت اور کربناکی سے بے حس و حرکت بت بنا بیٹھا رہا۔ اس کی بے پناہ صعوبتوں کا اندازہ لگانا بھی کتنا مضحکہ خیز تھا۔

وہ اسی طرح انسانی دلوں میں بسی ہوئی سوہوم امید کے سہارے کسی آسمانی معجزے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہم کبھی حقیقت میں مبدل نہیں ہوتا۔ اور اعجاز کا زمانا بھی گذر چکا تھا تو معجزہ نما کیا۔

معاً کالی مرغیوں کی ایک ٹولی اس کے پاس سے ننھے ننھے غرمرئی کیڑوں کو ٹھونگتی گذر گئی۔ اسی طرح یقینی طور پر کیڑے تلاش کرتی اور ٹھونگتی ہیں ولنگڑا تھوڑی دیر تک خالی الذہن ہو کر ان مرغیوں کو دیکھتا رہا۔ اور پھر اس کے دماغ نہیں اس کے پیٹ میں ایک خیال ایک لہر سی دوڑ گئی کہ اگر ان مرغیوں کو سوکھی لکڑی کی آگ پر بھونا جائے تو اچھی غذا میسر ہو جائے چور کی کا ایک مبہم سا لمحاتی خیال اس کے ذہن میں آیا اور پھر محو ہو گیا اس نے پاس ہی پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھایا اور پھر اپنی جانب آتی ہوئی مرغی کو پوری نشانہ بازی سے کام لے کر صاف مار ڈالا ایک مرغی پھڑ پھڑا کر وہیں ڈھیر ہو گئی اور دوسری مرغیاں کٹکٹاتی ہوئی فرار ہو گئیں۔ اور پھر لنگڑا بیساکھی کے سہارے ان مرغیوں کے تعاقب میں ان کے پیچھے لپکا لیکن وہ سب تو بھاگ بھی گئیں۔

جب وہ اس بے جان خون آلود مرغی کے قریب پہنچا تو اسے پیچھے سے ایک زوردار دھکا لگا۔ اور وہ اپنی بیساکھی سے دس قدم ——— پرے چاروں شانے چت گر پڑا۔ اور پھر غصے میں بھوت چیکٹ نے پاگلوں کی طرح گھونسوں اور مکوں کی بارش شروع کر دی جیسے کوئی لٹا ہوا کسان اپنا سر پیٹ رہا ہو۔ آس پاس کے کسان بھی جمع ہو گئے۔ ایک تو بارش دوسرے اولا سبھوں نے مل کر بے چارے کی درگت بنا دی۔ جب سب پیٹتے پیٹتے تھک گئے تو اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ اور پولیس میں خبر کرنے چلے گئے

اور بھوک سے نڈھال ادھ موا خون سے لت پت لنگڑا بے حس و حرکت زمین پر پڑا رہا۔ شام آئی رات گذر گئی اور پھر دوسرے صبح مشرقی افق پر آسمان کا سینہ چاک ہوا۔ اور بچارا لنگڑا اسی طرح زمین پر پڑا رہا۔ دانے دانے کو ترستا رہا۔

جھوٹ کی معجز نمائیاں بھی عجیب حیرت انگیز ہیں۔ چیکٹ نے تھانے میں یہ رپورٹ لکھوائی کہ اس پر ڈاکوؤں نے حملا کیا تھا۔ اور اس نے مقابلا کر کے ایک کو پکڑ لیا ہے۔ اور اس ڈاکوؤں کے اچانک حملا آور ہو جانے کے خوف سے چپکے چپکے دوپہر کو پولیس کوٹھری میں داخل ہوئی اور پھر پولیس کی مخصوص دشنام طرازی اور کرخت آواز سے لیکن لنگڑے کو زمین پر پڑا پا کر پولیس غرائی۔

"اب اٹھتا بھی ہے کہ نہیں حرام زادے"

اور پھر پولیس کی مخصوص دشنام طرازی اور کرخت

آواز سے کوٹھری کی دیواریں جھنجھنا اٹھیں۔ جیسے در و دیوار سے "اٹھ حرامزادے" کی آواز بلند ہو رہی ہو۔

لنگڑا اپنی ساری کوششوں کے باوجود ذرا سا ہل بھی نہ سکا۔ اور ان لوگوں نے لنگڑے کی اس چال کو کسی آئندہ "حرمزدگی" کا پیش خیمہ سمجھ کر اس کو زور زور سے زمین پر گھسیٹتے ہوئے بیساکھی کے سہارے کھڑا کر دیا۔

اور پھر مارے خوف کے "حرامزادا" کانپ کانپ اٹھا جیسے چوہا بلی سے اور کوئی معصوم چڑیا صیاد سے بعد میں وہ کسی فوق البشری قوت و محنت سے کھڑا رہنے میں کامیاب ہو گیا "چل حرامزادے" اور پھر پولیس والوں کی ماں بہن کی "اخلاقی گردان" شروع ہو گئی۔

کھیت کے تمام کمیئے (مزدوری پر کام کرنے والے) اور کسان اسے گھیرے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے عورتیں گھونسا دکھا رہی تھیں تو مردوں کی غراہٹ اور تحقیر آمیز قہقہے فضا میں بلند ہو کر کہیں گم ہو جاتے آخر ان کسانوں کو چھٹکارا مل ہی گیا۔

وہ اسی طرح پولیس کے دو محافظوں کے درمیان چلتا رہا آج اس میں غیر معمولی طاقت آ گئی تھی۔ اسی لیے شام تک وہ ان دونوں محافظوں سے قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔ اس نے سمجھنے کی کافی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ آخر سبب کیا ہوا۔ اور کیا ہو رہا ہے۔

"راہ ہی ڈاکو ہے ـــــ ذلیل ـــ حرامزادے کتا"

جب پکی رات بھیگ آئی تو یہ لوگ ضلع کے خاص شہر میں پہنچے اس نے اس شہر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا تھا کہ کیا ہو رہا اور کیا ہونے والا ہے۔ اسے انجانی چیزوں نے چہروں اور کبھی کے نہ دیکھے ہوئے مکانوں سے ایک نامعلوم خوف محسوس ہو رہا تھا۔

جب پولیس والوں نے اس سے سوال کیا تو وہ کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ آخر ما جرا کیا ہے زمانے سے وہ صرف گداگری کے فقروں کے کوئی دو سہ الفاظ بھی سمجھ نہ کر پایا تھا اور اس لیے بھی اس کے خیالات شرمندہ الفاظ و اظہار نہ بن سکے ـــــ

اور پھر اسے ایک تنگ و تاریک کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا کسی نے بھی یہ محسوس نہ کیا کہ وہ حرامزادا ابھی تو بھوکا ہے

جب دوسرے دن افسران بالا دست تفصیلات اور مزید باز پرس کے لیے آئے تو ان لوگوں کے تحیر کی کوئی حد و انتہا نہ تھی کہ اس کا پیکر خاکی ہنس ہنس کر ان کا جواب دے رہا تھا۔

غزل

حکیم سید حسین محشر سوہانی

یہ چاندنی کا منظر پر کیف یہ فضائیں
اب تک نہ آنے والے ایسے میں کاش آئیں
ان کی نظر سے دل کو کس طرح ہم بچائیں
آنکھوں کی راہ دل میں تو بار جو سمائیں
تم جان آرزو ہو، ہم آرزو مجسم
تم سے نہ ملنے آئیں پھر کس سے ملنے جائیں
اہل جنوں کو صدمے جائیں گے جب ہی تڑپاں
دیوانوں کو وہ اپنے خدہ ڑیاں پہنائیں
ہمت کا ہے تقاضا یہ اہل گلستاں سے
اک آشیاں جلا ہے تو آشیاں بنائیں
ہوتی ہے دل کو تسکیں نقش قدم سے تیرے
یارب وہ روز تربت میری مٹانے آئیں
دنیا کی وہ بھی باتیں، یہ باز پرس محشر
دنیا کی زندگی کو ہم اب کہاں سے لائیں

امریکا کی جنگ آزادی کا ہیرو

یو یس

امریکا کو دوسروں کی غلامی سے نجات دلانے جنگ آزادی میں فتح و نصرت سے ہمکنار کرانے اور جمہوری حکومت کو پائیدار بنیاد پر قایم کرنے اور سب سے پہلا صدر بننے کا فخر جارج واشنگٹن کو حاصل تھا۔ ہر سال ۲۲ فروری کو امریکا بھر میں اور امریکا کے تمام سفارت خانوں میں واشنگٹن کی سالگرہ بڑی شان سے منائی جاتی ہے۔ ذیل میں اس عظیم ہستی کی زندگی کا کچھ حال درج ہے۔

جارج واشنگٹن کو نئی دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں میں سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس وقت کے گھٹنوں کے بل چلنے والے ننھے نوخیز امریکا کی انہوں نے قیادت کی۔ اور جس طرح ہندستان میں گاندھی جی کو باپو (راشٹر پتا) کے نام سے پکارا جاتا ہے اسی احترام کے ساتھ واشنگٹن کو امریکا کا باپو کہا جاتا ہے۔ ان کی سالگرہ ہر سال ۲۲ فروری کو امریکا بھر میں منائی جاتی ہے اگرچہ آپ جنگجو یا آتش مزاج باغی نہیں تھے لیکن آپ نے ۱۷۷۶ء میں بے سروسامان اور غیر تربیت یافتہ اہل ملک کے بلاوے پر برطانیا میں اپنی کھیتی باڑی کے پرامن کام کو ترک کیا اور جنگ آزادی میں شامل ہو گئے۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

واشنگٹن ویسٹ مورلینڈ ورجینیا میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے لڑکپن کا زمانا اپنے باپ کے تمباکو کے کھیتوں میں بسر کیا۔ ۱۶ برس کی عمر میں آپ ایک سرویٹر (آفیسر پیمایش) بن گئے۔ اور کالونی اور فرانسیسی نوآبادیوں کی درمیانی سرحد کی پیمایش کی۔ ۲۱ برس کی عمر میں آپ کو کالونی کی حفاظت کے لیے ورجینیا کی ملیشیا (فوج) کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ ان دنوں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ ہو ہی تھی چونکہ انہیں سرحدی علاقے سے واقفیت تھی اس لیے ان سے کہا گیا کہ وہ برطانوی فوجی مہم کی ایک لق و دق علاقے میں امداد کریں۔

فوجی لیڈر

جب اس علاقے میں برطانوی فوج پر حملا ہوا اور اس کا کمانڈر ہلاک ہو گیا تو واشنگٹن نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور باقی فوج کو بچا لیا اس طرح ایک فوجی کمانڈر کی حیثیت سے آپ کی شہرت نزدیک اور دور پھیل گئی۔ اور جب فرانسیسیوں کو شکست ہو گئی تو واشنگٹن پھر اپنے فارم پر چلا گئے۔

برطانیا کی مخالفت

اس اثنا میں نوآبادیوں پر انتہائی شدید تجارتی

پابندیوں کے نتیجے کے طور پر برطانوی حکومت کے خلاف بھی لوگوں کے جذبات تیزی سے بھڑکنے لگے یہاں پابندیوں کے خلاف احتجاج کرنے کا ایک واقعہ بوسٹن ٹی پارٹی" کے نام سے مشہور ہے جب نوآبادی کی ایک پارٹی انڈینوں (سرخ فارم امریکنوں) کا بھیس بنا کر برطانوی جہازوں میں گھس گئی۔ اور چائے کی پیٹیاں سمندر میں پھینک دیں تو اس کے بعد جلد ہی ۱۷۷۵ء میں نوآبادی کے کسانوں اور برطانیا کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس طرح امریکا کی جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا۔

پھر میدان جنگ میں

جلدی ہی واشنگٹن کو نوآبادیوں کی فوج کی کمانداری کے لیے اپنے فارم سے پھر بلایا گیا۔

اگرچہ اس وقت وہ جنگ بے سود اور مایوس کن معلوم ہوتی تھی اور بے سروسامان امریکی رضاکاروں کو برطانیا کی پوری طرح ہتیار بند تربیت یافتہ اور باقاعدہ فوج سے مقابلہ کرنا تھا۔ پھر بھی واشنگٹن میدان میں آ گئے۔

واشنگٹن کی اس بے سروساماں فوج کو جس کے لیے رسد کا انتظام بھی ٹھیک نہیں تھا شکستوں پر شکستیں کھانی پڑیں۔ اور خود بھی انہوں نے وہ تمام مصیبتیں اور سختیاں برداشت کیں جو ان کی فوج کو سہنی پڑیں۔

فتح و نصرت

چھ برس تک شکستوں حوصلا شکنیوں اور سختیوں کا سامنا کرتے ہوئے واشنگٹن نے برطانیا کے ساتھ غیر مساوی پیمانے کی جنگ جاری رکھی۔ جس کے دوران میں انہوں نے اپنی ذاتی بہادری اور جنگی محاذوں پر بیدار مغزی اور جنگی حکمت عملی کی مثالیں قایم کیں مثلاً ایک رات برطانوی فوجوں پر اچانک حملا کرنے اور انہیں گرفتار کرنے کے لیے جنرل واشنگٹن نے اپنی فوجوں کو ایک برف لبتا دریا سے پار کرایا آخر کار فرانسیسی امداد سے انہوں نے برطانیا کی فوجوں کو ۱۷۸۱ء میں شکست فاش دی اب نوآبادیاں آزاد ہو گئی تھیں اس لیے پھر سے واشنگٹن اپنے محبوب فارم پر واپس چلا گئے۔ اور کھیتی باڑی میں مصروف ہو گئے۔

صدر امریکا

لیکن واشنگٹن کو اپنے فارم سے جلدی ہی پھر ملک کی قیادت اور رہنمائی کے لیے بلایا گیا۔ فوجی کمانڈر کی حیثیت سے انہیں ملک کا اولین پریذیڈنٹ بنانے کے لیے۔

چنانچہ ۱۷۸۹ء میں انہیں پہلی بار امریکا کا صدر متفقہ رائے سے چنا گیا۔ اولین صدر کی حیثیت سے انہوں نے کرسی صدارت کو اپنے عمل اور مستحسن کارروائیوں سے بہت باوقار اور قابل تعظیم بنایا۔ اور جو ساتھ مرکزی حکومت لوگوں کی تضحیک اور ملامت کا نشانا بنی ہوئی تھی وہ بدنامیاں دور کیں۔

ملک کے نظم و نسق اور حکومت کے شعبوں کو انہوں نے استواری استقامت اور وقار بخشا وہ ہر لحاظ اور ہر معیار سے نہایت قابل حکمراں اور اپنے روشن دماغ ہاتھیوں سے سوچ بوجھ اور دانش و تدبر میں برتر و بالا تھے ان کی کابینا میں تھامس جیفرسن جیسے وزیر خارجا اور الیگزینڈر ہیملٹن جیسے قابل وزیر خزانا شامل تھے۔ اپنی ذات اور عالا کیرکٹر سے انہوں نے حکومتی ادارے میں باہمی اتحاد قایم کیا جس کے باعث حکومت سیاسی پارٹیوں کے قیام کا دباؤ برداشت کرنے کے قابل ہو گئی۔

ایک حاکم کی حیثیت سے واشنگٹن فوری کاروائی کرنے والے اور معاملا فہم اور فیصلا کن شخص تھے اور اپنے ہاتھوں اور خد اپنے آپ سے سخت گیری سے کام لیتے تھے وہ معاشرتی اور سماجی ملاقات میں لطف و کرم

کرنے میں انصاف سے کام لیتے اور سماجی فرائض انجام دینے میں بڑے محتاط رہتے۔ اگرچہ سرکاری ضیافتیں اور دعوتیں انہیں گراں گذرتی تھیں لیکن وہ انہیں بہت ضروری سمجھتے تھے اور اس بات پر اصرار کرتے کہ آداب و رسوم تقریب کی پوری پوری پابندی کی جائے۔

اپنے نئے ملک اور قوم میں اس طرح اتحاد اور مضبوطی اور طاقت پیدا کرنے میں انتھک طور پر کام کرتے کرتے آخر واشنگٹن کی جسمانی طاقت میں بھی کمی آنے لگی۔ اپنی صدارت کی پہلی میعاد کے خاتمے پر وہ اپنے فارم پر واپس جانے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن سارے ملک نے ہم آواز ہو کر احتجاج کیا اور کہا کہ ابھی انہیں چھٹی نہیں دی جا سکتی۔ واشنگٹن نے مجبور ہو کر لوگوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور انہیں دوسری بار متفقہ رائے سے امریکا کا صدر چنا گیا۔ اس کے بعد انہیں تیسری بار بھی صدر بننے کے لیے مجبور کیا گیا لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اور اپنے فارم پر چلے گئے۔

الوداعی پیام

۱۷۹۶ء واشنگٹن کا الوداعی خطبہ امریکا میں خطابت کی ایک تاریخی یادگار ہے انہوں نے لوگوں کو نصیحت کی کہ "تمام ملکوں کے ساتھ خوش اعتمادی اور انصاف برتو۔ سب کے ساتھ امن اور دوستی اور صلح و آشتی سے پیش آؤ۔" امریکا کے لوگوں نے واشنگٹن کی احسان مندی کا اظہار امریکی اتحاد کو ان کے نام پر قایم کرنے اور ایک ریاست کا ان کے نام رکھنے کی صورت میں کیا ہے۔ امریکا کے لوگ جنگ میں بہادر میدان امن میں سب سے آگے اور اہل ملک کے دلوں میں سب سے پہلا مقام رکھنے والے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے ہیں۔

غزل

صفی احمد بہاری

بہار آئی ہے پیمانا بنا ہر پھول گلشن کا
ہوا جاتا ہے رنگیں پھر فسانا چاک دامن کا

کلی مسکائی ہنس پڑے بلبل چہک اٹھی
مبارک باد خوار و آ گیا موسم سیاوں کا

محبت اہتمام وضع و پابندی کو کیا جانے
جنوں کاروں کے آگے ذکر کیا آئین گلشن کا

سنورتی جا رہی ہے گیسوئے لیلیٰ شب ہمدم
الجھتا جا رہا ہے نظم اپنے دل کی دھڑکن کا

شب اول یہ کس نے کی تصور میں خنثانی
نگاہوں میں سویرا چھا گیا وادی ایمن کا

مبارک باد اے برق بلا پھر آرزو میری
سجانے جا رہی ہے ایک تنکا نشیمن کا

وفور شوق زندہ ہے تو کیا دشوار ہی منزل
مرے جذبے جو صادق ہیں تو پھر کیا خوف رہزن کا

جنوں کے ایک جھٹکے نے جسے کر ڈالا تار تار
خرد کی ناخنوں میں پھنس گیا وہ چاک دامن کا

صفیؔ دل حزیں شغل سخن کاری میں پھر کھو جا
تری الفت سہارا بن رہی ہے اب تیرے فن کا

شعرا کے تخلص

فضا جالندھری
(فاضل ادب)

غالباً ۱۹۴۵ کا واقعہ ہے کہ علامہ سیماب جالندھر چھاؤنی میں تشریف لائے۔ مرحوم مخمور جالندھری کے مکان پر قیام پذیر تھے۔ دوران گفتگو میں میں نے استفسار کیا کہ آپ نے سیماب تخلص کس بنا پر اختیار کیا؟ علامہ مرحوم نے میری استدعا کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے تحریری جواب لکھوا دیا اس کے بعد میں نے دوسرے مشاہیر ادب سے سلسلہ استفسارات قایم رکھا ان تمام جوابات کو ایک گلدستے کی شکل میں پیش کرتا ہوں
(فضا)

(۱) علامہ سیماب اکبرآبادی

اذعان سخن پیدا ہونے کے بعد مہینوں تخلص زیر تجویز تھا کہ ایک صحبت میں بعض ہم عصر احباب جمع تھے حذا حذا جانے کیا بات ہوئی ایک صاحب نے میری جانب مخاطب ہو کر کہا ؎

آدمی کاہے کو ہے سیماب ہے

میں نے کہا بس آج سے میرا تخلص سیماب ہے اور یہی تخلص رکھ لیا۔

(۲) اعتبار الملک نواب شاہجہاں پوری

چونکہ استاذی امیر کے خلف کو چک مسعود احمد صاحب کا تخلص صغیر تھا اس لیے سوے ادب خیال کر کے دلی تخلص اختیار کیا اس دو حرفی تخلص میں جاذبیت بھی ہے اور بحر میں ہمواریت نظم یہ بھی فخریاً دعوا کر سکتا ہوں کہ ہر عاشق اور ہر معشوق اور ہر شاعر کے بائیں پہلو میں جگہ پا گیا ہے۔ میرا سکون موت اور حرکت زندگی ہے۔

(۳) تاجدار سخن حضرت نوح ناروی

میں نے اپنے نام کا جز سمجھ کر اپنا تخلص نوح رکھا۔

حضرت داغ نے بھی یہ مشورہ دیا کہ تخلص اچھا اور نیا ہے اس تخلص کا کوئی مشہور شاعر نہیں گذرا۔

(۴) مولانا عبدالمجید سالک بی۔ اے سابق مدیر انقلاب (لاہور)

میں نے جن دنوں سالک تخلص کیا اس کا کوئی محرک نہ تھا بس مجھے یہ لفظ اچھا معلوم ہوا۔ اور بعض احباب نے کہا کہ یہ تخلص بے نقط بھی ہے۔ اگر تم کسی وقت صنعت غیر منقوطہ میں شعر کہو گے تو تخلص کو بدلنے کی ضرورت نہ ہوگی لیکن خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ آپ یقین کیجیے میں تخلص کرنے کے وقت بارہ تیرہ سال کا بچا تھا۔ اس تخلص کے پسند کرنے کی کوئی علمی وجہ تلاش کرنا بے سود ہے۔

(۵) مولانا بیخود دہلوی

عنفوان شباب میں بیخودی عشق نے مجھے بیخود بنا دیا۔

(۶) مولانا سید علی اختر حیدرآبادی مقیم کراچی

میرا نام علی اختر ہے میں نے ارادتاً کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ نام کا ایک ٹکڑا بطور تخلص کام آجاتا ہے میں عموماً نظموں میں تخلص نہیں دیتا۔ غزل میں مقطع کی شرط ہے اس لیے اختر سے کام نکل جاتا ہے۔

(۷) مولانا ناطق گلاوٹھی

جب میں نے شاعری کو شاعری کی طرح شروع کیا اس وقت دارالعلوم دیوبند کا طالب علم تھا جہاں انسان کے لیے بسلسلہ معقول جیوان ناطق کی اصطلاح عام ہے۔ ناطق مکرانی وغیرہ کے نام سے واقف نہ تھا نے تخلص کی فکر میں ناطق مناسب معلوم ہوا۔ اختیار کر لیا۔

(۸) پنڈت بھورام صاحب جوش ملسیانی مقیم منٹگومری (پنجاب)

شعروادب کے لیے بطبیعت پر جوش تھی اس لیے جوشش تخلص پسند آیا۔

(۹) مولوی عبدالباری آسی مرحوم لکھنوی

پہلے عاصی تخلص تھا جب ۱۹۱۰ء میں مولانا ناطق گلاوٹھی سے ملاقات ہوئی تو استاد کے آگے زانوے ادب تہہ کیا ناطق صاحب نے فرمایا کہ پہلے آپ کے تخلص کی اصلاح کرنا ہے بعد میں شعروں کی اصلاح کی جائے گی چنانچہ اسی وقت ہم عاصی سے آسی بن گئے۔

(۱۰) نواب سراج الدین صاحب سایل دہلوی مرحوم

میری شاعری کا آغاز تھا نواب غلام حسین خاں تجو سے اصلاح لیتا۔ اور سراج تخلص کرتا تھا لیکن حجا باوا نواب احمد سعید خاں کو یہ تخلص پسند نہیں تھا لیکن اور کوئی موزوں تخلص بھی ان کے خیال میں نہیں آتا تھا ایک دن وہ نواب غلام حسین خاں کے کمرے پر تشریف فرما تھے میں بھی خدمت میں حاضر تھا کہ پھر میرے تخلص کی بات چھڑ گئی۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شریف صورت دروازے پر آن کر کھڑا ہوا کسی نے پوچھا کون؟ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ سایل ہوں خیرات سے تو کچھ دے دلا کر رخصت کیا لیکن اس کے ٹلنے کی دیر تھی کہ محجو صاحب کہنے لگے لو بھئی تمہاری مشکل حل ہو گئی ان صاحب زادے کا تخلص سایل رکھ دو۔ حجا کو بھی یہ پسند آگیا چنانچہ اس دن سے ہم سراج سے سایل ہو گئے۔

(۱۱) نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مرحوم شاگرد السلطان حضرت استاذی امیر مینائی کا ایک مصرع ہے۔

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر

میں نے بھی تبرکاً تقلید میں جلیل تخلص اختیار کیا

(۱۲) فضا جالندھری

آخر میں میں اپنے متعلق بھی اظہار خیال کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے کہ مولوی نوازش دانش تلمیذ شمس العلما آنجہانی مرحوم لدھیانہ ضلع جالندھر شرقی (پنجاب) ہمیں فارسی کا سبق دے رہے تھے۔ مجھے اس زمانے میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہی ہوا تھا۔ میں نے قبلا استاد مکرم سے عرض کی کہ تخلص کیا ہونا چاہیے۔ یہ فرمایا کہ ماہر رکھ لیجیے چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں مجھے جالندھر شہر ٹریننگ کالج میں داخلہ مل گیا وہاں اس زمانے میں شعر و شاعری کی گرم بازاری تھا۔ قاضی بشیر حسین سیکریٹری میونسپل کمیٹی کے دیوان خانے میں مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں حفیظ جالندھری رسا جالندھری آرزو جالندھری (مرحوم) سرور جالندھری اصغر علی احسن جالندھری (مرحوم) شامل ہوا کرتے تھے ایک آدھ دفعہ مولانا گرامی بھی جلوہ افروز دیکھے گئے میری مشق کا ابتدائی زمانہ تھا۔ مشاعرے ہفتہ وار ہوا کرتے تھے چنانچہ میں نے جب پہلی مرتبہ شرکت کی تو اپنے اساتذہ کے سامنے اپنے (ماہر) تخلص سے خفت سی محسوس کرنے لگا۔ گھر آکر لغت کی کتابیں دیکھیں تاکہ کوئی اچھا سا تخلص مل جائے بہت دنوں غور و فکر کے بعد فضا تخلص پسند آیا۔ چونکہ اس زمانے میں حضرت رسا جالندھری غزل گو شعرا میں سرِ فہرست تھے۔ لفظ رسا کے وزن پر فضا تخلص مناسب معلوم ہوا

۱۹۳۰ء میں جب میں باقاعدہ طور پر اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گیا تو استاذ نامدار سے تخلص کے متعلق مشورہ فرمایا۔ دل صاحب نے فرمایا۔ فضا تخلص میں نمایاں کشش پائی جاتی ہے۔ یہی موزوں ہے ؎

بے خبر سخن تھا میں شعر سے آگہی نہ تھی
حضرت دل نے اے فضا مجھکو فضا بنا دیا

ہندستانی زبان
اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

پیکنگ میں تعلیمی اور تہذیبی قومی کانفرنس

پ-ا

پیکنگ میں منعقد اقوامی کانفرنس میں ماہرین تعلیم کے لیے ۱۹۵۴ء کی خاطر جو کلیدی کام مقرر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "مزید سائنس داں ٹیکنیکل ماہرین اور مزید منتظم سیدان میں لائے جائیں۔"

تعلیمی اور تہذیبی قومی کانفرنس میں جو حال ہی میں پیکنگ کے بعد ختم ہوئی، ملک کے سب ہی حصوں کے تہذیبی اور تعلیمی میدانوں کے ۱۷۹ سربرآوردہ افسروں نے شرکت کی جو ملک کے ۴۰ لاکھ تہذیبی اور تعلیمی کارکنوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔

کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر کو۔ مو۔ جو سرکاری ثقافتی کونسل کی تہذیبی اور تعلیمی معاملات کی کمیٹی کے چیرمین نے کہا "ہمارے تہذیبی اور تعلیمی کام کو اقتصادی تعمیر میں ترقی کی رفتار کا ساتھ دینا چاہیے۔ آپ نے ان لوگوں سے جو تہذیبی اور تعلیمی کاموں میں مصروف ہیں اصرار کیا کہ وہ سوویت تجربوں اور مارکسیت اور لینن کے مطالعے کو تیز تر کریں۔ اور چین کی اشتراکی صنعت بندی کے مفادات کی خاطر اپنے پیشہ ورانہ کام پر دسترس کو اور بھی بہتر بنائیں تہذیبی اور تعلیمی معاملات کی کمیٹی کے نائب چیرمین شی چنگ ہشن نے انتہائی ہنرمند مردوں اور عورتوں کی تربیت کے لیے اہم اصولوں کا خاکا کھینچا جن کی اقتصادی تعمیر کے سلسلے میں ضرورت ہے۔

آپ نے عالا تعلیم کے اداروں خاص طور سے ٹیکنیکل تعلیم اور فطری سائنس کے اداروں میں درس و تدریس کے معیار کو بلند کرنے اور طالب علموں کی گنتی کو مزید بڑھانے پر زور دیا۔ انجینیرنگ کے اداروں کو خاص طور سے پولی ٹیکنیکل اداروں (کیڈر اسکولوں) کو بہتر بنانے پر زور دیا آپ نے اعلان کیا "بہت سے مزید طالب علموں کو انتہائی ہنرمند انجینیر بننے اور ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں اور دوسرے اداروں کو ہنرمند استاد بننے کے لیے سوویت یونین میں اور عوامی جمہوریتوں میں بھیجا جائے گا۔"

آپ نے آگے چل کر کہا "خاص خاص کاموں میں مہارت بہم پہنچانے والے ثانوی اسکولوں کو ترقی دینے اور انہیں نئے سرے سے منظم کرنے کے لیے ہم اپنی توجہ ان اداروں پر مرکوز کر رہے ہیں جو ٹیکنیکل ماہرین کو تربیت دیتے ہیں۔" اس کے لیے آپ نے یہ وضاحت پیش کی کہ ایسا ٹیکنیکریوں اور کانوں کی فوری ضروریات کے جواب میں کیا جا رہا ہے شی۔ چنگ ہشن نے اعلان کیا "ہم اپنے ثانوی اسکولوں کو جن میں کسانوں اور مزدوروں کے لیے کل وقتی مڈل اسکول بھی شامل ہیں۔ عالا تعلیم اور تربیت کے لیے محفوظ قوت سمجھتے ہیں۔ اور منصوبا بند ثانوی تعلیم کے سلسلے میں وہ ہماری گہری توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔" سو جو اوسط اسکولوں کو جو آسانیاں دی گئی ہیں انہیں پوری طرح بروے کار لایا جائے گا۔ اور جونیر مڈل اسکولوں اور پرائمری اسکولوں سے آنے والے نوجوانوں کو موسم گرما میں یہاں جگہ دینے کے لیے مزید آسانیاں بہم پہنچائی جائیں گی۔

آپ نے اس بات پر زور دیا کہ "ہمارا عظیم سیاسی کام یہی ہے کہ کارکنوں کو اور محنت کشوں اور کسانوں کے کنبوں سے آنے والے کاڈروں کو اشتراکی تعمیر کے محور اور سرمایہ

قوت کے طور پر تربیت دیں اس لیے کسانوں اور مزدوروں کے کل وقتی مڈل اسکولوں کو تیزی سے توسیع دی جائے گی اور ان کے لیے بہترین استاد مہیا کیے جائیں گے تاکہ عالا تعلیم کے اداروں میں مزید تربیت کی فراطروہ نخب صنعتی کارکنوں اور انقلابی کاڈروں کی بھاری گنتی کو بھیج کرنے کے قابل ہو جائیں"۔ شی۔ جنگ۔ شن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "آنے والی ایک لمبی مدت تک اطلاقی سائنس کے میدان میں تحقیقی کام کو ترقی دینے کے لیے عظیم کوششیں کی جائیں گی اور علم کیمیا، علم نباتات، ارضیات، جغرافیا، علم طبیعیات، علم ریاضی اور سماجی سائنسوں کے سلسلے میں تحقیقی کام کو تقویت دینے کے لیے بھی عظیم کوششیں کی جائیں گی"۔ آپ نے کہا: "سائنس کی ہم رشتہ ترقی کے بغیر اشتراکی جدید بندی کے کام کو پورا کرنا دشوار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سائنس کو ترقی دینا ممکن ہے اگر اس کے عمل کو قومی تقدیر کی سرگرم حمایت سے الگ کر دیا جاتا ہے"۔

اس تہذیبی اور تعلیمی قومی کانفرنس میں ۱۹۵۸ء کے لیے جن دوسرے کاموں کو منظور کیا گیا ان میں یہ کام شامل ہیں۔ کالجوں اور صنعتوں کے مراکز میں صحت عامہ کا تربیتی مزدوروں طالب علموں اور دوسرے لوگوں میں کھیلوں کو مقبول بنانا، خاندگی اور فن کا... کی حمایت کرنا، اقلیتی قومیتوں کے عوام کی تربیت میں آسانیاں بہم پہنچانا، ان میں صحت عامہ اور اشاعتی کام کو فروغ دینا اور سوویت یونین، عوامی جمہوریتوں اور رہ مایا دار ممالک کے عوام کے ساتھ تہذیبی رشتوں کو استوار کرنا۔

نائب چیرمین نے یہ اعلان بھی کیا کہ گذشتہ سال کی تعلیم کی ہر اعتبار سے پھر سے تنظیم مکمل کر لی گئی تھی ۱۹۵۳ء کے دوران میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طالب علموں کی گنتی دس فی صدی بڑھ گئی تھی۔ آپ نے آگے چل کر کہا کہ انجینئرنگ کے طالب علموں کی گنتی میں ۱۹ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ ٹیکنیکل اسکولوں میں ۴۰ فی صدی کا سینئر مڈل اسکولوں میں ۴۰ فی صدی کا اور کسانوں اور مزدوروں کے مڈل اسکولوں میں طالب علموں کی گنتی ۷۰ فی صدی بڑھی۔

اختتامی تقریر میں کو۔ مو۔ جو نے اقتصادی تعمیر کی خدمت کے لیے تہذیبی اور تعلیمی کام کی عظیم اہمیت پر زور دیا۔ آپ نے اصرار کیا کہ عوام میں حب وطنی اور بین قومیت کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔ نظام تعلیم کی رہنمائی کو اور اسے آگے بڑھانے کے کام کو بہتر بنایا جائے اور اس سال کے لیے مقررہ پلان کی تکمیل کے لیے ان تمام کاموں کی خاطر عظیم اتحاد کو اور بھی مضبوط بنایا جائے۔

غزل

عہد شباب پیر وہ حسن کی ادائیں
چاہیں جو وہ۔ تو محشر چل کر بھی کھائیں
میں منتظر رہوں گا وہ آئیں یا نہ آئیں
وہ ان کی ہیں ادائیں۔ یہ میری ہیں وفائیں
میں کہہ رہا ہوں دل سے، دل کہہ رہا ہے مجھ سے
ذوق طلب سلامت وہ آئیں اور آئیں
ہاں بات تو یہی ہے جب ضد ہے آسماں کی
وہ بجلیاں گرائے ہم آشیاں بنائیں
چاہو بدل کر سینے میں چھپائے
ڈرے کہ حسن والے دل کو نہ دیکھ پائیں
اے موت تو نے آخر کیسے کیا گوارا
وہ میرے دیکھنے کو غیروں کے گھر آئیں
برباد یوں نے ہم کو یہ تو سبق سکھایا
وہ آشیاں مٹائیں ہم آشیاں بنائیں

محضر ندیلوی

آساں نہیں تغزل یاروں سے کہہ محضر
بزم سخن میں آکر اپنی غزل سنائیں

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

۹۹۔اے اغظ پورہ۔ شرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن ۲

حکومت، پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے۔

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

چندہ سالانا چھ روپے — قیمت ایک پرچا آٹھ آنے

جلد ۱۴ — نمبر ۴، ۵

اسفندار۔ فروردی ۱۳۶۳ف — جنوری۔ فروری ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	افقر موہانی	۳	
پکار	سیدہ فرحت	۴	
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	کے۔ ام منشی	۵	
غزل	صفی احمد (بہاری)	۷	
کشمیر کی سیر گاہیں	جنا داس اختر	۸	
۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک چین میں ٹیچر کی کامیابیوں کا خلاصا	چ۔ ا	۱۱	
نوبل انعام پانے والے امریکی شاعر	یوسیس	۱۲	
ڈیٹیک شاہ	فایز (افضل پوری)	۱۴	
محبت کے پھول	عزیز الحسن ضیا (عثمانیا)	۱۶	
جسم انسانی کی ترتیب	ا۔ ا	۱۸	
معما	شاہین فاروقی (عثمانیا)	۱۹	
چیل	طالوت	۲۰	
سوسیقاروں کی تخلیقی کام	چ۔ ا	۲۱	
سویت یونین کے متعلق ایک ہندنی اسٹانی کے تاثرات	دیوپا بھٹ	۲۲	
پرواز محبت	انجم صہبائی (عثمانیا)	۲۳	
برطانیا کے قومی اخبار	والیم کلارک	۲۴	
بھوک	انور احمد ارکوی	۲۶	
اس نے پھر کیا کیا	ریاض چندی۔	۲۸	
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	ایڈیٹر	۳۲	

ہمارے خیالات

ایک اچھا اقدام

وزارت تعلیم حکومت ہند ستان نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ ہر زبان کے ادیبوں اور مصنفوں کی ہمت افزائی کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے ہر اس تصنیف کے ایک ہزار نسخے خرید لیے جائیں گے جس کی منظوری کمیٹی نے دی ہو۔ کتابوں یا مخطوطوں کی جانچ کے لیے حکومت نے چند ماہران کی ایک کمیٹی قایم کی ہے۔ یہ کمیٹی ہر بھاشا کے لیے الگ الگ ہوگی۔ ماہروں کی اس کمیٹی پر منحصر ہے کہ وہ جس کتاب کی چاہے سفارش کرے اور جس کتاب کو چاہے مسترد کر دے۔ ہمیں شبہ ہے کہ کمیٹی بہ یک اشارہ و سفارش کے اپنے فرائض انجام دیں گے تاکہ ایسے مستحق ادیبوں کی مدد امداد ہو سکے جن کی قلمی کاوشیں کم استطاعتی کے سبب مخطوطوں کی شکل میں پڑی ہوتی ہیں۔ اور اگر چند ادیبوں کی کتابیں چھپی بھی ہیں تو بازار میں مانگ نہ ہونے کے سبب بیشتر ان اسٹور روم یا مصنف کے گھروں میں ڈھیر کی شکل میں محفوظ ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مخطوص علمی ادبی یا لسانی اور فن سے متعلق تصنیف تبھی عام ہی حاصل کر سکتی ہے اور یہ بھی عوام ہی ہو سکتی ہے تاہم ان لوگوں کے مجموعہ خاطر فیصلوں کی جو عام طور پر جیسے ہیں ان کی نگاہ ہی کوشش یا سعی سفا کو وفا نہیں ہوتا کہ ہے میں۔ رہتے ہیں تو صرف مخصوص طبقہ پیش کرنے والے جن کی تحقیقاتی کوششوں سے بہت کچھ فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر ان میں سے بہت سے ایسے بے نصیب ہوا کرتے ہیں کہ کوششوں کے باوجود وہ اپنے تحقیقاتی کاموں کو کتابی شکل نہیں دے سکتے جس کی وجہ ہے کہ ان کام کرنے والوں کے حوصلے پست ہو جانے کے سبب وہ اپنی چھان بین یا تصنیف و تالیف کے شغل کو اور آگے نہیں بڑھاتے۔ اب جبکہ حکومت نے ایسے لوگوں کی امداد کا بیڑا اٹھایا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ تحقیقاتی کاموں کی مشین تیز تر ہو جائے گی۔

حکومت ہندستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کام حقیقت میں ایک یادگار کارنامہ ہے۔ مولانا خود بھی ایک زبردست عالم فاضل شخص ہیں۔ حقیقی معنی میں علمی ادبی سرپرستی اور ادیب نوازی کا ثبوت دیا ہے مولانا کے اس اعلان سے نادار اور مفلس ادیبوں اور مصنفوں میں کام کرنے کے عزم کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے لکھنے والوں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ اور اپنے مستقبل کو درخشاں دیکھنے لگے ہیں۔

اس سلسلے میں وزارت تعلیم کو ہمارا یہ مشورا ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے اس لیے کہ کسی تصنیف کے صرف ایک ہزار نسخے خرید لینے سے مصنف یا ادیب کو کوئی فایدہ نہیں پہنچتا۔ اخراجات جانے کے بعد اتنی تھوڑی رقم بچ رہے گی کہ اس سے مصنف مالی طور پر خوش حال نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہماری رائے میں کسی مصنف کو واقعی فایدہ پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ منظور کتاب کے ایک ہزار کی بجائے دو ہزار نسخے خرید کیے جائیں اور اس مصنف کو پانچ ہزار روپے نقد بطور انعام الگ دیے جائیں۔ اس حساب سے مصنف کا تھوڑا بہت مالی فایدہ ہو سکتا ہے جس کے سہارے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہوئے وہ اپنے مخاص فن یا ادب کی مزید تحقیقات میں پورے طور پر منہمک ہو سکتا ہے۔

ہمیں اس کا یقین ہے کہ اس سکیم سے حکومت کا مقصد نہ صرف کتابیں خریدنا نہیں ہے بلکہ مصنف کی امداد مقصد ہے اور امداد جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ کتاب لکھنے والے کی محنتوں اور کوششوں کا صلا الگ انعامی شکل میں نہ دیا جائے صرف اسی رقم سے کسی مصنف کو تحقیقی فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ کسی مخصوص علمی ادبی یا فنی تحقیقات کا معاوضہ پانچ ہزار روپے کی زیادہ نہیں اگر حکومت اس معاوضہ کو زیادہ سمجھتی ہے تو تصنیف اور مصنفوں کے فرسٹ سکنڈ اور تھرڈ گریڈ مقرر کر دے اس سے رقم کی ادائی میں سہولت اور کیپ بھی ہو جائے گی فرسٹ گریڈ کا معاوضہ نو پانچ ہزار ہو اور سکنڈ اور تھرڈ گریڈ کا معاوضہ دو اور ایک ہزار مقرر کر دیا جائے ظاہر ہے کہ فرسٹ اور سکنڈ گریڈ کے معیار کی کتابیں بہت ہی کم وصول ہوں گی اور جو مقررہ کیے ہوئے معیار پر پوری اتریں انہیں لازماً معاوضہ ضرور دیا جانا چاہیے ——

ہمارا یہ مشورہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ حکومت ہند ستان کی اس اچھی سکیم کا فایدہ زیادہ سے زیادہ مصنفوں کو پہنچے۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

دم رحلت مناسب مشکلوں کا سامنا ہوگا
جو تم ہوگے تو پھر آسان یہ بھی مرحلا ہوگا

تباہی دیں کتھے زاہد کہ بعد مرگ کیا ہوگا
گذر جائے گا بندا بندگی سے تو خدا ہوگا

وفور شوق میں جان تمنا کہہ دیا ہوگا
خبر کیا تھی کہ اتنی بات پر وہ بت خفا ہوگا

در پیر مغاں کی جبہ سائی تو نہ چھوٹے گی
خدا جانے اگر چھٹ جائے گا کعبہ تو کیا ہوگا

یہ آنکھیں بند کیوں کر لیں آ آنسو کیوں نکل آئے
لے بس رہنے بھی دو تم سے علاج درد کیا ہوگا

جو سچ پوچھو ہمیں تو کام تھا عرض تمنا سے
اب اس سے کیا نہ ہوگا بدگماں وہ شوخ یا ہوگا

ہمیں لیسے چمن سے تو قفس صیاد بہتر ہے
نشیمن ہی نہ ہوگا جب تو غم کس بات کا ہوگا

تڑپتا ہے بہت جب دل تو یوں تسکین دیتا ہوں
نہیں گر دیکھتے بندے خدا تو دیکھتا ہوگا

ہزاروں راستے میخانے سے نکلے ہیں اے واعظ
یہیں سے تیرے کعبے کا بھی کوئی راستا ہوگا

بنے فرعون تو لاکھوں نہ موسیٰ بن سکا کوئی
فریب حسن باطل کب حقیقت آشنا ہوگا

اسیر دام گیسو کی اسیری کیا رہائی کیا
یہ جتنا ہوگا آزاد اور اتنا مبتلا ہوگا

سنو تم قیس کا قصہ فسانہ یار رہنے دو
نتیجا ایک ہی نکلے گا مضموں دوسرا ہوگا

ہیں اپنے دل کی دنیائے خیالی کا نہیں قایل
تخیل ہوگا تیرا ہی مگر تیرے سوا ہوگا

فرشتوں کی جہاں پیشانیاں مصروف سجدہ ہیں
اسی روئے زمیں پر مقتل اہل وفا ہوگا

اسیری کیا بری تھی ایسی آزادی سے اے افقر
کہ فصل گل کے آتے ہی خزاں کا سامنا ہوگا

ذرا سی چاندنی سرسبز کر دیتی ہے زخموں کو
خیال ہوشاں ہیں داغ دل افقر ہرا ہوگا

پکار

سیدہ فرحت

دھن کے لوبھی لوبھ میں دھن کے چلتے ہیں پھر چال
کھوئیں گی اپنے بالوں سے پھر لال ہزاروں مائیں

بیٹھتے ہیں مکار شکاری پھر پھیلائے جال
ہوں گے پھر اناتھ ہزاروں اور لاکھوں بیوائیں

پڑنے کو ہے رینا بھاری آئے گا بھو چال
خون کے ساگر میں ڈوبیں گی پھر لاکھوں آشائیں

دھرتی پر پھر لگ جائیں گے لاشوں کے انبار
بھوک اور بھیکنگا ہوگا ساتھی سارے جگ میں راج

ہوگی پھر آکاش سے ساتھی گولوں کی بوچھار
سوجیں خوب اڑائیں گے پھر دھن والے مہاراج

دھن کے پجاری دھینٹ میں دیں گے انسانوں کی جانیں
آ ساتھی ہم جان لڑا کر آنی بلائیں ٹالیں

دھن کی دیوی دھن سے بھر گی پھر ان کی دکانیں
آ ساتھی مل جل کر الٹ دیں سب شیطانی چالیں

اہل پڑے گی سونے سے پھر ان کی سادی کانیں
چلتے پھرتے فتنوں کے ہم پیر میں بیڑی ڈالیں

کال مگر دنیا میں پڑے گا تڑپیں گے سب بھوکے
ڈگ مگ کرتی نیا کو آ ساتھی پار لگائیں

جھلسیں گے پھر تن من سارا پیٹ سے اٹھ کے لوکے
جیون کو جو روگ لگے ہیں ان کو کھوج مٹائیں

سر پر پھر منڈرانے لگے ہیں جنگ کے کالے بادل
اذرنگی یا امریکی ہوں جرمن یا جاپانی

کوئی گرج سنے ایٹم بم کی دھرتی ہوگی بیکل
مصر اور عرب کے واسی ہوں وہ ترک ہوں ایرانی

پھر جاگیں گے خون سے ساتھی سارے جگ میں جل تھل
بھارت کے ہوں بسنے والے یا ہوں پاکستانی

سارے جگ میں چھا جائے گا ساتھی گھورا اندھیرا
جو بھی جیون میں بس کھو لے انساں کو کلپائے

کونے کونے میں دنیا کے ہوگا موت کا ڈیرا
پاپی ایسا سارے جگ میں کوئی نہ رہنے پائے

(نیا ہند سے شکریے کے ساتھ)

(۳)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

کے۔ ایم۔ منشی

پچھلے کچھ عرصے سے اس بات کی طرف خصوصی توجہ دی جارہی ہے کہ مستقبل میں ہمارے ملک کا تعلیمی ڈھانچا کس قسم کا ہونا چاہیے موجودا طریق تعلیم کی کئی خامیوں کی طرف اشارا کیا گیا ہے اور انہیں رفع کرنے کی کئی تجاویز پیش کی گئی ہیں لیکن ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ملک کے باشندوں میں تعلیم حاصل کرنے کی زبردست خواہش کی موجودگی ان کی پیدائی کی علامت ہے لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کے موزوں انتظامات کی عدم موجودگی معیار تعلیم کو بلند کرنے کی کوشش ناکام بنا سکتی ہے

اس وقت ہمارے ملک کے اکثر تعلیمی ادارے کی حالت یہ ہے کہ ان کے پاس سرمایے کی کمی ہے اور ان کے ذرائع کے مقابلے میں طلبا کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان سب کی تعلیم کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جا سکتی۔ استادوں کی تنخواہیں قلیل ہیں اور تقاضا دی صحیح اس پیشے کی پرانی روایات کو تدریج ختم کر رہی ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں بھی ایسے ڈھنگ سے تعلیم دی جارہی ہے کہ اسکول میں قدم رکھتے ہی دیہاتی طلبا میں دیہاتی زندگی سے بیزاری کا مادا پیدا ہو جاتا ہے۔ ان اسکولوں کے استادوں کو بھی دیہاتی تہذیب و تمدن سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی ان ہی دیہات کی تعمیر نو کے بارے میں تربیت بہم پہنچائی جاتی ہے وہ خود شہری زندگی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور ملک کے بہترین نوجوانوں میں دیہاتی زندگی سے دور بھاگنے کا جو جذبا پیدا ہو رہا ہے وہ اس کا سدباب نہیں کر سکتے۔ شہروں میں بھی ابھی تک طلبا کی تعلیم کتابیں رٹ کر امتحان پاس کرنے تک ہی محدود ہے اکثر والدین اپنی اولاد کو محض حصول ڈگری کے خیال سے یونیورسٹیوں میں بھیجتے ہیں تاکہ کے معاوضے میں ان کا وقار بڑھ جائے اور ان کے لیے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے امکانات روشن ہو جائیں۔ ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کا معیار گر رہا ہے۔ نتیجتاً نسل کی اخلاقی اور روحانی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آزاد بھارت میں تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟ اس امر پر اکثر لوگ متفق ہیں کہ ہمارے تعلیمی نظام کا ایسا ہونا چاہیے جو جسمانی، ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے شہریوں کی صحت مند نشوونما میں معاون ثابت ہو اور تعلیم یافتہ شہری جمہوری طریقوں پر آزاد بھارت کی تعمیر نو میں نمایاں حصہ لے سکیں۔ مختصر لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ نئے طریق تعلیم کا مدعا طلبا کو اس قسم کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی تربیت بہم پہنچانا ہونا چاہیے کہ وہ زندگی میں محنت کرنے کے عادی بن کر رہیں۔ طلبا میں مادی مفاد سے بالاتر سماجی قدروں کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا چاہیے تاکہ وہ سماجی زندگی میں دوسروں کے ساتھ عزت و شفقت سے پیش آنا سیکھ جائیں۔ اس کے علاوہ انہیں اس قسم کی تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ باعزت پیشے کے ذریعے اپنی ضروریات زندگی کما سکیں اور موجودہ معاشی نظام کو بحیثیت مجموعی بہتر بنانے میں اپنا پارٹ ادا کر سکیں۔ ان میں حق کی خاطر لڑنے کا جذبا پیدا کیا جائے اور ان میں مقدس کاموں کی تکمیل کے لیے اپنی تمام تر روحانی قوتوں کو بروئے کار لانے کی اہلیت ہونی چاہیے۔

پرائمری سکنڈری اور ہائر سکنڈری تک تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو اپنی تعلیم کے زمانے کے مطابق بھارت کی تاریخ، بھارتی روایات اور بھارت کے ادب سے واقف ہونا چاہیے اور انہیں اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ ان

کی زندگی کا مدعا کیا ہے۔ طالب علموں کو دیہاتی گری رسم خط میں ہندستانی پڑھائی جائے تاکہ وہ اس زبان کے ذریعے کاروبار چلانے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ طلبا کو دیش کی آزادی اور قومی اتحاد کی اہمیت کا اس حد تک احساس ہونا چاہیے کہ وہ ان کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے پر آمادہ ہوں۔

اس موقع پر ان اقدامات کا مختصر ذکر بے محل نہ ہوگا جن کے ذریعے ہم اوپر کے تعلیمی مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں خصوصی تعلیم کو چھوڑ کر عام تعلیم کسی طالب علم کی انفرادی کوششوں کے ذریعے نہیں بلکہ اجتماعی کام کے ذریعے دی جانی چاہیے۔

پانچ سالہ پلان میں بجا طور پر زرعی ترقی پر زور دیا گیا ہے اور مستقبل میں ہمارے کسان کو قومی تعلیم کی ہر اسکیم میں مرکزی مقام حاصل کرنا چاہیے۔ طلبا کو موقع و محل کے مطابق بھجن گانوں اور زمینوں سے متعلق امور کی کلی واقفیت بخشنی چاہیے دیہاتی علاقوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی وجہ سے شہروں کی طرف رجحان کی روک تھام بھی ضروری ہے اور حکومت اتر پردیش کی تجویز کے مطابق ہر ابتدائی اور سکنڈری اسکول کے ساتھ ایک کھیت بھی وابستہ ہونا چاہیے۔

ہر ملک میں دیہاتی علاقے کے مستقبل اسکولوں کا ایک جال سا بچھا دینا چاہیے اور ان میں تفصیلی ہدایات کی ایسی ہی تعلیم دی جائے جیسی کہ بنیادی اور ٹریننگ کے دیہی اسکولوں میں دی جاتی ہے۔

ہر ایک ملک کو ابتدائی تربیت اجتماعی ترقی کے پروجیکٹ یا دیہاتی علاقے سے متعلقہ اسکول میں دی جانی چاہیے تاکہ اس میں دیہاتی آبادی کے اقتصادی اور دیہاتی نوجوان کے ذہنی طرف جانے کے رجحان کا اندازہ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ دیہاتی اسکولوں کے دیہاتی علاقوں میں عالی پیمانے کی تعلیم کو تعلیمی اور زرعی نیز اجتماعی ترقی کے پروجیکٹوں کے ساتھ ملا کے سرگرم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آفت اگر کیلچرل ایجوکیشن کی طرح کا کوئی ادارہ قائم کر دیا جائے۔

شہری تعلیم

شہری علاقوں کی تعلیم میں ٹیکنیکل اور پیشہ ور اتا تربیت بھی شامل ہونی چاہیے۔ شری راج گوپال آچاریا کے تخلیقی خیال کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے تاکہ ہر طالب علم کے تعلیمی وقت کا کچھ حصہ دستکاریوں اور پیشوں کی عملی تربیت میں بھی صرف ہو سکے۔

سکنڈری تعلیم کو ڈگری کی تعلیم کے لیے ایک ابتدائی ذریعہ ہونے کی بجائے بذات خود مکمل ہونا چاہیے۔ اس تعلیم میں ٹیکنیکل، پیشہ ور اتا اور زرعی تربیت کے علاوہ ایسے بنیادی مضامین بھی شامل ہوں جو طالب علم کو آزاد شہری کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکیں۔ ان بنیادی مضامین میں ہندی کا مطالعہ ہندستان کا مختصر تاریخ ادب اور تمدن کے مضامین شامل ہونے چاہئیں۔

اس کے سوا اس بات کی روک تھام کے لیے ضروری انتظامات کیے جائیں کہ یونیورسٹیوں کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ سمجھا جائے لیکن پیشہ ور اتا اور فنی تعلیم کو اس سے مستثنا کر دیا جائے۔

یونیورسٹی تعلیم کی تشکیل نو

یونیورسٹی کی تعلیم کو ازسر نو منظم کیا جائے اور جب ڈگری کی تعلیم سرکاری ملازمت کے لیے پروانۂ راہداری نہ رہے گی تو عالی تعلیم کے سلسلے میں موجودہ یونیورسٹیاں کچھ عرصے تک ضروریات کو پورا کر سکیں گی تاہم یونیورسٹیوں کو ہی صورت حال کے مطابق بنانے کے لیے اور ان کو ترقی دینے کے لیے حکومت کو مالی امداد فراہم کرنی چاہیے۔ اس کے سوا یونیورسٹیوں میں داخلہ بھی نہایت سخت کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور صرف وہی طلبا داخل کیے جائیں جنہوں نے سیکنڈری تعلیم کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے امتحان میں اول

درجے کی سند حاصل کی ہو۔ کالجوں میں شفٹ کا طریقہ بند ہونا چاہیے۔ اور کالج میں تعلیمی عملا بھی کافی ہونا چاہیے۔

قومی زبان کے مطالعے کے لیے ہر یونیورسٹی میں ہندستانی زبان کی درس گاہ بھی ہونی چاہیے۔ جہاں پر طالب علم قومی زبان اور علاقائی زبانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم کو فوجی تربیت بھی دی جائے۔

تعلیم کے موجودہ طریقے کی وجہ سے ملک پستی کی طرف جا رہا ہے۔ اور ہر سال ایک کروڑ روپے اور ساڑھے تین لاکھ نوجوانوں کا وقت ضایع ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں سماجی اور تعلیمی سائنس کے مطالعے کی بھی ضرورت ہے لیکن ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیاں اس امر میں معدور ہیں کہ وہ زندگی کے سماجی یا طبعی نظام میں کوئی بھی قسم کی تبدیلی پیدا کر سکیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوان طبقے اور تعلیم دینے کے پیشے میں روحانیت اور اخلاق کی بنیادوں کو استوار کیا جائے۔ حق اور ناحق میں امتیاز کرنے کا احساس پیدا کیا جائے کوئی ملک الحاد پر مبنی تعلیم کے ذریعے نوجوانوں میں عالی مقاصد کے لیے زندگی گذارنے کا جذبا پیدا نہیں کر سکتا ہے اس کے علاوہ تعلیم کے سلسلے میں ہمیں بغیر کسی منصوبے اور بغیر کسی خاکے اور پیمانے کے کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے اگر ہم نے پانچ سالا منصوبے میں معین مقصد کو ہمت اور استقلال سے حاصل کر لیا تو قوم کی قسمت کا ستارہ منور اور درخشاں ہو جائے گا۔

اگر آپ مصنف ہیں

اور اپنی تصنیف کی علالتوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے اس لیے کہ یہی وہ بیباک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے۔

غزل

نگاہ امید دیکھتی ہے وہی سہانا سا خواب اب تک
میرے تصور پہ چھا رہا ہے کسی کا رنگیں شباب اب تک

زمانا ہوتا ہے تم نے چھیڑا تھا ساز الفت کا تار اکدن
مگر فضاؤں میں بج رہا ہے یوں ہی وہ دل خش رباب تک

گئی وہ فصل بہار خش کن ہوا وہ نقش خزاں ہویدا
نگاہ بلبل مگر ہے محو جمال و حسن و گلاب اب تک

زمانا بدلا بدل بھی جائے گی جو فصل بہار جائے
یہ تیرا فیض و کرم ہے ساقی کہ ہم مست شراب اب تک

وصال کی شب گذر رہی ہے سحر نمودار ہو رہی ہے
مگر ہے تیری زباں پہ پیارے وہی سوال و جواب تک

نئے سرے سے تو کر رہی ہے پھر آج تعمیر آشیانا
مگر یہ دیکھا ہے تو نے بلبل وہی ہے رنگ شباب تک

صفی احمد (بہاری)

کشمیر کی سیر گاہیں

جمنا داس اختر

پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے سوئیزرلینڈ کے ایک اخبار نویس نے کشمیر کی سیاحت کے بعد ایک مضمون میں لکھا کہ ہندستان میں کشمیر واقعی سورگ کا درجہ رکھتا ہے اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ تمہاری بہترین خواہش کیا ہے تو میں کہوں گا کہ میرا آئندہ جنم کشمیر میں ہی ہو۔

فارسی کے ایک مشہور شاعر نے کشمیر کو سورگ سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر دنیا میں کہیں سورگ ہے تو کشمیر کی سرزمین ہے۔ اور واقعی یہ بات درست ہے کشمیر ہمالیہ کی ہوا، دھان کی کھیتیوں، حسین سرسبز وادیوں، برف پوش پہاڑوں اور جھومتے ناچتے اور گاتے ہوئے چشموں کو دیکھ کر کس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے کشمیر کا ہو کر رہ جائے۔

ہندستان کی پرانی تاریخ کے مطابق کشمیر رشیوں اور مہرشیوں کی پنبہ بھومی تھا۔ ان رشیوں نے اپنے بہترین گرنتھوں کی تصنیف کے لیے کشمیر کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں دلی اور آگرا کے حکمرانوں کی نگاہ انتخاب کشمیر پر ہی پڑی اور انہوں نے اپنی بلند ذوقی سے کشمیر کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ انگریز کے بعد میں کشمیر بیرونی دنیا کے لیے پھر ایک سیرگاہ بنا۔ بھارت کی آزادی کے بعد کشمیر سرکار نے سیاحوں کو سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے ایسے انتظامات کیے کہ اب کشمیر کی سیر کرنا نہایت آسان ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب کشمیر کی سیر کے لیے جانے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

کشمیر جانے والے سیاح پنجاب کے سرحدی شہر پٹھانکوٹ سے موٹر بس پر اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ پٹھان کوٹ میں کشمیر سرکار کی گاڑیاں ہر وقت تیار ملتی ہیں۔ سیر و سیاحت کے موسم میں جو ان دنوں پورے جوبن پر ہے پٹھان کوٹ سے سری نگر جانے اور آنے کا ٹکٹ ۲۷/ روپے میں ملتا ہے اگر آپ صبح بس پر سوار ہوں تو زیادہ سے زیادہ چودہ گھنٹے میں سری نگر پہنچ جائیں گے۔ سری نگر پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ایک حسین اور سرسبز شہر ہے۔ اس کے درمیان ایک طرف جہلم کی ندی خراماں خراماں بہتی ہوئی نظر آتی ہے تو دوسری طرف جھیل ڈل سری نگر میں آنے والے سیاح عام طور پر ہاؤس بوٹ میں ٹھہرتے ہیں۔ ان ہاؤس بوٹوں میں بجلی پانی اور خوراک کا بہترین انتظام ہوتا ہے۔ ہر ایک ہاؤس بوٹ کے ساتھ ایک وکٹشیاں ہوتی ہیں۔ سیاح لوگ ان وکٹشیوں میں بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔

سری نگر میں ہی جھیل ڈل کے دائیں طرف ایک پہاڑی پر شنکر آچاریہ کا مشہور مندر ہے اس سے آگے کچھ قدم پر سڑک کے کنارے ہی چشمہ شاہی۔ نشاط باغ۔ شالامار باغ اور دوسرے متعدد باغ ہیں۔ یہاں لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں اور باغوں میں رنگا رنگ کے پھولوں کے علاوہ بادام اخروٹ، ناشپاتی وغیرہ پھلوں کے درخت ٹھنڈے پانی کے چشمے۔ چنار کے لہلہاتے ہوئے پیڑ اور ان کے سامنے ایک طرف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ دوسری طرف جھیل ڈل کا منظر آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔

یہ حسین منظر آپ کو وادی کشمیر میں جگہ جگہ دکھائی دیں گے۔ مثال کے طور پر سری نگر سے چوبیس میل کے فاصلے پر گلمرگ کی دلفریب وادی میں پہنچ کر یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا ہم واقعی سورگ دیش میں آ گئے ہیں۔ گلمرگ ایک اونچی

جگہ پر واقع ہے اس جگہ جانے کے لیے سیاح لوگ پہلے تو بس پر ٹرن مرگ پہنچتے ہیں اور وہاں سے پیدل یا ٹٹوؤں پر گلگرگ ٹن مرگ سے گلگرگ جانے کے رستے پر چاروں طرف چنار اور چیل کے درخت نظر آتے ہیں۔ یہ رستا پہاڑی ہے مگر کٹھن نہیں۔ چلتے وقت کبھی کبھی بادل چھا جاتے ہیں تو چھوہارے پڑنے لگتی ہے اور جب سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی سے چاروں طرف حسین منظر دکھائی دیتے ہیں۔ گلگرگ سے چھ سات میل اوپر کھلن مرگ کا صحت افزا مقام ہے۔ یہ جگہ گلگرگ سے بھی زیادہ دل کش ہے۔ سری نگر سے اننت ناگ کی طرف کا علاقا بھی سیاحوں کے لیے بے حد کشش انگیز ہے اس علاقے میں ہزاروں سال پہلے کے گندھرو نگر اونتی پور کے کھنڈرات نظر آتے ہیں اس علاقے میں وہری ناگ کا تاریخی چشمہ ہے اس سے آگے یعنی سری نگر سے ۴۰ میل پر پہلگام کا مشہور صحت افزا مقام واقع ہے۔ پہلگام پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ایک دل کش وادی ہے۔ یہاں پر ٹیلے اور مکانوں میں رہنے کے علاوہ کئی لوگ خیموں میں، کہ قدرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پہلگام میں بھی جگہ جگہ پانی کے بھرنے نظر آتے ہیں جہاں ماہی گیری کے شوقین بھی پہنچتے ہیں۔ پہلگام سے آگے چندن واڑی کا علاقا ہے امرناتھ کی یاترا کو جانے والے شردھالو اس جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ جھیل ولر جو دنیا کی ایک بہت بڑی جھیل ہے وہ وادی کشمیر میں ہے۔ جہلم اسی جھیل میں ایک اپنے کو جذب کرکے دوبارا خامشی سے بہنے لگتا ہے۔ یہ جھیل سولہ کے قبضے سے چند میل آگے ہے اس کے کناروں پر میلوں تک سنگھاڑے کے پودے اگے ہوئے ہیں۔ وولر جھیل کی نسبت بہت چوڑی جھیل ہے اس کا پانی میٹھا اور بلور کی طرح صاف شفاف ہے سیاح لوگ صبح سویرے کشتیوں میں بیٹھ کر وولر کی سیر شروع کرتے ہیں اور دوپہر سے پہلے پہلے کنارے پر لوٹ آتے ہیں۔ گاندھر بل جو سری نگر سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیر و تفریح کے لیے ایک دل کش مقام ہے۔ گاندھر بل میں ٹرک اور سندھ نہر کے دونوں طرف پھلوں سے لدے ہوئے اور چنار کے اونچے درخت نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ سندھ نہر میں رہنے کے لیے معمولی دام پر ہاؤس بوٹ مل جاتے ہیں۔ یہاں سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر کھیر بھوانی کا تاریخی اس مندر کی یاترا کے لیے دیوی کے بھگت دور دور سے آتے ہیں۔

سری نگر سے سات میل کے فاصلے پر مائے گام کی شکارگاہ ہے شکاری لوگ جانوروں کا شکار کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ سری نگر سے بارہ میل کے فاصلے پر مانک بل کی جھیل ہے اور ۳۵ میل کے فاصلے پر اننت ناگ کی طرف مٹن صاحب کا مشہور تیرتھ استھان واقع ہے پرانے خیال کے ہندوؤں کا یہ عام عقیدہ ہے کہ جب تک مٹن صاحب کی یاترا نہ کی جائے کوئی دوسری یاترا پھل نہیں ہوتی۔

کشمیر میں سیر و تفریح کے لیے آنے والا کوئی شخص یہاں آئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی علاقے میں لوگ مچھلیوں کا شکار بھی کرتے ہیں۔ سری نگر سے ۴۶ میل کے فاصلے پر سون مرگ کی طرف گنگا بل کا تیرتھ استھان واقع ہے گنگا بل کو کشمیر کے ہندو وہی درجا دیتے ہیں جو بھارت کے دوسرے حصوں میں ہردوار کو حاصل ہے۔ سون مرگ بجائے خود ایک مشہور سیرگاہ ہے یہ جگہ برف سے ڈھکے ہوئے بیس بیس ہزار فٹ بلند پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے یہاں لوگ دور دور سے سیاحت اور بحالی صحت کے لیے آتے ہیں۔

میرے لیے یہاں کشمیر کی تمام سیرگاہوں کا مفصل طور پر ذکر کرنا ممکن نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وادی کشمیر کا کونا کونا جائے خود ایک سیرگاہ ہے کشمیر میں آپ کو کوئی ایسی جگہ نہ ملے گی جہاں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے بھرنے ندی نالے جھومتے جھامتے پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ، سرسبز و شاداب وادیاں اور سفید برف ڈھکی ہوئی بلند پہاڑیاں نظر آئیں۔ ان تمام مناظر کو دیکھ کر انسان اپنے آپ کو واقعی ایک مختلف دنیا میں پاتا ہے اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا قدرت نے اسے دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پرسکون وادی میں لاکھڑا کیا ہے جہاں کوئی غم

نہیں کوئی فکر یا پریشانی نہیں اور وہ نہ صرف قدرت کی دلکش مصوری کا مداح بن جاتا ہے بلکہ اس کے دل میں یہ امنگ پیدا ہونے لگتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہی وادی کو اپنا مسکن بنالے۔

کشمیر میں سیر و تفریح کے لیے بھی یہی دن موزوں ہیں ستمبر اور اکتوبر میں وادی کشمیر میں قدرت کا حسن اپنے پورے شباب پر ہوتا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر میں سیر و تفریح کے لیے جانے والے لوگوں کو جو مشکلات پیش آتی تھیں اب ان کا نام و نشاں نہیں رہا۔ کشمیر کی عوامی حکومت نے سیاحوں کی سہولت کے لیے تمام مناسب انتظامات کر دیے ہیں۔ ضروریات زندگی سے تعلق رکھنے والی تمام اشیا بافراط اور سستی ملتی ہیں اور اس سے بھی زیادہ اطمینان کا مقام یہ ہے کہ کشمیر کے عوام روایتی طور پر امن پسند خوش خلق اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ اگر قدرت نے اپنی مصوری سے کشمیر کو حسن کا مرقع بنایا ہے تو کشمیر کے عوام نے اس امن و شانتی کا گہوارا بنا دیا ہے۔

ہندستان کی قدیم کتابوں کی نمائش

انڈنوں برٹش میوزیم لندن میں مشرق وسطیٰ ہندستان اور مشرق بعید کے ممالک کی قدیم کتابوں اور قلمی نسخوں کی ایک نمائش کی جارہی ہے یہ اپنی قسم کی سب سے بڑی نمائش ہے اور اس میں تقریباً پچاس مختلف زبانوں کی قدیم کتابیں اور مسودے دکھائے جارہے ہیں برٹش میوزیم نے اپنی دو سو سالہ سالگرہ کے موقع پر نمائشوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہوا ہے اور یہ نمائش اس سلسلے کی آخری نمائش ہے اس نمائش میں جس کا تعلق مشرقی تہذیبوں سے ہے ہندستان کی قدیم دینی کتابوں مثلاً رگ وید اور رامائن کے قلمی نسخے بھی رکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی غیر دینی ادبی کتابیں اور قلمی نسخے بھی دکھائی جارہے ہیں۔

ڈاک کے نئے سوویت ٹکٹ

سوویت یونین کی وزارت مواصلات نے ڈاک کے ٹکٹوں کا نیا سلسلہ جاری کیا ہے جو اکتوبر انقلاب عظیم کی ۳۶ ویں سالگرہ سے متعلق ہے ایک ٹکٹ پر اسمولنی انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں جہاں اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب کا ہیڈ کوارٹر تھا لینن اور اسٹالن کو دکھایا گیا ہے ایک اور ٹکٹ قوموں کی دوستی کا مظہر ہے اس پر جو تصویر ہے اس میں سوویت یونین کے ریاستی جھنڈے کے نیچے سولہ وفاقی جمہوریتوں کے وفاقی نمائندے دکھائے گئے ہیں۔

سوویت یونین کی وزارت مواصلات میں تاس کے نمائندے کو بتایا گیا ہے کہ سوویت حکومت کے قیام کے بعد سے اب تک ٹکٹوں میں ایک ٹکٹ ایسا ہے جس میں والگا ڈان نہر جہاز رانی کے ایک دروازے سے وفاقی جہاز "جوزلیف استالن" کو گذرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ ٹکٹ "سوویت یونین میں تعمیر" نام کے سلسلے میں سے ہے سوویت یونین کی جمہوریتوں سے متعلق ٹکٹوں کے سلسلوں میں نت نئے ڈزائن پیش کیے جاتے ہیں۔ نئے ٹکٹوں میں سے چند لینن گراڈ کے مناظر ہیں۔ فنلینڈ سکی ریلوے اسٹیشن کے سامنے کا ایک تاریخی چوراہا جہاں ۱۹۱۷ء میں ایک مکتر بند گاڑی پر کھڑے ہو کر لینن نے مزدوروں فوجیوں اور ملاحوں کو خطاب کیا تھا۔ روسی ماہرین فن تعمیر کی عظیم تخلیقات بلند سنہری مینار والی امارت بحری کی عمارت یادگار پیٹر اعظم — یہ ہیں اس سلسلے کے چند ڈزائن۔

عظیم فن کاروں اور رہنماؤں کی تصویروں والے ٹکٹوں میں (جن میں پشکن اور وکٹر ہیوگو کی تصویروں والے ٹکٹ بھی شامل ہیں) امسال لیو ٹالسٹائی کی تصویر والا ٹکٹ بھی جاری کر کے شامل کر دیا گیا ہے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک چین میں تھیٹر کی کامیابیوں کا خلاصا

چ - ا

چین میں ۲ ہزار سے زاید سرکاری اور قانگی ناٹک کمپنیاں ہیں جو ملک بھر میں تھیٹر کے شایقین کے لیے ڈرامے، کلاسیکی اور مقامی اوپیرا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے اور تفریح کی دوسری صورتیں مہیا کرتی ہیں۔

ادیبوں اور فن کاروں کی کل چین کا نفرنس کے ایک حصے کے طور پر ملک کے چوٹی کے ڈراما نگاروں نے اپنی ۵ روز اٹھنگ میں جو ۳ اکتوبر کو ختم ہوئی ۱۹۴۹ء سے اب تک کی تھیٹر کی کامیابیوں کا جایزا لیا اور ان کا ایک خلاصا تیار کیا۔

جدید ڈرامے جن کے موضوعات ہنگامی ہوتے ہیں بھاری تعداد میں سامعین کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کامیاب ڈراموں میں لاوریشہہ کا ناٹک "اژدھے کی داڑھی کی کھلائی" بھی ہے اس ڈرامے میں محنت کش طبقے کے ذریعے نئے اور پرانے سماج میں تقابل دکھایا گیا ہے۔ ہوکو کے ڈرامے "جنگ میں پل کر جوان ہوئے" جاپان کے خلاف مزاحمتی جنگ کے خیالوں کی عکاسی کی گئی ہے "نئی حقیقت کے روبرو" "چالیس سالوں کے سپنے" اور "یمن دریا تک بہا رہا تی" نام کے ڈراموں میں ملک کی تعمیر کرنے والے مردوں اور عورتوں کو حقیقت پسندانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

چینی زبان میں منتقل کیے گئے روسی ڈرامے "ماسکو پر سحر" اور "فولاد کیسے تیار کیا گیا" ایک عرصے تک کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں سامعین کے سامنے کھیلے گئے۔ لیکن سامعین کی مانگ اس پر بھی بہت زیادہ تھی۔

چین کے کلاسیکی اور مقامی اوپیرا ہر روز دس لاکھ سامعین کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اوپیرا کی اس روایتی ہیئت میں کوئی ۲ لاکھ ایکٹر اور ایکٹریس مصروف کار ہیں۔ پچھلے چار سالوں میں چین کے شروت مند کلاسیکی اور مقامی ناٹکوں کے ورثے کو ترقی دینے کے لیے بہت کچھ کیا گیا ہے۔ نئے اوپیرا پیش کیے گئے ہیں اور پرانے اوپیراؤں کو ان کے توہم پرستانہ اور غیر صحت مندانہ پہلوؤں سے پاک کیا گیا ہے۔

پہلا قومی ناٹک میلا جو پچھلے اکتوبر میں منعقد ہوا تھا اس نے کلاسیکی ڈراموں سے متعلق کام کرنے والوں کو ناٹک میں نمایاں حقیقت پسندعناصر کو وضاحت کے ساتھ دیکھنے میں مدد دی۔ اس بات نے ان کے لیے قوت بخش تحریک کا کام دیا کہ وہ نفیس روایات کو آگے بڑھائیں اور اس بنیاد پر جدید قومی اوپیرا تخلیق کریں۔

ناٹک میلے کے بعد سے اچھے اور نئے میعاری اور اصلاح یافتہ اوپیرا اور ناٹک اسٹیج کیے گئے۔ تین ناٹک جن میں "لیانگ شان۔ پو اور جو۔ ینگ تائی" "سفید سانپ کا قصہ" "چھوٹا خاوندرا" "مغربی کمرے میں" نام کے ناٹک شامل ہیں۔ اور جنہیں ناٹک میلے میں سراہا گیا۔ کلاسیکی اور مقامی ناٹک منڈلیوں نے ان کو اسٹیج کیا۔ ناٹک میلے میں فنی مظاہرے سے متاثر ہو کر ایکٹر اور ایکٹریسیا اپنی اداکاری کرداروں کی عکاسی اور گانے کے میعار کو بلند کرنے کے لیے سخت محنت سے کام لے رہی ہیں۔

یہ حقایق اداکاروں، ہدایت کاروں اور ڈراما نگاروں کی انجمن کے چیئرمین تین ہان اور مشہور ڈایریکٹروں ہونگ شان اور ما۔ ین۔ شیانگ کی رپورٹوں میں پیش کیے گئے۔ بہرحال انہوں نے اس بات کی طرف اشارا کیا کہ جدید اور کلاسیکی ناٹک ابھی تک سامعین کی مانگوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں۔

جدید ناٹک کمپنیوں کے لیے اس بات پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے ناٹکوں کے ذخیرے کو مشہور روسی اور بدیسی ناٹکوں اور قومی آزادی سے پہلے کے ترقی پسند مسودوں سے تو سیع دیں۔

نوبل انعام پانیوالے امریکی سائنسداں

یوسیس

سب لکھے پڑھے لوگ جانتے ہیں کہ ایلفریڈ بی۔ ایچ نوبل کی وصیت کے مطابق سویڈن میں ہر برس دنیا کے بہترین موجدوں۔ سائنسدانوں، نوع انسانی کی خدمت کرنے والوں، ادیبوں، ڈاکٹروں اور امن عالم کے لیے بہترین کوشش کرنے والوں کو انعامات دیے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ بڑی رقم میں اور کہیں نہیں دی جاتی۔ اب کے امریکا کے دو باشندوں کو نوبل پرائز ملا ہے ہندستانی میں بھی اب تک پانچ نوبل انعام جا چکا ہے۔

ہر برس ۱۰ر دسمبر کو جو نوبل انعامات دیے جاتے ہیں ان سے نوع انسانی کے محبتوں اور فیض رسانوں کی عزت افزائی ہوتی ہے

یہ انعامات سویڈن کے کیمیا دان موجد اور نامور مخیر ایلفریڈ برن ہارڈ نوبل کی وصیت کے مطابق مقرر کیے گئے ہیں جن کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا۔

انہوں نے نوے (۹۰) لاکھ ڈالر کی رقم وقف کی جس کے سود کی رقم ایسے اشخاص میں انعامات کے طور پر تقسیم کی جاتی ہے جو نوع انسانی کے فائدے کے لیے سال بھر کے دوران میں کوئی نمایاں کام کریں۔ اور فزکس (طبیعیات) کیمسٹری (کیمیا دانی) میڈیسن (دوائیں) فزیالوجی (علم الاعضا) ادب اور امن عالم کے متعلق کوئی دریافت یا ایجاد کریں یا کوئی اہم خدمت بجا لائیں۔

ہر ایک انعام ایک ڈپلوما، سنہری تمغے اور ۳۰ ہزار ڈالر سے ۴۰ ہزار ڈالر کی رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔

امن کا انعام اسلو ناروے میں مسٹر نوبل کی برسی کے موقع پر ۱۰ر دسمبر کو دیا جاتا ہے۔ فزکس۔ کیمسٹری اور میڈیسن اور ادب کے لیے انعامات سٹاک ہام سویڈن میں جدید دنیا کے سویڈن ایک شاندار تقریب میں اسی دن (۱۰ر دسمبر) تقسیم کرتے ہیں۔ اس صدی کے شروع میں نوبل انعام کی بدولت فزکس کیمسٹری، میڈیسن اور ادب (لٹریچر) کی ترقی کا پتا چلتا ہے۔

اس وقت تک جن ۱۶۰ اشخاص کو یہ انعامات ملے ہیں ان کی فہرست پر غور کرنے سے ایک طالب علم کو معلوم ہوتا ہے کہ علم کی ترقی کے لیے کتنا شاندار کام ہوا ہے۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ عالمی امن کے متعلق انسان کوششیں ابتک کچھ زیادہ بارور نہیں ہوئیں۔

۱۹۵۳ء میں انعام پانے والے

اس سال نوبل انعام پانے والوں میں دو ممتاز امریکی شامل ہیں۔ مسٹر جارج سی مارشل جنہیں امن کا انعام اور ڈاکٹر فرٹز اے لپمین جو میڈیسن کے لیے نوبل انعام میں اور ایک شخص کے شریک ہیں۔

ڈاکٹر لپمن ہارورڈ یونیورسٹی امریکا میں بیالوجیکل کیمسٹری بیالوجیکل کیمسٹری (حیاتیات کی کیمیا دانی) کے پروفیسر ہیں اور انہیں ۴۰۔۸۴۳۳ ڈالر ملیں گے ان کے دوسرے شریک ڈاکٹر ہینس کریب ہیں جو شیفیلڈ یونیورسٹی انگلستان میں پروفیسر ہیں انہوں نے انسانی جسم کے سیلز (خلیوں) کے متعلق ریسرچ

کی ہے۔ ان کی تحقیق سے جسم کی کیمیاوی ساخت اور جسم پر وٹامن کا طبیعاتی اثر اور ذیابطس (شکر آنا) میں خلیوں میں بے قاعدگی پیدا ہونے متعلق اہم دریافتیں ہوئی ہیں۔ ان کی ریسرچ سے علاج اور روایتوں کی دریافت میں جو ترقی ہوئی ہے اسے ساری سائنسی دنیا نے تسلیم کیا ہے۔

امن کا انعام

مسٹر مارشل کو امن کا انعام دیے جانے سے ان کی ان مختلف قسم کی کوششوں کا اعتراف کیا گیا ہے جو انہوں نے عالمی امن اور عالمی خوش حالی کے لیے جاری رکھی ہیں ۷۲ سالا مارشل غالباً مارشل پلان یعنی یورپ کی بحالی کا پروگرام مرتب کرنے کے لیے زیادہ مشہور ہیں جو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں تیار کیا تھا جب وہ امریکا کے وزیر خارجا تھے۔

مسٹر مارشل نے اول اول اس وقت شہرت حاصل کی جب آپ دوسری عالمی جنگ میں چیف آف سٹاف تھے جنگ کے بعد آپ اپنی مرضی سے فوج سے ریٹائر ہو گئے۔ بعد میں پھر انہوں نے سابق امریکی صدر مسٹر ٹرومین کے ذاتی سفیر کی حیثیت سے چین میں خانہ جنگی کے خاتمے کے لیے کام کیا۔ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ۔

"جنگ نوع انسانی کے لیے ایک نہایت بھیانک المیا اور ٹریجڈی ہے۔"

امریکا کے وزیر خارجا اور مارشل پلان کے اصلی مصنف اور بانی کی حیثیت سے آپ نے یورپ کے ان تمام ملکوں کی بحالی کے لیے پروگرام بنایا جو جنگ کی وجہ سے برباد ہو گئے تھے بہرحال انہیں صرف مغربی یورپ میں ہی اس پلان کو عملی جامہ پہنانے کے کیونکہ سوویت روس نے اس پلان کو منظور نہیں کیا اور اپنے زیر اقتدار مشرقی یورپ کے ملکوں کو اس پروگرام کے تحت امداد حاصل کرنے سے منع کیا۔

۱۲ ویں امریکی

مسٹر مارشل ۱۲ ویں امریکن ہیں جنہیں امن کے لیے نوبل انعام ملا ہے۔ یہ انعام سابق صدر تھیوڈور روزویلیٹ کو ۱۹۰۶ء میں ایلی ہوروٹ کو ۱۹۱۲ میں صدر وڈرو ولسن کو ۱۹۱۹ میں نایب صدر مسٹر چارلس جی ڈاویز کو ۱۹۲۵ء میں وزیر خارجا مسٹر کیلاگ ۱۹۲۹ء میں وزیر خارجا کارڈل ہل کو ۱۹۴۵ء میں مشتری جان آرموٹ اور ایملی جی بالنش کو ۱۹۴۶ء میں اور ڈاکٹر رالف جے بنیشے کو ۱۹۵۰ء میں دیا گیا۔

کل پچاس انعام

امریکنوں کو اس وقت تک کل پچاس انعام ملے ہیں جن میں سے دس فزکس کے لیے نو کیمسٹری۔ ۱۵ میڈیسن اور فزیالوجی کے لیے ۱۴ ادب کے لیے اور ۱۲ امن کی مساعی کے لیے دیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک امریکی تنظیم امریکن فرینڈس سروس کمیٹی کو بھی ۱۹۳۸ میں ایک انعام ملا جس میں انگلستان کی تنظیم فرینڈس سروس کونسل شریک تھی۔

ان امریکنوں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے کئی نوبل انعام پانے والے بھی اب امریکا میں آباد ہو گئے ہیں جن میں البرٹ آئنسٹائن۔ وکٹر ایف ہاس پیٹر جے ڈبلیو دوبے۔ اینریکو فارمی جیمز فرینک اور آٹو میرہوف شامل ہیں۔ اس طرح آج امریکا میں کسی دوسرے ملک کے مقابلے میں نوبل انعام پانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کا اختلافی نوٹ

ہم جارج مارشل کو امن کا نوبل انعام دیے جانے سے ہرگز متفق نہیں ہیں۔ اس لیے کہ مارشل کی ساری زندگی جنگ جدل لڑائی بھڑائی اور خون آشامیوں میں گذری۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی جیسے کسی سات سو چوہے کھا کر بلی حج کو گئی۔ عمر بھر قتل و غارت اور لاکھوں ہی آدمیوں کے خون میں اپنے ہاتھ رنگنے کے بعد اگر مارشل نے امن یورپ کے لیے کوئی پلان بنایا تو اس کے باعث اس کے پچھلے تمام پاپ ہرگز ہرگز دھل نہیں سکتے۔ ایک جنگ باز سراسر ظالم ہوا کرتا ہے اس

آسمان پر تھی۔ جہاں دیپک شاہ اور سری دیوی دیوتا اور دیوی کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایک سونے کا بنا ہوا ہار ایک سونے کی کشتی میں اس لیے رکھا ہوا تھا کہ منتخب شدہ راجکمار کے گلے میں ڈال دیا جائے چنانچہ راجکماری نے وہ ہار لے لیا اور دیپک شاہ کے گلے میں ڈال دیا۔ شرط کی رو سے اب راجکمار دیپک شاہ، راجکماری سری دیوی کا شوہر بننے کا مستحق تھا۔ راجکماری اور راجکمار کی شادی نہایت ہی دھوم دھام سے ہوئی جس میں شاہانہ روایات کو ملحوظ رکھا گیا۔ دونوں میں بے حد محبت تھی اور وہ اپنی اس ازدواجی زندگی سے بے حد مسرور تھے۔ راجا وکرم سینا اس وقت حتی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے کئی کشتیاں جو جواہرات سے بھری ہوئی تھیں اس محبت کے حسین و جمیل جوڑے پر سے نچھاور کر دیں۔

شادی کے بعد کچھ عرصہ ٹھہر کر اپنی نوعروس یعنی راجکماری کے ہمراہ اپنے دارالسلطنت کا رخ کیا۔ رستے میں ایک شہر "پرالٹسٹنہ" ملا غروب آفتاب کے وقت وہ یہاں پہنچے ایک خوب صورت باغ میں رات بھر کے لیے خیمہ زن ہوئے جب وہ رات کا کھانا کھا چکے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک روشنی شہر سے ان کی طرف آ رہی ہے وہ ایک جلوس تھا۔ یہ جلوس ایک جگہ آکر رک گیا۔ یہاں ایک چتا بنی ہوئی تھی اس کے سامنے ایک تابوت رکھا ہوا تھا جس میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ کا جنازہ تھا۔ دوشیزہ کے چہرے پر ایک دائمی تبسم رقصاں تھا۔ اس کے تابوت کے اطراف ماتم کرنے والے آہ وزاری میں مصروف تھے۔ راجکمار نے اپنے ایک ملازم کو روانہ کیا کہ وہ حقیقت حال دریافت کرے۔ ملازم نے یہ خبر دی کہ یہ جنازہ راجکماری لیلاوتی کا ہے جو راجا کراکا کی لڑکی تھی یہ راجا پرالٹسٹنہ پر حکومت کرتا تھا۔ صبح جب وہ اپنے باغ میں پھول توڑ رہی تھی سانپ نے اسے ڈس لیا۔ دارالسلطنت کے تمام منتر جاننے والوں کو بلایا گیا لیکن کوئی بھی راجکماری کو موت کا ظالم پنجوں سے بچا نہ سکا۔

جب دیپک شاہ کو راجکماری لیلاوتی کی موت کی وجہ معلوم ہوئی تو اس نے راجکماری سری دیوی سے کہا کہ راجکماری لیلاوتی مری نہیں بلکہ اس پر غشی طاری ہے اس نے کہا اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ موسیقی کے اثر سے اسے ہوش میں لائیگا۔

جب راجا کراکا کو معلوم ہوا تو اسے تعجب ہوا کہ جب منتر جاننے والے سانپ کے اثر کو دور نہ کر سکے تو بھلا موسیقی کے اثر سے اس کا اثر زایل ہو سکے گا۔ اور راجکماری زندہ ہو جائیگی اسے یقین نہ آتا تھا لیکن چونکہ اسے اپنی لڑکی سے بے حد محبت تھی اس لیے اس نے موسیقی سے اس کا علاج کرانا قبول کر لیا۔ اور اس نے حکم دیا کہ کوئی رسومات ادا نہ ہوں۔

دیپک شاہ نے ایک حوض میں غسل کیا جس میں کنول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اپنا ساز لے کر وہ جنازے کے ساتھ شاہانہ وقار سے چلا۔ عوام اسے حیرت و تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے انہوں نے خیال کیا کہ راجکماری کے دردمند والدین کی التجاؤں کو سن کر دیوتا انسان کی شکل میں نمودار ہوا ہے تاکہ مردار راجکماری کو دوبارہ زندہ کرے۔

دیپک شاہ نے جنازے کے اطراف تار بجاتے ہوئے تین چکر کیے تار سے بہترین نغمے پیدا ہو رہے تھے جوں ہی کہ اس نے تیسرا چکر پورا کیا ایک سانپ قریب کی جھاڑی سے نکلا اور اس انگلی کو جہاں پر اس نے کاٹا تھا چوسنا شروع کیا جوں جوں سانپ چوستا جاتا تھا راجکماری کا زرد چہرا سرخ ہو رہا تھا اور اس میں زندگی کے آثار پائے جانے لگے۔ جب سانپ چوسنا ختم کیا تو اس نے تین مرتبہ اپنے پھن کو زمین پر مار کر دیپک شاہ کو سلام کیا اور چلا گیا۔

اب دیپک شاہ نے خوشی و مسرت سے بھرا ہوا راگ ستار پر بجایا جس کے اثر سے راجکماری کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لبوں پر تبسم تھا۔ وہ تابوت میں بیٹھ گئی۔ اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کے حیرت و تعجب کی انتہا نہ رہی۔

جب اس کی نظر چتا پڑی اب دیپک شاہ نے نام لے کر پکارا اور اسے ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔ اور پھر اسے اس کے منھ بولے والدین کے ہاں لے گیا، جو حیرت و تعجب کے مجسمے بنے کھڑے تھے جب راجکماری لیلاوتی کو دیپک شاہ کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ جب راجکماری نے ان سے گفتگو کی تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اور پرجوش مسرت میں اس کی پیشانی کے ان گنت بوسے لیے۔ راجکماری سری دیوی بھی راجکماری لیلاوتی سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ملی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں

راجا کرا کا عجب کشمکش و پنج میں تھا۔ کیونکہ راجکمار دیپک شاہ کے لایق کوئی تحفا اس کے ہاں نہ تھا۔ اگر راجکمار کے قابل کوئی تحفا تھا تو وہ راجکماری لیلاوتی تھی۔

آخر کار راجا کرا کے بار بار اصرار پر اور راج کماری سری دیوی کی رضامندی اور خوشی سے راجکمار دیپک شاہ نے راجکماری لیلاوتی سے شادی کرلی اور یہ حسین و جمیل جوڑے کچھ دن یہاں قیام کرکے دار السلطنت کی طرف روانا ہوئے۔

ٹکٹیں جمع کرنا

تقریباً ایک کروڑ امریکی مختلف ملکوں ۱۶۳ حکومتوں کی ۴۵۵۵ قسم کی نئی ٹکٹیں جمع کرنے اور اپنے البم پورے کرنے کے شوقیا کام میں لگے رہتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے ٹکٹیں جمع کرنے والوں کے ساتھ کاروبار اور لین دین کرتے ہیں۔

امریکا میں ٹکٹیں جمع کرنے کا شوق ۱۸۴۲ء سے شروع ہوا ہے جب کہ گوندگی ہوئی ٹکٹیں رایج ہوئی تھیں امریکا کا ڈاک کا محکمہ بھی ٹکٹیں جمع کرنے کے شوق کی حوصلا افزائی کرتا ہے اور خود بھی نئی نئی یادگاری ٹکٹیں جاری کرتا رہتا ہے

محبت کے پھول

عزیز الحسن ضیا (عثمانیا)

(۱)

غم کے بادل میری دنیا پر چھائے ہوئے تھے کہ تو نے مجھے زندگی عطا کی!

اے میرے محبوب! جس کے تصور سے میں ایک نئی روح اور ایک نئی مسرت محسوس کرنے لگتا ہوں ــــ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میرے لیے تیرے ساز کے تاروں میں محبت کے نغمے گونج رہے ہیں۔ بلکل اسی طرح جیسے میرا دل تیری محبت کی تیز شراب سے مخمور ہے۔

میں تیرا ہوں اور زندگی بھر تیرا ہی رہوں گا ــــ
تیرے سوا میرے دل میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں!

(۲)

میں اور تو ــــ میں ایک ایسی بستی کی تلاش میں ہوں جہاں ہمارے سوا کوئی نہ ہو اور جہاں ایسے لوگوں کا گذر نہ ہو جو محبت اور حسن کا راز نہیں جانتے اور زندگی کو فطرت کا ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے اور ان کی دنیا سے علحدہ رہنا چاہتا ہوں!

میری محبت کے مندر میں کوئی ایسا پجاری نہ آئے جس کا دل درد کی لطافتوں سے نا آشنا ہو! مجھے ایسے لوگوں کی جستجو ہے جن کے دل محبت کی صداقت سے لبریز ہوں اور جن کی زندگی فریب و مکر سے آلودہ نہ ہوئی ہو!

لیکن ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ یہ دنیا ایسے لوگوں سے خالی ہے میں ایک ایسی بستی آباد کرنا چاہتا ہوں جہاں تیرے اور میرے سوا کوئی نہ ہو! یہ دنیا فریب و مکر کی دنیا ہے ــــ میں ایسی دنیا سے عاجز آگیا ہوں۔ میں ایسی دنیا سے کنارا کش ہو جانا چاہتا ہوں!

میری دنیا پریت کی دنیا ہو ــــ اور تو اس دنیا کی رانی۔

جسم انسانی کی تربیت

۱۰۱

جسم انسانی اس نشو و نما کا نتیجہ ہے جو لاکھوں برس تک ہوتی رہی اور اکثر لوگ زندگی کی اس داستان سے بھی واقف ہیں جس کی ابتدا برسہا برس گذرے حیوانات کی شکل میں ہوئی اور وہ حیوانات اس قدر چھوٹے ہوتے تھے کہ آنکھ ان کو دیکھ بھی نہ سکتی تھی ۔ اور ان کے جسم کا صرف ایک خلیہ ہوتا تھا ۔ اس حقیر سی ابتدا سے زندگی کی نشو و نما شروع ہوئی اور پھر اس نے بیشمار اجزا والی شکلیں اختیار کیں ۔

جسم انسانی کا بنیادی یونٹ (اکائی) ہی خلیا ہے جو ایک خلیے والے ان حیوانات سے بالکل ملا جلا اور جو نشو و نما کے زینے کے زیرین ترین مقام پر ہیں ۔ لیکن ان میں ایک بہت اہم فرق بھی ہے یعنی ایک خلیے والے حیوان ایک آزاد نظام رکھتے ہیں جبکہ انسانی جسم کے خلیوں میں یہ آزادی مفقود ہے ۔ ان خلیوں کی زندگی مشترکہ ہے جو مختلف اجزا کے ایک سالم کے یونٹوں کے طور پر منتظم ہوتے ہیں ۔

جسم کے اندر حرکت کی ایک عمدا اور مختلف نوعیت کی تقسیم بھی ہے جو اسے تفریق اور تفس وغیرہ کے مختلف فرائض انجام دینے کے قابل بناتی ہے ۔ اگرچہ جسم انسانی ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے مگر ایک جاندار شے ہے یہ بڑھتا ہے اور اس کے حسب معمول کاموں میں قوت بھی صرف ہوتی ہے ۔ ان دو امور کے لیے جسم انسانی کو مقوی غذا کی بھی ضرورت پڑتی ہے ۔ غذا ہضم کرنے کا کام آلات ہضم کرتے ہیں ۔ ان کا دایرہ بہت طویل ہے اور ان نے بڑے بڑے اجزا ہیں معدے اور آنتیں شامل ہیں ۔ اس دایرے سے ایسے اعضا بھی وابستہ ہیں جو بدن سے غذا کے ہضم میں مدد دینے والی رطوبت حاصل کرتے ہیں ۔

غذا جو ہم کھاتے ہیں وہ مادہ جسمانی سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہیں ۔ اور جب تک اسے تحلیل کر کے قدرے مادہ جسمانی کی مانند نہ بنا دیا جائے نظام انسانی اسے ہضم بھی نہیں کر سکتا ہے غذا کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے کسی شے کو بھسم کیا جائے اسی لیے غذا کو جلانے کے لیے ہمیں جسم کے اندر آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے اور آکسیجن کے نظام تنفس کے لیے پھیپھڑے ایک بہت ہی اہم جز ہیں ۔ اور پھیپھڑے ہمارے ارگرد کی فضا میں سے اس قیمتی گیس کو جسم میں پہنچاتے ہیں ۔

غذا ہضم ہو کر زیادہ تر آنتوں میں جذب ہوتی ہے تاہم غذا جسم کے ہر حصے میں پہنچتی ہے کیونکہ ہر حصہ جاندار ہے اور جسم میں دوران خون کے ذریعے یہ کام سرانجام پاتا ہے دوران خون کے بڑے آلات دل اور خون کی رگیں اور نسیں ہیں جسم انسانی فضلاتی مادے بھی تیار کرتا رہتا ہے اور ان کا اخراج بھی ضروری ہے ورنہ تمام نظام جسمانی زہر کی وجہ سے تباہ ہو جائے ۔ یہ فضلاتی مادے جلد میں پسینے کے غدودوں اور سانس کے باہر اخراج کے ذریعے بھی خارج ہوتے رہتے ہیں ۔

جسم انسانی کا ڈھانچا اور ہیئت دونوں مستحکم ہیں اور جب تک اس استحکام کو برقرار نہ رکھا جائے جسم اجتماعی فرائض کو انجام دینے سے معذور رہے گا ۔ ڈھانچے کا نظام جس میں ہڈیوں کی اجتماعی ترتیب شامل ہے) ہی جسم کو استحکام کی صورت دیتا ہے جسم کو حیات انسانی کے روز روز کے معمول میں بے شمار حرکات کرنی پڑتی ہیں اور یہ حرکات محض چلنے پھرنے

یا بات اٹھانے تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں اندرونی جسم کے اعضا کی حرکات بھی شامل ہیں جن کا ہمیں شعور بھی نہیں ہے پٹھے جسم کو متحرک ہونے کے قابل بناتے ہیں جن کے ریشوں میں انقباض پذیری کی خاصیت ہوتی ہے۔

نظام جسمانی لگاتار اپنے ماحول کے تبادل موثرات سے گذر رہا ہے متعدد آلات حس مثلاً آنکھ۔ کان۔ ناک زبان اور جلد اپنے ماحول کی تبدیلیوں کی اطلاع نظام اعصابی کو پہنچاتے ہیں۔ اور جسم اس نظام اعصابی کے ذریعے ضروری تطبیق کرتا ہے جو نظام فضلات کو احکام پہنچاتا ہے اس لیے جسم کے اندر ارتباط کا عالاترین فرض نظام عصبی پر عاید ہوتا ہے اور اس نظام کے اہم ترین اجزا دماغ اور حرام مغز ہیں۔

معما

شاہین فاروقی
(عثمانیا)

مصیبت موت کی ہرکارا ہے یا زیست کی رہبر؟ دکھ، دکھ کے لیے ہے یا اس میں حیات کا پیغام مسرت؟ تکلیف میں آہ و شیون ہے یا سرور انگیز اٹکھیلیاں۔ مصیبت اپنے محبوب کو اس کے رستے سے ہٹانے آتی ہے یا صبر آزما زندگی میں ڈھالنے؟

زندگی کے اس گھن چکر میں تکلیف کیوں مانیں؟ سچ لیں کہ ہر مصیبت زندگی کے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص پیغام لاتی ہے ہر تکلیف اور مصیبت میں کون کون سے اسرار پنہاں ہیں۔

اسے ہم کیا جانیں؟

تکلیف بھی راحت ہی کی دوسری شکل ہے — اس سے گھبرانے اور حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ سچ مانو تو یہ خدا کی بہت بڑی دین ہے — پیش خیمہ ہے — شام کے بعد سحر کی پیدائش کی

اور پھر یہ سوال خد بخد حل ہو جاتا ہے کہ مصیبت میں موت کا سکون پوشیدہ ہے یا زندگی کا حسین خواب؟

سینما اور ٹیلی ویژن تھیٹر

ماسکو میں ایک سینما اور ٹیلی ویژن تھیٹر کھلنے والا ہے۔ یہ باغ "گوشا نیشنی" میں سینما تھیٹر کی جگہ قایم ہوگا۔ مشینیں اور اسکرین لگانے کا کام ہو رہا ہے یہ اسکرین تین میٹر اونچی اور چار میٹر چوڑی ہوگی آواز جذب کرنے والی چھت اور دیواریں بنائی جا رہی ہیں اس طرح سے ٹیلی ویژن براڈ کاسٹ کے ساتھ گانے اور مکالمے وغیرہ بہت اچھی طرح سنائی دیں گے۔

آج کل بجلی کے مشہری ہائی فری کونسی اور ہائی وولٹیج کی بجلی کے لیے تار لگا رہے ہیں ٹیلی ویژن اور بڑی اسکرین پر تصویر ڈالنے کے آلے ایک مخصوص کمرے میں لگائے جا رہے ہیں اس آلے کا ڈیزائن تیار کرنے اور خداس آلے کو بنانے میں کئی سائنٹیفی تحقیق کے اداروں صنعتی کارخانوں نقشہ بنانے اور عمارت تعمیر کرنے والے اداروں کی مدد کی۔

بڑی اسکرین پر اچھی قسم کی ٹیلی ویژن تصویر منعکس کرنا ایک پیچیدا سائنٹیفی اور انجنیری مسلا ہے۔ عام ساخت کے ٹیلی ویژن سیٹ پر ہمیں وہ عکس نظر آتا ہے جو کاتھوڈ اسکوپ کی اسکرین پر براہ راست آتا ہے بارامر یع میٹر کی اسکرین پر ٹیلی ویژن کے عکس کو صاف دکھانے کے لیے عکس کو بڑا نا اور مختلف محرب شیشوں کے سلسلوں میں سے کوئی دس میٹر تک گذار کر اسکرین پر ڈالنا پڑتا ہے اس مقصد کے لیے آئینا دار لینس استعمال کیا جاتا ہے جو روشنی کے اثر کو قبول کرنے کے لیے خاص طور پر زیادا طاقت ور ہوتا ہے اس مقصد کے لیے یہ آئینا دار لینس پروفیسر سلیوسازیف نے تیار کیا ہے ٹیلی ویژن کی تصویر کی چمک ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ اس پالیش کی اسکرین پر سینما کی مثبتین سے منعکس ہونے والی تصویر کی ہوتی ہے

چیل

طالوت

چیل ایک ایسا پرند ہے جس سے ہر کہہ و مہ واقف ہے خورد و کلاں سب اس کو جانتے ہیں اور اس کی جھپٹا جھپٹی کی عادت کو پہچانتے ہیں۔ یہاں نہ اس کی حقیقت و ماہیت سے بحث ہے اور نہ اس کے خواص وغیرہ سے۔ بلکہ ادب عربی کی کتابیں مطالعہ کرنے سے چند ایک تاریخی واقعات ایسے گذرے جو اس پرندے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یقیناً وہ قارئین "ہندستانی ادب" کے لیے بھی معلومات افزا اور دلچسپ ثابت ہوں گے۔ اس مضمون میں صرف انہیں واقعات کا ذکر مقصود ہے۔

۱۔ صحیح بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس ایک لونڈی تھی وہ عموماً یہ شعر پڑھا کرتی تھی۔ یعنی

ویوم الوشاح من اعاجیب ربنا
علی انہ من طلمت الکفر نجانی

یعنی ہار والا دن رب اکبر کے عجائبات میں سے ہے اور اس نے مجھے کفر کی تاریکی سے نجات دی۔ حضرت عائشہ نے ایک دن ان سے پوچھا اکثر و بیشتر یہ شعر تمہاری زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عجیب قصہ اس سے متعلق ہے ہمیں بھی تو سناؤ۔ لونڈی نے عرض کیا۔ میرے پہلے آقا کے ہاں ایک بار شادی ہوئی دلہن جب غسل خانے میں گئی اور سونے کا ہار اس نے اتار کر رکھا۔ تو اس بار کو ایک چیل اٹھا کر لے گئی۔ دلہن کو نیا ہار مل سکا کہ ہار کدھر گیا ہے کافی تلاش کے بعد جملہ گھر والوں کا سوءِ ظن مجھ پر پڑ گیا کہ ہار میں نے چرایا ہے۔ میری تلاشی لی گئی اور کچھ نہ نکلا مگر ان کی بدگمانی نہ گئی۔ میں ان لوگوں کے درمیان انتہائی شرمندگی کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ خدائے قدیر سے دعا مانگ رہی تھی کہ اے قادر و توانا اور حی و قیوم تو ہی میری صفائی دے سکتا ہے کہ اچانک چیل اوپر سے گذری اور ہار اس کے پنجے میں سے گر کر ان لوگوں کے درمیان آپڑا یہ ہے اس مستجیب الدعوات کی قدرت کا کرشما کہ اپنی ایک عاجز لونڈی کی اس طرح صفائی دیدی

۲۔ حافظ نفسی نے فضایل الاعمال میں ایک روایت بیان کی ہے کہ شیخ القراء عاصم ابن ابی النجود کو ایک بار فاقوں کی وجہ سے بہت مصیبت جھیلنی پڑی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں تنگ آکر بعض دوستوں کے پاس سوال کی غرض سے گیا۔ مگر ان کے چہروں پر گرفتگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تو میں اس کے پاس سے اٹھ کر جنگل میں چلا گیا۔ اور کافی دیر تک نماز پڑھتا رہا۔ اس کے بعد سر سجدے میں ڈال کر بارگاہ خداوندی میں میں نے عرض کی۔

یا مسبب الاسباب یا مفتح الابواب یا سامع الاصوات یا مجیب الدعوات یا قاضی الحاجات الفنی بحلالک عن حرامک واغنی بفضلک عمن سواک۔

وہ فرماتے ہیں کہ ابھی میں یہ دعا پڑھ ہی رہا تھا کہ کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سرخ سی تھیلی ہے جو ایک چیل کے پنجے سے گر گئی۔ تھیلی کو کھول کر دیکھا تو اشرفی دینار اور ایک نہایت قیمتی موتی اس

میں سے برآمد ہوئے چنانچہ خدا کا شکر بجا لاکر میں گھر چلا گیا۔ اور زمین وغیرہ خرید کر نہایت آسودگی سے گذارنے لگا۔

۳۔ قشیری نے اپنے رسالے میں ذکر کیا ہے کہ حضرت شبل مروزی ایک دن گوشت خرید کر گھر آرہے تھے کہ رستے میں گوشت کو چیل جھپٹ کر لے گئی۔ آپ بجائے گھر آنے کے مسجد میں تشریف لے گئے۔ اور دیر تک نماز پڑھتے رہے۔ جب کھانے کے وقت گھر تشریف لائے تو آپ کی اہلیہ نے گوشت سامنے رکھا آپ نے پوچھا کہ یہ کہاں سے آگیا۔ تو اس نے عرض کیا کہ دو چیلیں لڑتی ہوئی آئیں۔ اور ان کے پنجے سے یہاں نیچے گر پڑا۔ حضرت شبل نے فرمایا:۔

الحمد للہ الذی لم ینس شبل وان کان شبل ینسا کا۔

۴۔ دینوری نے کتاب المجالسۃ میں ذکر کیا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص فاتح ایران کے سامنے ایک بار گوشت رکھا ہوا تھا ایک چیل آئی اور جھپٹ کر لے گئی۔ حضرت سعد نے بد دعا دی تو اسی گوشت کی ایک ہڈی اس کے حلق میں ایسی پھنسی کہ وہ آخر مر گئی۔

۵۔ دمیری نے حیوۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ ایک بار حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ وعظ فرما رہے تھے کہ ایک چیل نے اوپر آکر شور مچانا شروع کر دیا۔ حاضرین اور شیخ اس سے بہت پریشان ہوئے اس وقت ہوا بھی بہت زور سے چل رہی تھی شیخ نے فرمایا اے ہوا اس چیل کا سر علیحدہ کر لے چنانچہ ان کا فرمانا تھا کہ چیل کا دھڑ وہیں گر پڑا اور سر دور جا کر پڑا۔ شیخ نے کرسی سے اٹھ کر اس کا دھڑ ایک ہاتھ میں لیا اور سر دوسرے میں۔ اور بسم اللہ پڑھ کر انہیں جوڑ دیا چیل زندہ ہو کر اڑ گئی اور جملہ حاضرین دیکھتے رہ گئے۔

ہفتہ ستانی ادب کے خریدار بن کر ہمیں علم و ادب کی سیوا کا موقع دیجئے

موسیقاروں کے تخلیقی کام

چ-۱

چینی نغمہ سازوں نے پچھلے چار سالوں میں ۹ ہزار گیت تخلیق کیے ہیں انہوں نے نئے اوپیرا اور تناروں پر بجائی جانے والی دھنیں بھی اچھی تعداد میں تخلیق کی ہیں اور ۵۸ فلموں کی موسیقی تیار کی ہے۔

موسیقاروں کی کل چین انجمن کے چیئرمین اور مشہور نغمہ نویس لوچی نے یہ حقایق اس انجمن کی کانفرنس میں بیان کیے۔

نیچے بتائے ہوئے گیت خصوصی تخلیقات میں سے ہیں (۱) "دنیا میں عوام کے دل ایک دل کی طرح متحد ہیں" یہ گیت عورت نغمہ ساز چو۔ شی۔ شین کا تیار کیا ہوا ہے۔ (۲) "مادر وطن کے نام" یہ گیت وانگ شین چا کی تخلیق ہے (۳) "عظیم چیئرمین ماؤ۔ زے۔ تنگ" یہ گیت اوئی عزکے فن کار اوپیرا کیمو کا ہے اور (۴) چینی عوامی والنٹیروں کا جنگی نغمہ" یہ گیت چاؤ۔ وے۔ چہرہ کا تیار کیا ہوا ہے اور دوسری خصوصی تخلیقات میں "وانگ کوفے اور لی شیانگ" نام کا اوپیرا ہے "سینڈلوں والی لڑکی" اور "مادر وطن چین کی بیٹیاں" نام کی فلموں کی موسیقی ہے۔ "یہ تخلیقی کام جاندار اسلوب میں چینی عوام کے بیش رو جذبے اور نئی امنگوں کی آئینہ داری کرتے ہیں" لوچی نے کہا "ان تخلیقی کاموں کا عوام کے وسیع حلقوں نے گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے اور انہوں نے ان کی ترقی کو تیز تر کیا ہے" نغمہ سازوں نے کوریائی جنگ کے واقعات سے مزدوروں کسانوں اور اقلیت والی قومیتوں کی زندگی اور بے غرض محنت سے تحریک حاصل کی ہے۔ جدید نغماتی تخلیقات کو مالا مال کرنے کے لیے نغمہ سازوں نے چین کی موسیقی کے نفیس ورثے کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

اسفندار۔ فروردی ۱۳۶۳ف ہندستانی ادب جنوری۔ فروری ۱۹۵۵ء

سوویت یونین کے متعلق ایک ہندستانی کے تاثرات

دیویا بھٹ

(اسکول کی استانی اور کوہن ہیگن میں منعقدہ عورتوں کی عالمی کانگرس میں شرکت کرنے والے ہندستانی وفد کی ممبر کے تاثرات)

سوویت یونین کی زندگی سے جہاں جنتا نے اپنے لیے حقیقی آزادی حاصل کرلی ہے ہم کو ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی ہے سوویت یونین آکر پورا یقین ہوجاتا ہے کہ انسان کا بڑے سے بڑا خواب بھی پورا ہوسکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی جو نہیں جانتی کہ بیروزگاری مفلسی یا عصمت فروشی کیا ہے ہمیں ایک ایسا ملک جہاں ہر فرد کی نگہداشت کی جاتی ہے جہاں سائنس اور کلچر انسانیت کی خدمت کے لیے مامور ہے ۔ کچھ غیر معمولی سا معلوم ہوتا ہے

ہم نے سوویت یونین کے مختلف اداروں اور ہسپتال وغیرہ دیکھے ۔ ہم نے ہزاروں سوالات پوچھے اور ہمیں پورا یقین ہوگیا کہ ملک میں صحت، عامہ اور تعلیم کی ترقی کے لیے جو کچھ بھی کیا جاسکتا تھا کیا گیا ہے ۔

سوویت فیکٹریوں اور کارخانوں کو دیکھ کر ہم تو ششدر رہ گئے اپنی زندگی میں پہلے کبھی ہمیں ایسے مزدوروں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا جنہیں اپنے کارخانوں پر ایسا ناز ہو جیسا کہ کسی ماں کو اپنے پہلوٹھی کے بچے پر ہوتا ہے ۔

میں نے اسٹاخنوفی نامگار عورت میریا روژ نوا سے جنہوں نے لاگت کم کرنے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا ہے ۔ سوال کیا۔

"اپنے بچت کا نیا طریقہ کیسے دریافت کیا؟"

انہوں نے ایک مالکا کی سی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جنگ کے بعد کپڑے کی کمی محسوس ہوئی لوگوں کو ہمیشہ ہی اس قسم کا کپڑا میسر نہ آتا تھا جو ان کی پسند کا ہو یا جس کی انہیں ضرورت ہوتی ہو ۔ اس لیے پیداوار کو بڑھانے کے نئے طریقے دریافت کرنے کا مسلا اٹھ کھڑا ہوا"

میں نے سوویت مزدوروں کے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن میں یہ تصور نہ کرپائی تھی کہ ان کا مفاد ریاست کے مفادات سے اس قدر پوری طرح یکساں ہوں گے ۔ میں نے مزدوروں کو پیداوار کی پوری ذمے داری اپنے اوپر لیتے کبھی نہ دیکھا تھا ہمارے ملک میں رہائشی مکانات کا مسلا دن بدن زیادہ شدید ہوتا جارہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو رہائشی مکانات کی تعمیر کے منصوبوں اور کاموں سے بڑی دلچسپی تھی ۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں پرانے مکانوں کی جگہ نئے مکانات تعمیر کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں ہے دنیا کے تقریباً تمام شہروں میں عالیشان عمارتوں اور بڑے بڑے صنعتی کارخانوں کے ساتھ ساتھ گندے اور بوسیدہ مکانوں کی بستیاں بھی بڑھتی رہتی ہیں ۔ صرف ماسکو ہی میں ہم نہایت غور و خوض کے ساتھ مرتب کیے ہوئے تعمیر کے منصوبے سے روشناس ہوئے اور پرانے مکانوں کی جگہ نئے مکانات تعمیر ہوتے تھے ۔

بچے قوم کا انتہائی بیش قیمت سرمایا ہوتے ہیں سوویت اسکولوں کنڈرگارٹنوں لائبریریوں پارکوں محلوں اور بچوں کے کیمپوں کو دیکھ کر ہمیں پورا یقین ہوگیا کہ سوویت بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے تمام لوازمات مہیا ہیں ۔ ہر بچے کو حقیقی انسان بننے کا موقع ملتا ہے ۔

ہم نے اوپیرا اور بیلے دیکھے ۔ ہم نے فوجی ناچ بھی دیکھے ۔ تھیٹروں میں ہمیں ہر وضع اور پیشے کے لوگ ملے ۔

مزدور پنچایتی کا شتکار دوکانوں کے ملازمین خانہ دار عورتیں ——— جو آرٹ سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔

سوویت یونین میں جیسے سادا اور اس کے ساتھ تہذیب اور تعلیم یافتہ لوگوں سے میں ملی ویسے لوگوں سے ملنے کا مجھے پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ سوویت سماجی نظام نے عوام کو روحانی اور مادی زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کر کے نہ صرف انہیں خش حال کر دیا ہے بلکہ خود انسان کو ہی تبدیل کر دیا۔

جی ہاں مجھے میریا روژنوا سے اتفاق ہے انہوں نے کہا تھا کہ میں خدکو دنیا کی سب سے زیادہ مالدار عورت تصور کرتی ہوں۔ بلا شبہ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ سوویت حکومت ان کی صحت اور تعلیم کا برابر اور ہمیشہ خیال رکھتی ہے۔ اس نے ادب اور موسیقی کو ان کی خدمت کے لیے مامور کر دیا ہے اور انہیں آرام اور کام کی گارنٹی دی ہے۔

ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہندستانی طلبا کی تعداد

جنگ سے قبل ہندستانی و سیلونی طلبا ایڈنبرا یونیورسٹی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایسوسی ایشن کی مقبولیت بڑی تیزی سے بحال ہو رہی ہے ۱۹۳۵-۳۶ء کے درسی سال میں اس یونیورسٹی میں ہندوستانی طلبا کی تعداد ۵۰ کے قریب تھی ۱۹۴۵-۴۶ء میں یہ تعداد کم ہو کر سات رہ گئی تھی ۱۹۵۳-۵۴ء میں یہ بڑھ کر ۱۷۹ ہو گئی تھی۔ اس سال کے اعداد و شمار ابھی تک مکمل نہیں ہوئے۔ لیکن امید ہے کہ ہندستانی اور سیلونی طلبا کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچ جائے گی ———

شیلی

ترجمہ انجم صہبائی (عثمانیا)

پرواز محبت

جب چراغ بھڑک اٹھتا ہے تو اس کی روشنی بہت جلد موت کے آغوش میں سو جاتی ہے جب ابر پار سے سارے آسمان پر چھا جاتے ہیں تو نوس فرح کی زنگینیاں ملیا میٹ ہو جاتی ہیں جب بالنسری کی لے ٹوٹ جاتی ہے تو اس کی نغمہ انگیزیاں بہت جلد حافظہ سے محو ہو جاتی ہیں۔ ہونٹوں سے نکلتے ہی محبت آمیز جملے جلد ہی فضاؤں میں کہیں کھو جاتے ہیں ———

! . . . . !

جس طرح نغمہ و نور بالنسری و چراغ کو زندگی بخشنے کی طاقت اپنے میں نہیں رکھتے۔

! . . . ! — اسطرح — ! . . . . ! ۱۰

دل کو بھی نغمے — سحر انگیز نغمے — زندگیاں نہیں بخشتے جبکہ روح کی بالیدگی پر الم انگیز سکوت چھایا ہو۔

! . . ! — اسوقت — ! . . . . !

نغمے نغمے نہیں بلکہ ایسے غم آلود آگیت کی طرح گوش گذار ہوتے ہیں۔ جیسے ہوائیں۔ ویران جگہوں سے سناتی ہوئی گذر رہی ہیں۔!

! . . . — یا — ! . . . .

جیسے زریا کی آغوش میں سو جانے والے ملاح پر موجوں پر ہلکورے مرثیا پڑ رہے ہوں لیکن جب یک نغمہ دو دل ایک دوسرے سے وابستا ہو جاتے ہیں

! . . . — تب — ! . . . .

محبت جلد ہی ایک خوب صورت آشیانہ تعمیر کر لیتی ہے!!

برطانیا کے قومی اخبار

ولیم کلارک

ذیل کے مضمون میں مسٹر ولیم کلارک نے برطانیا کے دس روزانا اخبارات کا ریویو کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش ہے کہ پریس کے رویے اور پالیسیوں کا ذمے دار کون ہوتا ہے

ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے میں یہ یقین کرتا ہوں کہ بہت سے لوگ صرف خبروں کی خاطر ہی اخبارات کا مطالعا نہیں کرتے ان کی دلچسپی اخبارات کے تبصروں، اور تفریحی مواد سے ہوتی ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے محبوب اخبار نے خبروں کو کس رنگ میں پیش کیا ہے۔

اخبارات کے تبصروں وغیرا کی اہمیت اس چیز سے ظاہر ہے کہ بی۔ بی۔ سی کی سمندر پار کی سروس انہیں باقاعدا طور پر نشر کرتی ہے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخبارات کے رویے کی ذمے داری کس پر ہوتی ہے۔

میں برطانیا کے بعض قومی روزانا اخبارات کی پالیسیوں وغیرا پر بحث کر کے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا میں ہر صبح سب سے پہلے ٹائمز کا مطالعا کرتا ہوں۔ یہ لندن کا سب سے پرانا اور سب سے مشہور اخبار ہے اور میرا یقین ہے کہ اس اخبار کا رسوخ بھی باقی سب اخبارات سے زیادا ہے لیکن اس کے باوجود ان اخباروں کی اشاعت ۱/۲ ۲ لاکھ سے قدرے زیادا ہے۔ حالانکہ اس میدان میں بعض فضل اخبارات ایسے بھی ہیں جن کی اشاعت چالیس لاکھ کے قریب ہے مگر ٹائمز ایک قومی اخبار ہے جس کا ریکارڈ بہت شاندار ہے اس اخبار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خبروں کو پوری طرح شایع کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو یہ اخبار پسند ہے اور چونکے یہ اخبار اونچے طبقے میں پڑھا جاتا ہے اس کے اداریوں کی اہمیت بہت زیادا ہے عام طور پر اس کے اداریے تشریحی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن جب کبھی یہ کسی مسئلے کے متعلق قطعی فیصلا کر لیتا ہے تو یہ اخبار بہت زیادا موثر ثابت ہوتا ہے اس کے رویے کے متعلق کوئی فیصلا کرتا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فیصلا تقریب ایڈیٹر اور اس کے متعدد لایق ساتھی ہی کرتے ہیں۔ ایڈیٹر کی کرسی کے پیچھے دو عالا مالکان کی طاقت ہے ایک کا نام تو کرنل جون آسٹر ہے جس نے ۱۹۲۲ء میں مرحوم لارڈ نارتھ کلف کی جایداد میں سے یہ اخبار خرید لیا تھا۔ اور دوسرے مالک کا نام پیٹر جون والٹر ہے جس کے دادا کے دادا نے ٹائمز کی بنیاد رکھی تھی۔

ٹائمز پبلشنگ کمپنی کے ڈایرکٹر اور یہ دونوں مالکان ایڈیٹر کو مقرر کرتے ہیں۔ ایڈیٹر کے متعلق ایک اہم فیصلا ہے لیکن اس کی تقرری کے بعد وہ اس کے کام میں دخل نہیں دیتے۔ یہ ایک رسم سی بن گئی ہے کہ ٹائمز کے ادارتی کنٹرول اور فینانشل کنٹرول کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جاتا ہے۔

اور ایک ایسا طریقا اختیار کیا گیا ہے جس سے اس بات کی حفاظت ہو جاتی ہے کہ اخبار کا فینانشل کنٹرول ایسے اشخاص کے ہاتھ میں نہیں جانے گا جو اخبار کو اپنی ذاتی پالیسی کا آلہ کار بنانا چاہتے ہوں۔

لے ہاک ورلے لاگ

دوسرا اخبار جس کا میں مطالعا کرتا ہوں "مانچسٹر گارڈین"

ہے۔ اس کا مطالعا کرنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس اخبار کے عملے میں بعض قومی معاملات کے چند ممتاز ماہرین شامل ہیں اور دوسرے یہ کہ اس کے اداریے بہت بے باک اور بے لاگ ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ اخبار لبرل پارٹی کے خیالات سے بھی زیادہ بے لاگ اور بے باک خیالات کا اظہار کرتا ہے اگرچہ اس اخبار کو برطانیا کی لبرل پارٹی کا حامی خیال کیا جاتا ہے "مانچسٹر گارڈین" کے اداریوں کو کون کنٹرول کرتا ہے۔

جواب وہی ہے۔ یعنی اداریوں کی ذمے داری ایڈیٹر پر ہے۔ اخبار کی ملکیت اور فنانشل کنٹرول ایک ٹرسٹ کے ہات میں ہے۔ ایڈیٹر کو ٹرسٹ مقرر کرتا ہے لیکن جہاں تک اخبار کو چلانے کا تعلق ہے ایڈیٹر کو پوری آزادی حاصل ہے ٹرسٹ اس کے کام میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایڈیٹر جو چاہے پالیسی اختیار کر سکتا ہے۔ ام۔ جی یعنی "مانچسٹر گارڈین" کی اپنی روایات ہیں جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک دم سے اخبار اپنی پالیسی تبدیل کر دیتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ ملک میں اس کی عزت کم ہو جائے اور اسے پڑھنے والوں کی جو حمایت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے۔

تیسرا اخبار ڈیلی ٹیلیگراف ہے جس کی اشاعت دس لاک کے قریب ہے اس کے مالک کا نام لارڈ کیمرا زہے جو لارڈ ڈیلمر کے بھائی ہے لارڈ کیمرے بہت سے صوبائی اخبارات کا مالک ہے ٹیلیگراف کا مین ایڈیٹر بھی لارڈ کیمرا زہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس اخبار کی پالیسی کے متعلق پہلے ہی سے پتا لگ جاتا ہے۔ سیاسی طور پر برطانیا کی قدامت پسند پارٹی کی حمایت کرتا ہے اور خارجی معاملات میں یہ ایک مضبوط برطانیا اور امریکا کی دوستی کا خواہش مند ہے اخبار کی بنیادی پالیسی کا فیصلا تو چیف ایڈیٹر ہی کرتا ہے لیکن روز روز کے معاملات میں تھوڑا بہت کنٹرول اخبار کے ایڈیٹر کے ہات میں ہے۔ اس لیے ہم ٹیلیگراف کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا اخبار ہے جس کے اداریوں پر مالک کا کنٹرول ہے۔

ڈیلی میل کی بھی تقریباً یہی حالت ہے اس اخبار کے رجحانات بھی دائیں بازو کی جانب ہیں ٹیلیگراف کے مقابلے میں لوگ زیادہ اس اخبار کا مطالعا کرتے ہیں اس کی قیمت ٹیلیگراف سے ہے اور اس کی اشاعت تقریباً بیس لاک کے قریب ہے اس اخبار کی بنیاد ایلفرڈ ہارمزورتھ نے رکھی تھی جو بعد میں لارڈ نارتھ کلف بن گیا تھا۔ اب بھی یہ اخبار ہارمزورتھ خاندان کی ملک ہے برطانوی اخبارات کی ایک خاص بات یہ ہے کہ متعدد اخبارات خاندانی ملک بن گئے ہیں ٹائمز کی بنیاد ۱۸ ویں صدی میں رکھی گئی تھی اور اب تک یہ اخبار جزوی طور پر والٹر خاندان کی ملک ہے۔ مانچسٹر گارڈین کی ملکیت کا اسکاٹ خاندان سے گہرا تعلق ہے۔ ڈیلی میل ہارمزورتھ خاندان کی ملک ہے۔

ڈیلی ایکسپرس ایک ایسا اخبار ہے جس پر صرف ایک آدمی کا کنٹرول ہے اسے ایک کمپنی چلاتی ہے جس کے سب سے زیادہ حصے لارڈ بیورو بروک کے ہات میں ہیں۔ وہ کمپنی کا منیجنگ ڈائرکٹر نہیں ہے وہ چیف ایڈیٹر بھی نہیں ہے سچ تو یہ ہے کہ جس عمارت میں یہ اخبار چھپتا ہے اس میں اس کا کوئی دفتر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کمپنی کے چیرمین نے ایک بار کہا تھا "لارڈ بیورو بروک ہی ڈیلی ایکسپرس ہے" چونکہ اس کا کنٹرول ذاتی نوعیت کا ہے اس لیے اس اخبار کی پالیسی کے متعلق کوئی قطعی بات کہنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اخبار سوشلسٹوں کے خلاف ہے اور قدامت پسندوں کی حمایت کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان قدامت پسندوں کی بھی مخالفت کرتا ہے جو تجارتی میں شاہی ترجیحات کے حق میں نہیں۔

ڈیلی ہیرالڈ کی پالیسی کو جاننا کوئی مشکل کام نہیں یہ لیبر پارٹی کا آرگن ہے اور اس کی پالیسی پر پارٹی کا کنٹرول ہے۔ مگر پھر بھی اس کے ایڈیٹر کو کافی آزادی ملی ہوئی ہے مثال کے طور پر حال ہی میں اس اخبار نے ایٹورن میوان پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اخبار بعض اوقات

بھوک

از میر احمد ارکوی

رامو نے بھکارن کو گھر میں جگہ کیا دی کہ ایک آفت آ گئی اس کے دور و نزدیک کے رشتے داروں اور عزیزوں کو اس کی خبر ہوئی تو بیک زبان بیسیوں نے لعنت ملامت کی ان کی نظر میں رامو کا یہ اقدام کسی صورت بھی سراہے جانے کے قابل نہ تھا۔ مگر رامو نے ان کی چیخ و پکار کو گوش سماعت نہ دی اور اپنے فیصلے پر قایم رہا۔ وہ خش تھا کہ اس قحط کی وبا سے اس نے ایک جان تو بچائی۔ درندہ انسانوں کے چنگل سے ایک شکار تو چھینا۔ وہ اپنے اقدام پر مطمئن تھا اور خش۔ اس کے ساتھ ساتھ گھر میں ایک عورت کے آجانے سے جو آرام اس کو ملا اس کا گمان بھی نہ تھا۔ عورتوں کے متعلق اس کا خیال بڑا ہی عجیب و غریب تھا وہ انہیں گناہ کی پوٹ اور مصیبت کی جڑ سمجھتا تھا اور اس لیے اب تک شادی کی سنہری زنجیروں سے آزاد تھا۔ مگر اب سے اپنا یہ نظریہ تبدیل کرنا پڑا۔ عورت نہ تو گناہ کی پوٹ ہے اور نہ مصیبت کی جڑ بلکے یہ سب کچھ اس کے جنس کے کمزور تو توں کا نتیجہ ہیں۔ غرض۔ رامو خش تھا کہ اس نے ایک معصوم کی جان بچا کر نہ صرف کار خیر کیا ہے بلکے اپنی راحت کا سامان بھی۔

وقت گذرتے کیا دیر۔ بھکارن کو رامو کے گھر آئے تین مہینے ہو گئے مناسب غذا۔ باقاعدہ آرام اور صاف ستھرے کپڑوں نے بھکارن کو رانی بنا دیا۔ تین مہینے کے عرصے میں گذشتہ بھوک و پیاس ضعف و ناتوانی یاس و نا امیدی اور آفت و مصیبت کی تصویر قدرت کی صناعی کا بہترین نمونا بن گئی اس کے گئے جیسے جسم پر گوشت اور بے رونق چہرے پر رونق آ گئی۔ زرد اور سوکھے ہونٹ گلاب کی شگفتہ پتی کی طرح کھل گئے۔ اور وہ حسن مجسم کا ایک حسن و جمیل شاہکار ہو گئی۔

یہ سب کچھ تھا مگر جب سے بھکارن گھر میں آئی تھی رامو دماغی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا اس کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ کھانے کی طرف سے بھی وہ لاپرواسا ہوتا جا رہا تھا اور امکان بھر گھر سے باہر ہی رہنے کی کوشش کرتا۔ اس کا ہمیشا کا قاعدہ تھا کہ اس نے سیدھا گھر آتا۔ اور ناشتے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا۔ تب پھر کہیں باہر جاتا۔ مگر اب اس میں بھی فرق آنے لگا تھا۔ عموماً وہ گھر بہت دیر کر کے آتا اور اگر کبھی سویرا جاتا تو ناشتا کرتے ہی باہر چلا جاتا۔ صبح بھی وقت سے بہت پہلے چل پڑتا۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود بھکارن کا خیال ایک لمحے کو بھی نہ جاتا۔ اس میں قائل دیکھتے دیکھتے یک بیک اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی۔ اور اس کا دل کام سے اچاٹ ہو جاتا۔ سب سے زیادہ اکھٹن وقت وہ ہوتا جب رات کے وقت بھکارن اسے کھانا کھلاتی اور باتیں بھی کرتی جاتی کتنی مرتبا اس کا دل سینے میں بری طرح مچلا تھا مگر رامو نفس پر قابو پانے میں ہمیشا کامیاب ہو جاتا۔ کسی بے یار و مددگار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اس کے نزدیک انسانیت کی بہت بڑی توہین تھی وہ سوچتا کہ اس طرح اس میں اور ہوس پرست امیروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔

ان تسلیوں سے وقتی سکون تو ہو جاتا۔ مگر اس کی روح کو اس مستقل عذاب سے نجات نہ ملتی جس میں وہ تین مہینوں سے مبتلا تھا۔ اس مصیبت کا علاج صرف ایک تھا۔ بھکارن کو گھر سے نکال دے۔ مگر رامو کو یہ کسی صورت بھی منظور نہ تھی وقت گذرتا رہا اور رامو کی ذہنی اور

دماغی پریشانیوں میں مبتلا ہی ہوتا رہا۔ اس کی بڑھتی پریشانیوں کا احساس بھکارن کو بھی ہو چلا تھا جب کبھی وہ کہتی کہ بابو آج آپ بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں تو رامو دفتری کام کی کثرت کا حوالا دے کر ٹال دیتا بھکارن رامو کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرتی تاکہ گھر پر آرام سے اس کی دفتری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ مگر بھکارن کی بہتر سے بہتر خدمت بھی اس کے لیے راحت و سکون کا باعث نہ بنتی۔ بھکارن اگرچہ جاہل مطلق عورت تھی لیکن اس میں بھلے برے کی سوجھ بوجھ ضرور تھی رامو کی پریشانی اس کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہی۔ وہ خود بھی ہر وقت مغموم اور خاطر پریشان سی رہنے لگی جب کبھی رامو اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کرتا تو وہ خرابی مزاج کا بہانا کر جاتی۔ بھکارن کے اس جواب سے رامو کی تشفی نہ ہوتی۔ اور رامو کی پریشانیاں بڑھتی ہی چلی گئیں

رامو ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا اس کا احساس اس کے ہمسایوں کو بھی ہو چلا تھا اگر کوئی ہمدرد وجہ دریافت کرتا تو رامو مزاج کی ناسازی یا کام کی کثرت ظاہر کیے دیتا۔ رامو کا کسی کام میں بھی جی نہ لگتا اس نے دوست احباب سے ملنا ملانا اور کہیں جانا آنا بھی چھوڑ دیا دفتر اور گھر کے سوا وہ کہیں بھی نہ جاتا۔ دفتر میں بھی رامو کام برابر نہ کرتا۔ افسروں کو اس کے کام سے شکایت ہو چلی تھی۔ ان کی یہ شکایت واجبی تھی۔ اس لیے کہ دفتر میں رامو اپنا زیادہ تر وقت گم سم بیٹھے گذار دیتا اس کے دفتری ساتھی اور احباب نے رامو کو ہر چند مشورہ دیا کہ مزاج کے ٹھیک ہونے تک رخصت حاصل کر لے۔ لیکن رامو رخصت لے کر کیا کرتا گھر تو اس کے حق میں دوزخ بنا ہوا تھا جس کی آگ میں وہ رات دن جھلسا جا رہا تھا۔ دفتر کے علاوہ جو بھی وقت گھر پر گذرتا اس کو کوئی سکون نصیب ہوتا۔ اس لیے کہ بھکارن کے سامنے آتے ہی اس کی آتش عشق بھڑک اٹھتی اور بعض وقت تو جذبات سے اس حد تک مغلوب ہو جاتا کہ بھکارن کی طرف لپک کر اس کو اپنی باہوں میں دبوچ دے لیکن وہ صبر و تحمل سے کام لیتا اور اپنے جذبات کو کچل کر رکھ دیتا۔

محلے والوں اور رامو کے عزیزوں میں یہ بات عام ہو گئی کہ ایک نیچ ذات بھکارن سے اس نے تعلقات قایم کر لیے ہیں جب کبھی ایسی باتیں رامو کے کانوں تک آتیں تو اس کا خون کھول کر رہ جاتا اور وہ چاہتا کہ کہنے والوں کی زبان کھینچ کر رکھ دے مگر پھر وہ صبر و تحمل سے کام لیتا اور اپنے دل کو اس بات سے تسلی دے لیتا کہ اس کا اپنا کردار تو بہتر ہے اگر لوگ اس پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں تو لگایا کریں۔ اس نے ایک خاتمکش بے سہارا کی مدد کر کے اخلاقی اور انسانی فرض ادا کیا ہے۔ رامو یہ سوچتے ہوئے فخر محسوس کرتا کہ جہاں اس ناپاک دنیا میں ہر چار طرف دغا اور مکر و فریب کا جال پھیلا ہوا ہے، وہاں اس نے اگر ایک مظلوم کی لیے ریا خدمت انجام دی ہے تو اس سے بڑھ کر اور کون انسانی خدمت ہو سکتی ہے۔ رامو خود ہی اپنے پاک ضمیر کی گواہی ملتی تھا کہ اس کا یہ کارنامہ بلا معاوضا انسانی خدمت کی بہترین مثال ہے۔

رامو اندر ہی اندر گھلا چلا جا رہا تھا۔ دن بدن اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ اب تو نوبت یہاں تک بھی آ گئی تھی کہ دفتر جانا بھی بند ہو گیا تھا رات دن گھر ہی پر رہتا۔ دوست احباب اور محلے والوں سے تک ملنا ملانا چھوڑ دیا تھا۔ بھکارن کی صورت بھی بہت کم دیکھتا اور صرف اپنے کمرے میں تنہا لیٹا رہتا۔ ادھر رامو کی بے لوث زندگی کا یہ حال تھا اور ادھر لوگوں میں چہ میگوئیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ ہر شخص رامو کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے لگا اور جب کبھی رامو باہر نکلتا محلے والے کانا پھوسی کرتے اور انگلیاں اٹھا کر اس کی طرف بتاتے۔ عوام کا یہ رویہ رامو کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا اس لیے وہ کھلی بغاوت پر اتر آیا۔ اور سماج کے ناپاک بندھنوں کو پاش پاش کرتے ہوئے اس نے یہ طے کر لیا کہ جب بھکارن بھی ایک انسان ہے تو کیوں نہ اس سے شادی کر لی جائے۔ غربت نے اس کو بھکارن بنایا ہے۔ پیٹ کی آگ اور بھوک نے اس کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا تھا۔ بھکارن کوئی ناپاک ہستی تو نہیں۔ بھکارن کے جسم میں کیڑے تو نہیں پڑے ہیں وہ کوئی کوڑی تو نہیں پھر لوگ کیوں اس سے نفرت برتتے اور اس کو اچھوت قرار دیتے ہیں۔

آخر کار رامو نے بھکارن سے شادی رچا کر یہ واضح کر دیا کہ انسان، انسان سب برابر ہیں کسی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تفرقہ صرف

اس نے پھر کیا کیا ۔۔۔؟

ریاض حنیدی

محبت سے زیادہ دوستی پائیدار شے ہے اور محبت کرنے سے زیادہ مشکل کام دوستی کرنا ہے (آسکر وائلڈ)

اختر اپنی مامو زاد بہن نجما کے ساتھ گھڑی میں اسٹانی سے سبق لیا کرتا تھا۔ ان دونوں میں باہم اس درجہ انس تھا کہ اختر کو بارہا مدرسے میں شریک کروانے کے لیے اس کے والد نے کہا لیکن ہمیشہ اپنی ضد سے ٹالتا ہی رہا۔ وہ نہیں پاہتا تھا اور نجما ۱۰ سال کی عقل و شعور اور ذمے داریوں کے احساس نے ابھی ان کے لطیف جذبات پر حملہ نہ کیا تھا۔ وہ صرف محبت کرنا جانتے تھے اور یہ انہیں معلوم تھا کہ سبق یاد کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کس طرح لے جائی جا سکتی ہے۔

اختر کے اسکول کی کتابوں کا بہت سا حصہ گھر ہی پر ختم کر دیا وہ اب اس قابل ہو چکا تھا کہ مدرسا جائے اور قابل اساتذہ سے علم کی تکمیل کرے۔ اب اسٹانی بھی اپنی حد کو پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جس قدر مجھ کو آتا تھا میں نے بچوں کو سکھا دیا۔ اب میں اس سے آگے نہیں پڑھ سکتی۔ اختر کو مجبوراً مدرسے کی دنیا میں زندگی گذارنی پڑے اور وہ آٹویں جماعت میں شریک کروا دیا گیا۔

جاوید اختر کے مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسی جماعت میں شریک تھا جس میں اختر شریک ہوا تھا وہ ذہین تھا اور رہونہار بھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بلکل اختر کا ہم شکل تھا۔ چنانچہ اختر کے داخل ہونے کے بعد اکثر ایسا ہوا کہ غلط فہمی میں جاوید کو اختر کی اور اختر کو جاوید کی غلطی پر سزا ملی اختر اور جاوید میں روز بروز دوستی بڑھتی گئی وہ ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ ان کے گھر والے بھی تعجب کرتے تھے کہ وہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کے ہم شکل ہم عمر اور ہم جماعت ہیں اب اختر کبھی کبھار چھٹی کے بعد جاوید کے ساتھ کھیل کے میدان میں ٹہر جاتا۔ اور دیر سے گھر کو آتا تھا۔ لیکن جب کبھی ایسا ہوتا تھا تو اس کی آتش محبت نجما کو دیکھنے کے لیے بھڑک اٹھتی۔

"عورت کو تو سب ہی چاہتے ہیں لیکن خوش
قسمت وہ ہے جس کو عورت چاہے (آسکر وائلڈ)

نجما بھی اختر سے محبت کرتی تھی اگر اتفاق سے اختر کے مدرسے سے آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی۔ گویا کہ اس کو کسی کا انتظار ہے اور جب اختر آ جاتا تو اس کے معصوم حسن میں اطمینان کی روشنی چمکتی نظر آتی تھی۔

جاوید کا اختر کے گھر اب بہت زیادہ آنا جانا ہو چلا تھا اس لیے کہ امتحان قریب تھا۔ اختر جاوید اور نجما بیٹھ کر آپس میں مباحثہ کرتے اور سبق پر ایک دوسرے سے سوالات کرتے تھے اختر کے گھر کے لوگ تعلیم یافتہ اور روشن خیال بھی تھے۔ وہ پردے کا زیادہ خیال نہ کرتے تھے اور انہیں یہ بھی خیال تھا کہ ابھی ان بچوں کی عمر ہی کیا ہے جو انہیں پردہ کرایا جائے جاوید اپنا زیادہ وقت اختر ہی کے گھر گذارنے لگا۔ اور اکثر اوقات اختر کے مجبور کرنے پر وہ رات کا کھانا بھی اسی کے ساتھ کھا لیتا تھا جب وہ پڑھنے کے لیے بیٹھتے تو جاوید ایسی جگہ انتخاب کرتا جو نجما کے مقابل ہوتی۔ اور جب وہ پڑھنے میں مصروف ہوتے تو اس کی نظر نجما کے رخساروں پر بکھرے ہوئے ریشمی بالوں میں گم ہوتی۔ اب وہ اکثر کچھ کھویا ہوا سا نظر آتا تھا دن گذرتے گئے اور شباب نے پردے کی بندشیں ان کے درمیان حایل کر دیں۔ اب نجما اختر اور جاوید ایک جگہ بیٹھ کر نہ پڑھ سکتے تھے

"دوستی اور ملاقات سے بعض ذمے داریاں عاید ہوتی ہیں اگر انسان میں ان کے برداشت کرنے کی قوت نہ ہو تو اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔"

جاوید اب خاموش اور کھویا ہوا سا رہنے لگا۔ اب اس نے اختر کے گھر آنا جانا بھی کم کر دیا۔ اختر نے کئی بار اس کا سبب دریافت کیا لیکن وہ ٹالتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس راز کے افشا ہونے کے بعد اس کے اور اختر کے درمیان کردورت کا پردا حایل ہو جائے گا ان کی دوستی کا آئینا دشمنی کے زنگ سے مکدر ہو جائے گا۔ وہ ایسا نہیں کرتا تھا کہ اختر جیسا دوست اس کا دشمن بن جائے۔ یا اس سے نفرت کرنے لگے۔ وہ یہ اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ اختر نجما سے محبت کرتا ہے اور نجما اختر سے۔ اس لیے کہ اس کے پہلو میں بھی زخمی دل تھا وہ لگا ہوں کی عبارت کو کتاب کی عبارت سے بہتر طریقے پر پڑھ سکتا تھا۔ اس کو اختر کی دل شکنی کا بہت خیال تھا۔ اور اس سے زیادہ نجما کی دل شکنی کا۔ چند سال گذر گئے۔ اختر اور جاوید کالج کی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ جاوید وکیل ہو گیا اور اختر کنٹریکٹر۔ دونوں معاشی الجھنوں میں پھنس گئے لیکن ان کی دوستی موالنت اور ملاقات میں کوئی فرق نہ آنے پایا کبھی اختر جاوید کے گھر چلا جاتا کبھی جاوید اختر کے گھر آ جاتا۔ اختر اور نجما کے والدین میں اب ان کی شادی کی گفت و شنید ہو رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے صد محبت کرتے ہیں۔ چند دن بعد نجما اختر کی بیوی بنا دی گئی اور وہ دونوں مسرت اور شادمانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ شادی کے بعد بھی اختر اور جاوید کی دوستی قایم رہی اور ان کی ملاقات بڑھ ہی گئی اختر کو جاوید سے بہت زیادہ اخلاص تھا اور وہ اس پر کامل اعتماد رکھتا تھا وہ تعلیم یافتہ نئی روشنی کا روشن خیال نوجوان تھا اس لیے پردے کی بندشیں بہت جلد ٹوٹ گئیں اور نجما جاوید کے سامنے اسی طرح بے حجاب آنے لگی جس طرح بچپن میں۔ لیکن اس کے بعد جاوید کا اختر کے گھر آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ اختر جب کبھی سکرٹ کرتا وہ مصروفیت کا عذر بتا کر ٹال دیتا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کے ہوش و خرد کی دنیا میں نجما کو ہر جنبش پاسے انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور وہ ڈرتا تھا کہ وہ راز جو اب تک اپنے سینے میں چھپے ساے سے بھی چھپا رکھا ہے۔ کہیں اختر پر نہ کھل جاے اور اس طرح اس کو پشیمان ہونا پڑے۔

اختر تنہائی میں اس کے طرز عمل پر غور کرتا تھا لیکن کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دوستی اور عشق کی منزلوں میں کیا تفاوت ہے اور اس سے نا آشنا تھا کہ شہوانی اور روحانی لذتوں میں کیا فرق ہے۔ وہ صرف اس قدر جانتا تھا کہ ایک حسین دوشیزا سے کس طرح محبت کی جا سکتی ہے۔ وہ حسن کی پرستش کرنی جانتا تھا لیکن دوستی کے مقدس دیوتا کا تخیل اس کی قوت ادراک سے پرے تھا۔ وہ صرف نجما کے لبوں کی شیرینی محسوس کر سکتا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دوست کے جذبات کی خاطر اپنے جذبات کی بھینٹ چڑھانے میں کیا حلاوت ہے۔

"کمال محبت کا مظاہرا اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنی جان اپنے محبوب کے لیے قربان کر دے۔" (ڈکنس)

"محبت کا راز موت کے راز سے زیادہ عظیم الشان ہے۔" (آسکر وائلڈ)

دن مہینے۔ سال گذرتے گئے زمانہ انقلاب پذیر ہے راحت و سکون نے اختر سے کنارا کشی کی۔ اطمینان قلب نے منھ موڑا وہ معاشی معاملات الجھتا گیا۔ اس کے بہت سے حریف اور دشمن پیدا ہو گئے لیکن جاوید اس کا تنہا دوست تھا اسی طرح جس طرح کہ وہ بچپن میں تھا۔ نصف شب گذر چکی تھی۔ اختر اپنے کام سے فارغ ہو کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا وہ آج بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اس کا ہر قدم لڑکھڑاتا ہوا پڑ رہا تھا۔ وہ جلد اپنے گھر پہنچ کر آرام لینا چاہتا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ راستے میں پولیس کے پہریداروں نے اسے پکڑ لیا وہ شبہے میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس لیے کہ اسی دن شب کے اوائل حصے میں گرفتار کر لیا گیا۔

اس لیے کہ اسی دن شب کے اول حصے میں ایک دوسرے کنٹراکٹر کا قتل ہو گیا تھا جس کے اختر سے لاگ ڈانٹ تھی۔ اختر بلکل بیگناہ تھا۔ لیکن پولیس نے شہادت، ثبوت، سب کچھ فراہم کر لیا۔ جاوید اختر کا وکیل مقرر ہوا۔ اس نے اپنا پورا زور اس کی رہائی میں صرف کر دیا لیکن اس کی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ اختر کو عدالت سے قصاص کا حکم سنا دیا گیا۔ وہ دوسرے دن صبح کو پھانسی پانے والا تھا اس کو قید کر دیا گیا۔

جاوید انتہائی مغموم تھا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس قدر شدید رنج میں مبتلا ہو گیا۔ نجما اس وقت فرسا خیر کو سن کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ زندگی اس کو ایک تاریک غار کی طرح دکھائی دے رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کے دماغ میں پریشان خیالات کا دریا لہریں مار رہا تھا اگر اس کے دماغ میں کوئی خیال یا احساس تھا تو وہ یہ کہ کسی طرح اختر کی جان بچ جائے۔

جاوید اختر کے گھر پہنچا وہ نجما کی اس حالت کو دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گیا وہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرح اس کو تسلی دے۔ نجما خاموش سراپا التجا بنی ہوئی اس کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے دلوں میں بے پناہ جذبات تھے۔

"حسین چہرا ایک خاموش سفارش ہے (بیکن)

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ جاوید کے دل میں فوراً کچھ خیال آیا۔ اس کا چہرا مسرت سے تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اس نے کہا ——!

"نجما گھبراؤ نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا!"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ جسکے سب کچھ ہو گیا" نجما نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"بگڑی ہو گئی ہو۔ اختر کبھی نہیں مر سکتا۔ نجما تم جانتی ہو کہ دنیا میں آپ کوئی شے ناممکن الحصول نہیں۔ بشرطیکہ اس کے حصول میں استقلال کے ساتھ سعی کی جائے" جاوید نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اختر چند ساعت بعد گھر میں ہو گا! زندا ——!"

اور بغیر اس کے کہ نجما سے کچھ سنے وہ اس طرح وہاں سے بھاگا جس طرح ایک ہرن پھندے سے نکل کر اپنے ریوڑ کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا ہے وہ بازار پہنچا کچھ خریدا اور سیدا جیل کی طرف چل پڑا۔ وہ اب خوش تھا۔ حقیقی مسرت کا طوفان اس کے دل میں اٹھ رہا تھا وہ مسرور تھا ایسے انتہا مسرور وہ جیل کے دروازے پر پہنچا۔ پہرے دار کے ہاتھ میں چپکے سے ایک اشرفی دھر دی اور کہا مجھے اس قیدی سے ملنا ہے جس کو کل پھانسی دی جانے والی ہے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے پہرے دار کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن قبل اس کے وہ کچھ کہے جاوید نے دو اور اشرفیاں اس کے ہاتھ میں رکھ دیں اور کہا "میں واپسی میں تمہیں اور پانچ اشرفیاں دوں گا"

"مگر دیکھئے صاحب! ذرا جلدی ہے" پہرے دار نے کہا "مجھے معلوم ہے" جاوید نے کہا اور دروازا کھول کر اندر گھس پڑا۔

اختر اپنا سر جھکائے مغموم بیٹھا تھا۔ آہٹ پا کر سر اٹھایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اختر نے پھر اپنا سر جھکا لیا جاوید نے کہا۔ اختر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بالکل بے گناہ ہو —— ہاں! لیکن اب دیر کرنے کا وقت نہیں۔ اٹھو! اور میں جس طرح کہوں اسی طرح عمل کرو ——!

اختر کے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔ جاوید نے کہا فوراً اپنا لباس مجھے دیدو —— جلدی وقت نہیں ہے اٹھو —— دونوں نے ایک دوسرے کا لباس پہن لیا۔ پھر جاوید نے استرا نکالا اپنے بال اختر کے جیسے اور اختر کے بال اپنے جیسے تراش دیے اب اختر جاوید تھا اور جاوید اختر۔ جاوید نے پانچ اشرفیاں اختر کو دیں اور کہا کہ پہرے دار کو دیدو اس لیے کہ میں نے اس سے وعدا کیا ہے۔ اب جاوید سیدے گھر چلے جاؤ۔ اور صبح ہونے سے

پہلے جلاوطن ہو جاؤ اب وقت نہیں ہے"

اختر باہر نکلا۔ اشرفیاں پہرے دار کے حوالے کیں اور چل پڑا اس کا دل جذبات سے لبریز تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں کس قسم کے جذبات ہیں۔ مسرت و شادمانی یا رنج و غم کے وہ گھر پہنچا۔ بنجا نتیجے کے انتظار میں تھی۔ اختر کو جاوید کے لباس میں دیکھ کر سمجھی کہ جاوید ناکام واپس آرہا ہے۔ اختر اس کے قریب پہنچا۔ اس کو گلے لگانا چاہتا تھا بنجا اس سے پرے ہٹ گئی۔ اور معنی خیز نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ مع اختر کے دل میں خیال آیا کہ وہ جاوید کے روپ میں ہے چنانچہ اس نے اپنا بند سینا کھول دیا اور کہا "بنجا! ادھر دیکھو"۔ بنجا اس کی آواز سے چونک پڑی۔ اس کے سینے پر ایک زخم کا نشان تھا جس سے بنجا بخوبی واقف تھی۔ اس کا رنج خشی سے مبدل ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور مسرت کے آنسو بہائے۔

"لیکن جاوید کہاں ہے" بنجا نے سوال کیا۔ "وہ دوستی کی راہ میں قربان ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی مجھے بخشدی اور وہ کل میری جگہ پھانسی کے تختے پر لٹکایا جائے گا۔ ہاں وہ بہت خش تھا بہت خش۔ اور اب تم بھی خش ہو جاؤ لیکن میں خش نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جاوید کے نہ ہونے سے میرے دل میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو سوائے جاوید کی موجودگی کے اور کوئی پر نہیں کر سکتا۔ اور اب وہ ایک حسرت ہے دائمی صبح ہوتے ہوتے وہ بہت دور نکل چکے تھے۔ اور جاوید اس دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں نہ موت کا خطرہ ہے اور نہ رنج و مصائب کا احتمال ——!!

اگر آپ مصنف ہیں اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے۔ اس لیے کہ یہی وہ بیباک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے۔

چینی سائنس اکیڈیمی

اگلے سال اور آنے والے سالوں میں چینی سائنس اکیڈیمی کو شوشلزم میں تبدیلی کے عبوری دور میں ملک کی ضروریات کے ساتھ ہم رشتہ کر دیا جائے گا۔

ٹیکنیکل سائنس کے ادارے اپنے تحقیقی کام کو فیکٹریوں کانوں اور بھاری تعمیری کام کرنے والے دوسرے اداروں کی ضروریات سے وابستہ کر دیں گے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت پر خاص زور دیا جائے گا۔ تحقیق کرنے والے کیمیا دان انیدھن بڑھانے لوہے اور فولاد اور بجلی کی صنعتوں کی ترقی پر خاص توجہ دینگے

جغرافیا دان اور حیاتیات کے عالم ملک کے قدرتی حالات اور زرائع کے معائینے کا کام آگے بڑھائیں گے۔ ان کا اہم نشانہ دریائے زرد کے دہانے کا معائینہ ہوگا۔ ریاضی داں اور طبیعیات داں قومی تعمیر کو جو اہم مسایل درپیش ہیں انہیں حل کریں گے۔ جیسے سماج سائنس کے ادارے تبتے چین کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے اور اپنے مطالعے کو بتدریج توسیع دیتے ہوئے اس میں وسطی دور اور قدیم چین کی تاریخ کو شامل کریں گے۔

یہ فیصلے ماہ رواں کے اوایل میں اکیڈیمی نے اپنے اداروں کے ڈایرکٹروں کی ۲۵ روزا کانفرنس میں جو پیکنگ میں منعقد ہوئی تھی کیے۔ کانفرنس میں مربوط اور ہم رشتا تحقیقی کام کی اہمیت پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ قومی تعمیر کو جو مسایل درپیش ہیں انہیں حل کرنے کا اور سائنسی ترقی کو تقویت دینے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔ کانفرنس کے دوران اس کے ارکان کے درمیان ریاضی اور طبیعیات ٹیکنیکل سائنس علم کیمیا، علم حیات اور جغرافیا اور سماجی سائنس پر پانچ الگ الگ مباحثے ہوئے سوویت روس کی سائنس کے مطالعے پر زور دیا گیا۔ میڈیکل کارکنوں سے کہا گیا کہ وہ پاولف اور لیپ تن سکایا کے نظریات کا اطلاق کریں۔

ایڈیٹر

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

لکھنو

محترمی جناب بھائی خان صاحب

تسلیم۔ مزاج اقدس!

آپ کا پرچہ "ہندستانی ادب" مسلسل ملتا رہتا ہے اور میں ہوں کہ مسلسل سکوت اختیار کیے ہوں۔ واللہ کیا دونوں میں تسلسل قایم ہے! مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک عرصے سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں نے بہت دنوں سے آپ کو کوئی نظم بھی نہیں روانا کی۔ مگر آپ کی خش اخلاقی بلند ہمتی اور ساتھ ہی صبر و استقلال قابل تعریف ہے اور کوئی ہوتا تو جھنجھلا کر بیٹھ رہتا۔ میں اپنی جگہ پر از حد نادم ہوں۔ اور معافی کا خواہاں ہوں۔

از خورداں خطا و از بزرگاں عفو

آپ یقین مانیے کہ آپ سے خفگی کا ذرا برابر خیال بھی میرے دماغ میں نہیں۔ رہا اختلاف کا سوال تو وہ بھی نہیں ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ کسی طرح رسالا چلے۔ وہ چاہے آوازی اصولوں پر ہو یا غیر آوازی اصولوں پر۔ بات یہ ہے کہ زمانا ہے فلمی۔ غیر فلمی پرچوں کی موت ہے آج کل۔ مجھے تعجب ہے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب "کاروان" نکالتے ہیں وہ بھی بے چارے مجبور ہیں کہ اس کو فلمی رنگ دیں۔

ٹائیٹل پیج پر کسی شوخ حسینا کی تصویر اور آخر کے کچھ صفحات فلمی پریوں کی ہزار داستان کے محفوظ۔ یہ تو زمانا لگا ہے۔ ادب کی بھی خدمت کا قدرشناس کوئی نہیں ہے اب آپ کی صحت کیسی رہتی ہے۔ حالات سے مطلع فرمایئے۔ آپ اپنا حال لکھے جایئے مجھے اس میں سکون ملتا ہے میرے حالات نہ پوچھیے۔ اس سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔ فقط

آپ کا نالایق بھائی

سلام سندیلوی

ایڈیٹر ——

ہمارے لایق بھائی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک خشک اور ٹھیٹ علمی ادبی رسالا صرف اسی صورت میں جاری رہ سکتا ہے جبکہ اس کے خریدار زیادا سے زیادا القدا دیں ہوں۔ بغیر مالیے کو بہتر بنائے ایک مستقل کام کو جاری رکھنا "کارے دارد" کے مصداق ہے اس لحاظ سے خریداروں کی فراہمی میں ہات بٹانا آپ جیسے ہمدردان "ہندستانی ادب" کا سب سے پہلا فرض ہونا چاہیے محض میٹھی باتوں سے کام نہ چلے گا۔

جمیع ہیڈ ماسٹر صاحبان فوری توجہ کریں

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کے ایک طول افسانے کا ترجما نہایت ہی سلیس اور سادا زبان میں کیا گیا ہے کتاب کا نام "دنی" ہے۔ محکمہ تعلیمات حیدرآباد نے تمام مدرسوں کی لائبریریوں اور انعامی کتب کے سلسلے میں اس کتاب کی خریدی کی سفارش کی ہے اس لیے جمیع ہیڈ مسٹرس اور ہیڈ ماسٹر صاحبان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ فوراً اپنا اپنا آرڈر بک کرا دیں ورنا کتاب ختم ہونے پر افسوس کرنا پڑے گا۔

قیمت کتاب ۸ء علاوہ محصول ڈاک

منیجر "ہندستانی ادب" ۹۹۔اے اعظم پورا شرقی پی۔او۔ جوبلی حیدرآباد دکن

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

12 MAY 1954

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

ہندستانی ادب

۹۹۔ اے اغظم پورا شرقی۔ پی او۔ جوبلی حیدرآباد دکن ۲

حکومت پنجاب، میسور اور بھوپال کا منظور ا

حکومت حیدرآباد کی طرف سے مدرسوں اور کالجوں کے لیے سرکاری طور پر خریدا جاتا ہے

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

چندا سالانا چھ روپے

جلد (۱۴) نمبر (۷)

قیمت ایک چار آٹھ آنے

خرداد ۱۳۶۳ف

اپریل ۱۹۵۴ء

ہمارے خیالات	ب ایڈیٹر	۲	
حقایق و معارف	اقبر بوہانی	۳	
رنگ فضا	فضا (جالندھری)	۴	
ہندستان میں تعلیم کا مستقبل	اچاریہ جے۔ بی کرپلانی	۵	
غزل	(سردار) علی وارث خاں (لاہی)	۶	
سویت یونین میں بچوں کی تربیت	ی۔ د۔ شریف	۷	
سونی۔ پاہ۔ وا	چ۔ الف	۹	
اپریل انٹی ٹیوٹ اور اس کے مقاصد	کیتھ۔ بریڈلے	۱۰	
کشمیر جنت نظیر			
نے رچین کا ادب			
اے غم دل کیا کروں			
اجنٹا کے غاروں میں مصوری کے نادر نمونوں کا تحفظ			
کلکتہ میں بہروں اور گونگوں کا اسکول	ڈی۔ دل۔ دت	۲۲	
ہاتھا اور آلات ہضم	ا۔ ا	۳۴	
لارڈ صاحب			
ہندستان میں انگریزی کا مستقبل	شہنشا پرویز	۲۵	
	کے۔ ام۔ منشی	۳۱	
ڈاکٹر گنیتی پرشاد مشرا		۱۲	
پرماو۔ لوتن		۱۴	
اجمل رشید (عادل آبادی)		۱۶	
ا۔ ا		۲۰	

ہمارے خیالات

عدالتوں میں ہندستانی کے استعمال کی اجازت

خبر ہے کہ حیدرآباد کی عدالتوں میں ہندستانی کے استعمال کی پھر سے اجازت دیدی گئی ہے۔ غالباً دو چار سال پہلے عدالتوں سے ہندستانی کا دیس نکالا ہو گیا تھا چھوٹی چھوٹی عدالتوں میں فیصلے مقامی بھاشا میں لکھنے کے احکام جاری ہو گئے تھے اور شہر کی عدالتوں میں فیصلے انگریزی میں لکھنے کی ہدایت ہے شہر کی عدالتوں کی حد تک اس حکم پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر ضلع اور تعلقوں کی عدالتوں کے حکم میں تھوڑی بہت لچک پیدا کر دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی منصفوں کا تقرر ہوتا ہے وہ شہر کے رہنے بسنے والے ہوا کرتے ہیں یہ لوگ زیادہ تر انگریزی اور ہندستانی جانتے ہیں۔ اسی لیے دفتری کام اور فیصلے وغیرہ بھی انہیں بھاشاؤں میں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

تقریباً ہر شخص ہی جانتا ہے کہ بھاشائی اعتبار سے حیدرآباد تین حصوں میں تقسیم ہے۔ تلنگانہ، مرہٹواڑی اور کرناٹک ہر حصے میں مقامی بولی کے ساتھ ساتھ ہندستانی بھاشا کا بھی بھاری عمل دخل ہے۔ اس بھاشا کو تینوں علاقوں کی جنتا سمجھتی اور بولتی بھی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ کاروبار بھی اسی بھاشا میں کرنے کے عادی ہیں۔

پولیس ایکشن سے پہلے اور سال دو سال بعد تک بھی ان تینوں علاقوں کے وکیل چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو عدالتی کام اور بحث وغیرہ ہندستانی ہی میں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے تمام منصف اور جج وغیرہ عدالتی فیصلے بھی اسی بھاشا میں لکھا کرتے تھے۔ ان فیصلے لکھنے والوں میں جیسا کہ ہم نے کہا ——— ہندو بھی شامل تھے۔ ان ہندو وکیل، منصف اور جج تینوں ہی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد اتنی نہیں کہ وہ کسی بھی ایک علاقے کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عدالتی کاموں میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ اسی کے پیش نظر حکومت نے اپنے پچھلے فیصلے پر پھر سے نظر کی اور یہ حکم دیا کہ منصف چاہیں تو ہندستانی میں بھی فیصلے لکھ سکتے ہیں۔

پچھلے ہی نمبر میں ہم نے ایک جلسے کا واقعہ لکھا تھا کہ کس طرح سے اس جلسے کے صدر کو ہندستانی میں تقریر کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے یہ کوئی نئی چیز تو نہیں پیش کی تھی۔ مختلف اوقات میں ایسے کئی ایک واقعے بیان کیے ہیں اور ہر وقت یہ ثابت کیا ہے کہ عام جلسوں وغیرا میں تقریر کرنے والوں کو ہندستانی میں بولنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستانی، ہندستان کی عام اور ملی جلی بھاشا ہے جس کو پوری جنتا سمجھتی اور بولتی ہے۔ ایک ایسی عام بھاشا سے بعض لوگ غیر ضروری طور پر نفرت برتتے اور اس سے اکتراتے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود خدا انہیں بھی کسی نہ کسی موقع پر ہندستانی ہی میں تقریر کرنی پڑتی ہے۔ یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ ہندستانی ایک ایسی بھاشا ہے جس کو ملے جلے پلاٹ فارم پر استعمال کیے بغیر چارا ہی نہیں۔ اس لیے حکومت حیدرآباد سے ہماری یہ پرارتھنا ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے بھاشا جیسے بھاری مسئلے پر پھر سے غور کرے اور حیدرآباد کی نہ صرف بڑی عدالتوں بلکہ حیدرآباد کے دفتروں میں بھی ہندستانی کے عام استعمال کی اجازت دیدے تاکہ اہل غرض حضرات اور جنتا کو سہولت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دفتری کاموں میں دفتر والوں اور اہل غرض حضرات دونوں کے لیے آسانی پیدا ہو۔

حقایق و معارف

افقر موہانی

ہیں آستان یار کے منظر نئے نئے
سجدے نئے جبیں ہے نئی سر نئے نئے

ہر دم اٹھاتے رہتے ہیں محشر نئے نئے
ارمان قلب، قلب کے اندر نئے نئے

دل میں کبھی جگر میں کبھی جان میں کبھی
بنتا بی فراق کے ہیں گھر نئے نئے

قید قفس سے اڑ کے نشیمن نہ جا سکا
نکلے ہزار بار مرے پر نئے نئے

گریہ کناں ہیں دیدۂ تر غم سے ہر گھڑی
ہر وقت جوش پر ہیں سمندر نئے نئے

جاتے بھی لوگ رہتے ہیں آتے بھی ہیں یہاں
تبدیل ہوتے رہتے ہیں بستر نئے نئے

کس طرح آئے چشمۂ آب حیات ہاتھ
جب خضر بھی نئے ہوں سکندر نئے نئے

آنسو تھمے جو آنکھوں میں قلب و جگر کے
ہیں کشتیاں نئی نئی لنگر نئے نئے

دعوا مرے لہو کا مجھی پر ہے حشر میں
لائے ہیں رنگ وہ سر محشر نئے نئے

وحشی کو دفن ہونا بھی دشوار ہو گیا
نکلے ہزاروں قبر سے پتھر نئے نئے

تبدیل ہوتا رہتا ہے رنگ نقاب یار
جلوے چھپے ہیں پردے کے اندر نئے نئے

وہ پتلیاں پھریں وہ رکا دم اڑا وہ رنگ
بدلے وہ مرنے والے نے تیور نئے نئے

قلب و جگر کے داغ لیے جا رہا ہوں میں
تحفے ہیں نذر یار کو افقر نئے نئے

رنگِ فضا

فضا جالندھری
فاضل ادب

اللہ اللہ غمِ عشق کے بیمار کا رنگ
اڑ گیا دیکھ کے جس کو ترے رخسار کا رنگ

سننے والے جو انہیں داد دیے جاتے ہیں
اور بھی شوخ ہوا جاتا ہے گفتار کا رنگ

بے پیئے بھی وہ شرابی سے نظر آتے ہیں
اف یہ سرشاری انداز یہ رخسار کا رنگ

ان کے جانے سے یہ چھائی ہے اداسی گھر پر
مجھ سے دیکھا نہیں جاتا در و دیوار کا رنگ

ایک ہی رنگ ہے سرشاری و ہشیاری کا
اللہ اللہ کسی سادا و پرکار کا رنگ

اک نہ اک صحنِ گلستاں میں ہوا کیا بدلی
نہ وہ پھولوں کی لطافت ہے نہ وہ خار کا رنگ

رنگ پھولوں کا اڑا ہوش عنادل کے اڑے
چھا گیا آج چمن پر ترے رخسار کا رنگ

دل یقیں کر نے پہ مجبور ہوا جاتا ہے
دلربا یا نا ہے کتنا ترے اقرار کا رنگ

آبلے پھوٹ کے کیا خون کے آنسو روئے
روکشِ رنگِ گلِ لالا ہے ہر خار کا رنگ

حشر سے پہلے ہی اڑ جائیگی ہستی کی بساط
یوں ہی کچھ اور رہا گر تری رفتار کا رنگ

اف یہ سرشار جوانی یہ بہکتی ہوئی چال
تری رفتار کا عالم! تری گفتار کا رنگ

ہر قدم دعوتِ نظارۂ نو ملتی ہے
اور ہوتا ہے فضا دیدہ بیدار کا رنگ

(۵)

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

اچاریا جے۔ بی۔ کرپلانی

تعلیم کے معنی صرف انفرادی صلاحیتوں کی ترقی ہی نہیں بلکہ ابتدا سے ہی اس کا سماجی نصب العین بھی رہا ہے ملک کے موجودہ طریقہ تعلیم کی ماہرین اور سیاست دانوں دونوں مذمت کر رہے ہیں۔ طلبا اور تعلیم کے سرکاری حکام کے تصادم سے عوام کے دل ہل گئے ہیں۔ اور اس آویزش میں مرن برت رکھے گئے۔ لاٹھیاں بلکہ گولیاں بھی برسی ہیں لیکن اس ہنگامہ آرائی کے باوجود نہ تو نقائص کا ازالہ ہی کیا گیا اور نہ ان کا کوئی ایسا متبادل ہی پیش کیا گیا ہے جو قوم اور افراد کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔

ہندستان کا موجودہ طرز تعلیم پرانے زمانے ہی سے اسی ڈگر پر چلا آ رہا ہے اور عالا طبقے اور سمتوں اشخاص تک محدود ہے۔ ٹھوس مقاصد کی بجائے طلبا کے سامنے تحریری الفاظ پیش کیے جاتے ہیں۔ مشاہدے، عمل اور تجربے کی عدم موجودگی کے باعث تعلیم خیالی اور غیر متحرک بن کر رہ گئی ہے اور ایسی تعلیم کے نتائج بے سود ثابت ہوئے ہیں۔

اس دور جدید کے آغاز سے ہی ماہرین تعلیم اور فلاسفر موجودہ طرز تعلیم کی بجائے ایسی تعلیم کی سفارش کرتے رہے ہیں جو تخلیقی کام، اقدام اور افادیت پر مبنی ہو۔ میلان تعلیم کے پیشرو روسو نے کہا ہے کہ بچوں کو کتاب کے کیڑے نہ بناؤ عملی کام سے ان کے ذہن کی نشوونما کرو۔ اور پستالوزی نے کہا ہے کہ تعلیم سے بچے کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی صلاحیتوں کی مربوط نشوونما ہوتی ہے لیکن ہمارے غیر نفسیاتی اسکول اور ان صلاحیتوں کو برباد کر دیتے ہیں اور بچے فطری زندگی سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔ ہمیں اسکول کی سرگرمیوں کی بدولت بچوں کو عقل و فہم کے کاموں کا عادی بنانا چاہیے اور کم و بیش ہر کام میں تخلیقی سرگرمی کی صفت موجود ہوتی ہے۔ امریکی فلسفی اور ماہر تعلیم جان ڈیوی نے کہا ہے کہ ہمیں تعلیم اور زندگی کے طریقوں کے لیے لکڑی دھات کپڑے کی بنائی، سلائی اور کھانا پکانے کے تمام کاموں کو روبہ کار لانا چاہیے اور اسکول کو سبق پڑھنے کے مقام کی بجائے قومی زندگی کی سرگرمیوں کا حقیقی مقام ہونا چاہیے۔ طرز تعلیم کے متعلق گاندھی جی نے بھی کہا ہے کہ آج کل اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ذہنی انتشار پر منتج ہو جاتی ہے جسمانی اور اخلاقی کاموں کو عقل و فہم کی تربیت سے علیحدہ چیز تصور کیا جاتا ہے۔

بہرکیف اگر موجودہ طرز تعلیم سائنسی اصولوں کے اعتبار سے ناقص ہے تو اس کے اغراض و مقاصد بھی ناقص ہیں۔ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم ایک غیر ملکی زبان انگریزی ہے جس پر پوری طرح عبور حاصل کرنے میں طالب علم کے عزیز وقت کا کثیر حصا صرف ہو جاتا ہے۔ اور طلبا آزاد اور حقیقی تصور کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے ماحول کی طرز معاشرت اور تہذیب سے بھی بیگانا ہو جاتے ہیں اور اسی باعث عوام اور تعلیم یافتہ افراد کے درمیان ایک صلح حایل ہو جاتی ہے وہ اپنے آپ کو خود ساختہ حلقے سے وابستہ کر لیتے ہیں اور شہری علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

تعلیم کا مقصد انفرادی صلاحیتوں کی ترقی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ سماجی آدرشوں کی بھی تربیت دی جائے ماضی میں

ہر طبقہ اور ہر قوم اپنے لیے وہی طرز تعلیم مقرر کرتی ہے جو اس کی اپنی ضروریات اور مطالبات کو پورا کرنے کے لیے موزوں اور اس کے ذوق اور تہذیب سے بھی ہم آہنگ ہو سکے ہندستان کا قدیم سماج "مدن دیا وستھا" کی بنیاد پر چار جاتیوں پر قائم کیا گیا تھا اور اس کے مطابق طرز تعلیم مقرر کر دیا گیا تھا اسی طرح دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ضرورت اور سماجی طرز زندگی کے مطابق طرز تعلیم مقرر اور تبدیل ہوتا رہا ہے اس کے علاوہ مغربی ملکوں میں جدید صنعتی انقلاب نے نظریوں اور قدروں میں بھی انقلاب پیدا کیا اور ایک نیا طرز تعلیم اختیار کیا گیا جو سرمایہ دار سماج کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ چنانچہ کمیونسٹ روس نے وہ طرز تعلیم بالکل بدل دیا جو زار شاہی کے زمانے میں قایم ہوا تھا۔ جنگ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ہی ساتھ طرز تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی تھی اور ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے ہندستان کے طلبا سے مطالبا کیا تھا کہ وہ غیر ملکیوں کے قایم کیے اسکول اور کالج چھوڑ دیں اور قومی اسکولوں اور ودیا پیٹھوں میں داخل ہو جائیں۔ گاندھی جی کے تعلیمی تجربات نے نئی تعلیم یا بنیادی تعلیم کی صورت اختیار کی۔ جو ہندستانی سماج کی تعمیر نو کے تصور پر مرتب کی گئی ہے۔

سائنسی اصولوں کے ذریعے تعلیم میں قدرے اصلاح ہو سکتی ہے لیکن جس تعلیم میں سماجی ہدایت نہ ہو وہ قوم اور فرد کے کردار میں اصلاح نہیں کر سکتی۔ اگرچہ سیاستدانوں نے ہندستان کی سماجی تعمیر نو کے لیے گاندھی جی کے تصور کو قبول کر لیا تھا مگر وہ سیاسی الجھنوں کی وجہ سے سماج میں انقلاب پیدا نہ کر سکے کیونکہ ان کی توجہ زیادہ تر غیر ملکی قبضے سے نجات حاصل کرنے پر مرکوز رہی۔

غرض یہ کہ جب تک ہندستان کے ان سماجی اغراض اور مقاصد اور سماجی نظام کا معاملا صاف نہ ہو جائے گا جسے وہ قایم کرنا چاہتا ہے اس وقت تک موجودہ طرز تعلیم میں کوئی فوری تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے اس وقت صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم دینے کی بجائے ہندستانی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ بنیادی تعلیم کے اسکول کے استاد بھی اپنے بچوں کو پرانے اسکولوں میں ہی بھیجتے ہیں۔ انہیں اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دلانی چاہیے جو ذات پات کے بندھن کو توڑ دے اگر ہم موجودہ طرز تعلیم میں کوئی اہم تبدیلی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں تو ہمیں سماجی انقلاب کے لیے بھی رستا صاف کرنا پڑے گا۔

غزل

کہہ دوں زمانے بھر سے میں ایک سے کیا ہزار کیا
وعدا شکن ہیں آپ کے وعدے کا اعتبار کیا
ان کو گلوں سے کیا غرض ان کو ہو فکر خار کیا
جن کی نظر ہے خد بہاراں کے لیے بہار کیا
درد فراق دیکھیے جینا ہے شوق دیکھیے
ان کا مذاق دیکھیے کہتے ہیں اعتبار کیا
دل کی طرح جگر بھی ہے درد سے بیقرار اب
دیکھنا کام کر گیا تیر نگاہ یار کیا
وعدا ضرور کیجیے جانتا میں بھی ہوں مگر
آپ کا اعتبار کیا آپ کا انتظار کیا
خاک درجیب پھر خاک درجیب ہے
خلد کا تیری ناصحا زیست میں اعتبار کیا
راہی ستم یہ دیکھیے دل بھی انہیں کا ہو رہا
اپنے پہ اعتماد تھا۔ غیر پر اختیار کیا

(سردار) علی وارث خان راہی وارثی

سوویت یونین میں زبانوں کی برابری

ی۔ د شریف

زبانوں کی برابری کا مسلا اصل میں قومی مسلے ہی کا ایک جز ہے۔ سوویت یونین میں جہاں ساٹھ سے زیادہ قومیں قومی گروہ اور قومیتیں رہتی اور اپنے اپنے کام دھندے کرتی ہیں، قومی مسلا صحیح معنی میں جایز اور منصفانا طریقے پر حل کیا گیا

سوویت ریاست کی قومی پالیسی ایک ہم آہنگ اور سائنٹیفک نظریے پر مبنی ہے جس کے بانی مارکسزم کے مشاہیر ہیں سوویت یونین میں قومی مساوات کی پالیسی ہر صورت حاوی ہے ریاست کے ہر شعبے میں اقتصادی اور تہذیبی تعمیر کے ہر میدان عمل میں سوویت یونین کے دستور اساسی میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ نسل یا قومیت کی بنیاد پر کسی شہری کے حقوق پر براہ راست یا بلواسطا پابندی یا اس کے برخلاف براہ راست یا بلواسطا کوئی رعایت دینا یروے قانون قابل سزا جرم ہے۔

سوویت یونین میں نہ صرف مختلف قوموں کی جایز مساوات موجود ہے بلکے ان میں حقیقت میں جو برابری نہ تھی اس کو ختم کیا گیا۔ زار شاہی زمانے کی مظلوم اور محکوم قوموں کی سیاسی اقتصادی اور تہذیبی پس ماندگی دور کی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی اور سوویت حکومت نے سوویت دیس کے عوام کو اشتراکی تعمیر کی جانب مایل کیا۔ انہیں اپنی قومی سوویت ریاست قایم کرنے اور اپنی زبان میں اشتراکی کلچر کو عالا پیمانے پر ترقی دینے میں مدد دی کمیونسٹ پارٹی اور سوویت حکومت نے سوویت یونین کی قوموں کی تمام زبانوں کی نشو و نما اور ترقی کے لیے مناسب فضا پیدا کی۔ سوویت یونین میں کوئی ایک زبان لازمی ریاستی زبان نہیں ہے۔ ملک کی تمام زبانیں قانونی طور پر برابر ہیں۔ سوویت یونین کے دستور اساسی کی دفعا ۔ ہم کے مطابق سوویت یونین کی مجلس عالا میں منظور ہونے والے تمام قوانین وفاقی جمہوریوں کی سولا زبانوں میں شایع ہوتے ہیں۔ سوویت یونین کی مجلس عالا کی روداد سولا جمہوریوں کی زبانوں میں شایع ہوتی ہے۔ مجلس عالا کے اجلاس کے دوران اس کا ترجمان اخبار "ازوستیا" پوری کارروائی ان تمام زبانوں میں شایع کرتا ہے۔

سوویت یونین کی قوموں میں باہمی خط کتابت اور دوستانا تعاون کا ذریعا روسی زبان ہے روسی زبان جو دنیا کی سب سے بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ سوویت یونین کی تمام قوموں کی زبانوں اور کلچر کی نشو و نما اور ترقی میں اہم کردار انجام دیتی ہے۔ سوویت یونین کی قوموں کے نمایندے روسی زبان کا شوق اور جوش و خروش کے ساتھ مطالعا کرتے ہیں۔ یہ سوویت یونین کی کوئی لازمی ریاستی زبان نہیں ہے اور دوسری زبانوں پر حاوی نہیں ہے

تمام قومی جمہوریوں اور خطوں میں حکومتی، سائنسی، عوامی اور تہذیبی اداروں میں باہمی خط کتابت اور روزمرہ کی کاروائیاں قومی زبان میں ہوتی ہیں۔ کیونکے وہی دیسی زبان ہوتی ہے اور متعلقا قومی جمہوریا یا خطے کی غالب اکثریت اس کو سمجھ اور بول سکتی ہے۔ ہر سوویت قوم کے نمایندے کسی جگہ بھی ــــ یہی سوویتوں اور عوامی عدالت سے لے کر سوویت یونین کی مجلس عالا تک ــــ اپنی مادری زبان کا استعمال کرسکتے ہیں۔ وہ کسی بھی ریاستی ادارے میں اپنے اظہار خیال کے لیے بات چیت یا تحریر میں اپنی قومی زبان استعمال کرسکتے ہیں۔ سائنسی اور ادبی تصانیف اشاعت گھروں اداراتی

مجلسوں سائنسی اور تہذیبی اداروں کے پاس اپنی مادری زبان میں بھیجی اور شایع کرائی جا سکتی ہیں۔

سوویت یونین کی تمام قومی جمہوریوں اور خطوں میں وہاں کی قومی زبان کے تھیٹر، تہذیبی اور تعلیمی ادارے ابتدائی اور ثانوی اسکول نیز عالا تعلیمی ادارے قایم ہیں روسی سائنسدانوں کی برادرانہ امداد سے لسانیات اور سوویت یونین کی قوموں کے ادب کے شعبوں میں سیکڑوں اور ہزاروں سائنسی کارکنوں نے تربیت حاصل کی۔ تمام وفاقی اور خداختیار جمہوریوں میں اور خداختیار خطوں میں زبان تاریخ اور ادب کے علمی ادارے قایم کیے گئے جو متعلقہ قوموں کی تاریخ، زبانوں اور ادب سے متعلق مسئلوں کا سائنٹیفک مطالعہ کرتے ہیں۔ قومی جمہوریوں اور خطوں میں استادوں کی تربیت کے عالا ادارے بھی ہیں جہاں انہیں قومی زبان اور ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔

قوموں اور ان کی زبان کی مساوات کی قومی پالیسی نے جو کمیونسٹ پارٹی نے مرتب کی تھی سوویت یونین کی تمام قومیتوں کی تخلیقی قوت کی بے نظیر ترقی کی ضمانت کر دی۔

روسی عوام کی مدد سے قومی جمہوریوں اور خطوں کی محنت کش عوام نے ایک مختصر سی تاریخ مدت میں اپنی اقتصادی پسماندگی پر عبور حاصل کر لیا۔ اور خود اپنی ترقی یافتہ صنعت اور عالا پیمانے کی زراعت کو جنم دیا۔ سوویت یونین میں بسنے والی تمام قوموں کی مادری زبانوں اور قومی کلچر نے جو ہیئت کے اعتبار سے قومی اور ماہیئت کے اعتبار سے اشتراکی ہے۔ ترقی کی عالا منزلیں طے کر لیں۔

تمام سوویت جمہوریوں میں ایک سچا تہذیبی انقلاب لایا گیا۔ سوویت یونین میں جہالت کا یکسر خاتمہ کر دیا گیا اور سارے ملک میں کوئی بھی ان پڑھ نہ رہا۔ مثلاً آج کل ازبکستان میں پانچ ہزار سے زیادہ اسکول ہیں جن میں تیرہ لاکھ سے زیادہ طلبا داخل ہیں۔ قزاقستان میں آٹھ ہزار پانچ سو اسکول ہیں ایک سو سے زیادہ مخصوص فنی ثانوی اسکول جن میں تین لاکھ سے زیادہ بچے داخل ہیں تاجکستان میں دو ہزار سات سو اسکول جہاں تین لاکھ ۳۰ ہزار سے زیادہ بچے پڑھتے ہیں۔ سوویت یونین کی چاہے کسی قومی جمہوریا یا قومی خطے کو لے لیجیے۔ یہی معلوم ہوگا کہ وہاں کے تمام بچے اسکول جاتے ہیں۔ قومی زبان میں سات جماعتوں تک کی عام تعلیم پورے سوویت یونین میں لازمی قرار دیدی گئی ہے۔ دس جماعتوں تک کی عام تعلیم اب رفتہ رفتہ رایج کی جا رہی ہے اور یہ بھی قومی زبانوں میں ہوگی۔

سوویت یونین کی اڑتالیس قوموں اور قومیتوں نے جن کی اپنی کوئی تحریری زبان نہ تھی اکتوبر اشتراکی انقلاب کے بعد اپنا رسم خط حاصل کیا۔ سوویت یونین کی قوموں کی اپنی زبانوں میں اخبارات، رسالے اور کتابیں کثیر تعداد میں شایع ہوتی ہیں۔ انقلاب سے پہلے وسط ایشیا میں وہاں کے لوگوں کی مادری زبانوں میں کوئی اخبار شایع نہ ہوتا تھا حکومت نے اس کمی کو بری طرح سے محسوس کیا اور ہر وقت اس فکر میں لگی رہتی تھی کہ وہاں بھی کوئی اخبار شایع ہو۔ چنانچہ انقلاب کے بیس برس بعد اڑتالیس اخبارات تاجکستانی زبان میں شایع ہونے لگے۔ ایک سو سینتالیس قزاقستانی زبان میں اڑتیس کرغیزی میں اور اڑتیس ہی ترکمانی زبان میں۔ قومی جمہوریوں اور خطوں میں اشاعت گھر قایم ہو گئے ہیں جو نصابی کتابیں، لغات سیاسی اور سائنسی کتابیں اور ادبی تصنیفات شایع کرتے ہیں ۱۹۵۳ء میں وفاقی اور خداختیار جمہوریوں کے اشاعت گھروں نے سات جماعتوں کے اسکولوں اور ثانوی اسکول کے طلبا کے لیے دیسی زبانوں میں صرف نصاب ہی کی ایک ہزار سے زیادہ کتابیں شایع کیں جن کی مجموعی اشاعت پانچ کروڑ سے زیادہ تھی۔ روسی فیڈریشن ہی کے اشاعت گھروں نے مختلف زبانوں میں نصابی کتابیں تیرہ کروڑ کی تعداد میں شایع کیں۔

سوویت عہد حکومت میں سوویت یونین کی تمام قوموں

کی ہمہ گیر ذہنی اور مادی ترقی کی ایک بہترین مثال شمالی قفقاز میں آباد ایک چھوٹی سی قوم لاک ہے۔

زارشاہی روس میں یہ قوم جو تقریباً پچاس ہزار پر مشتمل ہے مفلسی، تاریکی اور جہالت کی زندگی بسر کرتی تھی اور رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جارہی تھی صرف ۵ فی صد لاک پڑھے لکھے تھے سوویت عہد حکومت میں لاک قوم کے لیے رسم خط تخلیق کیا گیا۔ روسی زبان میں تعلیم دینے والے اسکول کھولے گئے پوری یا نیم آبادی اور اسکولی عمر کے تمام بچے اب تعلیم یافتہ ہیں۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو لاک مزدوروں اور عورتوں کو مدرسی کی تربیت دی گئی ہے۔

سوویت عالا تعلیمی اداروں اور سائنسی تحقیق کے علمی اداروں سے لاک قوم کے بائیس افراد نے عالا تعلیم حاصل کرکے ام۔ ایس سی اور ڈی۔ ایس سی کی سندیں حاصل کیں۔ انہیں میں ناگاجی مرکیلنسکی ہیں جنہوں لسانیات میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی وہ لاک زبان کے ماہر ہیں۔ لاک قوم کے ستر افراد جن میں عورتیں بھی شامل ہیں عالا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لاک قوم کے صرف ایک گاؤں کو لوخ میں جس کی آبادی تقریباً ڈھائی ہزار ہے تین سو اسی مرد اور عورتیں عالا تعلیم یافتہ ہیں اور تقریباً چار سو افراد ثانوی تعلیم مکمل کر چکے ہیں عالا تعلیم یافتہ لاکھوں میں انجنیر، تیل مزدور بجلی کا کام کرنے والے مستری، جہاز ساز، سائنسداں، ڈاکٹر ماہرین لسانیات ادیب اور مدرس بھی شامل ہیں۔

اشتراکی سماج میں تمام قوموں اور ان کی زبانوں کی نیز رفتار اور ہمہ گیر ترقی کے لیے ساز گار فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ قوموں کی مساوات ایک اٹل قانون ہے۔ جس پر عملدرآمد کیا جاتا ہے۔

مضمون نگار حضرات مضامین صاف اور خوش خط لکھنا کریں

سوئی پاوا

پ۔ ا

فوجی ادیب سوئی پاوا چین میں ابھرتے ہوئے نئے طرز کے ادیبوں میں مخصوص رنگ کے مالک ہیں ان کی تخلیقات نادر محسوسات اور محنت کش طبقے کی قوت سے لبریز ہیں۔

ان کی عمر ۲۵ برس کے لگ بھگ کی ہے اور یہ شمال مغرب میں جاپانی سیاہ آزادی کی صفوں سے ابھرے ہیں اور پیشان اف لون" قرض کی ادائیگی کے لیے بیٹے کو بیچنا" اور کتے پھر بھونکتے ہیں" کے لیے بہت مشہور ہیں جن میں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے تلخ تجربے بیان کیے ہیں ان افسانوں میں آپ نے کسانوں کے کثیر عوام کی سادگی اور افلاس کے مقابلے میں جاگیردار طبقے کی بربریت اور زوالت کی وضاحت کے ساتھ عکاسی کی ہے اپنی تیز تر قوت مشاہدے سے کام لیتے ہوئے سوئی۔ پاوا عوام کی سادہ زبان میں جاگیردار طبقے کے خلاف اپنی نفرت کی آبیاری کرتے ہیں آپ کی کہانیاں مزاح اور تیکھے طنز سے بھری پڑی ہیں۔

ادیبوں اور فن کاروں کی کانفرنس میں جب میری ملاقات سوئی۔ پاوا سے ہوئی تو میں ان کے اپنی ذات سے بے نیاز شعور اور مشکلوں پر رجائی انداز میں اس کے تبصرے سے بے حد متاثر ہوا۔ جس پر انہیں ابھی عبور حاصل کرنا ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پاوا نے کہا کہ ان کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ قوم کے ادیبوں اور فن کاروں کی کانفرنس میں ایک دن شرکت کریں گے وہ سالنی صوبے میں ایک کھیت مزدور گھرانے میں پیدا ہوئے جس وقت ان کی عمر ۸ برس کی تھی تو انہیں جاگیردار کے ہاں چرواہے کے طور پر کام کرنا پڑا اور انہیں جلد معلوم ہو گیا کہ سردی اور بھوک کے کیا معنی ہیں۔

امپیریل انسٹی ٹیوٹ اور اس کے مقاصد

کینتھ بریڈلے
ڈائرکٹر امپیریل انسٹی ٹیوٹ

ساٹھ سال ہوئے ملکہ وکٹوریا کی ڈائمنڈ جوبلی کی یادگار میں بمقام لندن دولت مشترکہ کے تمام حصوں سے آئے ہوئے فنڈ کی مدد سے ایک امپیریل انسٹی ٹیوٹ قایم کیا گیا تھا۔ ۱۰ مئی ۱۸۹۳ء میں ملکہ وکٹوریا نے انسٹی ٹیوٹ کی عظیم عمارت کی رسم افتتاح ادا کی تھی۔ جاری سال انسٹی ٹیوٹ کی اپنی ڈائمنڈ جوبلی کا سال ہے اب اس کے کام کا دایرہ بہت وسیع ہوگیا ہے اور اس کے کام کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

اس انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں نمایش گیلریاں ایک سینما اور ایک نہایت خوب صورت آرٹ گیلری موجود ہے اور ان سب کا ایک ہی مقصد ہے یعنی دولت مشترکہ کے متعلق واقفیت پہنچانا۔ شروع میں اس کا مقصد دولت مشترکہ کی تجارت کو ترقی دینا تھا۔ بعد میں ریسرچ کے کام پر زور دیا جانے لگا اور اب اس کا مقصد کامن ویلتھ معاملات کے بارے میں معلومات پہنچانا ہے۔

اس انسٹی ٹیوٹ کی تاریخ میں ۱۹۵۰ء ایک اہم سال تھا کیونکہ اس سال حکومت نے لارڈ ٹیوڈر میور کے ماتحت ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ کے مستقبل کے متعلق اپنی سفارشات پیش کرے۔ پچھلے سال اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی جس میں اس نے بتایا تھا کہ اس انسٹی ٹیوٹ کو کس طرح دولت مشترکہ کے عوام کی کلچرل سرگرمیوں اور دولت مشترکہ کے متعلق معلومات کا ایک بڑا مرکز بنایا جا سکتا ہے۔

اس نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی تھی کہ انسٹی ٹیوٹ کی نمایش گیلریوں کو از سر نو منظم کیا جائے اور ان میں تازہ ترین چیزیں رکھی جائیں۔ آرٹ گیلری کو کامن ویلتھ آرٹ کا مرکز بنایا جائے۔ دولت مشترکہ کے طلبا کو ہر قسم کی کلچرل سرگرمیوں کے متعلق سہولتیں بہم پہنچائی جائیں لکچروں کا سلسلہ وسیع کیا جائے اور کامن ویلتھ امور سے دلچسپی رکھنے والی انجمنوں اور سوسائیٹیوں کے استعمال کے لیے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں زیادہ جگہ کا انتظام کیا جائے۔

میں نے ۱۹۵۳ء کے آغاز میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے انسٹی ٹیوٹ کا چارج لیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ یہ انسٹی ٹیوٹ کتنا زیادہ ناکام کر رہا ہے ہر سال تقریباً چار لاکھ لوگ اس انسٹی ٹیوٹ کی گیلریوں میں نمایش دیکھنے آتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے لیکچر اور ہر سال برطانوی اسکولوں کے چار لاکھ بچوں کو کامن ویلتھ ممالک کے حالات بتاتے تھے اور اسکولوں کو کامن ویلتھ کے بارے میں ہر طرح کا لٹریچر مہیا کیا جاتا تھا۔ ہر ہفتے تقریباً چار ہزار لوگ ہمارے سینما میں مفت کامن ویلتھ ممالک کی فلمیں دیکھتے تھے۔ اور انسٹی ٹیوٹ کے بڑے کمرے کو سمندر پار کے طلبا تفریح اور کام کے لیے استعمال کرتے تھے۔

انسٹی ٹیوٹ میں اتنا زیادہ کام ہونے کے باوجود یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ ابھی کوئی خاص کام نہیں ہو رہا ہے

چنانچہ ہم نے تاجپوشی کے سلسلے میں ایک بہت بڑا پروگرام مرتب کیا۔ ہم نے ملکا اور دولت مشترکا کے عنوان سے انسٹی ٹیوٹ میں سات نمائشیں منعقد کیں۔ ان نمائشوں کا افتتاح نیوزی لینڈ پارلیمنٹ کے اسپیکر سر میتھیوز نے کیا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، ہندستان اور برطانوی نوآبادیات سے آئے ہوئے موسیقاروں اور رقاصاؤں نے اپنے پروگرام پیش کیے اسی کے ساتھ ہم نے لیکچروں کا دایرا بھی بڑا دیا۔ زیادہ سے زیادہ لیکچروں اور دوسرے لوگوں کو دولت مشترکا کے حالات بتانے گئے صرف ماہ جولائی میں طلبا کے لیے سات خاص کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ جن میں برطانیا کے ۵۰ لڑکے لڑکیوں نے کامن ویلتھ ممالک کے مسایل کی بحثوں میں شرکت کی۔

اب وزیر تعلیم نے ٹویڈز میور رپورٹ کی روشنی میں انسٹی ٹیوٹ کا آیندہ پروگرام مرتب کرنے کے لیے ایک نیا بورڈ آف گورنرز مقرر کر دیا ہے نئے بورڈ کو اب پہلے سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں گے نئے بورڈ میں دولت مشترکا کے ممالک کی حکومتوں کے نمایندے شامل ہیں یہ بورڈ اس بات کا فیصلا کرے گا کہ آیا انسٹی ٹیوٹ کا نام تبدیل کیا جائے یا کہ نہیں۔ وہ اس چیز کا بھی فیصلا کرے گا کہ اس کے اخراجات کس طرح چکائے جائیں۔ اور اگر اس کے کام کو وسعت دیجائے تو اس کی مثال کیا ہو۔

تاجپوشی کی تقریب دراصل دولت مشترکا کی تقریب تھی اور اس نے ثابت کر دیا تھا کہ دولت مشترکا کے ممالک میں کتنا زیادہ روحانی اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور سیاست کی تنگ حدود سے باہر تمام میدانوں میں اس اتحاد کو جاری رکھنے کے لیے اس قسم کے انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت بلکل واضح ہے۔

جواب طلب امور کے لیے جوابی خط کا آنا ضروری ہے۔

وائنا میں طبی تربیت حاصل کرنیکی سہولتیں

وائنا اکادمی آف میڈیسن کی طرف سے ہندستانی طلبا کو داخلے کا پیش کش

مرکزی وزارت صحت کا ایک پریس نوٹ مظہر ہے کہ وائنا اکادمی میڈیسن نے ڈگری یافتہ ہندی طلبا کی محدود تعداد کو آنکھ کے علم تشخیص امراض، دوا سازی، جراحی، امراض نسوانی، ناک کان و گلے کی بیماریوں، اور دندان سازی وغیرہ سے متعلق امور کی تربیت حاصل کرنے کے لیے داخلے کی پیش کش کی ہے۔ یہ تربیتی نصاب یکم اپریل ۱۹۵۴ء سے شروع کیے جائیں گے جن کی میعاد ایک سے دو سال تک ہوگی تربیت حاصل کرنے والے طلبا کا ماہانا خرچ ۲۵ سے ۳۰ پونڈ تک ہوگا فیس دس پونڈ فی ماہ ہے اس اسکیم کے تحت وہ امیدوار اپنے خرچ پر ان تربیتی سہولتوں سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں جو ام بی۔ بی ایس۔ ال۔ ایم۔ ایس یا کسی اور منظور شدہ طبی امتحان کی ڈگری حاصل کر چکے ہوں۔

علاوہ ازیں وائنا یونیورسٹی میں دیگر کئی موضوعات پر مختصر المیعاد تربیتی نصابوں کا اہتمام کیا ہے ان میں سے اکادمی سرٹیفکٹ کے تربیتی نصاب کی میعاد ایک ماہ اور یونیورسٹی سرٹیفکٹ کے تربیتی نصاب کی میعاد تین ماہ ہوگی یونیورسٹی ڈپلوما حاصل کرنے کے مختلف تربیتی نصابوں کی میعاد دس سے بیس ماہ تک ہے طبی پریکٹس کا پانچ سال سے زیادہ کا تجربہ رکھنے والے لائسنس یافتگان اور منظور شدہ ہندی یونیورسٹیوں کے طبی گریجویٹ اپنے خرچ پر ان سہولتوں سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ امیدواروں کے لیے جرمنی زبان سے واقف ہونا مفید ثابت ہوگا لیکن اس کا جاننا لازمی نہیں

کشمیر جنت نظیر

ڈاکٹر گنپتی پرشاد شرما

مورکے ان الفاظ میں کتنی سچائی ہے کہ انسان وادی کشمیر میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اس خاکی دنیا سے نکل کر بہشت میں داخل ہو گیا ہے ہمالیا کے دامن میں واقع یہ وادی سچ مچ ہی خیتوں اور مرغزاں کا گہوارا ہے قدرت نے اس پر حسن و خوب صورتی کے خزانے لٹا دیے ہیں اور اس کے رنگین نظارے ہمیشا ہی سے شاعروں اور مصوروں کے پرواز تخیل کا سرچشمہ رہے ہیں یہاں کے بلند پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں پھولوں بھرے میدان سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریا بڑی بڑی جھیلیں، خوب صورت چشمے، آبشاریں اور مختلف مقدس مقامات ہر سال کتنے ہی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

کشمیر کے لیے ہوائی آمدورفت کا سلسلا تمام سال جاری رہتا ہے۔ گرمیوں میں ہم پٹھان کوٹ سے کار یا بس کے ذریعے بھی سفر کر سکتے ہیں۔ یا نہال کے درے سے گذر کر ہم سری نگر کے خوب صورت شہر تک پہنچتے ہیں جسے بجا طور پر مشرق کا وینس کہا جا سکتا ہے اگرچے یہاں ہوٹلوں میں رہایش حاصل کرنے میں دقت پیش نہیں آتی تاہم یہاں کے ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ہاوس بوٹ میں رہایش اختیار کرنا زیادا موزوں ہے۔ سری نگر کے تاریخی باغات، نشاط، شالیمار اور چشمہ شاہی اس شہر کی زینت ہیں۔

شنکراچاریا کے مشہور مندر کو دھارمک اہمیت حاصل ہے۔ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے وہاں سے تمام شہر کا منظر ہمیں دکھائی دیتا ہے جو بہت ہی قابل دید ہے اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دریاے جہلم ایک بہت بڑے سانپ کی طرح بل کھا کر بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جھیل ڈل میں ہاوس بوٹ کنول کے پھولوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ رات کو جھیل ڈل کا نظارا اتنا دل کش ہوتا ہے کہ ایک بار دیکھنے کے بعد انسان اس کی یاد کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ خوب صورت اور روشن ہاوس بوٹ جھیل کی سطح پر ہنسوں کی مانند تیرتے ہوے دکھائی دیتے ہیں، اور رات کے اس سناٹے میں جب دور سے کسی کشمیری دوشیزا کے گانوں کی آواز کانوں میں پڑتی ہے تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا سے دور، بہت دور کسی اور ہی دنیا میں محسوس کرنے لگتا ہے

سری نگر سے ۴۲ میل کے فاصلے پر گلمرگ کا مشہور صحت افزا مقام ہے گلمرگ یہاں سے صرف چار میل دور ہے گلمرگ پہنچنے کے لیے پیدل چلنا پڑتا ہے یا ٹٹوؤں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ دنیا کے تمام حصوں سے گولف کے کھلاڑی یہاں آتے ہیں۔ گلمرگ سے پیدل چل کر ہم کھلنمرگ پہنچتے ہیں۔ جہاں سے نانگا پربت، جھیل ولر اور جھیل ڈل ہمیں صاف دکھائی دیتے ہیں کھلنمرگ میں سارا سال برف جمی رہتی ہے برف کے کھیلیں کھیلنے کے شایقین ہر سال یہاں آتے ہیں۔

سری نگر سے ساٹھ میل اتر پورب کی طرف بہلگام کا مشہور صحت افزا مقام واقع ہے۔ اس رستے میں تاریخی و دھارمک اہمیت کے کئی مقامات ہیں ان میں اونتی پور، اونت ناگ اور مٹن کے مقامات قابل ذکر ہیں۔

انت ناگ کا دوسرا نام اسلام آباد ہے۔ اس میں کئی زیارت گاہیں ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اسے تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اچابل اور چشمہ ویری ناگ کو یہیں سے رستا جاتا ہے۔ موضع اچابل میں پہاڑی کے دامن میں ایک خوبصورت باغ واقع ہے جہاں ایک ندی سے کئی چشمے پھوٹتے ہیں۔

مرتمند کا مندر انت ناگ سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ کشمیر کا سب سے بڑا مندر ہے۔ تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ یہ مندر پانچویں صدی میں رام دیتہ نامی بادشاہ اور اس کی ملکا امرت پربھا نے تعمیر کرایا تھا۔ مٹن میں زیادہ تر یاتری پڑاؤ رہتے ہیں۔ جو زایرین کے لیے بہترین رہنما ثابت ہوتے ہیں۔

پہلگام میں سیاح عام طور پر کھلی ہوا میں خیموں میں رہنا پسند کرتے ہیں بھارت کے تمام حصوں سے ہزارہا ہندو ہر سال اس مقام پر ہر سال جمع ہوتے ہیں اور یہاں سے امرناتھ کی یاترا کو روانا ہوتے ہیں۔ پہلگام سے امرناتھ تک ۲۷ میل کا سفر ہے اور رستے میں زایرین اور سیاح سب سے پہلے چندن واڑی کے مقام پر ٹھہرتے ہیں۔ ہر سال کئی غیر ملکی سیاح بھی یہ خطرناک سفر اختیار کرنے کے لیے یہاں آتے ہیں چندن واڑی سے اگلا پڑاؤ شیش ناگ ہے شیش ناگ کی جھیل کا نظارہ قابل دید ہے۔ شیش ناگ سے وادیٔ جن اور وہاں سے پنجتارنی پہنچتے ہیں۔ پنجتارنی میں پانچ ندیاں بہتی ہیں اور ان میں اشنان کرنا بڑا متبرک خیال کیا جاتا ہے۔

امرناتھ کا مقدس مقام یہاں سے صرف چار میل دور رہ جاتا ہے لیکن یہ رستا بڑا خطرناک ہے تقریباً ڈیڑھ میل کا رستا ایسا ہے جو زایرین اور سیاحوں کو برف پر چل کر عبور کرنا پڑتا ہے امرناتھ کی گپھا میں برف کا شولنگ بنا ہوا ہے جس کی زایرین پوجا کرتے ہیں۔ گپھا کے باہر پہاڑی کبوتروں کا ایک جوڑا دکھائی دیتا ہے جو سرویوں میں بھی یہیں رہتا ہے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ یہ جوڑا اتنی سردی میں کیسے کھانے کو پا بھی میسر نہیں آتا۔ کیونکہ زندہ رہتا ہے گپھا کے نزدیک امرونی کی ندی بہتی ہے اور زایرین اس میں بھی اشنان کرتے ہیں۔ رکھشا بندھن پورنما کو زایرین گپھا میں پہنچتے ہیں اور اگلے روز پہلگام کو واپسی کا سفر شروع کر دیتے ہیں۔

شکار کے شایقین کو بھی کشمیر کی سیر و سیاحت سے مایوسی نہیں ہوگی۔ وادی میں ہر قسم کا شکار ملتا ہے۔ کشمیر کے قدرتی مناظر ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس لیے فلنگ نے بجا طور پر وادیٔ کشمیر کو سلسلہ جبالیا کے وسط میں جڑے ہوئے ہیرے سے تشبیہ دی ہے اور ٹاپنر نے یہ کہا ہے کہ یہ حسن کا ایک ایسا مرکز ہے جس کی سیر و سیاحت سے کسی بھی سیاح کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔

سمندر پار کے طلبا کے لیے کورس

برٹش کونسل نے سمندر پار کے طلبا کے لیے برطانیا میں مخصوص کورسوں کا ایک وسیع پروگرام مرتب کیا ہے یہ کورس مارچ تا اکتوبر جاری رہیں گے۔ کل ۴۲ کورس ہیں اور ہر کورس ۲ تا ۱۶ ہفتوں میں ختم ہوگا۔

برٹش کونسل کے کورس دولت مشترکہ کے طلبا بہت مقبول ہیں اور پچھلے سالوں کے دوران ہند پاکستان اور سیلون کے کئی طلبا ان سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ برٹش کونسل مرکزی و مقامی حکومتوں کے مالیاتی محکموں کے افسران کے لیے بھی ایک کورس کا انتظام کر رہی ہے جو لندن میں یکم ستمبر تا ۲۵ دسمبر جاری رہے گا۔

نئے چین کا ادب

پرماوتون

"نئے چین کا ادب آج موضوع اور سمت کے اعتبار سے زیادہ وسیع ہے تشبیہات محاکات اور منظر کشی کے لحاظ سے پہلے سے کہیں زیادہ ثروت مند ہے یہ جاندار رجائیت اور مستقبل میں لامحدود اعتماد کا رجحان لیے ہوئے ہے۔ بڑے ادیب ماوتون نے ادیبوں اور فن کاروں کی دوسری کل چین کانفرنس کے ادیب منتخبین کے ایک خاص اجتماع میں اس نکتے کی طرف اشارا کیا۔ کانفرنس اس وقت آرام کے وقفے سے گذر رہی تھی۔

ماوتون نے سلسلا کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "۲ ہزار سے زاید ناول مضامین خاکے ڈرامے اور فلموں کے منظر نامے جو چین کے مقتدر اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہیں ان میں سے آٹھ سو تخلیقات ایسی ہیں جن میں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا تذکرا ہے دوسری تخلیقات میں جنگ نوجی زندگی نوجی اقلیتوں اور سماجی اصلاحات سے متعلق موضوعات ہیں۔"

"ان تخلیقات میں نئے ٹائپ کے ہیرو ابھر رہے ہیں۔" آپ نے آگے چل کر کہا "اور یہ ٹائپ محاذ کے بہادر مثالی کسان اور مزدور، کمیونسٹ پارٹی اور نئی جمہوری یوتھ لیگ کے ممبر نئے چین کے مرد اور عورتیں اور قومی اقلیتوں کے بہترین نمائندے نجات پائے ہوئے چینی عوام کی بلند و عظیم خصوصیات کی بیش و کم آئینہ داری کرتے ہیں۔" موضوع میں بھاری تبدیلی سے آپ نے اشارا کیا "ادب زیادا سے زیادہ مزدوروں کسانوں اور فوجیوں میں مقبول ہو رہا ہے۔ نجات سے پہلے کے عرصے کے مقابلے میں اس کے محجم میں دس سے بیس گنا اضافا ہوا ہے۔ فلم دیکھنے والوں کی گنتی گذشتا سال ۷۰ کروڑ تک پہنچ گئی۔ اور یہ وہ میزان ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔"

عوام نہ صرف ادبی تخلیقات میں سے مواد اخذ کر کے اس سے مقبول ناٹک تیار کر رہے ہیں بلکے بہت سے لوگ طبعزاد ڈرامے اور گیت لکھ رہے ہیں۔"

"محنت کش عوام جن کا ادب سے پہلے برائے نام رشتا تھا یا مطلق نہیں تھا اب اہم قارئین اور سامعین بن چکے ہیں۔" آپ نے آگے چل کر کہا "ہمارے ادبی جرایدکے نام ان کی طرف سے خطوط آتے ہیں جن میں اچھی تخلیقات کی تعریف ہوتی ہے اور بھونڈی تخلیقات کے بارے میں قیمتی رائے دی ہوئی ہوتی ہے گذشتا چار سالوں میں چین نے کتابی صورت میں ۶، ۵ مختلف ادبی تخلیقات پیش کیں۔ ناولیں، نظمیں، ڈرامے مضامین اور دوسری تخلیقات ان میں سے بیشتر نئے ادیبوں کی قوت فکر کا نتیجا ہیں متعدد نئے ادیب جو کسانوں اور مزدوروں کی صفوں سے ابھرے ہیں وہ اپنے لوگوں کی زندگی سے اچھی طرح روشناس ہیں اور انہیں اپنے میں سے ابھرتی ہوئی نئی شخصیتوں کا احساس ہے۔"

ماوتون نے صنعت بندی اور سوشلزم میں تبدیلی کے زمانے کے ان کاموں کی طرف اشارا کیا جن سے ادب کی تخلیق آج دوچار ہے اور کہا "سوشلزم میں داخل عوام کی روحانی زندگی میں جو پیچیدا تبدیلیاں لا رہا ہے

ادیب صداقت کے ساتھ ان کی عکاسی کریں۔" آپ نے اس بات پر زور دیا "ہمیں اپنی فن کارانہ صلاحیت کو ہوشلزم میں تبدیلی کو آگے بڑھانے میں مدد دینے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ نئی شخصیتوں کی شجاعانہ خصوصیات کا تذکرہ کرکے ہم کروڑوں اشخاص کی حوصلہ افزائی کرسکتے ہیں کہ وہ اعتماد اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھیں۔ ہمیں بورژوا نظریات، بڑھتی ہوئی مشکلات کے خوف اور کمٹر خیالات کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے۔" ان کاموں کو جاری رکھنے کے لیے، ماؤ تون نے اشارہ کیا، "ہمارا ادب سب سے پہلے موضوع کے اعتبار سے سوشلسٹ نظریات کا حامل ہونا چاہیے ہمارے ادیبوں کو یا تو سوشلسٹ (اشتراکی) ہونا چاہیے یا سوشلسٹ بننے کی انہیں کوشش کرنی چاہیے اور اشتراکی حقیقت پسندی کے مطابق انہیں ادب تخلیق کرنا چاہیے۔"

پھر آپ نے ادب میں نقائص پر قابو پانے کے بارے میں کچھ تجاویز پیش کیں۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ "ادیبوں کو سب مسئلوں سے پہلے منت کرداروں کی چاہے وہ کسی سطح سے تخلیق کا مسلا رکھنا چاہیے خاص طور پر ایسی شخصیتیں — ہوانگ چی۔ کوانگ متراسف ٹاچنگ الا ہیرو، لی سین تا خاص کسان ورکر اور ہوچین شیو نئی طرز کی کتابی کی نوجوان موجد۔ اس قسم کے ہیرو عوام کی صفوں سے برابر ابھر رہے ہیں لیکن ادیب ابھی اس طرح کے ہیرو بہت کم نمودار ہو رہے ہیں۔" آپ نے اعلان کیا "آج ہمارا اولین کام ہے کہ ہم ناولوں، فلموں، ناٹکوں اور نظموں میں حقیقی زندگی کی نسبت زیادہ اقوت، نظریاتی پختگی اور وضاحت کے ساتھ ایسی شخصیتوں کا خاکا کھینچیں اور اپنی تخلیقات کو کروڑوں محنت کشوں کی رہنمائی کے لیے استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں منفی کرداروں کی بدصورتی اور ان کے گھناؤنے پن کو پورے طور پر دکھانا چاہیے۔ تاکہ ان کے خلاف عوام کی جوکسی کو تیز تر کیا جا سکے۔ اور ہمیں بے باکی کے ساتھ سوشلزم میں تبدیلی کے دوران اپنی سماجی زندگی میں ابھرتے ہوئے تضادات کی آئینہ داری کرنی چاہیے۔"

ماؤ۔ تون نے ادیبوں پر زور دیا کہ "وہ سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا آزادی، ہمہ گیری اور نیرنگی کے ساتھ ذکر کریں۔ اپنی تخلیقات کے لیے مرکزی خیالوں اور موضوعات کے انتخاب کا جال دور دور تک پھیلا دیں۔ ادبی تخلیقات میں لوگوں کی رنگا رنگ ادبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تنوع، تمثیل اور اسالیب پیدا کریں۔"

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ماؤ۔ تون نے اس بات پر زور دیا کہ "ادیبوں کو زندگی کی جدوجہد سے کترانا نہیں چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے براہ راست تجربا حاصل کرنا چاہیے اپنی ادبی تکنیک کو اکمل ترین بنانے کے لیے سخت محنت کرنی چاہیے۔ اور انتہائی سادا اور صاف زبان استعمال کرنی چاہیے۔ ادیب اور نقاد ایک دوسرے کو زیادہ از دلی تعاون دیں۔ صحتی تنقید کو فروغ دینے کی مشترکا کوشش کریں۔ ایک دوسرے کی مدد کریں اور ایک دوسرے کا احترام کریں کیونکہ یہ بات تخلیقی کام کے لیے بڑی ممد ثابت ہو سکتی ہے۔

آخر میں ماؤ۔ تون نے ادبی کارکنوں کی انجمن کی از سر نو تنظیم اور پھر اس کی ادیبوں کی یونین میں تبدیلی کی تجویز پیش کی۔ آپ نے کہا "اس یونین کا کام ہونا چاہیے کہ اونچے درجے کی تخلیقات پیش کرنے کے لیے مصنفوں کی رہنمائی کرے۔ ادبی تنقید کو فروغ اور ترقی دے اور ادب کو مقبول بنائے۔"

اگر آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے تو اپنا چندہ جلد روانا کردیجئے

"اے غم دل کیا کروں"

اجمل رشید (عادل آبادی)

میں اپنے آپ کو جیسے گہرے اندھیرے میں محسوس کر رہا تھا انجانے تارے میری روح پر لپیٹے جا رہے تھے تاریکی اور گہری ہوتی جا رہی تھی میری زندگی ـــــ پھر ایک چٹیل ریگزار تھی جس کی تپتی ہوئی ریت پر دوڑتے دوڑتے میرے پیروں میں آبلے پڑ رہے تھے ـــــ آبلے بن رہے تھے پھوٹ رہے تھے ـــــ بن رہے تھے پھوٹ رہے تھے۔ میں اس آبلا پائی سے تنگ آکر یا وسموم کے گرم گرم جھونکوں میں ایک حسین سے نخلستان کی تمنا کر رہا تھا ایک ایسے ٹھنڈے چشمے کی جس کا خنک پانی پی کر جان بلب پیاسے مسافر پر بے خودی سی طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے حواس پر ایک سرور سا محسوس کرنے لگتا ہے ـــــ اور میں اس ٹھنڈے چشمے کا پانی پی کر ایک طویل طویل نیند سونا چاہتا۔ طویل نیند ـــــ!

اور پھر میرے اس تپتے ہوئے ریگستان میں ایک ٹھنڈا جھونکا چل گیا۔ سلما چپکے سے میرے دل کے اندھیاروں میں گھس آئی۔ دل کے کواڑ کھٹکھٹا رہی تھی "دھڑک دھڑک ـــــ دھڑک دھڑک" جیسے سلما کہہ رہی ہو ـــــ "رشو دروازہ کھولو، میں آرہی ہوں"!؟

اور وہ آگئی صبح کا پیغام بن کر ـــــ گھٹا ٹوپ اندھیاروں کی کرن بن کر۔ چٹیل بیدان کا نخلستان بن کر ـــــ دکھے دل کی مسکراہٹ بن کر ـــــ زخم کا مرہم بن کر اور میرا دل خشی کے گیت گانے لگا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ ایسی مسکراہٹ جو بچوں کے ہونٹوں پر کھلونا مل جانے پر آجاتی ہے وہ مسکراہٹ جو دکھے دل سے نکلتی ہے ایسی مسکراہٹ جو مستقبل میں تھرکتی ناچتی ایک حسین قہقہا بن جائے گی۔

سلما روز ہی آتی ہے اور میں اس سے گھنٹوں باتیں کرتا ہوں۔ تصور میں اس کے روبرو بیٹھا گھنٹوں تکا کرتا ہوں۔ جس کی نیم واغمائی آنکھوں میں جیسے ہزاروں رومان مچلتے ہوئے اپنی آخری ہچکیاں پورے کر رہے ہوں جس کے نیلے نیلے خشک لبوں میں کیف کی جگہ ایک تلخی تھی جس کو چکھ لینے ہی سے طبیعت میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتا ہے جس کے بیضوی چہرے میں میں نے گلابیاں نہیں دیکھیں۔ یکلخت موسم گرما کا آخری پھول جو اپنی رعنائیاں آفتاب کی گرمی سے کھو چکا ہے۔

اکثر دفعا میں ایک عجیب سی سوچ میں ڈوبا رہتا کہ قدرت نے سلما کی تخلیق کر کے جیسے اپنے آپ کی توہین کر لی ہے ـــــ ایک عرصے کے بعد بارگاہ ایزدی میں میری دعا قبول ہوئی مگر مجھے ملی تو سلما ـــــ جس میں نہ رس ہے نہ زندگی بلکہ ایک بے برگ شجر جو کسی ویرانے میں کھڑا ہوا زبان حال سے اپنے تخلیق کرنے والے کا گلا کر رہا ہو ـــــ بعض دفعا اس مرجھائی ہوئی لڑکی سے میں جھنجلا اٹھتا جو ہمیشا حیا کا پردا آنکھوں میں لیے چپ چاپ میرے بازو بیٹھ جاتی۔ اور سر میں اپنی سوکھی مخروطی انگلیوں سے بال سنوارنے لگتی ـــــ اور مجھے سلما سے وحشت ہونے لگتی۔ میں جیسے جلد سے جلد اس کالی بلا سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ عجیب سا تیڑا بھینگا چہرا بنائے رکھائی سے پیش آتا۔ وہ آنکھوں میں ٹھاٹیں مارتا ہوا محبت کا سمندر لیے پوچھتی۔

"آج پریشان معلوم ہوتے ہو ـــــ"؟

"تمہاری بلا سے ـــــ" میں جھنجلا کر جواب دیتا۔

میرے اس وحشی پن سے وہ سہم سہم جاتی۔ ایک لمحے کے لیے تر بھی نظروں سے مجھے گھورتی اور پھر میری بکھری ہوئی کتابوں کو سلیقے سے جمانے لگتی۔ گرد سے اٹے ہوئے جوتوں پر پالش کرتی سارا مکان جھاڑ دیے چپ چاپ صاف کر دیتی۔ بدبو سے سڑے ہوئے موزوں کو صابن لگا لگا کر دھو دیتی اور پھر چولھا جلا کر چائے کی کیتلی چڑھا دیتی ـــــ اور مجھے معلوم ہوتا جیسے یہ مدقوق لڑکی تراخ پڑاخ میرے گالوں پر چانٹے لگا رہی ہے اپنی خدمت جتا کر ـــــ میں انتہائی فہم کا روکھا پن استعمال کرتا اور کبھی کبھی۔ جی میں آتا اس دھرتی کے بوجھ سے پوچھوں ـــــ

"او میری سوکھی نارنگی! آخر اس خدمت کو جتا کر مجھ پر احسان کا بوجھ کیوں لادنا چاہتی ہو ـــــ" مگر میرے یہ الفاظ دل کے دل ہی میں رہتے اور میں سگریٹ جلا کر سلما سے متعلق سوچنے لگتا۔ سلما چائے لیے چپ چاپ سی میری منتظر ایک خدمت گذار بیوی کی طرح کھڑی ہو جاتی۔ چہرا اور زرد ہو جاتا۔ ہونٹ کپکپانے لگتے۔ ڈرتے جھجکتے چائے کی پیالی میرے سامنے اسٹول پر رکھ دیتی اور دبی آواز میں ایک لفظ کہتا

"چائے"!!

اور مجھے معلوم ہوتا جیسے سلما نے ایک گھونسا سا میرے دل پر جڑ دیا ہو ہزاروں مرتے ہوئے ارمانوں کو جیسے ایک جگہ مجتمع کر کے بول رہی ہو ـــــ "چائے"

سلما کے ہاتھوں نے ہزاروں دفعا چائے بنائی ہوگی۔ ہزاروں ہی پیالیاں اس نے پینے والوں کے شکم میں انڈیل دی ہوں گی۔ اور پینے والوں نے بڑے ہی شوق سے اس کی بنائی ہوئی دودھ اور شکر کی چائے کو پیا ہوگا۔ مگر آج کی یہ چائے مجھے معلوم تھا کہ سلما نے اس میں چائے کی جگہ اپنا خون ڈالدیا ہے اور شکر کی جگہ اس کے موتی جیسے آنسو ٹپک پڑے ہیں خون اور آنسوؤں سے بنائی ہوئی یہ محبت بھری چائے جس کو بناتے ہوئے نہ جانے سلما نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ کتنے تصورات کی آگ اس نے چولھے میں جلائی ہوگی۔ اور کتنے ارمان چولھے کی لپکتی ہوئی آنچ کی طرح ابھر ابھر کر ٹھنڈے ہو چکے ہوں گے۔ اور پھر میرا یہ برتاؤ ـــــ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ایک شیطان کی طرح اپنے آپ پر بہت ملامت بھیجنے لگتا اور مجھے معلوم ہوتا سامنے کھڑی ہوئی سلما آسمان سے اتاری ہوئی محبت والی دیوی ہے۔ ایک روح جو امن و سکون کے سفید لبادے میں ملبوس، محبت بھرا آنچل پھیلائے صبر آزما لمحات لیے کھڑی ہے۔ چہرے پر اداسی دل میں بھڑکتے ہوئے شعلے ـــــ آنکھیں بے نور سی۔ مگر جگر میں محبت کا انجان سا طوفان ـــــ ایکایک وہ پھر بول اٹھتی ـــــ

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"

ایک لمحے کے لیے میری نگاہیں اٹھ جاتیں اور سلما کی آنکھیں نمناک ہونٹ لرزتے۔ زلف پریشاں گالوں پر چولھے کی سیاہی کے دھبے بالوں میں راکھ کی سفیدی، غایت درجا غم کا مرقع نظر آتی ـــــ

"ارے تم رو رہی ہو ـــــ؟" میں پوچھتا۔

"آپ کی بلا سے"

وہ بجھ سی جاتی ـــــ آنکھوں میں جھلملاتے تارے چمکنے لگتے۔ اور پھر میں اسے جھوٹی سچی قسمیں دے دے کر منانے لگتا اور روتی ہوئی سلما پلکوں پر تارے لیے ہوئے مسکرانے لگتی۔ اس کا بند بند مسکرانے لگتا۔ اس کی کومل تمنائیں۔ انگڑائیاں لینے لگتیں۔ اور پھر سلما جیسے مجسم عقیدت بن جاتی۔

شاید مرد کی پچھے دار باتوں پر ہر عورت مجسم عقیدت بن جاتی ہے۔ کتنی بھولی ہوتی ہے۔ ہندستانی عورت اور کتنی احمق ہوتی ہے۔ یہاں کی محبت ایک لمحے میں آنسو اور ایک لمحے میں مسکراہٹ، روتی ہوئی عورت کو ذرا مسکرا دو وہ اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور سلما سے جب کبھی میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہوں وہ پھیل پھیل جاتی ہے۔ ہندستانی

لڑکی جو ٹھہری۔ کبھی کبھی پیار بھرے لہجے میں پوچھتی "رشو سچ بتا و تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا ——؟"

اب میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ واقعی میں اس سے محبت کرتا ہوں اگر محبت نہ ہوتی تو بھلا ایک سوکھی ٹہنی کو اپنی محبت کے آنگن میں کیسے نصب کرتا۔ اور پھر جب کبھی اس کے اپنے گھر میں شادی بیاہ کی باتیں ہوتے لگتیں تو وہ پانی کا بھری دوڑی دوڑی میرے پاس آتی۔

"رشو! رشو!!" چہرے پر دنیا بھر کی بے بسی لیے پوچھتی "رشو! زندگی بھر تک کا ساتھ دو گے نا؟" اور میں حیرت سے اس کا چہرا دیکھنے لگتا۔ وہ امید و بیم کے ہزاروں مچلتے ہوئے سوال لیے پوچھتی۔

"بولو رشو ——!!"

میرا دماغ ماؤف سا ہو جاتا۔ اتنا بہت کچھ پڑھ لکھ کر بھی سلما مجھے پاگل ہی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے اس بھولے پن سے ایک کوفت سی ہوتی۔ جی میں آتا کہ صاف صاف نفی میں جواب دیدوں۔ مگر زبان پر جیسے تالے سے لگ جاتے الفاظ حلق میں آ آ کر رک جاتے اور میں بغیر کچھ سوچے ہوئے اثبات میں جواب دیتا اور سلما جیسے ناچنے لگتی۔

اور پھر ایک عرصے تک سلما نہ آئی۔ میں وسوسوں کے بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنے آپ کو پاگل بنا بیٹھا ایک ہندستانی عاشق کی طرح جو خاک اڑانے سے زیادہ سگریٹ پھونکنے لگتا ہے —— قیس نے صحرا بجد میں خاک اڑائی اور شنجر و حجر سے اپنی لیلا کا پتا پوچھا۔ اور میں گھر کی چار دیواری میں بند سگریٹ پھونک پھونک کر اپنا سینا کھوکلا کرتا رہا۔ ثمنو کی زہر عشق کی جگہ نگمگین فلمی گانے گا گا کر اس کمی کو ایک حد تک پورا کر گیا۔

کتنی حیرت کی بات ہے جو میں ایک مدقوق قسم کی لڑکی کے لیے آہیں بھر رہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں ساغر نہیں چھلکتے۔ جسم چاندی نہیں اگلتا۔ دانت موتی نہیں روتے ہونٹ پھول نہیں جھڑاتے جس کی آواز سے نغمے نہیں نکلتے۔ میرے وحشت زدہ چہرے پر اور وحشت آ گئی۔ مسکین چہرے پر یتیموں کی سی یاسیت برس رہی تھی۔ بغیر شیو کیا ہوا چہرا الجھے ہوئے بال میلے کپڑے میں کسی چڑیا گھر کا بن مانس تھا جو آئینے کے سامنے کھڑا ہوا عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔

اور آخر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ایک کالی رات میں سلما کے گھر پہنچ گیا۔ رات کے دس بج رہے تھے سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سلما کے ماں باپ شاید کھا پی کر پلنگ پر لیٹے لیٹے اللہ میاں کا شکر ادا کر رہے تھے۔ مٹی کے تیل کے چراغ کی روشنی میں مجھے ایک چہرا نظر آیا۔ سلما کا چہرا ایک حسینا کا چہرا قلوپطرا کا چہرا حسین، ہیلن کا چہرا شیکسپیر کی ہیروئن کا ایک ڈرامائی چہرا —— بھرے بھرے گلابیاں اگلتے ہوئے گال مخمور آنکھیں، گلابی رسیلے ہونٹ جو ایک مدھر اکیف چھلکانے کو تیار رہیں۔ اور میں پھٹی پھٹی آنکھیں لیے ٹٹی کی آڑ سے سلما کو تکے جا رہا تھا۔ کتنی بدل گئی تھی وہ —— ہڈیوں کے ڈھانچے کی جگہ اب وہ خون اور گوشت کا ایک ترشا ہوا یونانی مجسمہ —— میں نے دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگ لی۔ اور جی ہی جی میں ہزاروں حمد و ثنائیں اس قادر مطلق کی کر ڈالیں جس سے میں بغاوت پر کمر لیتا تھا۔ اب سلما ایک حسین تتلی تھی —— پھوندگی شلوار کی جگہ ایک قیمتی سی سفید ساڑھی، سفید نگینوں والا کالا بلاؤز مشانے پر بکھری ہوئی کالی کالی زلفیں اور پھر میں جیسے تڑپ کر رہ گیا دل میں ایک گدگدی سی اٹھی کہ جھپٹ کر سلما کو اپنی باہنوں میں بھینچ لوں اور اس سے گڑگڑاتے ہوئے کہوں ——

"میری روح۔ میری۔ تمنا، میری زندگی! آخر تم نے میرے پاس آنا کیوں چھوڑ دیا۔ آخر اتنا لمبا عرصا میں نے کس طرح کاٹا۔ تمہیں احساس ہے —— میں نے تمہارا انتظار شام کے جھٹپٹے میں ستاروں کی چھاؤں میں چاندنی راتوں

میں . . . " مگر ـــــ مگر یہ سلما چراغ روشنی میں آنسو کیوں بہا رہی ہے میں تڑپ کر رہ گیا۔ تھوڑی سی ہمت کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پہنچ گیا وہ گڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

" ارے آپ "! وہ حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

" ہاں ، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تمہارا شوہر"

اور پھر سلما نے رو رو کر بتایا کہ اب وہ میری نہیں ہو سکتی کیونکہ پروفیسر نجمی کی ہو چکی ہے جو چار بیویوں کو مار کر پانچویں کی تیاری کر رہا ہے۔ نجمی جو ایک یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، جو قریب پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے جو میرا اپنا لکچرار ہے میرا اپنا استاد ہے جس کا میں عزیز ترین شاگرد جو کالج کی چار دیواری میں سر پھرے لونڈوں کو زندگی کا درس دیتے آیا تھا۔ کالج کے در و دیوار آج بھی گواہ ہیں جہاں اس نے چیخ چیخ کر اخلاقیات پر لکچر دیے تھے۔ کالج کی ایک لڑکی کی عصمت دری پر وہ گھنٹوں غمگین رہا تھا۔ ہفتوں میں نے دو ایک نوالے بمشکل نہ کھائے تھے۔ اس دن کا غم خوار پروفیسر نجمی آج ایک خونخوار بھیڑیے کا روپ دھارے سلما سے زیادہ اس کی جوانی کا مالک بن رہا تھا جو ہر ماہ چپ چاپ ایک بھاری رقم اس کے ماں باپ کو بھیج کر اس کا مقدار بن رہا تھا۔

میری آنکھوں میں دنیا تیرا و تار ہو گئی اپنی محبت کا جنازہ لیے سلما کے بھرے بھرے جسم کو دیکھ رہا تھا جو پروفیسر نجمی کے ریشمی لبادوں میں لپٹی ہوئی اس بکری کی طرح پھول چکی تھی جسے قصاب کی چھری تلے ایک نہ ایک دن ذبح ہونا تھا ـــــ آج میری محبت مونہہ چڑا رہی تھی میری سکراہٹ، میری خستی میری محبت سلما میں وہ تبدیلی نہ پیدا کر سکی تھی جو پروفیسر نجمی کے چمراتے ہوئے نوٹوں نے پیدا کر دی تھی محبت دولت کے نیچے دب گئی تھی۔ پروفیسر نجمی نے محبت کے گلے میں ریشم کا حسین پھندا ڈال دیا تھا اور مجھے اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا حلق میں پھندے سے پڑ رہے تھے آنکھیں باہر نکلی جا رہی تھیں ـــــ

میں نے سلما پر ایک آخری نظر ڈالی جو جھینگی پلکیں لیے چپ چاپ میرا چہرا تکے جا رہی تھی۔ اور میں پروفیسر نجمی کے قمار خانے میں اپنا سب کچھ ہار کر گھر آگیا۔ رات بھر میں سگریٹ کے دو ئیں پھونک ڈالے ـــــ تکیوں میں سر گھسیڑے دیر تک چپکے چپکے سسکتا رہا۔ بلکتا رہا ایک بچے کی طرح ایک معصوم بچے کی طرح جس کا کھلونا چھن چکا ہو ـــــ آج مجھ سے سلما بھی تو چھن چکی تھی۔

رات کی دھندلاہٹیں آہستہ آہستہ صبح کی شفق میں مدغم ہو رہی تھیں اور مجھے معلوم ہو رہا تھا جیسے آج کی صبح نے میری محبت کا خون شفق کے چہرے پر مل دیا ہے۔ میری لرزتی ہوئی بصورواتی آنکھیں پوری قوت سے چیخ اٹھیں

" سلما "!!!

ایک لمحے کے لیے شفق کی لالی سے سلما نے جھانکا۔ اور دوسرے ہی لمحے پروفیسر نجمی کے سوکھے ہاتھوں نے اسکا گلا دبوچ لیا ـــــ

شاعری کے مقابلے کے نتائج

برطانیا کی آرٹس کونسل نے حال ہی میں شاعری کا ایک مقابلہ منعقد کیا تھا جس میں دولت مشترکہ کے متعدد شاعروں نے شرکت کی تھی جن ہندستانی شعرا بھی اس مقابلے میں شامل ہوئے تھے اب اس مقابلے کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ مس الزبتھ جننگز کی کتاب "نظمیں" بہترین قرار دی گئی ہے اور اسے ۲۲۵ پونڈ کا پہلا انعام دیا گیا ہے آتنی ہی مالیت کا دوسرا انعام مس کیتھلین رین کو دیا گیا ہے اسی لیے اس مقابلے میں جو کتاب داخل کی گئی اس کا نام ہے "پہلا سال اور دوسری نظمیں" کل ۱۳۱ کتابیں اس مقابلے داخل کی گئی تھیں جن میں . . اکتابیں برطانوی شعرا کی تھیں

۱۰۱

اجنٹا کے غاروں میں مصوری کے نامونوں کا تحفظ

اجنٹا کے غاروں میں فن مصوری کے نمونوں کو نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے بیش بہا نوادرات میں شمار کیا گیا ہے۔ ان کو زمانے کے دست برد سے بچانے کے لیے محکمۂ آثار قدیمہ کے عملے کو زبردست جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔

اجنٹا کے غاروں میں اس بیش بہا ورثے کی قدر و قیمت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ اس کی آخری تصویریں بھی ۱۳۰۰ سال پرانی ہیں اور خدا اجنٹا کے غار بھی ہزارسالہ قدامت کی آئینہ داری کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان تصویروں کی آب و تاب کو زمانے کی گردش نے چھین لیا ہے تاہم یہ تصویریں حسن اور خوب صورتی کے مجسمے ہیں۔ اور ان کی بدولت صدیوں سال پہلے کی دنیا کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

اجنٹا کے غار آدمیل کے ارد گرد ایک ۲۵۰ فٹ بلند چٹان کو تراش کر بنائے گئے ہیں ان غاروں کے نشیب میں دریائے واگھورا کا صاف اور شفاف پانی سبزا پوش درختوں کے سائے میں بہا جا رہا ہے غاروں کے چند دالان ۶۰ مربع فٹ ہیں ان کی سایا پوش دیواروں پر گم شدہ صدیوں میں گم نام مصوروں نے گوتم بدھ کے بے شمار مجسموں کی تصویر کشی ہے صنف نازک کا ایک مکمل آدرش پیش کیا گیا ہے اور جانوروں اور پودوں کے شفقت اور مہربانی کا اظہار کیا گیا ہے۔

کنول کے پھول کا ہر دور دکھایا گیا ہے۔ غرض یہ کہ ان غاروں کے در و دیوار پر درندوں وحشی جانوروں اور کیڑوں تک کی تصویروں سے آراستہ ہیں اس کے علاوہ فن عمارت، لباس اور زیورات گھر کا آرائشی ساز و سامان اور کھانے پکانے کے برتنوں تک کی تصویریں موجود ہیں اور اجنٹا کے غاروں میں ہر وہ چیز موجود ہے جو فن مصوری کو ناپائیداری کی آغوش سے جدا کر کے غیر فانی حسن و معنی سے مزین کرتی ہے۔ فن مصوری کے ان نمونوں میں حیات انسانی کے ہر دور اور ہر شعبے کی نقاشی کی گئی ہے۔ بدھ مت کے اس ہزار سالہ دور میں جب اس کی روشنی کل براعظم ایشیا اور سمندر سے گھرے ہوئے جنوبی قطعات ارض پر چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت آلات مصوری اس مذہب کے پیغام سلامتی کی تصویر کشی میں مصروف تھے اجنٹا کی ان تصویروں نے دور افتادہ ملکوں میں بھی اس جوش عقیدت کو ابھارا اور آج افغانستان میں باغی بان سیلون میں سیگیریا نیپال اور تبت کی جلی مصوری چین کی تنگ ہونگ کی غاروں اور جاپان میں ہوری یوجی کے مقام پر اجنٹا ہی کی مصوری کے موثرات نقش ہیں۔

اجنٹا کی تصویروں کی بوسیدگی کا بڑا سبب یہ ہے کہ جس پلاستر پر تصویر کشی کی گئی ہے اس میں نباتاتی مادے کی آمیزش ہے اور اس نباتاتی مادے کے کیڑوں کا عمل تخریب ان تصویروں کو برباد کر رہا ہے۔ چنانچہ ان کیڑوں کی مزید تخریب کی روک تھام کے لیے غاروں کے ان تصویر کشیدہ حصوں کی حفاظت کی جا رہی ہے۔ جہاں خرابی پیدا ہو گئی ہے وہاں سے گرد و غبار صاف کر کے تصویر کشیدہ حصے کے ارد گرد پلاستر کو مضبوط بنانے کی غرض سے لاک کو اسپرٹ میں گھول کر برش سے لگایا

جاتا ہے۔ جب کسی تصویر کی نہ اتارنے لگتی ہے تو اسے مکمل کے ٹکڑے اور سریش سے لسنا کر دیا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ اس طرح کے اکثر طریقوں سے تصویروں کو محفوظ کیا جاتا ہے۔

۱۸۱۹ء میں جب ان غاروں کو دریافت کیا گیا تھا تو اس وقت ان پر صدیوں کا گرد و غبار جمع تھا۔ چنانچہ اس وقت ان تصویروں کو محفوظ کرنے والوں نے ان پر وارنش پھیر دیا تھا اور اس وارنش کے ساتھ ہی تصویروں کا کچھ گرد و غبار بھی وہیں جم گیا تھا لیکن اب تصویروں کو صاف شدہ اسپرٹ سے صاف کیا جاتا ہے اور بے رنگ کی صاف ستری لاک لگائی جاتی ہے اس کے علاوہ ان تصویروں کو سون سون ہواؤں سے بھی نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ بارش کے پانی سے اس چٹان میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ اور چٹان کے معدنی اجزا پانی میں گھل جاتے ہیں اور اس کے باعث چٹان کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس لیے چٹان کے جو حصے کمزور ہو گئے ہیں انہیں مضبوط بنایا جا رہا ہے اکثر اوقات بارش کا پانی غاروں کی منقش چھتوں سے ٹپکنے لگتا ہے رنگ دار سطح پر پھیل جاتا ہے اور ان میں نمی پیدا کرنے کا باعث ہو جاتا ہے چنانچہ پلاستر میں بڑے سے سوراخ کر دیے گئے ہیں تاکہ پانی نیچے سے بہہ جائے اور تصویروں والا حصہ خراب نہ ہو۔ اس کے علاوہ اوپر کی چٹانوں سے بہہ کر آنے والے برساتی پانی کے لیے سطح پر پانچ نالیاں بنا دی گئی ہیں۔

اوپر گنائی ہوئی باتوں کے علاوہ غاروں میں سنگتراشی کے کانٹوں کی بھی حفاظت کی جاتی ہے۔ انہیں صاف اور ایمونیا کے مرکب سے برش کی مدد سے دھویا جاتا ہے حال ہی میں ایک ماڈل سازہ بھی مقرر کیا گیا ہے تاکہ وہ سنگ تراشی کے ضایع شدہ حصوں کا جایز لے جایزے کے بعد اس بات پر غور کیا جائے گا کہ ضایع حصوں کی مرمت کیوں کر کی جائے۔

سوویت یونین میں ریڈیو براڈ کاسٹنگ کی تنظیم

۱۹۰۵ء میں روس کے بڑے مشہور سائنس داں اس پوپوف نے ریڈیو ایجاد کیا اس ایجاد نے سائنس اور انجینیرنگ کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ۱۹۱۱ء میں عملی طور پر کارآمد ٹیلی ویژن کے سیٹ کا دنیا میں سب سے پہلا ماڈل روس میں تیار کیا گیا۔

۱۹۱۹ء میں نژنی نوگورود ریڈیو لیبوریٹری نے ریڈیو براڈ کاسٹنگ سروس شروع کی یہ اس فرمان کے مطابق شروع ہوئی تھی جس پر وی۔ آئی لینن نے دستخط کی تھی چنانچہ اس طرح سوویت یونین دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں ریڈیو براڈ کاسٹنگ سروس شروع ہوئی۔

اس لیے سوویت عوام کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک کو ریڈیو کی جنم بھومی تصور کریں۔

سوویت براڈ کاسٹنگ سروس میں طاقت ور اسٹیشنوں کا ایک گنجان سلسلہ ہے جو لانگ میڈیم اور شارٹ ویو نیز پروگرام نشر کرتے ہیں یہ نشریات سوویت یونین میں بسنے والی تمام قوموں کی زبان میں ہوتے ہیں۔

ریڈیو سیٹ کے علاوہ سوویت باشندوں کو ریڈیو ریلے سروس کی بھی سہولت ہے جو شہروں اور دیہی علاقوں میں موجود ہے اس نظام میں لاؤڈ اسپیکر کا بٹن دباتے ہی پروگرام سنائی دینے لگتا ہے بڑے بڑے تھیٹروں، موسیقی گاہوں اور کھیل کے میدانوں (اسٹیڈیم) میں ڈراموں موسیقی کھیلوں کے مقابلوں وغیرہ کے براڈ کاسٹ کرنے کے لیے خاص آلے لگے ہوئے ہیں۔

حالیہ چند برسوں میں ٹیلی ویژن نے بڑی ترقی کی ہے ٹیلی ویژن اسٹیشن مقبول فلمیں اور ماسکو کے تھیٹروں کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔

کلکتا میں بہروں اور گونگوں کا اسکول

ڈی۔ ال۔ دت

سائنس۔ علم طب۔ علم نفسیات اور علم الاعضا کی جدید ترقی اور معلومات میں اضافے کی بدولت دنیا لاکھوں طریقوں سے مستفید ہو رہی ہے سماج کے ان ابدنصیب اشخاص کو بھی اپنی زندگیاں اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مفید بنانے میں بھی سائنس اور اوپر بتلائے ہوئے علوم سے بڑی مدد مل رہی ہے۔ اندھے بہرے گونگے اپاہج اور جسمانی نقائص میں مبتلا لوگ بھی اب نسبتاً خشگوار زندگی بسر کرنے کے قابل ہو رہے ہیں۔ ذیل میں کلکتا کے بہروں اور گونگوں کے سکول کا کچا حال درج ہے۔

کلکتا میں بہروں اور گونگوں کے ادارے نے پچھلے ۶۰ برس کے قیام میں بڑا مفید کام کیا ہے اور اس نے ہندستان کے ۲ لاکھ بہروں اور گونگوں کو قابل کارنبانے میں بیش قیمت حصا لیا ہے۔ یہ ادارہ عنقریب ہی اپنی سالوڑیں سالگرا کا جشن منائے گا۔

جب سے اس کی بنیاد پڑی ہے تقریباً اسی زمانے سے اس اسکول کا واشنگٹن میں گیلاڈٹ کالج سے تعلق رہا ہے جو دنیا بھر میں واحد ادارہ ہے جہاں بہروں کو عالی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلکتا کے اس بہروں اور گونگوں کے اسکول کے تین پرنسپلوں میں سے دو نے گیلاوٹ کالج میں تربیت پائی تھی جن میں سے پہلے نے ۹۷۔۹۶۔۸ کے دوران میں وہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ دوسرا پرنسپل اب جو ٹائر ہو چکا ہے کلارک اسکول نارتھمپٹن مساچیٹس (امریکا) کا طالب علم تھا۔

ان دونوں اداروں نے درمیان قریبی تعلق ہند امریکا کے باہمی تعاون کی ایک نمایاں مثال ہے چنانچہ اس اسکول کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر سیلندر ناتھ بیرجی (ڈی پیڈ گیلاڈٹ کالج) کا کہنا ہے کہ ہم نے گیلاڈٹ کالج میں بہت سے لڑکا کو وظیفے دیے جانے کی سفارش کی تاکہ انہیں فیس اور اخراجات ادا نہ کرنے پڑیں۔ اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اس کالج کے منتظموں نے اس سفارشوں کو بلا امتیاز منظور کیا۔

رسالا بہروں کے اسکولوں کے معلموں کے کنونشن کے رسائے ڈوف ان انڈیا (ہندستان میں بہرے) میں گیلاڈٹ کالج کا عملا بھی مضمون لکھتا رہتا ہے۔ کلکتا کے اس ادارے کا پرنسپل اس رسالے کا پبلشر ہے۔

پرنسپل کے علاوہ کلکتا کے اس بہروں اور گونگوں کے اسکول کے عملے میں امریکا کا تربیت یافتا ایک اور معلم بھی ہے۔ اس کا نام ــــ انل سی مترا ہے جو فل برائٹ وظیفے پر حال ہی میں کلارک اسکول اور آئیوا یونیورسٹی میں سال بھر کے بعد ڈپلوما لے کر ہندستان واپس آیا ہے

ابتدا کلکتا کے سٹی کالج سے ایک کرسٹان مشنار نے کرسمس ۱۸۹۳ء میں بہروں اور گونگوں کو پڑھانے کی جماعت شروع کی گئی تھی۔ جس میں صرف دو طالب علم تھے۔ اس وقت سے بہروں اور گونگوں کے اس سکول نے مستعدی سے ترقی کی ہے

آج اس میں ۲۶۸ لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں جن کی عمریں ۲ سے ۱۶ برس تک کی ہیں۔ اور باقاعدہ تربیت یا فتہ عملا موجود ہے۔

کلکتا کی کٹ دا بالائی سرکلر سڑک کے کنارے ۱½ ایکڑ زمین پر واقع ہے اس اسکول کی اچھی عمارتیں اور کھیل کا وسیع میدان، جماعتوں کے کمرے۔ ورکشاپ بھی ہے جیسمی ناتھ منیرجی اس اسکول کے پہلے پرنسپل اور بانیوں میں سے تھے۔ اسی طرح یہ اسکول امریکا کی بہری اور گونگی خاتون مس جیرٹروڈ میکسویل جیسی چندا دینے والوں کی فیاضی کا ثبوت دیتا ہے۔

امداد ہندستان اور بنگال کی سرکاریں اس کی امداد کرتی ہیں۔ ٹرسٹیوں کا ایک بورڈ اور ایک مجلس عاملا اس کی منتظم ہے اور بہروں اور گونگوں کے ہمدرد لوگوں کے چندوں پر اسکول کا بڑی حد تک دارومدار ہے۔

مفید پیشوں میں اس اسکول کے سابق طلبا سارے ملک میں مختلف نافید بخش پیشوں میں مصروف ہیں ان میں سے چند مصور ہیں چند پرنٹر چھپائی کا کام کرنے والے چند درزی اور چند جلبی کا کام کرنے کے ماہر ہیں۔ ان میں ممتاز دو جاپانے والے ایک شخص مسٹر بیرین پی چودھری ہیں۔ جو بھوپنیشور میں کل انڈیا بہروں اور گونگوں کے اسکول (آل انڈیا ڈیف اینڈ ڈمبا سکول) کے بانی پرنسپل ہیں۔

تربیت کا طریقا کلکتا کے بہروں اور گونگوں کے اسکول میں طلبا کی تربیت کے تین درجے ہیں پرائمری (ابتدائی) انٹرمیڈیٹ (درمیانا) اور ایڈوانسڈ (عالا) عالا درجے میں طالب علم کو اپر پرائمری اسکول کے امتحان کے لیے تیار کیا جاتا ہے تین جماعتوں میں ایسے آلات کا انتظام کیا گیا ہے کہ جن سے طلبا کو سننے میں آسانی ہو۔ سب جماعتوں میں اس قسم کا انتظام کیے جانے کا پلان بنایا گیا ہے حالیا ئی بات لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکا تعلیم ہے

صنعتی شعبا اسکول کے صنعتی شعبے میں ورکشاپ لوہار بڑھئی جلا ہے جلد سازی، درزی کے کام اور پوشاکیں بنانے نمونے تیار کرنے تجارت اور دوسرے فنون لطیفا کی تربیت دی جاتی ہے۔ پبلک کی طرف سے جو آرڈر ملتے ہیں انہیں طلبا پورا کرتے ہیں۔ یہ آرڈر اسکول کی باقاعدہ آمدنی کا ذریعا ہیں۔

کھیل۔ ناٹک۔ ناچ وغیرا اسکول کے پروگرام کا باقاعدہ حصا ہیں۔ رابندرناتھ ٹیگور کا ایک دلکش ناچ "ناٹک ناچ پوجا" حال ہی میں یہاں کھیلا گیا جس سے ناٹکوں میں ایسے معذور بچوں کے حصے لینے کی قابلیت کا پتا چلتا ہے۔

اسکول کی توسیع اور ترقی کے پلان بھی زیر نظر ہیں ان میں سے ایک پلان یہ ہے کہ مکانات کی توسیع کے لیے مزید زمین ملتے ہی تعلیمی شعبے کو سکنڈری درجے تک پہنچایا جائے ہندستان کی سرکار کی طرف سے ایک ٹھوس امدادی رقم ملنے پر گھریلو صنعتوں کا ایک شعبا قایم کرنے کا کام شروع کیا جائے والا ہے جس میں کام سیکھنے کے ساتھ ساتھ طلبا کو آمدنی بھی ہوتی رہے گی۔

سمندر پار کے طلبا کے لیے انگریزی

سمندر پار کے طلبا کے لیے انگریزی کے ایک کورس کا انتظام کر رہی ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریبا ساٹھ ممالک کے طلبا جن میں ہندستانی طلبا بھی شامل ہیں اس کورس سے مستفید ہو چکے ہیں۔ سمندر پار کے کالجوں اور اسکولوں کے ٹیچروں کے لیے اس کورس کی خاص اہمیت ہے کیونکہ اس میں نیا دا زور انگریزی زبان اور ادب پر دیا جاتا ہے انگریزی زبان کے ماہرین مختلف موضوعات پر لکچر دیں گے۔

۱-۱ ہاضمہ اور آلات ہضم

ہماری خوراک کیمیاوی اعتبار سے بہت پیچیدہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ ہر شخص اجزا کے طور پر سادا مادا اور مرکبات کی نوعیت کے مختلف اجزا مادوں کے فرق سے واقف ہے مرکبات میں متعدد اجزا کے جوہر باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ جوہروں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی ترتیب بھی زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے اور مادے کے زیادہ مختلف اجزا ہونے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ کاربو ہائیڈریٹ (آکسیجن اور ہائیڈروجن کے کاربن کا مرکب) روغنیات اور پروٹین والی مختلف صورتوں کی جو غذا ہم کھاتے ہیں انہیں سادا مادوں میں تحلیل کرنا نظام ہضم کا کام ہے تاکہ وہ بدن میں جذب ہو سکے۔

آلات ہضم میں موٹھ دانت زبان اور لعاب دار غدود، غذا کی نالی معدہ اور چھوٹی بڑی آنتیں شامل ہیں بڑی آنت میں سے غذا کا وہ حصہ گذرتا ہے جو جسم کے لیے کارا ہوتا ہے۔

لعاب دہن موٹھ کے لعاب دار غدودوں میں سے نکلتا ہے لعاب دہن کے بہت سے کام ہیں یہ موٹھ اور دانتوں کو صاف کرتا ہے اور ان میں سے غذا کے ذروں کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے جو بیماریوں کے جراثیم پیدا ہونے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ یہ موٹھ اور ہونٹوں کو نرم اور چکنا رکھتا ہے تاکہ وہ گویائی کا کام کر سکیں۔ پس اگر لعاب دہن خشک ہو جائے تو بولنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ لعاب دہن غذا کے ساتھ مل کر اسے اور زیادہ نرم اور ملایم بنا دیتا ہے اور وہ زیادہ آسانی کے ساتھ نگلی جا سکتی ہے۔ یہ غذا کو تحلیل کرتا ہے اور اس عمل تحلیل کے باعث غذا میں ذائقے کی حد پیدا ہوتی ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ اس لعاب دہن میں پتھالین (PTHYLION) نامی ایک کیمیائی خمیر بھی ہوتا ہے اس کیمیائی خمیر میں ایسے مادے شامل ہیں جو کیمیائی عمل میں سرعت پیدا کرتے ہیں اور اگر یہ نہ ہوتے تو کیمیاوی عمل یا تو بہت سست ہوتا یا بالکل ہی نہ ہوتا۔ کیمیائی خمیر کاربوہائیڈریٹ کو شکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

موٹھ کی غذا کو دانت چبا کر لعاب دہن کے عمل سے نگلنے کے قابل بناتے ہیں اور زبان کے پٹھوں کی حرکت اسے غذا کی نالی میں پہنچاتی ہے اور غذا کی اس نالی کے ذریعے خوراک معدے میں پہنچتی ہے۔

معدے میں غذا کو ہضم کرنے کے لیے کئی قسم کے رس موجود ہوتے ہیں۔ معدے کے بعض غدود ایک آبی رس بناتے ہیں جس میں ہائیڈروکلورک تیزاب کی کافی مقدار ہوتی ہے اس تیزاب کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ معدے کو کیمیائی چیزوں نیز تیزابی محلل کی موجودگی میں ہی مناسب طور پر کام کر سکتے ہیں۔ رینن اور پیپسن (جو ہر ہضم) دو کیمیائی خمیر معدے ہی میں تیار ہوتے ہیں رینن دودھ میں سے پروٹینی اجزا کو علحدہ کرتا ہے پھر پیپسین کا عمل ان اجزا پر شروع ہوتا ہے۔ پیپسین کھائی ہوئی غذا کے پروٹینوں کو بھی تحلیل کرتا ہے۔

غذا معدے سے گذر کر چھوٹی آنت میں پہنچتی ہے جو طویل اور ایک کنڈلی نما نالی کی صورت میں ہوتی ہے۔ نالی کی اندرونی دیواریں انگلیوں کی مانند بے شمار دندانے ہوتے ہیں جو سطح کو بڑھاتے ہیں اور اس کے ذریعے عمل تحلیل انجام پاتا ہے انگلیوں کے مشابہ ہر دندانے کے اندر خون کی ایک نالی ہوتی ہے اور دوسری نالی میں ۔ ۔ تام کی ایک سیال شئے ہوتی ہے روغنی مادا دوسری نالی میں چلا جاتا ہے اور غذا کے دوسرے مادوں کی تحلیل کی ہوئی پیداوار خون کی نالی میں چلی جاتی ہے۔

یہیں پر نمک اور پانی خون میں جذب ہوتے ہیں لیکن پانی کی زیادہ مقدار بڑی آنت میں جذب ہوتی ہے یہ بڑی آنت دایرہ ہضم ہی کا حصہ ہے اور اس کے فوراً ہی بعد چھوٹی آنت

لارڈ صاحب

شہباز پرویز

انٹ گیری سینی ٹوریم کے ایک ویران وارڈ میں آج میں نے اسے موت سے کشمکش کرتے دیکھا آج شام جب میں اس کے وارڈ میں گئی تو کمرے میں ایک بھیانک خاموشی طاری تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہوئی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے اور دہکتے ہوئے کوئلے کی راکھ بھی پڑی ہوئی تھی۔ کتنی مناسبت تھی اس میں اور ان کوئلوں کی راکھ میں۔

وہ ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا موٹا بلانکٹ اس کے آدھے جسم کو ڈھانکے ہوئے تھا کتنا خطرناک نظر آرہا تھا وہ ——— جس کا سانولا سلونا رنگ مسکراتا ہوا شاداب چہرا دیکھنے کی مجھے ہمیشہ خواہش رہی آج اس کے قریب جاتے ہوئے اس کے دبلے ہوئے پچکے ہوئے گالوں اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس قدر ہیبت ہونے لگی۔ وہ زندگی بھر مسکراتا رہا۔ مصیبتوں کے وقت تو یہ مسکراہٹ اور زیادہ پھیل جاتی تھی کسی نے اس کے متعلق کیا خوب کہا تھا کہ قدرت اس سے سب کچھ چھین سکتی ہے لیکن اس کی مسکراہٹ کو چھیننا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اور یہ واقعی بھی تھا۔ آج شام جب میں نے ڈرتے ڈرتے بلانکٹ کو اس پر سے ہٹایا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ——— مجھے اس کی وہ شوخ مسکراہٹ یاد آگئی جو نہ جانے کتنوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی کتنوں کے سینوں پر سانپ لوٹا دیتی تھی۔ کتنوں کو ہنسا دیتی تھی ———

لوگ اسے چاہتے تھے لوگ اس سے چڑتے تھے۔ لوگ اس کے معترف تھے لوگ اس سے حسد کرتے تھے لوگ اسے نیک سمجھتے تھے لوگ اسے بدنام کرتے تھے لیکن وہ لوگوں کی چاہت، چڑ، اعتراف، حسد نیک نامی اور بدنامی سے نہ تو خوش ہوتا تھا اور نہ رنجیدہ البتہ وہ بے حد ضدی واقع ہوا تھا۔

کسی بات پر اڑ جانا اس کی فطرت تھی۔

"دیکھو شمشیر خاں تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ میں کہتی وہ صرف مسکرا دیتا"

"تمہاری یہ ضد لوگوں کو پسند نہیں۔ اس کے جواب میں بھی وہی خاموش مسکراہٹ اس کی یہ ضد مجھے اس معصوم بچے کی ضد معلوم ہوتی جو کالج کے ٹکڑے ہی کو ہیرے کا نعم البدل سمجھ کر مسکراتے ہوئے ہیرا پھینک دیتا ہے اور کالج کے ٹکڑے سے کھیلنے لگتا ہے۔

واقعتاً تو یہ ہے کہ اس کے کردار میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ دھوکا فریب کا سایا تک اس کے پاس نہ پھٹکتا تھا وہ نہایت سادہ لوح اور بھولے قسم کا انسان تھا۔ اس کی لاپروائی، دریا دلی اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس کے دوستوں نے اسے "لارڈ صاحب" کا خطاب دے رکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ساری صفات جو ایک نوبل لارڈ میں ہونی چاہئیں اس میں موجود تھیں۔

شادی کے بعد جب میں پہلی مرتبہ حیدرآباد آئی تو اپنے سسرال میں سب سے زیادہ بے تکلفی اسی سے ہوگئی وہ خود ایک دن کسی کام سے جھجکتے جھجکتے میرے کمرے میں چلا آیا۔ اور کوئی کتاب لیے تیز تیز واپس جانے لگا۔

"دیکھیے آپ کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے خود چھیڑا حقیقت تو یہ ہے کہ میں تنہائی سے اکتا گئی تھی۔

"جی یوں ہی باہر جا رہا ہوں اس نے مرعوب لہجے میں کہا"

"آپ کہاں پڑھتے ہیں"

"جی سٹی کالج میں" میں نے اس کے لبوں پر ایک

دل کش مسکراہٹ دیکھی۔"

"یہ ناول آپ کا تھا۔" بلا اجازت ہم نے پڑھ لیا۔

"جی کوئی مضائقہ نہیں" آپ کو ناول افسانا پسند ہیں۔ وہ بے اختیار نہیں پڑا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کے بعد پابندی سے لارڈ صاحب مجھے رسالا ناول سربراہ کرنے لگا۔ ہم اکثر افسانوں کے پلاٹ پر اور کہانیوں کے لکھنے والوں پر تبادلہ خیالات کرتے کتنے بکھرے ہوئے خیالات ہوتے تھے اس کے ہم دونوں کے خیالات بڑی حد تک ملتے جلتے تھے اور جہاں کوئی بحث چھڑتی وہ بڑی عمدگی سے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹا تھا لیکن اس کا انداز اس قدر بزرگانہ اور لہجہ پر اثر ہوتا تھا کہ بعض اوقات میں مرعوب ہو جاتی حقیقت تو یہ ہے کہ خیالات کا میل ہی دوستی کا سنگ بنیاد ہے اور پھر اس کی وہ معصوم مسکراہٹ میں نے اس عمر کے نوجوانوں میں اس قدر معصومیت کہیں نہیں دیکھی۔

وہ ایک دن پریشان سا میرے پاس آیا۔ میں نے دریافت کیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"جی آپ پاس ہی آ رہا تھا" رستے میں خان صاحب کی بیٹی ریشمان مل گئی۔ اس کے ساتھ چائے پینے میں دیر ہو گئی میرا نا تھا ٹھہرتا اور ایک دن میں اس کے گھر گئی۔ وہ کسی تقریر کے مقابلے میں حصہ لینے جا رہا تھا۔ چلتے میں اس نے کہا ——

"دیکھیے میری الماری میں ایک بڑا ہی اچھا ناول رکھا ہے آپ لے جایئے ساری الماری ڈھونڈ ماری لیکن کم بخت ناول کا پتا نہیں تھا سارے دراز کھول ڈالے لیکن ایک دراز نہ کھل سکا میں نے اپنی کنجی سے اسے کھول دیا۔

"یا الہٰی یہ کیا" میری حیرت کی انتہا نہ تھی۔ سارے دراز میں نازک خوبصورت چوڑیاں، بندے، تراش سفید موتیوں کے نکلس بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک چٹھی لگی ہوئی کسی پر "ادیب" کے ساتھ، کسی پر ہدیۃً تہنیت کہیں تحفۃً حقیر اور کسی پر خلوص کے ساتھ" میں ایک ایک چیز دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے میں نے سوچا۔

"یہ لارڈ صاحب" بھی چھپا رستم نکلا۔ اچانک میری نظر دراز کے اندرونی حصے میں رکھے ہوئے مرمریں تاج محل پڑی۔ میں نے تاج اٹھایا تو اس کے نیچے خطوط کا ایک پلندا ملا میں نے خطوط کو الٹ پلٹ کر دیکھا خطوط سے بھینی بھینی سینٹ کی بو آ رہی تھی میں نے ایک خط لیا پہلی مخاطب تھی۔

"ریشمان" میں پریشان ہو گئی کہ کیا کیا جائے۔ میں نے جلدی سے سب چیزوں کو سمیٹ لیا اور خطوط کے پلندے کو بیگ میں رکھ دیا۔ اور آیا سے کہہ دیا کہ وہ ساری چیزیں چھپا کر موٹر میں رکھ دے اور تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر واپس چلی آئی۔

رات دیر گئے —— میں وہ خطوط پڑھتی رہی لارڈ صاحب نے بھی انشا پردازی کی انتہا کر دی تھی۔ سارے خطوط ریشمان کے نام۔ کم بخت نے تو قلم توڑ کر رکھ دیا تھا اسی پلندے میں بعض خطوط ریشمان کے تھے کہاں لارڈ صاحب کے عالا پاکیزہ التصورات اور کہاں ریشمان کے جذبات انگیز ہیجان خیز تحریرات میں نے دل ہی دل میں ان دونوں کا مقابلہ کیا ریشمان لپکتا ہوا شعلا اور لارڈ صاحب ایورسٹ کے برف کا تودا۔ ریشمان ابھرتے ہوئے سورج کی تیز مچلتی ہوئی کرن اور لارڈ صاحب چاند کی شفاف خاموش روشنی کیا ان دونوں کا نباہ ہو سکتا ہے میں نے بار بار آپ ہی آپ سوال کیا اور کوئی غیر ہیجانی طاقت کہتی "نہیں"

ان تمام خطوط کو پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ واضح ہوا کہ لارڈ صاحب نے یہ سارے پرزنٹ ریشمان کے لیے خریدے لیکن اپنی شرم اور غالباً اپنی بے مائیگی کے احساس کی

بدولت وہ انہیں ریشمان کو نہ دے سکا۔ اور نہ یہ خطوط اس تک پہنچ سکے۔ ریشمان نے خود لکھے جن کے جوابات لارڈ صاحب نے الماری کے دراز کی زینت بنائے رکھا۔

اس کے پانچ چھ دن بعد لارڈ صاحب میرے پاس آیا۔

"اتنے دن کہاں غایب رہے" میں نے انجان بن کر اس سے دریافت کیا۔

"جی کچھ مصروف تھا" سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا۔

"مصروف تھے یا کچھ غایب ہو جانے پر ماتم کر رہے تھے"

"یہ آپ نے کیا کہا" کم بخت پھر مسکرا پڑا "بات دراصل یہ ہے کل ریشمان کی سالگرہ ہے آپ کی بھی دعوت ہے" اس نے میرا رقعا دیتے ہوئے کہا۔

"کل وہ تحفے دینے کا خیال ہے"

"اتنے سارے پرنٹ دیتے ہیں لے کہا، کہتے کیوں نہیں ہمت نہیں ہوتی" صرف اتنا کہ رہے تھے۔ اور وہ ہنس دیا۔

میں دوسرے دن وقت مقررہ سے کچھ پہلے پہنچی اور ریشمان کے ہاتھ میں وہ سارے تحایف تھما دیے جن کے ہر کونے پر باریک الفاظ میں "لارڈ صاحب" لکھا ہوا تھا۔ ریشمان کا چہرا فرط مسرت سے نکھر گیا اور ان بندوں اور نکلس میں تو واقعی بڑی حسین معلوم ہوتی تھی شام کو لارڈ صاحب آیا اور ریشمان کے کانوں میں بندے اور گلے میں نکلس دیکھا تو سیدا میرے پاس بھاگا ہوا آیا اور میرے ہاتوں کو چومتے ہوئے کہنے لگا۔ کتنا بڑا احسان کیا آپ نے۔ اس کی آنکھوں میں میں نے عقیدت کے آنسو تیرتے دیکھے۔ اس کی اس سادگی اور معصوم حرکت پر میں تو کیا سب ہی ہنس پڑے۔

دعوت شاندار تھی۔ مرد اور عورتوں کا کافی مجمع تھا ساری جوان نگاہیں ریشمان کا طواف کر رہی تھیں جو نہیں سی سفید شیفارن کی ساڑی اور تنگ نیلی ریشمی چولی پہنے ہنستے ہوئے پتلی کمر لچکاتے ہوئے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔

اور میں یہ بھی نوٹ کر رہی تھی کہ تحفا دیتے ہوئے اکثر نوجوان ریشمان کا ہاتھ زور سے دبا دیتے تھے جس کے جواب میں ریشمان کا ایک بانکا سا لفظی تنقید گونج اٹھتا۔

لارڈ صاحب میرے بازو بیٹھا یہ تماشا خامشی سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے یہ حرکات پسند میں نہیں۔

"دیکھیے مس ریشمان۔ آپ کا ایک گانا ہو جاے۔ ایک قیمتی سوٹ پہنے ہوئے شخص نے سگریٹ کا بھرپور کش لیتے ہوئے کہا ریشمان نے شوخ نگاہوں سے اسے دیکھا اور اپنی گردن کو دو ایک جھٹکے دیے اور پیانو پر کوئی لچر فلمی گیت گانے لگی میں نے کوری نگاہوں سے لارڈ صاحب کو دیکھا۔ غصا اور کوفت سے اس کا چہرا تمتما رہا تھا گانا ختم ہونے کے ساتھ ہی کئی آوازیں ریشمان کی طرف لپکیں۔ فرمایش کرنے والے شخص نے تو ریشمان کے شانوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا "اف آپ نے تو آج ہمیں کو بھی مات کر دیا"

"آپ کی آواز میں غضب کا جادو تھا" دوسرے نے کہا

"آپ کچھ دیر اور گائیں تو شاید یہ جلتے ہوئے چراغ بجھ جائے" اور ریشمان کمر لچکاتی مسکراتی، ہنستی گردن کو ہلکے ہلکے سے جھٹکے دیتی سب کا شکریا ادا کرتی رہی۔ لارڈ صاحب غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

ایک شام میں اور لارڈ صاحب گھر کے پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ریشمان سفید ریشمی مچھلیس پہنے جس میں سے اس کے بدن کا گورا رنگ جھوٹ پڑ رہا تھا۔ سیاہ سفید فراک اور سیاہ اوڑنی گلے میں لپیٹے چلی آئی۔

"اور بیٹھو ریشمان" میں نے کہا اور لارڈ صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنی کرسی پیش کر دی اور خود دوسری کرسی لینے اندر چلا گیا۔

"سالگرہ کی پارٹی سے ——— جلد کیوں چلی آئیں ریشمان نے جھجک سے پوچھا۔

"انہیں سے دریافت کر لو۔" میں نے کہا۔ لارڈ صاحب کرسی لیے آیا۔ اور ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ رشیمان نے سوال دہراتے ہوئے کہا۔

"کیا گانا پسند نہیں آیا۔"

"آپ کی آواز تو ٹھیک تھی۔" لارڈ صاحب نے آرام سے کرسی پر نیم دراز ہوتے اور الفاظ کو تولتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "لیکن آپ کا وہاں گانا مناسب نہیں تھا۔ آپ کی آواز میں نہ تو جادو ہے اور نہ آپ کا مقابلات سے کیا جا سکتا ہے۔ ان صاحبین کا مقصد اتنی زیادہ تعریف کرنے سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ آپ کو اپنے اندازوں پر نچانا چاہتے ہیں۔ اور کوئی تعجب بھی نہیں کہ آپ ایک ان ناچنے بھی لگیں مجھے کسی کے متعلق برے خیالات کے اظہار کا حق تو نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صاحبین عورت کی اس کمزوری سے پوری طرح واقف ہیں کہ عورت فطرتاً خشامد پسند واقع ہوئی ہے اور بدقسمتی سے یہ جذبا آپ میں کچھ زیادہ ہے۔ برا نہ مانیے۔ شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں ناچنے گانے کے لیے نہیں پیدا ہوئیں۔ وہ آسائی سے گھر کا چراغ بن سکتی ہیں۔ شمع محفل بننا ان کے لیے مناسب نہیں ہو سکتا تھا کہ اس ان لائیٹ کا فیور اڑوا دیا جاتا اور اس سے پیدا ہونے والی تاریکی کو آپ کی آواز کے جادو کا نتیجہ بنا دیا جاتا۔ بہرحال آپ کو احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔" لارڈ صاحب دفعتہً خاموش ہو گیا۔ رشیمان کا چہرا ایسا ہو گیا جیسے ابھی ابھی کونین کی گولیاں کھالی ہوں۔ صاف گو سادہ لوح لارڈ صاحب اطمینان سے بیٹھا اس کے لیے جامے بناتا رہا ہنستے ہنستے اسے بسکٹ پیسٹری OFFER کرتا رہا۔

"دیکھی آپ نے رشیمان کی حالت" لارڈ صاحب ایک دن آتے ہی کہنے لگا۔ اس کا چہرا اترا ہوا تھا لیکن مسکراہٹ حسب حال بحال تھی رشیمان دن رات اس جوہری کے ساتھ موٹر میں پھرا کرتی ہے جس نے اس رات اس سے گانے کی فرمائش کی تھی۔ وہ اب باریک کپڑے پہننے لگی ہے کہ ان کا پہننا نہ پہننا دونوں برابر ہے۔ ابھی ابھی میں نے ان دونوں کو ساتھ جاتے دیکھا ہے رشیمان سگریٹ بھی پینے لگی ہے مجھے دیکھ کر وہ انجان ہو گئی۔ شاید وہ حج سے روٹھ گئی ہے آپ اسے سمجھایئے وہ غلط روش چل رہی ہے ممکن ہے سنبھل جائے ورنہ تباہ ہو جائے گی۔

"آخر وہ ہے کون۔ کرتا کیا ہے۔" میں نے دریافت کیا

"وہ جوہری ہے" لارڈ صاحب کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ لوگوں سے ہیرے تھیروں کے دام خریدتا ہے۔ اور لوگوں کو پتھر ہیرے کے دام بھیجتا ہے۔ اصل نگینوں کی قیمت گھٹا دیتا اور جھوٹے نگینوں میں چمک پیدا کر دیتا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے آپ رشیمان کو حقیقت حال سمجھا دیجیے۔

میں رشیمان سے مل بھی نہ سکی تھی کہ مجھے رشیمان اور سیٹھ عبداللہ جوہری کی شادی کا رقعا ملا میں نے رکھتے رکھتے لارڈ صاحب کے سامنے کر دیا۔

"ارے یہ تو میرے پاس بھی آچکا ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے جیب سے رقعہ نکال کر مجھے بتلایا۔ میں تو ضرور جاؤں گا۔ آپ بھی چلیں گی نا۔ لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ وہ شادی میں شریک ہوگا۔ لیکن بیچ بیچ وہ بن ٹھن کر آیا۔ اس کا چہرا معمول سے زیادہ شگفتہ تھا۔ وہ ساری محفل میں ہنستا رہا۔ لوگوں کو ہنساتا رہا البتہ جب میں جلوے کی رسم میں شرکت کرنے اور تحفہ دینے اندر جا رہی تھی تو اس نے ایک دستی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ یہ رشیمان نے دیا تھا۔ اسے آپ خامشی سے رشیمان کو لوٹا دیجیے اس کا گلا رندھ گیا۔ اور رات گئے وہ خامش میرے ساتھ واپس ہوا۔

چند دن بعد معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب سخت بیمار ہے مجھے اپنے آپ پر غصا آیا کہ اتنے دن اس کے پاس کیوں نہیں گئی وہ چارپائی پر خاموش پڑا تھا۔ مجھے دیکھتے

ہی ہنس پڑا۔

"کہاں تھیں اتنے دن آپ"

"تم کہاں غایب رہے بیمار تھے تو اطلاع تو دی ہوتی آخر ہوا کیا" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے کیا ہوا۔ کچھ سردی زکام"

"سردی زکام نہیں۔ رات رات بھر جاگنے کا نتیجہ ہے" میں نے دیکھا ایک نازک سی لڑکی کمرے کے کونے میں کھڑی تنزلی کہہ رہی ہے۔

"ارے آپ زبیدا سے ملیے" لارڈ صاحب فوراً بول اٹھا۔ میرے پڑوس میں رہتی ہیں۔ کبھی کبھی آجا کرتی ہیں میری بیماری کا حال سنکر میں نے غور سے دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔

"یہ ٹھیک ہوگی اُس کے لیے۔ لارڈ صاحب جیسے لاپروا جذباتی انسان کے لیے اس نرم طبیعت کی لڑکی موزوں ہوگی"

لارڈ صاحب کی بیماری اور زبیدا کی مسلسل تیمارداری نے ایک دوسرے کو قریب کر دیا۔ جب وہ کامل تندرست ہوگیا تو زبیدا کی اس ہمدردی سے کافی متاثر تھا بلکہ زبیدا کے اس التفات نے لارڈ صاحب کے دل سے ریشماں کی بے التفاتی کو بڑی حد تک دور کر دیا تھا۔

ایک دن لارڈ صاحب بن ٹھن کر میرے پاس آیا۔

"یہ کوٹ پالین کر کہاں جا رہے ہو۔ میں نے اس کی سیاہ شیروانی سفید پائجامے اور سیاہ جوتے کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا

"آپ بھی چلیے آج زبیدا کی منگنی ہے"

"اس نے چوری چوری ہر چیز لیے ـــــ اور اب آخری وقت آئے ہیں"

"حسد کر رہی ہیں آپ بھی۔ لارڈ صاحب کی آواز روندی ہوئی تھی۔

"میرا رسم تھوڑی ہی ہے۔ زبیدا کی منگنی راشد کے ساتھ ہو رہی ہے۔

"کون راشد"

"میرے ساتھ میٹرک میں پڑھتا تھا۔ عین امتحان کے قریب اس نے میرے نوٹس اٹھا لیے تھے۔ جس کی وجہ سے میرا ایک سال ضایع ہوا۔ پرسوں اس نے مجھ سے کہا کہ وہ زبیدا کو بے حد چاہتا ہے اور خود زبیدا کے والد نے مجھ سے یہ کہتے ہوئے رائے طلب کی کہ راشد ایک شریف نوجوان ہے اچھے اثرات رکھتا ہے سات سو روپے ماہوار آمدنی ہے ترقی کی کافی امید ہے آپ کی کیا رائے ہے بھلا میں کیا رائے دے سکتا تھا صرف یہ کہہ دیا "جو آپ کی مرضی"

اور میں سوچنے لگی کہ لارڈ صاحب بھی عجیب دل گردے کا مالک ہے اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا کر ہنس رہا ہے۔ مجھے اس راشد کے کردار پر غصہ آیا اور تعجب بھی ہوا کہ نوٹس چرا کر بے چارے لارڈ صاحب کا ایک سال ضایع کیا اور اب اس کی ایک ہمدرد کو اس سے چھین کر اس کی ساری زندگی تباہ کر رہا ہے۔ لارڈ صاحب قسمت کا یہ وار بھی سہہ گیا۔

"سنا آپ نے کل ریشماں کو کسی نے زخمی کر دیا وہ دواخانے میں رجوع ہے آپ چل سکتی ہیں میرے ساتھ" لارڈ صاحب ایک صبح ہانپتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"کس نے کیسے" میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

"یہ سب کلب کی برکات ہیں اور پھر بیچاری کو سیٹ عبداللہ نے بھی چھوڑ دیا۔ افسردا اور ملول سا تھا بجھوٹ اس کے ساتھ دواخانے گئی معلوم ہوا کہ ریشماں کے جسم سے کافی خون بہہ چکا ہے اور اس کی زندگی کے لیے تازا تازا گرم گرم انسانی خون کی ضرورت ہے ڈاکٹر نے کئی لوگوں کے خون کا معائنہ کیا لیکن کسی کا خون ریشماں کے خون سے نہیں مل رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب میرے خون کا بھی TEST کر لیجیے۔ لارڈ صاحب نے قمیص کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے ایک اور بار کوشش کی۔ معائنے کے دوران

لارڈ صاحب کا چہرا تردد سے کئی رنگ بدل چکا تھا۔ لارڈ صاحب کو دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل اٹھی اور لارڈ صاحب، مسکراتے مسکراتے ہنس پڑے اور لارڈ صاحب کا خون لیا جانے لگا۔

لارڈ صاحب کمزور ہو گیا۔ مسلسل تین بار اسے خون دینا پڑا۔ وہ دواخانے میں شریک ہو گیا۔ ایک شام میں اس کے وارڈ میں گیا۔

لارڈ صاحب پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ سامنے اسٹول پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ اور لارڈ صاحب چینی کا مذاق جلا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے" میں نے تعجب جاتے ہوئے دریافت کیا

"انعام ہے بدلا لینے" لارڈ صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور ایک چٹھی میری طرف بڑھا دی۔

"میرے محسن!

دنیا میں اگر کسی کا بدلا نہیں دیا جا سکتا ہے تو وہ خون ہے آپ کے اس ایثار کی عمر بھر مشکور رہوں گی یہ تھوڑی سی رقم مرسل ہے ——

—— امید کہ قبول فرمائیں گے۔

بدلفیہ ریشمان"

"یہ کیا ویلو انا پن ہے" میں نے موم بتی گل کر دی۔ بقیہ لوٹ زبردستی محفوظ کر لیے۔

"ریشمان کو عبداللہ نے کیوں چھوڑ دیا"

"جوہری نے ہیرے کی جوت چھین لی۔ اب اس کی نظر میں وہ صرف پتھر ہے" لارڈ صاحب کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔

"آپ اسے دیکھ آئے۔ دیکھیے وہ کیسی ہے"۔ لارڈ صاحب نے بڑی عاجزی سے کہا۔

میں نے دواخانے کے عملے سے دریافت کیا معلوم ہوا ریشمان وارڈ چھوڑ چکی ہے اور اس نے ٹیکسی اسٹینڈ کے لیے لی تھی۔ یہ سنکر لارڈ صاحب پھچ پھچ رو پڑا۔

پلنگ پر لیٹے لیٹے اس نے زبیدا اور راشد کی شادی کی خبر سنی مجھے بلا کر کہا۔

"شاید میں زبیدا کی شادی میں شرکت نہ کر سکوں آپ ضرور جائیے اور وہ رقم جو ریشمان نے میرے خون کے معاوضے میں مجھے دیا تھا۔ جیسے آپ نے محفوظ کیا تھا آپ زبیدا کو دیدیجیے۔ اسے میرا سلام کہیے۔ اور کہیے کہ میری ساری نیک تمنائیں اس کے ساتھ ہیں"۔ اور جب میں نے لارڈ صاحب کے تحفے کو زبیدا کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس کے ہونٹ پھڑک پھڑک اٹھے۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ عشق پیچاں کی بیل کی طرح لرز اٹھی۔ وہ مضراب کے تار کی طرح تھرتھرا اٹھی۔ وہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ ہچکیوں کو دبائے مجھ سے لپٹ گئی اور میں نے واپس آکر دیکھا کہ لارڈ صاحب کا چہرا آنسوؤں سے نم تھا۔

اور آج شام اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھ کر وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"زندگی میں وہی شخص کامیاب رہ سکتا ہے جو ہر حال بازی جیتنے کی صلاحیت رکھے۔ ہم جیسے لارڈ صاحب اس دنیا میں جی نہیں سکتے۔ آپ کیوں رو رہی ہیں ایب صرف آپ کے آنسو میری دولت ہیں اس کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی ——!!!

اگر آپ مصنف ہیں اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے۔ اس لیے کہ یہی وہ بیباک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے تبصرے کیلیے ہر کتاب کے دو نسخے آنے چاہئیں۔

ہندستان میں انگریزی کا مستقبل

کے۔ ایم منشی

حصول آزادی نے جہاں ہمارے ملک کے کئی مسایل کو حل کر دیا ہے وہاں اس سے کئی نئے مسئلے پیدا بھی ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ مشکل درپیش ہے کہ ہمارے ملک کی مختلف زبانوں کا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ آزادی کے بعد جذبہ قومیت کی شدت کے زیر اثر انگریزی زبان کو فوراً اس درجے سے ہٹانے کی خواہش پیدا ہوئی جو اسے انگریزی راج کے زمانے میں حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ زندگی کے مختلف شعبوں سے انگریزی کو خارج کرنے کی تحریک جاری ہے لیکن چونکہ ہندی اسی سرعت سے انگریزی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اس لیے اس سے پیدا کیے خلا کو علاقائی زبانوں سے پر کیا جا رہا ہے انگریزی کو ہٹانے کے لیے غیر ضروری جوش و خروش کے مظاہرے سے ہندی کو فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچتا ہے اس سے ملک کے مختلف حصوں کے لوگوں میں علاقائی احساس زور پکڑ رہا ہے، اور شتر کا قومیت کا احساس ماند پڑ رہا ہے چار حاناً زبان پرستی کا یہ جذبہ ہمارے لیے آج سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان نفسیاتی دیواریں حایل کرنے کا موجب بنتا ہے اور بھارت کی یک جہتی کو کمزور کرنے کے اس جذبے سے شدید نتایج پیدا ہو رہے ہیں۔

انگریزی کو اپنی زندگی سے خارج کرنے کی جلد بازی میں ہمیں انگریزی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے ہماری قومی زندگی کو رشتہ اتحاد میں منسلک رکھنے کے لیے انگریزی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے ملک کی مختلف زبانوں کی نشو و نما پر انگریزی نے گہرا اثر ڈالا ہے اور آج کے تعلیم یافتہ اشخاص ابھی مزید کئی سالوں تک ہندی یا علاقائی زبانوں کے ذریعے غور و فکر کرنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے ان زبانوں کی اظہاری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے اب بھی انگریزی کا گہرا ربط قایم رکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم اپنے ذہنی اور سائنسی تربیت کے بلند معیار کو انگریزی کے ذریعے قایم رکھے ہوئے ہیں اور غیر ممالک سے ہمارے میل جول کا انحصار بھی اسی زبان پر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہمارے ملک میں قانون کے معیار کے انحصار بھی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی قانونی کتب پر ہے۔ مثال کے طور پر میں بڑے ادب کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ میرے خیال میں ابھی کافی عرصے تک سپریم کورٹ کا کوئی بھی جج خیال کی درستگی اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ہندی میں بھی ولیپ ہی فیصلا نہیں لکھ سکے گا جیسا کہ انگریزی میں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انگریزی کو ہندستان میں وہ درجہ حاصل نہیں رہ سکتا جو اسے انگریزی راج کے زمانے میں حاصل تھا۔ ہمارا تہذیبی اور سیاسی مستقبل ہندی کو قومی زبان کے طور پر فروغ دینے پر ہی منحصر ہے اس لیے ہندی میں نئے الفاظ کا ذخیرہ اکٹھا کرنے اور اسے زیادہ مقبول بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا جانا چاہیے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ انگریزی اور یہاں تک کہ ہندی بھی علاقائی مادری زبان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ چنانچہ علاقائی زبانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وقت پا کر علاقائی زبانیں سنسکرت اور ہندی اور یہاں تک کہ انگریزی کے بھی زیر اثر یکساں طور پر ترقی کرنا شروع کر دیں گی اور مختلف علاقوں کے باہمی میل جول

کی عوامی زبان ہندی کی مدد سے وہ ایک دوسرے کے قریب تر آتی جائیں گی۔

انگریزی کو ہندستان کے کسی طبقے کے لوگوں کے لیے مادری زبان کے طور پر برقرار رکھنا درست نہیں۔ ایسا کرنے سے ملک کی ایک چھوٹی سی اقلیت جذبہ قومیت کی رو سے کٹ جائے گی۔ اور ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا جو نفسیاتی لحاظ سے قطعی غیر ملکی ہوگا اس سے آخر میں متعلقہ اقلیت کو نقصان پہنچے گا اس لیے جن لوگوں کی مادری زبان اب تک انگریزی رہی ہے انہیں چاہیے کہ وہ جلد سے جلد تعلیم کی ابتدائی منزل سے ہی ہندی یا کسی علاقائی زبان کو بھی دوسری زبان کے طور پر سیکھنے کی طرف توجہ دیں۔

جن انگریزی اسکولوں کا ماحول غیر ملکی ہے انہیں انگریزی کی تعلیم کا معیار کم کیے بغیر یا اپنی کارکردگی کے علما معیار کو ترک کیے بغیر اپنے آپ کو بھارتی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے کہ انگریزی کو ہٹانے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ جوں جوں ہندی انگریزی کی جگہ لینے کے قابل ہوتی جائے گی توں توں بتدریج انگریزی کو ہٹانے کے لیے قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس تدریجی عمل کی کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مرکزی سرکار ہندی کی ترقی کے لیے مستقل اور پرجوش لائحہ عمل مرتب کرے اور انگریزی کے ہٹائے جانے سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے اسے علاقائی زبانوں سے پر نہ کرنے دیا جائے بجا لات موجودہ جبکہ اتری ہندستان کے ہندی نہ بولنے والے علاقوں میں انگریزی کو ہٹانے کی مہم بڑی تیزی سے جاری ہے لیکن ہندی کو اس کی جگہ لینے کے قابل بنانے کی کوششیں کمزور ہیں اور اس کے برعکس دکنی بھارت کے کئی مقامات پر نہ صرف ہندی بلکہ سنسکرت کی بھی مخالفت کی جا رہی ہے۔ یہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں انگریزی کو اختیاری زبان کے طور پر علا اسطحوں پر نظم و نسق چلانے کے لیے واحد زبان کی حیثیت سے برقرار رکھا جائے قومی اسمبلیوں میں بھی ابھی تک کئی ممبران ہندی کو عموماً نہیں سمجھ سکتے اس لیے انگریزی کے بارے میں ہمیں زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

انگریزی کو زندگی کے کسی شعبے سے جلد بازی میں نکالنے کی ضرورت نہیں۔ جوں جوں ہندی ترقی کرے گی وہ خود بخود انگریزی کی جگہ لیتی جائے گی اس لیے انگریزی کو آج کل کی ثانوی تعلیم سے علیحدہ کرنے کی ضرورت نہیں جہاں تک سائنس، ٹیکنالوجی وغیرہ کی عالا تعلیم حاصل کرنے کا تعلق ہے انگریزی کے مطالعے کے بغیر چارا نہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران وویکانند، آر بندو، گاندھی جی، اور جواہر لال ایسے نامور ہندستانیوں نے بھی انگریزی ادب کی دولت میں بھاری اضافہ کیا ہے اگر ہم غیر ممالک کے لوگوں تک ہندستان کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ کام انگریزی کے ذریعے ہی انجام دیا جا سکتا ہے اور ان حالات میں انگریزی کو نظر انداز کر دینا ہمارے لیے ایک مجرمانہ فعل کے مترادف ہوگا۔

برٹش میوزیم کے لیے مشرقی زبانوں کے قلمی نسخے

گذشتہ سال کے دوران برٹش میوزیم نے اپنے مجموعے میں مشرقی زبانوں کے ۴۲ قلمی نسخوں کا اضافہ کیا۔ ۹ قلمی نسخے تبتی زبان، پانچ چینی زبان، ایک ہندی زبان، ایک میلگو زبان اور ایک پالی زبان کا ہے ان کے علاوہ ۱۱ ان قلمی نسخوں میں غالب کے اردو میں چار خطوط بھی شامل ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔
(۲) مجوّہ حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا رہے گا۔
(۳) دل آزار مباحث کے سوا ہر موضوع پر مضامین قبول کیے جائیں گے۔
(۴) بے لاگ تنقید اور تبصرے کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے رہیں گے۔
(۵) مستقل خریداروں کو وقت پر رسالہ نہ پہنچے تو دس تاریخ تک اطلاع دینے پر دوبارہ بھیجا جائے گا۔
(۶) جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ اور مضامین کی واپسی کے لیے بھی مناسب ٹکٹ لگا ہوا لفافہ لازمی طور پر بھیجا جائے۔
(۷) اشتہار صاف ہونا چاہیے۔ دفتر کسی قسم کی غلطی کا ذمے دار نہ ہوگا۔
(۸) جب تک اشتہار کی اجرت پہلے وصول نہ ہو اشتہار چھاپے نہ جائیں گے۔
(۹) مضامین ٹائپ یا صاف ایک طرف پر خوش خط لکھے جائیں۔
(۱۰) اگر رسالے کی خریداری منظور ہو تو ایک سال کا چندہ پہلے ہی بھیجا جائے۔

منیجر "ہندستانی ادب"

۹۹۔ اے۔ اعظم پورہ شرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی۔ حیدرآباد دکن